چوگان ہستی

(۲۶)

اراولی کی سرسبز جھومتی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں جسونت نگر
طرح منہ چھپائے ہوئے ہے جیسے بچہ ماں کی گود میں ۔ ماں کی چھاتی
ے دودھ کی دھاریں جوشِ محبت سے بیقرار ابلتی میٹھے سُروں میں
ی نکلتی ہیں اور بچہ کے ننھے سے منہ میں نہ سماکر نیچے بکھر جاتی ہیں ۔
ج کی سنہری شعاعوں میں نہاکر ماں کا چہرہ نکھر گیا ہے اور بچہ بھی آنچل
ے منہ نکال کر ماں کے ممتا بھرے چہرہ کی طرف دیکھتا ہے اور
کراتا ہے ۔ مگر ماں بار بار اُسے آنچل سے ڈھک لیتی ہے کہ کہیں
ے نظر نہ لگ جائے ۔

دفعتاً توپ کے دغنے کی کرخت آواز سنائی دی ۔ ماں کا دل دہل
یا ۔ بچہ گود سے چمٹ گیا ۔ پھر وہی مہیب آواز ۔ ماں کانپ اُٹھی ۔ بچہ
ٹ گیا ۔

پھر تو لگا تار توپیں چھوٹنے لگیں۔ ماں کے چہرہ پر خوف کے بادل چھاگئے+ آج ریاست کے نئے پولٹیکل ایجنٹ یہاں آرہے ہیں۔ انہیں کے خیر مقدم میں سلامیاں اُتاری جارہی ہیں۔

مسٹر کلارک اور صوفیا کو یہاں آئے ایک مہینہ گزر گیا۔ جاگیرداروں کی ملاقاتوں دعوتوں نذرانوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ آپس میں کچھ بات چیت ہو+ صوفیا بار بار ونے سنگھ کا تذکرہ کرنا چاہتی مگر تو اُسے موقع ہی ملتا اور نہ یہی سوجھتا کہ کس طرح تذکرہ کروں۔ آخر جب پورا مہینہ ختم ہوگیا تو ایک روز اُس نے کلارک سے کہا "ان خاطر داریوں کا سلسلہ تو جاری ہی رہے گا اور برسات گزری جارہی ہے۔ اب یہاں جی نہیں لگتا۔ اب پہاڑی علاقوں کی سیر کرنی چاہئے پہاڑیوں میں خوب بہار ہوگی" مسٹر کلارک بھی راضی ہو گئے +ایک ہفتہ سے دونوں ریاست کی سیر کررہے ہیں۔ ریاست کے دیوان سردار نیلکنٹھ راؤ بھی ہمراہ ہیں۔ جہاں یہ لوگ پہنچتے ہیں بڑی دھوم دھام سے اُن کا خیر مقدم ہوتا ہے۔ سلامیاں دی جاتی ہیں ایڈریس بھی ملتے ہیں۔ خاص خاص مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ مدرسوں شفاخانوں اور دیگر سرکاری عمارتوں کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ صوفیہ کو جیل خانوں کے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ قیدیوں کو اُن کے کھانے کے مقامات کو نیز قید خانہ کے قواعد کو نہایت توجہ سے دیکھتی ہے اور قید خانوں کی حالت میں اصلاح کرنے پر ملازموں سے خاص زور دیتی ہے۔ آج تک بد نصیب قیدیوں کی طرف کسی ایجنٹ نے کبھی توجہ نہ کی تھی۔ اُن کی حالت قابلِ افسوس تھی۔ انسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا

تھا کہ اُس کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر صوفیا کی متواتر مساعی سے اُن کی حالت سدھرنے لگی ہے۔ آج جسونت نگر کو مہمانوں کی خاطر و تواضع کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے اور سارا شہر اُن کی خاطرداریوں میں مصروف ہے۔ ریاست کے ملازمین پگڑیاں باندھے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ کسی کے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں جیسے خواب میں کسی نے بھیڑیا دیکھا ہو۔ عمّال نے بازاروں کو آراستہ کرایا ہے۔ جیل کے قیدیوں اور شہر کے چوکیداروں نے قلیوں اور مزدوروں کا کام کیا ہے۔ وہاں کا کوئی بھی آدمی بلا اجازت سڑکوں پر نہیں جانے پاتا۔ شہر کا کوئی شخص اس خیر مقدم میں شریک نہیں ہوا اور ریاست نے عوام کی اس بے اعتنائی کا اسی صورت میں جواب دیا ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف مسلح سپاہیوں کی قطاریں استادہ ہیں۔ کہ رعایا کی دلی بے چینی کا کوئی نشان نظر نہ آئے عام جلسوں کی ممانعت کردی گئی ہے۔

شام ہوگئی تھی۔ جلوس نکلا۔ پیدل اور سوار آگے آگے تھے۔ باجے بج رہے تھے۔ سڑکوں پر روشنی ہو رہی تھی۔ مگر مکانوں کی چھتوں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ چھتوں سے نہیں بلکہ سپاہیوں کے ہاتھوں سے۔ صوفیا سب کچھ سمجھتی تھی مگر کلارک کی آنکھوں پر پردہ سا پڑا ہوا تھا۔ اقتدار کی بے حسی نے اُن کی عقل خبط کردی ہے۔ سرکاری عمّال سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن عقیدتِ عامہ پر اُن کا قابو نہیں ہوتا۔ شہر میں کہیں جوش و مسرت کا پتہ نہیں ہے۔ منحوس سی چھائی ہوئی ہے۔ نہ ہر قدم پر تھے

کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ نہ کوئی دیوی آرتی اُتارنے کو آتی ہے۔ اور نہ کہیں گانا بجانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کے سوگ میں مبتلا ماں کے سامنے جشن منایا جا رہا ہے۔

شہر کا گشت کر کے صوفیا مسٹر کلارک سردار نیلکنٹھ اور دو ایک اعلےٰ ملازمین سرکاری تو شاہی محل میں آ کر رونق افروز ہوئے۔ بقیہ لوگ رخصت ہو گئے۔ میز پر چاء لائی گئی مسٹر کلارک نے بوتل سے پیالہ میں شراب ڈالی تو سردار صاحب جنہیں شراب کی بُو سے نفرت تھی۔ کھسک کر صوفیا کے پاس جا بیٹھے اور بولے ——— جسونت نگر آپ کو کیسا پسند آیا؟

صوفیا۔ نہایت پُر فضا مقام ہے۔ پہاڑیوں کا منظر نہایت دلفریب ہے۔ شاید کشمیر کے سوا ایسا قدرتی نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ شہر کی صفائی سے جی خوش ہو گیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں یہیں رہوں۔

نیلکنٹھ ڈر گئے۔ ایک دو روز تک تو پولیس اور فوج کی طاقت سے شہر کو پُر امن رکھا جا سکتا ہے مگر مہینے دو مہینے تک کسی طرح بھی نہیں۔ بالکل ناممکن ہے۔ کہیں یہ لوگ یہاں ٹھہر گئے تو شہر کی واقعی حالت ضرور ہی روشن ہو جائے گی۔ نہ جانے اُس کا کیا انجام ہو۔ بولے "یہاں کی ظاہری دلفریبی کے دھوکے میں نہ آئیے۔ آب و ہوا بہت خراب ہے۔ آگے جا کر آپ کو اس سے زیادہ بہتر مقامات دیکھنے کو ملیں گے۔"

صوفیا۔ کچھ ہی ہو۔ میں یہاں دو ہفتے ضرور ہی رہوں گی۔ کیوں ولیم۔ تمہیں یہاں سے جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

کلارک۔ تم یہاں رہو تو میں دفن ہو جانے کو تیار ہوں۔

صوفیا۔ لیجئے سردار صاحب۔ ولیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

صوفیا کو سردار صاحب کے دق کرنے میں مزہ آرہا تھا۔

نیلکنٹھ۔ پھر بھی میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جسونت نگر بہت اچھی جگہ نہیں ہے۔ آب و ہوا کی خرابی کے علاوہ یہاں کی رعایا میں بدامنی کی علامات پیدا ہو گئی ہیں۔

صوفیا۔ جب تو ہمارا یہاں رہنا اور بھی ضروری ہے۔ میں نے کسی ریاست میں یہ شکایت نہیں سُنی۔ گورنمنٹ نے ریاستوں کو اندرونی انتظامات میں خود مختار بنا رکھا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ریاستوں میں بغاوت کے جراثیم کو نشو و نما پانے کا موقع دیا جاوے۔ اس کی ذمہ داری ریاست کے حکام پر ہے اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ وہ اس غفلت کے لئے اُن سے اطمینان بخش جواب طلب کرے۔

سردار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ صوفیا سے اُنھوں نے یہ بات بیخوف ہو کر کہہ دی تھی۔ اس کی منکسر مزاجی سے اُنھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میری نذر و نیاز نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ کچھ بے تکلف سے ہو گئے تھے۔ یہ ڈانٹ پڑی تو آنکھیں چوندھیا گئیں۔ التجا کے لہجہ میں بولے:۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگرچہ ریاست پر موجودہ حالات کی ذمہ داری ہے تاہم ہم لوگوں نے حتےالامکان حالات کو درست رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ بدامنی کا بیج اُس مقام سے آیا جہاں سے اس کے آنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ زہر کے قطرے سنہری برتنوں میں لائے گئے۔ بنارس کے رئیس

ور بھرت سنگھ ... لٹیروں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کا
ر تک نہ ہوئی۔ ڈاکوؤں سے دولت کی حفاظت کی جا سکتی ہے مگر ساہوؤ
ے نہیں۔ رضاکاروں نے خدمت کی آڑ میں یہاں کی بیوقوف رعایا پر
سامنت پھونکا۔ کہ اس کے اتارنے میں ریاست کو بڑی بڑی مشکلات
سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خصوصاً کنور صاحب کا لڑکا تو نہایت شریر
بیعت کا آدمی ہے۔ اس نے اس علاقہ میں اپنے باغیانہ خیالات
ی یہاں تک اشاعت کی کہ اسے باغیوں کا اکھاڑا بنا دیا۔ اس کی باتوں
یں کچھ ایسا جادو ہوتا تھا کہ رعایا پیاسوں کی طرح اس کی طرف دوڑتی
ی۔ اس کا فقیرانہ بھیس، اس کی سادہ اور بے لوث زندگی، اس
ی سچی ہمدردی و غمگساری اور سب سے زیادہ اس کے حسنِ مردانہ
ی کشش نے سب چھوٹے بڑوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ ریاست
و بڑی فکر ہوئی۔ ہم لوگوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ہر لحظہ بغاوت کی آگ
ھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں صدر سے فوجی کمک
روانہ کرنی پڑی۔ ونے سنگھ تو کسی طرح گرفتار ہو گیا مگر اس کے دیگر
رفقا ابھی تک علاقہ میں چھپے ہوئے رعایا کو اکسا رہے ہیں۔ کئی بار یہاں
سرکاری خزانہ لٹ چکا ہے۔ کئی بار ونے کو جیل سے نکال لے جانے
ی ناکام کوشش کی جا چکی ہے اور ملازمین کو ہمیشہ اپنی جانوں کا خوف
نا رہتا ہے۔ مجھے مجبور ہو کر آپ سے یہ حال بیان کرنا پڑا۔ میں آپ کو
یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہرگز نہ دوں گا۔ اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ہم
لوگوں نے جو کچھ کیا اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

صوفیہ نے بہت زیادہ متفکرانہ انداز سے کہا۔ واقعی حالت اس

سے زیادہ تشویش ناک ہے جتنا میں سمجھتی تھی۔ ایسی حالت میں ولیم کا یہاں سے چلا جانا فرض کے خلاف ہوگا۔ وہ یہاں گورنمنٹ کے قائمقام ہوکر آئے ہیں۔ صرف سیر و تفریح کے لئے نہیں۔ کیوں ولیم تمہیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ یہاں کے حالات کی رپورٹ بھی تو بھیجنی پڑے گی ؛۔
مسٹر کلارک نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا۔
تمہاری مرضی ہو تو جہنم میں بھی بہشت کی خوشی حاصل کرسکتا ہوں۔ رہا رپورٹ کا لکھنا۔ وہ تمہارا کام ہے ؛۔
نیلکنٹھ۔ میری آپ سے مؤدبانہ عرض ہے کہ ریاست کو سنبھلنے کے لئے کچھ اور وقت دیجئے۔ آپ کا رپورٹ بھیجنا ہمارے لئے مضر ہوگا +

ادھر تو یہ تماشا ہو رہا تھا۔ صوفیا اقتدار کے تخت پر جلوہ افروز تھی۔ ثروت مورچھل ہلاتی تھی۔ رعب اردلی میں تھا۔ اُدھر وِنے سنگھ اپنی اندھیری کال کوٹھڑی میں غم و غصّہ میں بھرا بیٹھا ہوا عورت کی بیدردی اور بیوفائی پر رو رہا تھا۔ اور قیدی اپنے اپنے کمرے صاف کر رہے تھے۔ انہیں کل نئے کمبل اور نئے کُرتے دئے گئے تھے۔ جو ریاست کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ تھا۔ جیل کے ملازمین قیدیوں کو پڑھا رہے تھے۔ میم صاحب پوچھیں۔ تمہیں کیا شکایت ہے تو سب لوگ یکزبان ہوکر کہنا۔ حضور کے اقبال سے ہم سب لوگ بہت آرام سے ہیں۔ اور حضور کے جان و مال کی خیر مناتے ہیں۔ پوچھیں کیا چاہتے ہو تو کہنا حضور کی روز بروز ترقی ہو۔ اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔ خبردار جو کسی نے سر اوپر اُٹھایا یا کوئی اور بات زبان سے

نکالی۔ کھال اُدھیڑ دی جائے گی۔" قیدی جامہ میں پھولے نہ سماتے تھے
آج میم صاحبہ کی آمد کی خوشی میں مٹھائیاں ملیں گی۔ ایک دن کی چھٹی
ہوگی۔ بھگوان اُنہیں سدا سکھی رکھیں کہ ہم ابھاگوں پر اتنی دیا کرتی
ہیں۔"

مگر ونے کے کمرہ میں ابھی تک صفائی نہیں ہوئی۔ نیا کمبل پڑا
ہوا ہے۔ چھوا تک نہیں گیا۔ نیا کرتہ جوں کا تیوں تہ کیا ہوا رکھا ہے
وہ اپنا پرانا کرتا ہی پہنے ہوئے ہے۔ اس کے جسم کے ایک ایک
جزو سے۔ دماغ کے ایک ایک ذرہ سے۔ دل کی ایک ایک حرکت سے
یہی آواز آرہی ہے "صوفیا! اس کے سامنے کیونکر جاؤں گا؟" اُس نے
سوچنا شروع کیا "صوفیا یہاں کیوں آرہی ہے؟ کیا میری تحقیر کرنا
چاہتی ہے۔ صوفیا! جو رحم و محبت کی مجسم دیوی تھی؟ کیا وہ مجھے
کلارک کے سامنے بُلاکر اپنے پیروں تلے کچلنا چاہتی ہے؟ اتنی بیدردی
اور مجھ سے بدنصیب پر جو آپ ہی اپنے دنوں کی گردش کو رو رہا ہے
نہیں وہ اتنی سنگدل نہیں ہے۔ واقعی اس کا نازک دل اتنا سخت
نہیں ہوسکتا۔ یہ سب مسٹر کلارک کی شرارت ہے۔ وہ مجھے صوفیا
کے سامنے ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں اُنہیں یہ موقع نہ دوں گا۔
میں ان کے سامنے بھی نہ جاؤں گا۔ مجھے جبراً لے جائے جس کا جی
چاہے۔ کیوں بہانہ کروں کہ میں بیمار ہوں؟ صاف کہہ دوں گا۔ میں
وہاں نہیں جاتا۔ اگر جیل کا یہ قانون ہو تو ہوا کرے۔ مجھے ایسے
قانون کی پروا نہیں جو بالکل بے معنی ہے۔ سنتا ہوں۔ دونوں یہاں
ایک ہفتہ تک ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ کیا رعایا کو پیس ہی ڈالیں گے۔

اب بھی تو مشکل سے نصف آدمی بچ رہے ہوں گے۔ سینکڑوں نکال دئے گئے سینکڑوں جیل میں ٹھونس دئے گئے۔ کیا اس شہر کو بالکل تباہ کرنا چاہتے ہیں؟

دفعتاً جیل کا داروغہ آکر تند لہجہ میں بولا "تم نے کمرہ کی صفائی نہیں کی؟ ارے تم نے تو ابھی تک کرتہ بھی نہیں بدلا۔ کمبل تک نہیں بچھایا تمہیں حکم ملا یا نہیں"؟

وستے۔ حکم تو ملا مگر میں نے اُس کی تعمیل کرنا ضروری نہیں خیال کیا۔
داروغہ نے اور گرم ہوکر کہا۔ "اس کا یہی نتیجہ ہوگا کہ تمہارے ساتھ بھی اور قیدیوں کا سا سلوک کیا جائے۔ ہم تمہارے ساتھ اب تک شرافت کا برتاؤ کرتے آئے ہیں۔ اس لئے کہ تم ایک معزز رئیس کے لڑکے ہو اور یہاں غیر جگہ آپڑے ہو۔ مگر میں شرارت نہیں برداشت کرسکتا"۔

وستے۔ یہ بتلائیے کہ مجھے پولیٹیکل ایجنٹ کے سامنے تو نہ جانا پڑیگا۔
داروغہ۔ اور یہ کمبل اور کرتہ کس لئے دیا گیا ہے؟ کبھی اُدھر بھی کسی نے یہاں نیا کمبل پایا ہے؟ تم لوگوں کے تو نصیب جاگ اُٹھے۔
وستے۔ اگر آپ میرے ساتھ اتنی رعایت کریں کہ مجھے صاحب کے سامنے جانے پر مجبور نہ کریں تو میں آپ کا حکم ماننے کو تیار ہوں۔
داروغہ۔ کیسی بے سر پیر کی باتیں کرتے ہو جی؟ میرا کوئی اختیار ہے! تمہیں جانا پڑے گا۔

وستے نے منت آمیز لہجہ میں کہا "میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولونگا کسی دوسرے موقع پر داروغہ جی شاید جامہ سے باہر ہو جاتے

لرآج قیدیوں کو خوش رکھنا ضروری تھا۔ بولے ”مگر بھائی۔ یہ رعایت
رنی میرے اختیار سے باہر ہے۔ مجھ پر نہ جانے کیا آفت آجائے۔
سردار صاحب مجھے کچا ہی کھا جائیں گے۔ میم صاحبہ کو جیل خانوں
کے دیکھنے کا خبط ہے۔ بڑے صاحب تو اہلکاروں کے دشمن ہیں مگر
یم صاحبہ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ سچ پوچھو تو جو کچھ ہیں وہ میم
ماحبہ ہی ہیں۔ صاحب تو اُن کے اشاروں کے غلام ہیں۔ کہیں وہ
اراض ہو گئیں تو تمہاری میعاد تو دونی ہو ہی جائے گی پر ساتھ ہی ہم
بھی کہیں کے نہ رہیں گے“۔

وسنے۔ معلوم ہوتا ہے۔ میم صاحب اُن پر بہت حاوی ہیں؟
داروغہ۔ حاوی! اجی یہ کہو کہ میم صاحبہ ہی پولیٹیکل ایجنٹ ہیں۔
صاحب تو صرف دستخط کرنے کو ہیں۔ نذر نیاز سب میم صاحب ہی
کے ہاتھوں میں جاتی ہے۔

ونے۔ آپ میرے ساتھ اتنی رعایت کیجئے کہ مجھے ان کے سامنے جانے
کے لئے مجبور نہ کیجئے۔ اتنے قیدیوں میں ایک قیدی کی کمی معلوم بھی نہ
ہو گی۔ ہاں وہ اگر مجھے نام لے کر بلائیں گی تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔
داروغہ۔ سردار صاحب مجھے زندہ ہی نگل جائیں گے۔
ونے۔ مگر کرنا آپ کو یہی پڑے گا۔ میں اپنی خوشی سے ہرگز نہ جاؤں گا
داروغہ۔ میں بُرا آدمی ہوں۔ مجھے دق مت کرو۔ میں نے اسی
جیل میں بڑے بڑے سرکش قیدیوں کی گردنیں ڈھیلی کر دی ہیں۔
ونے۔ اپنے کو کوسنے کا آپ کو اختیار ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ میں
جبر کے سامنے سر جھکانے والا آدمی نہیں ہوں۔

داروغہ۔ بھئی تم عجیب آدمی ہو۔ اُس کے حکم سے سارا شہر خالی کرایا جا رہا ہے اور تم پھر بھی اپنی ضد کئے جاتے ہو۔ لیکن تمہیں اپنی جان بھاری ہو۔ مجھے تو اپنی جان بھاری نہیں ہے ۔

وسنے۔ کیا شہر خالی کرایا جا رہا ہے؟ یہ کیوں؟

داروغہ۔ میم صاحب کا حکم ہے اور کیا؟ جسونت نگر پر اُن کا قہر ہے۔ جب سے انہوں نے یہاں کی واردا تیں سُنی ہیں۔ مزاج بگڑ گیا ہے۔ ان کا بس چلے تو سارا شہر کُھدوا کر پھینک دیں۔ حکم ہوا ہے کہ ایک ہفتہ تک کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں شورش برپا نہ ہو جائے۔ صدر سے فوجی امداد طلب کی گئی ہے ۔

داروغہ نے حالات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ اس سے اُن کا مقصد ونے سنگھ پر اثر ڈالنا تھا اور اُن کا مقصد پورا ہو گیا۔ ونے سنگھ کو فکر ہوئی کہ کہیں حکم عدولی سے ناراض ہو کر حکام نے مجھ پر زیادہ سختی کرنی شروع کی۔ اور عوام کو یہ خبر ملی تو وہ یقیناً فساد برپا کر دیں گے اور اُس حالت میں اُن کی خونریزیوں کے گناہ کا عذاب میری گردن پر ہوگا۔ کون جانے۔ میرے بعد میرے ساتھیوں نے عوام کو اور بھی اُبھار رکھا ہو کیونکہ اُن میں شریر المزاج نوجوانوں کی کمی نہیں ہے نہیں۔ حالت نازک ہے۔ مجھے اِس وقت صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ داروغہ سے پوچھا۔ میم صاحب یہاں کس وقت آئیں گی؟

داروغہ۔ ان کے آنے کا کوئی وقت تھوڑا ہی مقرر ہے۔ دھوکا دے کر کسی ایسے وقت آ پہنچیں گی جب ہم لوگ غافل پڑے

ہوں گے۔ اِسی لئے تو کہتا ہوں کہ کمرہ کی صفائی کر ڈالو۔ کپڑے بدل لو۔ کون جانے آج ہی آجائیں ٭

وِنے۔ اچھی بات ہے۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں۔ سب کر لوں گا۔ اب آپ بیفکر ہو جائیں ٭

داروغہ۔ سلامی کے وقت آنے سے انکار تو نہ کرو گے ؟

وِنے۔ جی نہیں۔ آپ مجھے سب سے پہلے صحن میں موجود پائیں گے ٭

داروغہ۔ میری شکایت تو نہ کرو گے ؟

وِنے۔ شکایت کرنا میری عادت نہیں۔ اسے آپ خوب جانتے ہیں ٭

داروغہ چلا گیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ وِنے نے اپنے کمرہ میں جھاڑو لگائی۔ کپڑے بدلے۔ کمبل بچھا دیا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جس سے کسی کی توجہ ان کی جانب مائل ہو۔ وہ اپنی بے عذری سے حکام کے شکوک کو رفع کر دینا چاہتے تھے کھانے کا وقت آ گیا مگر مسٹر کلارک نہ آئے۔ بالآخر داروغہ نے نا اُمید ہو کر قید خانہ کے دروازے بند کرا دئے اور قیدیوں کو سونے کا حکم دے دیا۔ ونے لیٹے تو سوچنے لگے :۔ صوفیا میں یہ تبدیلی کیوں کر ہو گئی ؟ وہی شرم و حیا کی دیوی۔ وہی خدمت و ایثار کی پُتلی۔ آج اپنی مطلق العنانی کے سبب ڈائن سی بنی ہوئی ہے۔ اُس کا دل کتنا نرم تھا اور رحم سے کتنا معمور۔ اس کے جذبات کتنے بلند اور خیالات کتنے پاکیزہ تھے۔ اس کے مزاج میں کتنی سادگی تھی۔ اس کی ایک نگاہ دل پر کالیداس کی ایک ایک تشبیہ کا سا اثر پیدا کرتی تھی۔ اُس کے منہ سے جو لفظ نکلتا تھا وہ شمع کے نور کی طرح دل کو منور کر دیتا تھا۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ صرف پھولوں کی خوشبو سے اس کی سرشت ہوئی ہے۔ کتنا سادہ۔ کتنا متین کتنا دل کش حسن تھا! وہی صوفیا اب اتنی بید رد ہو گئی ہے!

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا گویا کوئی طوفان آ رہا ہے۔ آج جیل خانہ کے صحن میں دارو غہ کے مویشی نہ بندھے تھے نہ برآمدوں میں گھاس کے ڈھیر تھے۔ آج کسی قیدی کو اہلکاران جیل کے جوٹھے برتن نہیں صاف کرنے پڑے۔ کسی کو سپاہیوں کی چپی نہیں کرنی پڑی۔ جیل کے ڈاکٹر کی بڑھیا مہری آج قیدیوں کو گالیاں نہیں دے رہی تھی۔ اور دفتر میں قیدیوں سے ملاقات کرنے والے رشتہ داروں سے وصول کئے گئے نذرانہ کی تقسیم نہ ہوتی تھی۔ کمروں میں چراغ تھے۔ دروازے بھی کھلے رکھے گئے تھے۔ ونے کے دل میں خیال پیدا ہوا کیوں نہ بھاگ چلوں۔ ممکن ہے کہ میرے سمجھانے بجھانے سے عوام کو تسکین ہو۔ صدر سے فوج آ رہی ہے۔ ذرا سی بات میں غدر ہو سکتا ہے۔ اگر میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ میرے اس گناہ کا کفارہ ہوگا۔ اُنھوں نے دبی ہوئی نگاہوں سے جیل کی اونچی دیواروں کو دیکھا۔ کمرہ سے باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑی۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟ لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں عوام کو بھڑکانے کے ارادہ سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی حیص بیص میں رات گذر گئی۔ ابھی اہلکاروں کی نیند بھی نہ کھلی تھی۔ کہ موٹر کی آواز نے آنے والوں کی خبر دی۔ دارو غہ۔ ڈاکٹر۔ وارڈر۔ چوکیدار سب گھبرا کر جھٹ پٹ نکل پڑے گھنٹی بجی

قیدی میدان میں نکل آئے۔ انہیں قطاروں میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا اور اُسی وقت صوفیا مسٹر کلارک اور سردار نیلکنٹھ جیل میں داخل ہوئے ٭

صوفیا نے آتے ہی قیدیوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں انتظار نہ تھا۔ اشتیاق نہ تھا۔ خوف تھا۔ اضطراب تھا۔ بیچینی تھی جس آرزو نے اُسے برسوں رولایا تھا۔ جو اُسے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ جس کے لئے اُس نے اپنے پسندیدہ اصولوں کو قربان کر دیا تھا اُسی کو سامنے دیکھ کر وہ اُس وقت مضمحل ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی پردیسی بہت دنوں کے بعد اپنے گاؤں میں آکر اندر قدم رکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ کہ کہیں کسی کی صدائے ماتم کانوں میں نہ آپڑے۔ دفعتاً اُس نے ونے کو سر جھکائے ہوئے کھڑے دیکھا۔ دل میں محبت کا ایک ہیجان پیدا ہوا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ گھر وہی تھا مگر ویران خس و خاشاک سے ڈھکا ہوا پہچاننا مشکل تھا۔ وہ شگفتہ چہرہ کہاں تھا جس پر شعر کی نزاکت نثار ہوتی تھی۔ وہ دستِ کرم کا سا فراخ سینہ کہاں تھا؟ صوفیا نے بے اختیار چاہا کہ ونے کے پیروں پر گر پڑوں۔ اُسے آنسوؤں سے دھوؤں۔ اُسے گلے سے لگاؤں۔ دفعتاً ونے شگھ غش کھا کر گر پڑے۔ ایک درد بھری آواز تھی جو ایک لمحہ تک گونج کر فرطِ غم سے دب گئی۔ صوفیا فوراً ونے کے پاس جا پہنچی۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ جیل کا ڈاکٹر دوڑا۔ وارڈر دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ آج نوکریوں کی خیریت نہیں۔ میم صاحب پوچھیں گی اس کی حالت اتنی نازک تھی تو ہسپتال میں کیوں نہیں رکھا۔ بڑی

مصیبت میں پھنسا۔ اس بھلے آدمی کو بھی اسی وقت بیہوش ہونا تھا کچھ نہیں۔ یہ سب اس کی شرارت ہے۔ اُس نے دم روک رکھا ہے۔ بنا ہوا ہے۔ مجھے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ بچہ جانے دو میم صاحب کو تو دیکھنا تمہاری کیسی خبر لیتا ہوں۔ کہ ساری بیہوشی غائب ہو جائے اور پھر کبھی بیہوش ہونے کا نام نہ لو۔ یہ آخر اِسے ہو کیا گیا؟ کسی قیدی کو آج تک یوں بیہوش ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاں قصّوں میں لوگوں کا بات بات میں بیہوش ہو جانا پڑھا ہے۔ صرع کی بیماری ہوگی اور کیا"۔

داروغہ تو اپنی جان کی خیر منا رہا تھا اور اُدھر سردار صاحب مسٹر کلارک سے کہہ رہے تھے کہ یہ وہی نوجوان ہے جس نے ریاست میں شورش برپا کر رکھی ہے۔ صوفیا نے ڈاکٹر کو جھڑک کر ہٹ جانے کو کہا اور ونے کو اُٹھوا کر دفتر میں لے گئی۔ آج وہاں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ نقرئی کُرسیاں تھیں۔ میز پر زرین میز پوش تھا اور اس پر خوب صورت گلدستے تھے۔ میز پر ناشتہ کی چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ تجویز تھی کہ معائنہ کے بعد صاحب یہاں ناشتہ کریں گے۔ صوفیا نے ونے کو قالین کے فرش پر لٹا دیا اور سب لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ہمدردی اور رحم کے لئے مشہور تھی۔ کسی کو کچھ تعجب نہ ہوا۔ جب کمرہ میں کوئی نہ رہا تو صوفیا نے دریچوں پر پردے ڈال دئے۔ ونے کا سر اپنی زانو پر رکھ کر اپنا رومال اس پر جھلنے لگی۔ آنسوؤں کے گرم گرم قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر ونے کے چہرہ پر گرنے لگے۔ ان میں کس قدر جان فزائی تھی۔ ان میں اس کی ساری

قلبی اور روحانی طاقت بھری ہوئی تھی۔ ایک ایک قطرہ اُس کی زندگی کے چشمہ کا ایک ایک قطرہ تھا۔ ونے سنگھ کی آنکھیں کھل گئیں۔ بہشت کا ایک پھول لازوال لا انتہا خوشبو میں نہایا ہوا اور ہوا کے ہلکے جھونکوں سے ملتا ہوا سامنے موجود تھا۔ حُسن کی سب سے زیادہ دلکش اور سہانی نمود وہ ہے جب وہ رشک آلود غم میں مبتلا نظر آتا ہے۔ وہی اُس کی روحانی نمود ہوتی ہے۔ ونے چونک کر اُٹھ نہیں بیٹھے۔ یہی تو محبت کے متوالوں اور عشق کے دیوانوں کی معراج ہے۔ یہی تو اُن کا بہشت ہے یہی تو اُن کی سنہری سلطنت ہے۔ یہی تو اُن کی آرزوؤں کی انتہا ہے اس روحانی لذت سے سیری کہاں ؟ اُس کے دل میں ایک درد بھری حسرت پیدا ہوئی :۔ کاش اسی طرح محبت کی سیج پر لیٹے ہوئے یہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوجاتیں۔ ساری آرزوؤں کا خاتمہ بالخیر ہوجاتا۔ مرنے کے لئے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا ہے ؟

دفعتاً اسے یاد آگیا۔ کہ صوفیا کو چھونا بھی اس کے لئے ممنوع ہے اُس نے فوراً اپنا سر اس کے زانو پر سے ہٹا لیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا" مسز کلارک۔ آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ اس کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں"۔

صوفیا نے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا" احسان گالی کی شکل میں تو نہیں ظاہر کیا جاتا۔

ونے نے متحیر ہوکر کہا" ایسا بڑا قصور مجھ سے کبھی نہیں ہوا"۔

صوفیا۔ خواہ مخواہ کسی شخص کے ساتھ میرا رشتہ قائم کردینا گالی نہیں تو اور کیا ہے ؟

ونے ۔ مسٹر کلارک ؟
صوفیا ۔ کلارک کو میں تمہارے جوتے کا تسمہ کھولنے کے قابل بھی نہیں سمجھتی ؛
ونے ۔ لیکن اماں جی نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
صوفیا ۔ تمہاری اماں جی نے جھوٹ لکھا اور تم نے اس پر یقین کر کے مجھ پر واقعی بڑا ظلم کیا ۔ کوئل آم نہ پا کر بھی نمکوڑیوں پر نہیں گرتی ؛
اتنے میں مسٹر کلارک نے آکر پوچھا ۔ "اس قیدی کی کیا حالت ہے ؟ ڈاکٹر آ رہا ہے ۔ وہ اس کی دوا کرے گا ۔ چلو دیر ہو رہی ہے ؛"
صوفیا نے سرد مہری سے جواب دیا ۔ "تم جاؤ ۔ مجھے فرصت نہیں ہے ؛"
کلارک ۔ کتنی دیر تک تمہاری راہ دیکھوں ؟
صوفیا ۔ یہ میں نہیں بتلا سکتی ۔ میرے خیال میں ایک انسان کی خدمت کرنا سیر کرنے سے زیادہ ضروری ہے ؛
کلارک ۔ خیر میں تھوڑی دیر اور ٹھہروں گا ؛
یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے ۔ اس وقت صوفیا نے ونے کے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ۔ "ونے ! میں ڈوب رہی ہوں ۔ مجھے بچا لو ۔ میں نے رانی صاحبہ کے شکوک سے بچنے کے لئے یہ سوانگ رچا تھا ؛"
ونے نے مشکوک انداز سے پوچھا ۔ "تم یہاں مسٹر کلارک کے ساتھ کیوں آئیں ۔ اور ان کے ساتھ کیسے رہتی ہو ؟"
صوفیا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا ۔ بولی ۔ "ونے ! یہ نہ پوچھو ۔ مگر میں ایشور کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے کیا ۔

تمہیں اس قید سے نکالنے کے لئے مجھے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ میں نے کلارک کو مغالطہ میں ڈال رکھا ہے۔ تمہارے ہی لئے میں نے یہ جھوٹا بھیس بنا رکھا ہے۔ اگر تم اس وقت کہو کہ صوفیا تو میرے ساتھ جیل میں رہ تو میں یہاں آکر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اگر تم میرا ہاتھ پکڑ کر کہو کہ صوفیا تو میرے ساتھ چل تو آج ہی تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔ میں نے تمہارا دامن پکڑ لیا ہے اور اب اُسے کسی طرح بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ خواہ تم مجھے ٹھکرا ہی کیوں نہ دو۔ میں نے اپنی خودداری تک کو تمہارے لئے وقف کر دیا ہے ——————

ونے یہ ایشور کی مرضی ہے۔ یہ اُسی کی تحریک ہے ورنہ اس قدر ذلت وخواری برداشت کرتے ہوئے تم مجھے زندہ نہ پاتے ۔

ونے نے صوفیا کے دل کی تھاہ لینے کے لئے کہا۔ اگر ایشور کی مرضی ہے تو اُس نے میرے اور تمہارے درمیان میں یہ دیوار کیوں کھڑی کر دی ہے؟

صوفیا۔ یہ دیوار ایشور نے نہیں کھڑی کی بلکہ آدمیوں نے کھڑی کی ہے۔

ونے۔ کتنی مضبوط ہے۔

صوفیا۔ ہاں۔ مگر ناقابل شکست نہیں۔

ونے۔ تم اسے توڑ سکو گی؟

صوفیا۔ اُسی لمحہ تمہاری آنکھوں کے ایک اشارہ پر۔ ایک وقت تھا جب میں اُس دیوار کو ایشور کی بنائی ہوئی خیال کرتی تھی اور اُس کا احترام کرتی تھی۔ مگر اب اُس کی اصلیت سے واقف ہو گئی ہوں۔ پریم (محبت) ان رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ جسمانی رشتہ نہیں

روحانی رشتہ ہے۔

وتے نے صوفیا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اُس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ تو آج سے تم میری ہو اور میں تمہارا ہوں۔ صوفیا کا سر ونے سنگھ کے سینہ پر جھک گیا اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ جس طرح سیاہ بادل زمین پر جھک کر ایک لمحہ میں اُسے سیراب کر دیتے ہیں۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ خاموش رہ گئی۔ غم کی انتہا خموشی ہے مگر خشک اور جلانے والی خوشی کی انتہا بھی خموشی ہے مگر تر اور طراوت بخش۔ صوفیا کو اب اپنے ایک ایک عضو میں نبض کی ایک ایک حرکت میں باطنی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ کشتی نے ناخدا کا سہارا پا لیا تھا۔ اب اس کے لئے منزل مقصود ایک یقینی شے تھی۔ وہ اب ہوا کے جھونکوں یا لہروں کے تھپیڑوں کے ساتھ ڈانواں ڈول نہ ہوگی بلکہ ٹھیک طور سے اپنے راستہ پر چلے گی۔

وتے بھی دونوں پر کھولے ہوئے خوشی کے آسمان میں اُڑ رہا تھا۔ وہاں کی ہوا میں خوشبو تھی۔ روشنی میں جان تھی۔ کسی ایسی شے کا وجود نہ تھا جو دیکھنے میں کریہہ۔ سننے میں کرخت۔ چھونے میں سخت اور ذائقہ میں تلخ ہو۔ وہاں کے پھولوں میں کانٹے نہ تھے۔ آفتاب میں اتنی تمازت نہ تھی۔ زمین پر آندھیاں نہ تھیں۔ پیری نہ تھی۔ مفلسی نہ تھی۔ فکر نہ تھی۔ لڑائی نہ تھی۔ ایک سلطنت تھی۔ امن و آشتی سے معمور۔ صوفیا سلطنت کی ملکہ تھی اور وہ خود اس کی آغوش محبت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس خواب مسرت کے مقابلہ میں وہ ایثار و ریاضت کی زندگی کتنی بے مزہ، کتنی مایوسی بخش تھی۔ وہ حجرۂ تاریک کس قدر خوفناک!

دفعتاً مسٹر کلارک نے پھر آکر کہا۔ ڈارلنگ (پیاری) اب دیر نہ کرو۔ دیر تو بہت ہو رہی ہے۔ سردار صاحب مصر ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اس مریض کی تیمارداری کرے گا۔

صوفیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ونے کی طرف سے منہ پھیر کر درد سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ گھبرانا نہیں۔ میں کل پھر آؤں گی۔

ونے کو ایسا معلوم ہوا گویا رگوں میں خون منجمد اور خشک ہوتا جاتا ہے۔ وہ سُن کر پڑا رہ گیا۔ صوفیا دروازہ تک گئی۔ پھر رومال لینے کے بہانہ سے واپس آکر ونے کے کان میں کہنے لگی۔ میں کل پھر آؤں گی۔ اور جبھی ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں تمہاری جانب سے سردار نیلکنٹھ سے کہہ دوں گی کہ وہ معافی چاہتے ہیں۔

صوفیا کے چلے جانے کے بعد بھی یہ جلدی میں کہے گئے مگر اُمید سے بھرے اور محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کسی نغمۂ شیریں کی آخری گونج کی طرح ونے کے کانوں میں گونجتے رہے۔ مگر وہ جلد ہی ٹھوس دنیا میں آنے کے لئے مجبور ہوا۔ جیل کے ڈاکٹر نے آکر اس کو دفتر ہی میں ایک پلنگ پر لٹا دیا۔ اور مقوی دوائیں دیں۔ پلنگ پر نرم بستر تھا۔ تکئے لگے تھے۔ پنکھا جھلا جا رہا تھا۔ داروغہ ایک ایک منٹ بعد مریض کی مزاج پرسی کے لئے آتا تھا اور ڈاکٹر تو وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ ونے نے ان تیمارداریوں سے تنگ آکر ڈاکٹر سے کہا۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ آپ اب جائیں۔ شام کو آجائیے گا۔

ڈاکٹر صاحب ڈرتے ڈرتے بولے۔ آپ کو ذرا نیند آجائے تو

میں چلا جاؤں ؛

وِ تّنے لئے اُنہیں یقین دلایا کہ آپ کے رخصت ہوتے ہی مجھے نیند آجائے گی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی مفروضہ خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے چلے گئے۔ اسی حیلہ سے وِتّنے نے داروغہ کو بھی ہٹایا جو آج اخلاق و رحم کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے سمجھا تھا کہ میم صاحب کے چلے جانے پر اس کی خوب خبر لوں گا مگر وہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ سردار صاحب نے جاتے وقت تاکید کر دی تھی کہ اِن کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا ورنہ میم صاحب جہنم رسید کریں گی ؛

کسی بات کو اطمینان سے سوچنے کے لئے تنہائی کا ہونا اُسی قدر ضروری ہے جتنا کہ مراقبہ کے لئے۔ ہوا کی جنبش ترازو کے پلڑوں کو برابر نہیں ہونے دیتی۔ وِتّنے کو اب خیال آیا۔ اَمّاں کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ اپنے دل میں کیا کہیں گی۔ میرے ساتھ اُن کی کتنی دلی تمنائیں وابستہ ہیں۔ صوفیا کے دامِ محبت سے بچانے کے لئے اُنہوں نے مجھے جلاوطن کیا اور اس لئے اُنہوں نے صوفیا کو بدنام کیا۔ اُن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ رنج تو پتاجی کو بھی ہوگا مگر وہ مجھے معاف کر دیں گے اِس لئے کہ اُنہیں انسانی کمزوریوں سے ہمدردی ہے۔ اَمّاں جی میں دماغ ہی دماغ ہے۔ پتاجی میں دل اور دماغ دونوں ہیں۔ لیکن میں اسے کمزوری کیوں کہوں؟ میں کوئی ایسا کام نہیں کر رہا ہوں جسے دنیا میں کسی نے نہ کیا ہو۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جنہوں نے اپنے کو قوم پر قربان کر دیا ہو؟ ذاتی خیال کے ساتھ ہی قوم کا خیال رکھنے والے آدمیوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ کیا ہے۔ فنا فی القوم

ہو جانے والے لوگوں کا شمار تو انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ پھر جس قوم کے حکام میں عقل و انصاف نہیں۔ رعایا میں احساس و جوش نہیں۔ اُس کے لئے قربان ہو جانا فضول ہے۔ اندھوں کے آگے روکر اپنے دیدے کھونے کے سوا اور کیا ہاتھ آتا ہے؟

رفتہ رفتہ تخیلات نے زندگی کی آسایش کے سامان جمع کرنا شروع کئے:۔ دیہات میں رہوں گا۔ وہیں ایک چھوٹا سا مکان بنواؤں گا صاف کُشادہ اور ہوادار۔ زیادہ تکلف یا تصنع کی ضرورت نہیں۔ وہیں ہم دونوں سب سے الگ رہ کر بعافیت زندگی بسر کریں گے۔ بیجا نمود سے کیا فائدہ؟ میں باغیچہ میں کام کروں گا۔ کیاریاں بناؤں گا۔ قلمیں لگاؤں گا اور صوفیا کو اپنی کارگزاری سے حیرت میں ڈالوں گا۔ گلدستے بنا کر اُس کے سامنے پیش کروں گا اور دست بستہ کہوں گا کہ سرکار۔ کچھ انعام ملے۔ پھلوں کی ڈالیاں لگاؤں گا اور کہوں گا کہ رانی جی کچھ نگاہ ہو جائے۔ کبھی کبھی صوفیا بھی پودوں کو سینچے گی۔ میں تالاب سے پانی بھر بھر دوں گا۔ وہ لاکر کیاریوں میں ڈالے گی۔ اُس کا نازک جسم پسینہ سے اور خوشنما لباس پانی سے تر ہو جائے گا۔ اس وقت کسی پیڑ کے نیچے اُسے بٹھلا کر میں پنکھا جھلوں گا۔ کبھی کبھی کشتی میں سیر کریں گے دیہاتی کشتی ہوگی۔ ڈانڈ سے چلنے والی۔ موٹر بوٹ میں وہ لطف کہاں۔ وہ سکون کہاں؟ اس کی تیزی سے سر چکرا جاتا ہے۔ اس کے شور سے کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ میں کشتی میں بیٹھ کر ڈانڈ چلاؤں گا صوفیا کنول کے پھول توڑے گی۔ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوں گے۔ کبھی کبھی پر بھو سیوک بھی آئیں گے۔ آہ کتنی خوش کُن زندگی ہوگی کل

ہم دونوں عازم وطن ہوں گے جہاں خوشیاں آغوش کھولے ہمارا انتظار کر رہی ہیں!

صوفیا اور کلارک کی آج شام کو ایک جاگیردار کے یہاں دعوت تھی۔ جب میزیں آراستہ ہوگئیں اور ایک صاحب۔ آبادی مداری نے اپنے کرتب دکھانے شروع کیے تو صوفیا نے موقع پا کر سردار نیلکنٹھ سے کہا۔ "اُس قیدی کی حالت مجھے خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دل کی حرکت بہت سست پڑ گئی ہے۔ کیوں ولیم۔ تم نے دیکھا اُس کا چہرہ کتنا زرد پڑ گیا تھا؟"

کلارک نے آج پہلی مرتبہ خلاف اُمید جواب دیا "غشی کی حالت میں اکثر چہرہ زرد پڑ جاتا ہے"۔

صوفیا۔ وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ اُس کی حالت اچھی نہیں۔ ورنہ غشی کیوں ہوتی۔ بہتر ہو کہ آپ اُسے کسی ہوشیار معالج کے سپرد کر دیں۔ میری رائے میں اب وہ اپنے تصور کی کافی سزا پا چکا ہے۔ اُسے رہا کر دینا مناسب ہوگا۔

نیلکنٹھ۔ میم صاحب اس کی صورت پر نہ جائیے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے یہاں عوام پر اُس کا کتنا اثر ہے۔ وہ ریاست میں اتنی زبردست بدامنی پیدا کر دے گا کہ اُس کا دبانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ بلا کا ضدی ہے۔ ریاست سے باہر جانے پر راضی نہیں ہوتا۔

کلارک۔ ایسے سرکش کو قید رکھنا ہی اچھا ہے۔

صوفیا نے بگڑ کر کہا۔ میں اسے سراسر ناانصافی سمجھتی ہوں اور مجھے آج پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ تم اتنے بیدرد ہو۔

کلارک۔ مجھے تمہارا جیسا دردمند دل رکھنے کا دعوے نہیں ہے۔

صوفیا نے کلارک کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ خودسری یہ تمکنت کہاں سے آئی؟ حقارت سے بولی۔ ایک انسان کی زندگی اتنی حقیر شے نہیں ہے۔

کلارک۔ سلطنت کے تحفظ کے مقابلہ میں ایک انسان کی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جس رحم سے جس ہمدردی سے کسی غریب کا پیٹ بھرتا ہو۔ اُس کی جسمانی تکالیف کا دفعیہ ہوتا ہو کسی مغموم کی تشفی ہوتی ہو اُس کا میں قایل اور مجھے فخر ہے کہ میں ان صفات سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ لیکن جو ہمدردی سلطنت کی جڑ کھوکھلی کر دے سرکشوں کو سر اُٹھانے کا موقع دے۔ رعایا میں بغاوت پھیلائے۔ اُسے میں ناعاقبت اندیشی ہی نہیں بلکہ حماقت سمجھتا ہوں۔

صوفیا کے چہرہ پر ایک غیر انسانی نمود کی جھلک دکھائی پڑی مگر اُس نے ضبط کیا۔ شاید اتنے تحمل سے اُس نے کبھی کام نہیں لیا تھا۔ مذہب داری کو تحمل سے عناد ہے۔ مگر اس وقت اُس کے منہ سے نکلا ہوا ایک غیر محتاط کلمہ بھی اس کی ساری زندگی کو تباہ کر سکتا تھا۔ نرم ہو کر بولی۔ "ہاں اس نقطۂ خیال سے بے شک شخصی زندگی کی کوئی قیمت نہیں باقی رہتی۔ میں نے اِس پہلو سے خیال نہ کیا تھا مگر پھر بھی اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ چھوڑ دیا جائے تو اس ریاست میں قدم نہ رکھے گا اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنے وعدہ کا پکا ہے"۔

نیلکنٹھ۔ کیا آپ سے اُس نے ایسا وعدہ کیا ہے؟

صوفیا۔ ہاں وعدہ ہی سمجھئے۔ میں اس کی ضمانت کرسکتی ہوں ٭
نیلکنٹھ۔ اتنا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے قول سے پھر نہیں سکتا ٭
کلارک۔ جب تک اُس کی تحریری درخواست میرے سامنے نہ آئے۔ میں اِس معاملہ میں کچھ نہیں کرسکتا ٭
نیلکنٹھ۔ ہاں یہ تو نہایت ہی ضروری ہے ٭
صوفیا۔ درخواست کا مضمون کیا ہوگا؟
کلارک۔ سب سے پہلے وہ اپنا قصور تسلیم کرے اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے بعد حلفی معاہدہ کرے کہ اس ریاست میں پھر قدم نہ رکھوں گا۔ اُس کے ساتھ ضمانت بھی ہونی چاہئے۔ یا تو نقد روپے ہوں یا معزز آدمیوں کی ضمانت ہو۔ تمہاری ضمانت کی میری نظر میں کتنی ہی وقعت ہو۔ ضابطہ کی نظر میں اس کی ذرا بھی وقعت نہیں ہے ٭

دعوت کے بعد صوفیا شاہی محل میں آئی تو سوچنے لگی۔ یہ عقدہ کیونکر حل ہو؟ یوں تو میں ونے کی منت سماجت کروں تو وہ ریاست سے چلے جانے پر راضی ہوجائیں گے لیکن غالباً وہ تحریری معاہدہ نہ کریں گے۔ اگر کسی طرح میں نے رو دھو کر انہیں اس پر بھی راضی کر لیا تو یہاں کون معزز شخص اُن کی ضمانت کرے گا؟ ہاں اُن کے گھر سے نقد روپے آسکتے ہیں مگر رانی جی کبھی اِسے منظور نہ کریں گی۔ ونے کو کتنی ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے پر اُن کو رحم نہ آئے گا۔ لطف توجب ہے کہ تحریری معاہدہ اور ضمانت کا کوئی ذکر ہی نہ رہے۔ وہ بلا کسی شرط کے آزاد کردیئے جائیں۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے ٭

محل برقی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ محل کے باہر چاروں طرف ساون کی کالی گھٹا تھی اور اتھاہ تاریکی۔ اس محیط تاریکی میں چمکدار محل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نیلے آسمان پر چاند نکلا ہو۔ صوفیا اپنے آراستہ کمرہ میں آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی ان قوتوں کو بیدار کر رہی ہے جن کا اثر لامحدود ہے۔ آج اس نے مدت کے بعد اپنے بالوں میں پھول گوندھے ہیں۔ فیروزی ریشمی ساڑی پہنی ہے۔ اور کلائیوں میں کنگن باندھے ہیں آج پہلی مرتبہ اس نے ان حسن افزا ترکیبوں سے کام لیا ہے۔ جن سے عورتیں واقف ہوتی ہیں۔ یہ منتر انہیں کو آتا ہے کہ کیونکر زلفوں کا ایک خم آنچل کی ایک لہر دل کو مضطرب کر دیتی ہے۔ آج اس نے مسٹر کلارک کے سلطنت پسندی والے اصول پر فتح یاب ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آج وہ اپنے حسن کی طاقت کو آزمائے گی ؛

رم جھم بوندیں گر رہی تھیں گویا مولسری کے پھول جھڑ رہے ہوں۔ بوندوں میں ایک دلکش نغمہ تھا۔ شاہی محل اور سرکوہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دیوتاؤں نے محفل جشن و طرب آراستہ کی ہے۔ صوفیا پیانو پر بیٹھ گئی اور دل کو بیچین کر دینے والا راگ گانے لگی۔ جس طرح صبح صادق کا سنہرا جلوہ ظہور پذیر ہوتے ہی قدرت کے ہر ہر جزو کو بیدار کر دیتا ہے۔ اسی طرح صوفیا کی پہلی ہی تان نے دل میں ایک چٹکی سی لی۔ مسٹر کلارک آ کر ایک کوچ پر بیٹھ گئے اور محو ہو کر سننے لگے گویا کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ انہیں کبھی کوئی کشتی اڑتے ہوئے سمندر میں جھکولے کھاتی نظر آتی جس پر چھوٹی چھوٹی خوب صورت چڑیاں منڈلاتی تھیں اور کبھی کسی صحرائے ناپیدا کنار میں

میں ایک فقیر جھولی کندھے پر رکھے لاٹھی ٹیکتا ہوا نظر آتا۔ نغمہ سے تخیل
با تصویر بن جاتا ہے ۔

جب تک صوفیا گاتی رہی مسٹر کلارک بیٹھے سر دُھنتے رہے۔
جب وہ خاموش ہو گئی تو اُس کے پاس گئے اور اُس کی کرسی کے
بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اُس کے منہ کے پاس منہ لے جا کر بولے۔
ان اُنگلیوں کو دل میں رکھ لوں گا ۔

صوفیا۔ دل کہاں ہے ؟

کلارک نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں تڑپ رہا ہے ۔

صوفیا۔ شاید ہو۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ میرا تو خیال ہے کہ خدا نے
تم کو دل دیا ہی نہیں ۔

کلارک۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر خدا نے جو کسر رکھی تھی اُسے تمہاری
نغمہ سرائیوں نے پوری کر دی۔ شاید اُن میں خلق کرنے کی صفت ہے ۔

صوفیا۔ اگر مجھ میں یہ اعجاز ہوتا تو آج مجھے ایک غیر شخص کے سامنے
نادم نہ ہونا پڑتا ۔

کلارک نے بے صبری سے کہا۔ کیا میں نے تمہیں نادم کیا؟ میں نے !

صوفیا۔ جی ہاں۔ آپ نے ! مجھے آج تمہاری بے اعتنائی سے جتنا رنج
ہوا اُتنا شاید اور کبھی نہ ہوا تھا۔ مجھے بچپن سے یہی سبق دیا گیا ہے کہ
ہر جان دار پر رحم کرنا چاہئے۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ یہی انسان کا سب
سے بڑا فرض ہے۔ مذہبی کتب میں بھی رحم اور ہمدردی ہی انسان
کی خاص صفات بتلائی گئی ہیں۔ مگر آج معلوم ہوا کہ بے رحمی کی اہمیت
رحم سے کہیں زیادہ ہے۔ سب سے بڑا رنج مجھے اس بات کا ہے کہ

اجنبی آدمی کے سامنے میری ہتک ہوئی ؂

کلارک۔ خدا جانتا ہے۔ صوفیا۔ میں تمہاری کتنی عزت کرتا ہوں۔ اس کا افسوس مجھے ضرور ہے کہ میں تمہاری مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہوا۔ اس کا سبب تمہیں معلوم ہی ہے۔ ہماری سلطنت اسی وقت تک ناقابل فتح رہ سکتی ہے جب تک رعایا کے دلوں پر ہمارا رعب قائم ہے۔ جب تک وہ ہم کو اپنا بھی خواہ اپنا محافظ اپنا سہارا سمجھتی رہے۔ جب تک ہمارے انصاف پر اس کا خاص اعتقاد ہو۔ جس روز رعایا کے دل سے ہمارا اعتبار اٹھ جائے گا اسی روز ہماری سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر سلطنت کو قائم رکھنا ہماری زندگی کا مقصد ہے تو شخصی خیالات و جذبات کے لئے اس میں ذرا بھی گنجائش نہیں۔ سلطنت کے تحفظ کے لئے ہم بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر سکتے ہیں۔ بڑی سے بڑی سختیاں جھیل سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی سلطنت جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور جس شخص سے ہمیں نقصان کا ذرا بھی اندیشہ ہو اُسے ہم کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اُسے بالکل فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی طرح کی رعایت۔ ہمدردی یہاں تک کہ منصفانہ سلوک بھی نہیں کر سکتے ؂

صوفیا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ مجھے سلطنت سے اتنی محبت نہیں جتنی تمہیں ہے اور میں اس کے لئے اتنی قربانیاں نہیں کر سکتی جتنی تم کر سکتے ہو تو تم نے مجھے بالکل نہیں سمجھا۔ مجھے دعوے ہے کہ اس معاملہ میں میں کسی سے جو بھر بھی پیچھے نہیں ہوں۔ لیکن یہ بات میرے قیاس میں بھی نہیں آتی کہ دو دوستوں میں کبھی اتنا اختلاف ہو سکتا

ہے کہ ہمدردی اور برداشت کے لئے کوئی گنجایش نہ رہے اور خصوصاً اُسی حالت میں جب کہ گوشِ دیوار کے علاوہ کوئی دوسرا کان بھی سننے کے لئے موجود ہو۔ دیوان کا دل حُب الوطنی کے جذبات سے ایک دم خالی ہے۔ وہ اس کی عمق و وسعت سے ذرا بھی واقف نہیں۔ اُس نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ جب ان دونوں میں میرے روبرو اس قدر بدمزگی ہو سکتی ہے تو تخلیہ میں نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہوگا۔ شاید آج سے اُس کے دل سے میری عزت اُٹھ گئی۔ اُس نے اور لوگوں سے بھی یہ ماجرا بیان کیا ہوگا۔ میری تو ناک سی کٹ گئی۔ تم سمجھتے ہو کہ میں گا رہی ہوں۔ یہ گانا نہیں رونا ہے۔ جب عقد والے مکان کے دروازہ ہی پر یہ حالت ہو رہی ہے جہاں پھولوں سے خوشی کے نعروں سے پرجوش مصافحوں سے ہنستی ہوئی آنکھوں سے میرا خیر مقدم ہونا چاہئے تھا تو میں اُس مکان کے اندر قدم رکھنے کی جُرأت کیونکر کر سکتی ہوں؟ تم نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ شاید تم مجھے بہت زیادہ ذکی الحس خیال کرتے ہو گے مگر اپنی فطرت کو فنا کر دینا میرے امکان کے باہر ہے۔ میں اپنے کو مبارکباد دیتی ہوں کہ میں نے اپنے عقد کے معاملہ میں اتنی دور اندیشی اور تامل سے کام لیا۔

یہ کہتے کہتے صوفیا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں گرنے لگیں مصنوعی غم کے اظہار میں بھی اکثر واقعی غم کا احساس ہونے لگتا ہے مسٹر کلارک افسوس و معذرت کا راگ الاپنے لگے مگر نہ مناسب الفاظ ہی ملتے تھے نہ ویسے خیالات۔ آنسوؤں کا سیلاب دلیل اور توجیہ کے کوئی ریلہ قرار نہیں چھوڑتا۔ اُنھوں نے بڑی مشکل

سے کہا۔ صوفیا مجھے معاف کرو۔ واقعی میں نہ سمجھتا تھا کہ اس ذرا سی بات سے تمہیں اتنا ملال ہوگا۔

صوفیا۔ اس کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تم میرے غلام نہیں ہو کہ میرے جا و بیجا احکامات کی تعمیل کرو۔ مجھ میں وہ اوصاف ہی نہیں ہیں جو مردوں کا دل کھینچ لیتے ہیں۔ نہ وہ حُسن ہے نہ وہ نمود ہے نہ وہ اندازِ دلکشی۔ ناز و نخرہ کرنا نہیں جانتی۔ روٹھ کر بیٹھ جانا نہیں جانتی۔ مجھے رنج صرف اس بات کا ہے کہ اُس آدمی نے تو میرے ایک اشارہ پر میری بات مان لی اور تم اتنی محنت کرنے پر بھی انکار ہی کرتے جاتے ہو۔ وہ بھی اپنے اصولوں کا مضبوط آدمی ہے۔ حکام کی سختیاں برداشت کیں۔ ذلتیں اُٹھائیں۔ جیل کے تاریک حجرہ میں قید ہونا پسند کیا لیکن اپنی بات پر قائم رہا۔ اِس سے کوئی بحث نہیں کہ اُس کی ضد جا تھی یا بیجا ہاں وہ اُسے جا سمجھتا تھا۔ وہ جس بات کو حق سمجھتا تھا اس سے خوف یا لالچ یا سزا کا خیال اُسے منحرف نہیں کر سکا۔ لیکن جب میں نے نرمی سے اُسے سمجھایا کہ تمہاری حالت خطرناک ہے تو اس کی زبان سے یہ ترنّاک الفاظ نکلے "میم صاحب۔ جان کی تو پرواہ نہیں۔ اپنے احباب و رفقا کی نظروں سے گر کر زندہ رہنا قابلِ تعریف نہیں۔ پھر بھی میں آپ کی بات نہیں ٹالنا چاہتا۔ آپ کے الفاظ میں ثقالت نہیں۔ ہمدردی ہے اور میں ابھی تک بالکل بے حس نہیں ہوا ہوں" مگر تمہارے اوپر میرا کوئی جادو نہ چلا۔ شاید تم اس سے بھی زیادہ اپنے اصولوں کے پکے ہو۔ حالانکہ ابھی اس کی آزمایش نہیں ہوئی۔ خیر میں تمہارے اصولوں سے سوتیاڈاہ نہیں کرنا چاہتی۔ سواری کا انتظام کر دو۔ میں کل ہی چلی

جائیں گی اور پھر اپنی نادانیوں سے تمہارے اصولوں کی راہ کا کانٹا بننے کے لئے نہ آئیں گی *

مسٹر کلارک نے روحانی کرب کے ساتھ کہا۔ ڈارلنگ تم نہیں جانتیں کہ یہ کتنا خطرناک شخص ہے۔ ہم بغاوت سے سازشوں سے جنگ و جدل سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس قسم کے استقلال سے دھن سے۔ میں بھی انسان ہوں۔ صوفیا۔ اگرچہ اس وقت میری زبان سے ایسا دعوےٰ بہت درست نہیں معلوم ہوتا۔ مگر کم از کم اس مقدس ہستی کے نام پر جس کا میں ایک ادنےٰ عقیدت مند ہوں۔ مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ میں اس نوجوان کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ اس کے آہنی ارادہ کا اس کی ہمت کا اس کی سچائی کا دل سے معترف ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ وہ ایک باثروت باپ کا بیٹا ہے اور شاہزادوں کی طرح عیش و عشرت میں مصروف رہ سکتا ہے۔ مگر اس کے یہی پاکیزہ اوصاف ہیں جنہوں نے اس کو ناقابل فتح بنا رکھا ہے۔ ایک فوج کا مقابلہ کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا ایسے محض چند آدمیوں کا جنہیں دنیا میں کسی کا خوف نہیں ہے۔ میرا قومی فرض میرے ہاتھ باندھے ہوئے ہے *

صوفیا کو معلوم ہو گیا کہ میری دھمکی بالکل بے اثر نہیں ہوئی۔ مجبوری کا کلمہ زبان پر افسوس کا خیال دل میں آیا اور رضامندی کی پہلی منزل پوری ہو گئی۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت نازو انداز کا اتنا اثر نہیں ہو سکتا جتنا پُرزور اصرار کا۔ اصول کا پابند انسان نازو انداز کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا دل مضبوط کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے سامنے اپنی کمزوری کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن بیجا مگر پُرزور

اصرار کے مقابلہ میں وہ نکما ہو جاتا ہے۔ اُس وقت اُس کی ایک نہیں چلتی
صوفیا نے طنز سے کہا ___ اگر تمہارا قومی فرض نہیں عزیز ہے تو مجھے
بھی اپنی خودداری عزیز ہے۔ وطن کی ابھی تک کسی نے تعریف یا
توضیح نہیں کی مگر عورت کا حفظ مراتب اُس کا ایک نہایت ضروری
جُزو ہے اور ہونا چاہئے۔ اس سے تم انکار نہیں کر سکتے ٭
یہ کہہ کر وہ مالکہ کی طرح میز کے پاس گئی اور ایک ڈاکٹ فارم
نکالا جس پر ایجنٹ اپنے احکام لکھا کرتا تھا ٭
کلارک۔ کیا کرتی ہو صوفیا؟ خدا کے لئے ضد نہ کرو ٭
صوفیا۔ "جیل کے داروغہ کے نام حکم لکھوں گی" کہتے ہوئے وہ
ٹائپ رائٹر کے پاس بیٹھ گئی ٭
کلارک۔ یہ اندھیر نہ کرو صوفیا۔ غضب ہو جائے گا ٭
صوفیا۔ میں غضب سے کیا۔ قیامت سے بھی نہیں ڈرتی ٭
صوفیا نے ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرتے ہوئے حکم نامہ
کو ٹائپ کیا۔ اُس نے عمداً ایک لفظ بے موقع ٹائپ کر دیا جیسے ایک
باضابطہ حکم نامہ میں نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس پر کلارک نے کہا۔ یہ لفظ
نہ رکھو ٭
صوفیا۔ کیوں شکریہ نہ ادا کروں؟
کلارک۔ حکم نامہ میں شکریہ کا کیا ذکر؟ کوئی پرائیویٹ خط تھوڑا
ہی ہے ٭
صوفیا۔ ہاں درست ہے۔ یہ لفظ خارج کئے دیتی ہوں۔ نیچے کیا لکھوں؟
کلارک۔ نیچے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف میرے دستخط ہونگے ٭

صوفیا نے پورا حکم نامہ پڑھ کر سُنا دیا ۔

کلارک ۔ ڈارلنگ ۔ یہ تم بُرا کر رہی ہو ۔

صوفیا ۔ کچھ پرواہ نہیں ۔ میں بُرا ہی کرنا چاہتی ہوں ۔ دستخط بھی ٹائپ کر دوں ؟ نہیں (مُہر نکال کر) یہ مُہر کئے دیتی ہوں ۔

کلارک ۔ جو چاہو کرو ۔ جب تمہیں اپنی خدا کے آگے کچھ بھلا بُرا نہیں سوجھتا تو میں کیا کہوں ۔

صوفیا ۔ کہیں اور تو اُس کی نقل نہ ہو گی ؟

کلارک ۔ میں کچھ نہیں جانتا ۔

یہ کہہ کر مسٹر کلارک اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگے ۔ صوفیا نے کہا ۔ آج اتنی جلد نیند آ گئی ؟

کلارک ۔ ہاں تھک گیا ہوں ۔ اب سوؤں گا ۔ تمہارے اس خط سے ریاست میں تہلکہ مچ جائے گا ۔

صوفیا ۔ اگر تمہیں اتنا خوف ہے تو میں اِسے چاک کئے ڈالتی ہوں ۔ اتنا نہیں گدگدانا چاہتی کہ ہنسی کے بدلے رونا آ جائے ۔ بیٹھتے ہو یا دیکھو یہ لفافہ پھاڑتی ہوں ۔

کلارک کُرسی پر بے پروائی کے ساتھ بیٹھ گئے اور بولے ۔ تو بیٹھ گیا ۔ کیا کہتی ہو ؟

صوفیا ۔ کہتی کچھ نہیں ۔ شکریہ کا گیت سنتے جاؤ ۔

کلارک ۔ شکریہ کی ضرورت نہیں ۔

صوفیا نے پھر گانا شروع کیا اور کلارک خاموش بیٹھے سُنتے رہے ۔ اُن کے چہرہ پر بے درد اشتیاق کا رنگ نمودار تھا جو زبان حال سے کہہ

رہا تھا یہ امتحان و آزمایش کب تک؟ اس کھیل کی کوئی حد بھی ہے؟
اس اشتیاق نے اُنہیں سلطنت کی فکر سے آزاد کر دیا۔"آہ کاش
اب بھی معلوم ہوجاتا کہ تو اتنی بڑی بھینٹ پاکر خوش ہوگئی" صوفیا
نے اُن کی آتشِ عشق کو خوب مشتعل کر دیا۔ اور اُس وقت یک دم پیالہ
بند کر دیا۔ پھر بلا کچھ کہے ہوئے اپنے سونے کے کمرہ میں چلی گئی۔
کلارک وہیں بیٹھے رہے۔ جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر تنہا کسی درخت
کے نیچے بیٹھا ہو۔

صوفیا نے ساری رات اپنی آیندہ زندگی کی تصویر کھینچنے میں
بسر کی مگر خاطر خواہ رنگ نہ دے سکی۔ پہلے رنگ بھر کر اُسے ذرا
دور سے دیکھتی تو معلوم ہوتا کہ دھوپ کی جگہ چھائوں ہے۔ چھائوں
کی جگہ دھوپ ہے۔ سُرخ رنگ زیادہ ہوگیا ہے۔ باغ میں قدرتی
دلکشی ہے۔ پہاڑوں پر ضرورت سے زیادہ ہریالی ہے اور دریاؤ
میں غیر مادی سکون ہے۔ پھر برش لے کر ان خرابیوں کو درست
کرنے لگتی تو سارا منظر ضرورت سے زیادہ بے لطف۔ اُداس اور میلا
ہوجاتا۔ اُس کی مذہبیت اب اپنی زندگی میں خدا کا ہاتھ دیکھتی تھی۔
اب خدا ہی اُس کا محرک تھا۔ وہ اپنے نیک و بد اعمال کے نیکی و بدی
سے مبرا تھی۔

علے الصباح وہ بستر سے اُٹھی تو مسٹر کلارک سو رہے تھے۔
موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اُس نے شوفر کو بلا کر موٹر کی تیاری کا
حکم دیا اور ایک لمحہ میں جیل کی طرف روانہ ہوئی جیسے کوئی لڑکا سکول
سے گھر کی طرف دوڑے۔

اُس کے جیل پہنچتے ہی ہل چل سی مچ گئی۔ چوکیدار آنکھیں ملتے ہوئے دوڑ دوڑ کر وردیاں پہننے لگے۔ داروغہ جی نے جلدی میں اُلٹی اچکن پہنی اور بے تحاشا دوڑے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ننگے پاؤں بھاگے۔ یاد نہ آیا کہ رات کو جوتے کہاں رکھے تھے اور اُس وقت تلاش کرنے کی فرصت نہ تھی۔ ونے سنگھ زیادہ رات گئے سوئے تھے اور ابھی تک خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے۔ کمرہ میں مینہ کی شمولیت سے تر و تازہ ہوا آ رہی تھی۔ نرم قالین بچھا ہوا تھا۔ ابھی تک رات کا لیمپ بھی نہ بجھا تھا۔ گویا ونے کی بیقراری کی شہادت دے رہا تھا۔ صوفیا کا رومال ابھی تک ونے کے سرہانے پڑا ہوا تھا اور اُس میں سے بڑھیا خوشبو نکل رہی تھی۔ داروغہ نے حاضر ہو کر صوفیا کو سلام کیا۔ اور وہ ان کو لئے ونے کے کمرہ میں گئی۔ دیکھا تو نیند میں ہیں۔ رات کی میٹھی نیند سے چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہے۔ لبوں پر ہلکی مسکراہٹ ہے گویا پھول پر شعاعیں چمک رہی ہوں۔ صوفیا کو ونے آج تک کبھی اتنے خوب صورت نہ معلوم ہوتے تھے۔

صوفیا نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ رات کو اس کی کیسی حالت تھی؟

ڈاکٹر۔ حضور کئی بار غش آئے مگر میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہاں سے نہیں ہٹا۔ جب یہ سو گئے تو میں کھانے کے لئے چلا گیا۔ اب تو اُن کی حالت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

صوفیا۔ ہاں مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ آج وہ زردی نہیں ہے۔ میں اب اس سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اسے کسی دوسری جگہ میں کیوں نہ بھجوا دوں۔ یہاں کی آب و ہوا اس کے موافق نہیں ہے

مگر آپ لوگوں کے سامنے وہ اپنے دل کی باتیں نہ کہے گا۔ آپ لوگ ذرا باہر چلے جائیں تو میں اسے جگا کر دریافت کروں اور اس کی حرارت کی بھی جانچ کر لوں۔ (مسکرا کر) ڈاکٹر صاحب میں بھی اس علم سے واقف ہوں۔ نیم حکیم ہوں لیکن خطرہ جان نہیں ؛۔

جب کمرہ میں تخلیہ ہو گیا تو صوفیا نے ونے کا سر اُٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پیشانی کو سہلانے لگی۔ ونے کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اس طرح جھپٹ کر اُٹھا جیسے نیند میں کسی دریا میں پھسل پڑا ہو۔ خواب کا ثمرہ شاید ہی کسی کو اس قدر جلد ملا ہو۔ صوفیا نے مسکرا کر کہا۔ "تم ابھی تک سو رہے ہو۔ میری آنکھوں کی طرف دیکھو رات بھر نہیں جھپکیں ؛۔

ونے۔ دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی جواہر پا کر بھی میٹھی نیند نہ سوؤں تو مجھ سا بدنصیب اور کون ہوگا"؟

صوفیا۔ میں تو اس سے بھی زیادہ بیش قیمت جواہر پا کر اور بھی تفکرات میں مبتلا ہو گئی۔ اب یہ خوف ہے کہ کہیں وہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ نیند کا لطف ناداری میں ہے جب کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اچھا اب تیار ہو جاؤ ؛۔

ونے۔ کس بات کے لئے؟

صوفیا۔ بھول گئے؟ اس تاریکی سے روشنی میں جانے کے لئے۔ اس کال کوٹھڑی سے جدا ہونے کے لئے۔ میں موٹر لائی ہوں تمہاری رہائی کا حکم نامہ میری جیب میں ہے۔ کوئی ذلت آمیز شرط نہیں ہے صرف اودے پور کی ریاست میں بلا اجازت نہ داخل ہونے کا وعدہ

لیا گیا ہے۔ آؤ چلیں۔ میں تمہیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچا کر لوٹ آؤں گی۔ تم دہلی پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی میں تم سے وہیں آ ملوں گی اور پھر ہم ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔

دنے سنگھ کی حالت اُس بچے کی سی تھی جو مٹھائیوں کے خوانچہ کو دیکھتا ہے مگر اس خوف سے کہ ماں مارے گی۔ منہ کھولنے کی جراٴت نہیں کر سکتا۔ مٹھائیوں کا ذایقہ یاد کر کے اُس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ رس گُلّے کتنے رسیلے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دانت کسی مٹھاس کے کنڈ میں پھسل پڑے۔ امرتیاں کتنی کُرکُری ہیں۔ اُن میں رس بھرا ہی ہوگا۔ گلاب جامن کتنی سوندھی ہوتی ہے کہ کھاتا ہی چلا جائے۔ مٹھائیوں سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ماں پیسے نہ دے گی۔ پیسے ہی نہ ہوں گے۔ وہ کس سے مانگے گی۔ زیادہ ضد کروں گا تو رونے لگے گی۔ خیر دنے سنگھ آبدیدہ ہو کر بولے "صوفیا میں بدنصیب شخص ہوں۔ مجھے اسی حالت میں رہنے دو۔ میرے ساتھ اپنی زندگی برباد نہ کرو۔ مجھے قسمت نے رنج اُٹھانے ہی کے لئے بنایا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم ....

صوفیا نے قطعِ کلام کر کے کہا۔ "دنے میں مصیبت ہی کی بھوکی ہوں۔ اگر تم عیش پسند ہوتے۔ اگر تمہاری زندگی عیش و عشرت کی زندگی ہوتی۔ اگر تم نفس کے غلام ہوتے تو شاید میں تمہاری طرف سے مُنہ پھیر لیتی۔ تمہارے حوصلہ و ایثار ہی نے مجھے تمہاری طرف کھینچا ہے"۔

ونے۔ اماں جی کو تم جانتی ہو۔ وہ مجھے کبھی معاف نہ کریں گی۔

صوفیا۔ تمہاری محبت کا سہارا پا کر میں اُن کے غصّہ کو برداشت کر لوں گی۔ جب وہ دیکھیں کہ میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بلکہ تمہارے

پیچھے اُڑنے والی گرد ہوں تو اُن کا دل پگھل جائے گا۔
ونے نے صوفیا کو محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم اُن کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ وہ ہندو دھرم پر جان دیتی ہیں"۔
صوفیا۔ میں بھی ہندو دھرم پر جان دیتی ہوں۔ جو روحانی سکون مجھے اور کہیں نہ ملا وہ گوپیوں کی داستانِ الفت میں مل گیا۔ وہ پریم کا اوتار جس نے گوپیوں کو پریم کا رس چکھایا۔ جس نے کبجا کی ناؤ پار لگائی۔ جس نے پریم کا کھیل دکھانے کے لئے ہی سنسار کو اپنے قدموں سے پاک بنایا اُسی کی داسی بن کر جاؤں گی تو وہ کون سچا ہندو ہے جو مجھ سے بیرخی کرے گا؟
ونے نے مسکرا کر کہا۔"اُس چھلیا نے تم پر بھی جادو ڈال دیا؟ میرے خیال میں تو کرشن کی داستانِ محبت صرف اُن کے بھگتوں کی خیالی ایجاد ہے"۔
صوفیا۔ ہو سکتی ہے۔ یسوع کا وجود بھی تو خیالی کہا جاتا ہے۔ شیکسپیر کا وجود بھی تو خیالی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کالی داس کی سرشت آب و گل سے ہوئی تھی؟ لیکن ان ہستیوں کے خیالی ہونے پر بھی ہم اُن کی پاک شہرت کے معتقد ہیں اور واقعی ہستیوں کی شہرت بہ نسبت زیادہ تر۔ شاید اسی لئے کہ اوّل الذکر کا وجود غلیظ عناصر سے نہیں بلکہ لطیف تخیل سے ہوا ہے۔ آدمیوں کے نام ہوں یا نہ ہوں مگر اُن کی معیاروں کے نام ضرور ہیں۔ اُن میں سے ہر شخص انسانی زندگی کا ایک ایک معیار ہے!
ونے۔ صوفیا میں تم سے دلائل میں پیش نہ پا سکوں گا۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ میں تمہارے حسنِ ظن سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہوں۔ میں تم سے

اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ تم میری اصلی صورت نہیں دیکھ رہی ہو۔ کہیں اس پر نگاہ پڑ جائے تو تم میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرو گی۔ تم میرے پیروں کی زنجیر چاہے نہ بن سکو۔ مگر میری دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے والی ہوا ضرور بن جاؤ گی۔ ماں نے بہت سوچ بچار کر مجھے یہ برت دیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ایک مرتبہ میں اس پابندی سے آزاد ہوا تو نفس مجھے اس قدر تیزی سے بہائے جائے گا کہ پھر شاید میرے وجود کا پتہ ہی نہ لگے۔ صوفیا مجھے اس سخت ترین آزمائش میں نہ ڈالو۔ میں دراصل بہت کمزور اور نفس پرور شخص ہوں۔ تمہاری اخلاقی بلندی مجھے خائف کر رہی ہے۔ ہاں مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کرو کہ آج ہی یہاں سے کسی دوسرے مقام کو روانہ ہو جاؤں ⁘

صوفیا۔ کیا تم مجھ سے اتنی دُور بھاگنا چاہتے ہو؟

ونے۔ نہیں نہیں۔ اس کا اور ہی سبب ہے۔ نہ جانے کیونکر یہ حکم صادر کر دیا گیا ہے کہ جسونت نگر ایک ہفتہ کے لئے خالی کر دیا جائے۔ کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سردار صاحب نے تمہاری حفاظت کے لئے یہ بندوبست کیا ہے۔ نہ لوگ تم کو بدنام کر رہے ہیں ⁘

صوفیا اور کلارک کی باہمی بحث سن کر سردار نیلکنٹھ نے فوراً یہ حکم جاری کر دیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ میم صاحب کے سامنے صاحب کی ایک نہ چلے گی اور ونے کو رہا کر دینا پڑے گا۔ اس لئے پہلے ہی سے حفظ امن کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ صوفیا نے متحیر ہو کر پوچھا۔ کیا ایسا حکم دیا گیا ہے؟

وسنے۔ ہاں مجھے خبر ملی ہے کوئی چپڑاسی کہتا تھا۔

صوفیا۔ مجھے مطلقاً خبر نہیں ہے۔ میں ابھی جا کر پتہ لگاتی ہوں اور اس حکم کو منسوخ کرائے دیتی ہوں۔ ایسی زیادتی ریاستوں کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ یہ سب تو ہو جائے گا مگر تم کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

وسنے۔ نہیں صوفیا۔ مجھے معاف کرو۔ دور کا سنہرا منظر قریب آکر ریگ کا میدان بن جاتا ہے۔ تم میرے لئے ایک زندہ معیار رہو۔ تمہاری محبت کا مزہ میں تخیل ہی کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ میں تمہاری نظروں سے گر نہ جاؤں۔ اپنے کو کہاں تک پوشیدہ رکھوں گا؟ تمہیں پاکر پھر میری زندگی بے لطف ہو جائے گی۔ پرستش اور حصول کے لئے پھر میرے پاس کوئی شئے باقی نہ رہے گی۔ صوفیا۔ میری زبان سے نہ جانے کیا کیا فضول باتیں نکل رہی ہیں۔ مجھے خود شک ہو رہا ہے کہ میں اپنے ہوش میں ہوں یا نہیں۔ فقیر تخت شاہی پر بیٹھ کر اگر پریشان خاطر ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ میری تم سے یہی آخری التجا ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔

صوفیا۔ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔

وسنے۔ کم از کم مجھے یہاں سے جانے کے لئے مجبور نہ کرو کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں یہاں سے نہ جاؤں گا۔ شہر کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں ہے کہ میں عوام کو قابو میں رکھ سکوں گا۔

صوفیا نے متانت سے کہا۔ جیسی تمہاری مرضی۔ میں جتنا تمہیں۔ وہ مزاج سمجھتی تھی تم اُس سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو۔ میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں اور اسی لئے کہتی ہوں کہ جیسی تمہاری مرضی۔ مگر شاید نہیں

معلوم نہیں ہے کہ نوجوان عورت کا دل بچوں کی طرح ہوتا ہے۔ اُسے جس چیز کے لئے منع کرو اُسی کی طرف دوڑے گا۔ اگر تم اپنی تعریف کرتے اپنے کاموں کی سراہنا کرتے تو شاید میں تمہاری جانب سے بدشوق ہو جاتی۔ اپنے عیوب و نقائص کو ظاہر کر کے تم نے مجھے اور بھی فریفتہ کر لیا ہے۔ تم مجھ سے ڈرتے ہو۔ اس لئے میں تمہارے سامنے نہ آؤں گی پر رہوں گی تمہارے ہی ساتھ۔ جہاں جہاں تم جاؤ گے۔ بس سایہ کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گی۔ محبت ایک خیالی وجود ہے۔ خیال ہی سے اُس کی پیدائش ہوتی ہے۔ خیال ہی سے وہ زندہ رہتا ہے اور خیال ہی سے وہ فنا بھی ہو جاتا ہے وہ کوئی مادی وجود نہیں ہے۔ تم میرے ہو۔ یہ یقین میری محبت کو زندہ اور آرزومند رکھنے کے لئے کافی ہے۔ جس دن اس یقین کی جڑ ہل جائے گی اُسی دن اِس زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر تم نے یہی فیصلہ کر لیا ہے کہ اس قید خانہ میں رہ کر تم اپنی زندگی کے مقصد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ پورا کر سکتے ہو تو میں اِس فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہوں۔ اِس بے نفسی نے میرے دل میں تمہاری عزت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔ کل شام کو پھر آؤں گی۔ میں نے اس حکم نامہ کے لئے جتنا "تریا چرتر" کیا ہے وہ تم سے بتلادوں تو تم تعجب کرو گے۔ تمہاری ایک نہیں نے میری ساری کوشش پر پانی پھیر دیا۔ کلارک کہے گا میں کہتا تھا کہ وہ راضی نہ ہوگا شاید طعنے دے۔ مگر کچھ مضایقہ نہیں کوئی بہانہ کر دوں گی۔

یہ کہتے کہتے صوفیا کے پُراشتیاق لب رنے سنگھ کی طرف جھکے مگر وہ کائی پر پھسلنے والے آدمی کی طرح گرتے گرتے سنبھل گئی۔ اُس نے

آہستہ سے ونے سنگھ کا ہاتھ دبایا اور دروازہ کی طرف چلی۔ مگر باہر جا کر پھر واپس آ گئی اور نہایت لجاجت سے بولی "ونے تم سے ایک بات پوچھتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم صاف صاف بتلا دو گے۔ میں کلارک کے ساتھ یہاں آ گئی۔ اُس سے چالاکی برتی۔ اُسے جھوٹی امیدیں دلائیں اور اب بھی اُسے مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہوں۔ تم اسے بیجا تو نہیں خیال کرتے؟ تمہاری نگاہ میں میں قابل ملامت تو نہیں ہوں"؟

ونے کے پاس اس کا ایک ہی ممکن جواب تھا۔ صوفیا کا یہ رویہ اس کو قابل اعتراض معلوم ہوتا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی اُس نے اِس بات کو تعجب کے لہجہ میں ظاہر بھی کر دیا تھا۔ مگر اس وقت وہ اِس خیال کو ظاہر نہ کر سکا۔ یہ کتنی سخت ناانصافی ہوتی۔ کتنی بڑی بے رحمی۔ وہ جانتا تھا کہ صوفیا نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک مذہبی خیال کے تابع ہو کر۔ وہ اُسے ندائی تحریک سمجھ رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ ناامید ہو گئی ہوتی۔ ایسی حالت میں کھری اور ٹھوس سچائی سے اُس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ عقیدت مندانہ سرگرمی سے بولے "صوفیا تم یہ سوال کر کے اپنے اوپر اور اُس سے زیادہ میرے اوپر ظلم کر رہی ہو۔ میرے لئے تم نے اب تک تیاگ (ترک) ہی تیاگ کئے ہیں۔ تم نے عزت۔ ثروت۔ اصول۔ کسی ایک کی بھی پرواہ نہیں کی۔ دُنیا میں مجھ سے بڑھ کر احسان فراموش اور کوئی نہ ہوگا۔ اگر میں تمہارے اس پریم کی بے وقعتی کروں"۔

یہ کہتے کہتے وہ رُک گئے۔ صوفیا بولی "کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟ رُک کیوں گئے؟ یہی نہ کہ تمہیں میرا کلارک کے ساتھ رہنا اچھا نہیں

معلوم ہوتا۔ جس دن مجھے ناامیدی ہو جائے گی کہ میں اپنی مغالطہ آمیز روش
سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی اُسی دن میں کلارک کو پیروں سے
اس طرح ٹھکرا دوں گی۔ اُس کے بعد تم مجھے پریم کی جوگن کے بھیس میں
دیکھو گے جس کی زندگی کا واحد مقصد ہوگا تمہارے اوپر نثار ہو جانا۔"

(۲۷)

نایک رام محلہ والوں سے رخصت ہو کر اودے پور روانہ ہوئے۔
ریل کے مسافروں کو ان کی بہت جلد عقیدت ہو گئی۔ کسی کو تمباکو مل
کر کھلاتے۔ کسی کے بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔ جس مسافر کو دیکھتے
کہ جگہ نہیں مل رہی ادھر اُدھر بھٹک رہا ہے۔ جس کمرہ میں جاتا ہے
وہی دھکے کھاتا ہے۔ اس کو بلا کر اپنی بغل میں بٹھا لیتے۔ پھر ذرا دیر
میں اُس سے سوالوں کا تانتا باندھ دیتے۔ کہاں مکان ہے؟ کہاں جاتے
ہو؟ کتنے لڑکے ہیں؟ کیا کاروبار ہوتا ہے؟ ان سوالات کا سلسلہ اس
التجا پر ختم ہوتا:۔ میرا نام نایک رام پنڈا ہے جب کبھی کاشی آؤ میرا
نام پوچھ لو۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔ دو دن چار دن۔ مہینے دو مہینے جب
تک جی چاہے آرام سے وہیں ٹھیرو۔ گھر دوار۔ نوکر چاکر۔ سب حاضر
ہیں۔ گھر کا سا آرام پاؤ گے۔ وہاں سے چلتے وقت جو چاہے دے دو
نہ ہو نہ دو۔ گھر آ کر بھیج دو۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ کبھی مت سوچو
ابھی روپے نہیں ہیں۔ پھر چلیں گے۔ شبھ کاج کے لئے مہورت نہیں
دیکھی جاتی۔ ریل کا کرایہ لے کر چل کھڑے ہو۔ کاشی میں تو میں موجود
ہی ہوں۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ کام پڑ جائے تو جان لڑا دیں۔
تیرتھ جاترا کے لئے ٹال مٹول مت کرو۔ کوئی نہیں جانتا کب چھٹی

جاترا کرنی پڑ جاتی۔ دُنیا کے جھگڑے تو سدا لگے ہی رہیں گے ۔

دہلی پہنچے تو کئی نئے مسافر گاڑی میں آ گئے۔ آریہ سماج کے کسی جلسہ میں جا رہے تھے۔ نایک رام نے اُن سے بھی وہی جرح شروع کی۔ یہاں تک کہ ایک مہاشے گرم ہو کر بولے ـــــ تم ہمارے باپ دادا کا نام پوچھ کر کیا کرو گے؟ ہم تمہارے پھندے میں پھنسنے والے نہیں ہیں۔ یہاں گنگا جی کے قائل نہیں اور نہ کاشی ہی کو بیکنٹھ سمجھتے ہیں ۔

نایک رام ذرا بھی خفیف نہیں ہوئے۔ مسکرا کر بولے ـــــ بابو جی آپ آریہ ہو کر ایسا کہتے ہیں۔ آریہ لوگوں ہی نے تو ہندو دھرم کی لاج رکھی نہیں تو اب تک سارا دیس مسلمان کرستان ہو گیا ہوتا۔ ہندو دھرم کے اودھارک ہو کر آپ کاشی کو بھلا کیسے نہ مانیں گے؟ اُسی نگری میں راجہ ہریش چند کی پریکچھا (آزمایش) ہوئی تھی۔ وہیں بُدھ بھگوان نے اپنا دھرم چکر چلایا تھا۔ وہیں سنکر بھگوان نے منڈن مسر سے ساسترارتھ کیا تھا۔ وہاں جینی آتے ہیں۔ بُدھ آتے ہیں۔ ولیشنو آتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کی نگری نہیں ہے۔ سارے سنسار کی نگری ہے۔ دُور دُور کے لوگ بھی جب تک کاشی جی کے درشن نہ کر لیں اُن کی جاترا سپھل نہیں ہوتی۔ گنگا جی مُکتی دیتی ہیں۔ پاپ کاٹتی ہیں۔ یہ سب تو گنواروں کو بہلانے کی باتیں ہیں۔ اُن سے کہو کہ چل کر اُس پوتر نگری کو دیکھ آؤ۔ جہاں پگ پگ پر آریہ جات کے نشان ملتے ہیں جس کا نام لیتے ہی سیکڑوں مہاتماؤں۔ رشیوں مُنیوں کی یاد آ جاتی ہے۔ تو اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی۔ پر اصل میں بات یہی ہے۔ کاشی کا مہاتم اس لئے ہے کہ وہ آریہ جاتی کا جیتا جاگتا پُران ہے ۔

اُن اصحاب کو پھر کاشی کی مذمت کرنے کی ہمّت نہ پڑی۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے اور نایک رام کی مذہبی واقفیت کے قایل ہو گئے۔ حالانکہ نایک رام نے یہ چند فقرے ایسے موقعوں کے لئے کسی مقرّر کی تقریر سے چُن کر رٹ لئے تھے ؂

ریل کے اسٹیشنوں پر وہ ضرور اُترتے اور ریل کے ملازموں سے تعارف پیدا کرتے۔ کوئی اُنہیں پان کھلا دیتا۔ کوئی کچھ ناشتہ کرا دیتا سارا سفر ختم ہو گیا مگر وہ لیٹے تک نہیں۔ ذرا بھی آنکھ نہ جھپکی۔ جہاں دو مسافروں کو لڑتے جھگڑتے دیکھتے آپ فوراً ہی ثالث بن جاتے اور اُن میں میل کرا دیتے۔ تیسرے روز وہ اودے پور پہنچ گئے اور ریاست کے حاکموں اور اہلکاروں سے ملتے جُلتے گھومتے پھرتے جسونت نگر میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ مسٹر کلارک کا ڈیرا پڑا ہوا ہے۔ باہر سے آنے جانے والوں کی بڑی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ شہر کا پھاٹک بند سا ہے۔ لیکن پنڈے کو کون روکتا؟ شہر میں پہنچ کر سوچنے لگے ونے سنگھ سے کیونکر ملاقات ہو؟ رات کو تو ایک دھرم شالا میں ٹھیرے۔ سویرا ہوتے ہی جیل کے داروغہ کے مکان میں جا پہنچے۔ داروغہ جی صوفیا کو بھیج کر آئے تھے اور نوکر پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے حقّہ کیوں نہیں بھرا۔ اتنے ہی میں برآمدہ میں پنڈا جی کی آہٹ پا کر باہر نکل آئے اُنہیں دیکھتے ہی نایک رام نے گنگا جل کی شیشی نکالی اور اُن کے سر پر جل چھڑک دیا ؂

داروغہ جی نے ذرا رُکھائی سے کہا۔ کہاں سے آتے ہو؟

نایک رام۔ مہاراج۔ استھان تو پراگ راج ہے پر آ رہا ہوں بڑی دور سے

جی میں آیا ادھر بھی جھانوں کو آسروا دیا چاہیے۔

داروغہ جی کا لڑکا جس کی عمر ابھی ۱۴-۱۵ سال کی تھی نکل آیا۔ نایک رام نے اُسے سر سے پیر تک بغور دیکھا اُس کی دیدار سے دلی مسرت حاصل ہو رہی ہے اور پھر داروغہ جی سے بولے "یہ آپ کے چرنجیو پُتر ہیں نا؟ پتا پُتر کی صورت کیسی ملتی ہے کہ دور ہی سے پہچان لے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب کیا پڑھتے ہو؟

لڑکے نے کہا۔ "انگریزی پڑھتا ہوں"۔

نایک رام۔ یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ آج کل تو اسی ودیا کا دور دورہ ہے۔ راج ودیا ٹھہری جو۔ کس درجہ (دفعہ) میں پڑھتے ہو بھیا؟

داروغہ۔ ابھی تو حال ہی میں انگریزی شروع کی ہے اُس پہ بھی پڑھنے میں جی نہیں لگاتے۔ ابھی تھوڑی ہی پڑھی ہے۔

لڑکے نے سمجھا میری تحقیر ہو رہی ہے۔ بولا "تم سے تو زیادہ ہی پڑھا ہوں"۔

نایک رام۔ اس کی کوئی چنتا نہیں سب آجائے گا۔ ابھی اُن کی اوستھا (عمر) ہی کیا ہے۔ بھگوان کی اچھا (مرضی) ہوگی تو کُل (خاندان) کا نام روشن کر دیں گے۔ آپ کے گھر پر کچھ جگہ جمین بھی ہے؟

داروغہ جی نے اب سمجھا۔ زود فہمی سے نابلد تھے۔ اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے ــــ ہاں چتور کے علاقہ میں کئی گاؤں ہیں۔ پرانی جاگیر ہے۔ میرے پتا جی مہارانا کے درباری تھے۔ ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں مہارانا پرتاپ نے میرے بزرگوں کو یہ جاگیر بخشی تھی۔ اب بھی مجھے دربار میں کرسی ملتی ہے اور پان الائچی سے خاطر کی جاتی ہے۔ ضرورت ہوتی ہے

تو مہارانا کے یہاں سے آدمی آتا ہے۔ بڑا لڑکا مرا تھا تو مہارانا نے ہمدردی کا خط بھیجا تھا ۔

نایک رام۔ جاگیرداری کا کیا کہنا۔ جو جاگیردار وہی راجہ۔ نام کا فرق ہے۔ اصلی راجہ تو جاگیردار ہی ہوتے ہیں۔ رانا تو نام کے ہیں ۔

داروغہ۔ راج گھرانے سے برابر آمد و رفت قائم ہے ۔

نایک رام۔ ابھی اِن کی کہیں بات چیت تو نہیں ہو رہی ہے ؟

داروغہ۔ اجی لوگ جان تو کھا رہے ہیں۔ روز ایک نہ ایک جگہ سے پیغام آتا رہتا ہے۔ مگر میں تو سب کو ٹکا سا جواب دے دیتا ہوں۔ جب تک پڑھ لکھ نہ لے اس وقت تک اُس کی شادی کر دینا حماقت ہے ۔

نایک رام۔ یہ آپ نے پکی بات کہی۔ جتھارتھ (اصل) میں ایسا ہی ہونا چاہئے۔ بڑے آدمیوں کی بُدھی (عقل) بھی بڑی ہی ہوتی ہے پر لوک ریت (دنیاوی رواج) پر چلنا ہی پڑتا ہے۔ اچھا اب آگیا (اجازت) دیجئے۔ کئی جگہ جانا ہے۔ جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں کسی کو جواب نہ دیجئے گا۔ ایسی کنیا آپ کو نہ ملے گی اور نہ ایسا اُتّم کُل ہی پائیے گا ۔

داروغہ۔ واہ واہ۔ اتنی جلد چلے جائیے گا ؟ کم سے کم بھوجن تو کر لیجئے۔ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ آپ کس کا سندیسہ (پیغام) لائے ہیں۔ وہ کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں ؟

نایک رام۔ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ پر ابھی بتانے کا حکم نہیں ہے۔

داروغہ نے لڑکے سے کہا۔ "تلک! اندر جاؤ۔ پنڈت جی کے لئے پان بنوا لاؤ۔ کچھ ناشتہ بھی لیتے آنا ۔"

یہ کہہ کر تلک کے پیچھے پیچھے خود اندر گئے اور بیوی سے بولے۔ "لو

کہیں سے تلک کے بیاہ کا سندیسہ آیا ہے۔ پان طشتری میں بھیجنا ناشتہ کے لئے کچھ نہیں ہے؟ وہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ گھر میں کتنی ہی چیز آئے دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملتی۔ نہ جانے کہاں کے مربھوکے جمع ہوگئے ہیں۔ ابھی کل ہی ایک تبدی کے گھر سے مٹھائیوں کا ایک پورا تھال آیا تھا کیا ہو گیا؟

بیوی۔ انہیں لڑکوں سے پوچھو کیا ہو گیا۔ میں تو ہاتھ سے چھونے کی بھی قسم کھاتی ہوں۔ یہ کوئی صندوق میں بند کر کے رکھنے کی چیز تو ہے نہیں۔ جس کا جب جی چاہتا ہے نکال کر کھاتا ہے۔ کل سے کسی نے روٹیوں کی طرف نہیں دیکھا۔

داروغہ۔ تو آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟ تم سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ جو چیز گھر میں آئے اُسے احتیاط سے رکھو۔ احتیاط سے خرچ کرو۔ وہ لونڈا کہاں گیا؟

بیوی۔ تمہیں نے تو ابھی اُسے ڈانٹا تھا۔ بس چلا گیا۔ کہہ گیا ہے کہ گھڑی گھڑی کی ڈانٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتی۔

داروغہ۔ یہ اور مصیبت ہوئی۔ یہ چھوٹے آدمی روز بروز چڑھتے جاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک اُن کی خوشامد کرے۔ اب کون بازار سے مٹھائیاں لائے؟ آج تو کسی سپاہی کو بھی نہیں بھیج سکتا۔ نہ جانے سر سے کب یہ بلا ٹلے گی؟ تمہیں چلے جاؤ تلک!

تلک۔ شربت کیوں نہیں پلا دیتے؟

بیوی۔ شکر بھی تو نہیں ہے۔ چلے کیوں نہیں جاتے؟

تلک۔ ہاں چلے کیوں نہیں جاتے! لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے

کہ حضرت مٹھائیاں لئے جاتے ہیں *

داروغہ- تو اس میں کیا گالی ہے؟ کسی کے گھر چوری تو نہیں کر رہے ہو- بُرے کام سے لجانا چاہئے- اپنا کام کرنے میں کیا لاج؟

تلک یوں تو لاکھ سر پٹکنے پر بھی بازار نہ جاتے- مگر اس وقت انہیں اپنی شادی کی خوشی تھی چلے گئے* داروغہ جی نے طشتری میں پان رکھے اور نایک رام کے پاس لائے *

نایک رام- سرکار- آپ کے گھر پان نہیں کھاؤں گا *

داروغہ- اجی- ابھی کیا ہرج ہے؟ ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی*

نایک رام- میرا من بیٹھ گیا تو سب ٹھیک سمجھئے *

داروغہ- یہ تو آپ نے بُری پخ لگائی- یہ بات نہیں ہو سکتی کہ آپ ہمارے دروازہ پر آئیں اور ہم بغیر کافی خاطر و مدارات کئے آپ کو چلے جانے دیں- میں تو مان بھی جاؤں گا پر تلک کی ماں کسی طرح نہ مانیں گی*

نایک رام- اِسی سے تو میں یہ سندیسہ لے کر آنے سے انکار کر رہا تھا- جس بھلے مانس کے دروازے پر جائیے وہ بنا بھوجن اور دچھنا کے گلا نہیں چھوڑتا- اسی سے تو آج کل کچھ لباڑیوں نے بر کھوجنے کو ایک دھندا بنا لیا ہے- اس سے یہ کام کرتے اور بھی سکوچ (تامل) ہوتا ہے *

داروغہ- ایسے دغاباز یہاں روز ہی آیا کرتے ہیں مگر میں تو پانی کو بھی نہیں پوچھتا- جیسا مُنہ ہوتا ہے ویسا بیڑا ملتا ہے یہاں تو آدمی کو ایک نظر دیکھا اور اُس کے رگ و ریشے سے واقف ہو گیا- آپ یوں نہ جانے پائیں گے *

نایک رام۔ میں جانتا کہ آپ اس طرح پیچھے پڑ جائیں گے تو لباڑیوں کی سی بات چیت کرتا۔ گلا تو چھوٹ جاتا ؛

داروغہ۔ یہاں ایسا نادان نہیں ہوں۔ اُڑتی چڑیا پہچانتا ہوں ؛

نایک رام ڈٹ گئے۔ دوپہر ہوتے ہوتے بچہ بچہ سے اُن کی دوستی ہوگئی۔ داروغائن نے بھی پالاگن کہلا بھیجا۔ اِدھر سے بھی آشرواد دیا گیا۔ داروغہ تو دس بجے دفتر چلے گئے۔ نایک رام کے لئے گھر میں پوڑیاں۔ کچوریاں۔ رایتہ۔ دہی۔ چٹنی۔ حلوہ۔ یہ سب چیزیں بڑی ترکیب سے تیار کی گئیں۔ پنڈت جی نے اندر جاکر بھوجن کیا۔ داروغائن نے خود پنکھا جھلا۔ پھر تو اُنہوں نے اور بھی رنگ جمایا۔ لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ دیکھے۔ داروغائن نے بھی لجاتے ہُوئے ہاتھ دکھایا۔ پنڈت جی نے ریکھاؤں (خطوط) کی پرکھ کے علم میں اچھی واقفیت دکھلائی۔ اور بھی دھاک جم گئی۔ شام کو داروغہ جی دفتر سے لوٹے تو پنڈت جی شان سے مسند لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور پڑوس کے کئی آدمی اُنہیں گھیرے کھڑے تھے۔ داروغہ نے کرسی پر لیٹ کر کہا۔ یہ عہدہ تو اتنا اونچا نہیں اور نہ مشاہرہ ہی کچھ ایسا زیادہ ملتا ہے مگر کام اتنی ذمہ داری کا ہے کہ معتبر اشخاص ہی کو دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے آدمی کسی نہ کسی جرم کے لئے سزا پاکر آتے ہیں۔ اگر چاہوں تو اُن کے گھر والوں سے ایک ایک ملاقات کے لئے ہزاروں روپے وصول کر لوں۔ لیکن اپنا یہ وتیرہ نہیں ہے۔ جو سرکار سے ملتا ہے اُسی کو بہت سمجھتا ہوں۔ کسی بُزدل شخص کا تو یہاں گھڑی بھر بھی نباہ نہ ہو۔ ایک سے ایک خونی ڈکیت۔ بدمعاش آتے رہتے ہیں جن کے ہزاروں مددگار ہوتے ہیں۔ چاہیں تو

دن دہاڑے جیل کو لٹوا لیں۔ مگر میں ایسے ڈھنگ سے اُن پر رعب جماتا ہوں کہ بدنامی بھی نہ ہو اور نقصان بھی نہ اُٹھانا پڑے۔ اب آج ہی کل دیکھئے۔ کاشی کے کوئی کروڑپتی راجہ ہیں مہاراجہ بھرت سنگھ۔ اُن کا لڑکا بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہو کر آیا ہے۔ حکام تک اُس کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بڑے صاحب کی میم صاحبہ دن میں دو دو بار اُس کی مزاج پُرسی کے لئے تشریف لاتی ہیں اور سردار نیلکنٹھ راؤ بھی برابر خطوط کے ذریعہ اس کے حالات خیر و عافیت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ چاہوں تو مہاراج بھرت سنگھ سے ایک ملاقات کے لئے لاکھوں روپے اینٹھ لوں مگر یہ اپنا شعار نہیں ؞

نایک رام۔ اچھا۔ کیا راجہ بھرت سنگھ کا لڑکا یہیں قید ہے ؟

داروغہ۔ اور یہاں سرکار کو کس پر اتنا اعتبار ہے ؞

نایک رام۔ آپ جیسے مہاتماؤں کے درشن دُرلبھ ہیں۔ مگر ہمارا ملنئے تو کہوں۔ بال بچوں کا بھی دھیان رکھنا چاہئے۔ آدمی گھر سے چار پیسے کمانے ہی کے لئے نکلتا ہے ؞

داروغہ۔ ارے تو کیا کوئی قسم کھائی ہے پر کسی کا گلا نہیں دباتا۔ چلئے آپ کو جیل خانہ کی سیر کراؤں۔ بڑی صاف ستھری جگہ ہے۔ میرے یہاں تو جو کوئی مہمان آتا ہے اُس کو وہیں ٹھہرا دیتا ہوں۔ جیل کے داروغہ کی دوستی سے جیل کی ہوا کھانے کے سوا اور کیا ملے گا ؟

یہ کہہ کر داروغہ جی مسکرائے۔ وہ نایک رام کو کسی حیلہ سے ٹالنا چاہتے تھے۔ نوکر بھاگ گیا تھا۔ قیدیوں اور چپڑاسیوں سے کام لینے کا موقع نہ تھا۔ اُنہوں نے سوچا۔ اپنے ہاتھ چلم بھرنی پڑے گی بستر بچھانا

پڑے گا۔ پانی لانا پڑے گا۔ عزت میں بٹہ لگے گا۔ گھر کا پردہ فاش ہو جائے گا
انہیں وہاں ٹھہرا دوں گا۔ کھانا بھجوا دوں گا۔ پردہ ڈھکا رہ جائے گا
نایک رام۔ چلئے کون جانے کبھی آپ کی سیوا (خدمت) میں آنا ہی
پڑے۔ پہلے سے ٹھور ٹھکانا دیکھ لوں۔ مہاراجہ صاحب کے لڑکے
نے کون سا کسور کیا تھا؟

داروغہ۔ قصور کچھ نہیں تھا۔ بس حاکموں کی ضد ہے۔ یہاں دیہاتوں
میں گھوم گھوم کر لوگوں کو سمجھاتا پھرتا تھا۔ بس حاکموں کو اُس پر شبہ
ہو گیا کہ یہ بغاوت پھیلا رہا ہے۔ یہاں لاکر قید کر دیا۔ مگر آپ تو
ابھی اُسے دیکھئے ہی گا۔ ایسا صبر و شاکر اور خلیق شخص آج تک
میں نے نہیں دیکھا۔ ہاں وہ کسی سے دبتا نہیں۔ خوشامد کر کے چاہے
کوئی پانی بھرا لے مگر چاہا ہو کہ رعب سے اُس کو دبا لیں تو پھر جو
بھر بھی نہ دبے گا۔

نایک رام دل میں خوش تھے کہ بڑی اچھی ساعت گھر سے
چلا تھا کہ بھگوان آپ ہی سب دروازے کھولے دیتے ہیں۔ دیکھوں
اب ونے سنگھ سے کیا بات ہوتی ہے۔ یوں تو وہ نہ جائیں گے پر رانی
جی کی بیماری کا بہانہ کرنا پڑے گا۔ وہ راضی ہو جائے پھر تو یہاں سے
نکال لے جانا میرا کام ہے۔ بھگوان کی اتنی دیا ہو جاتی تو میری مراد
پوری ہو جاتی۔ گھر بس جاتا۔ زندگی سپھل ہو جاتی۔

(۲۸)

صوفیا کے چلے جانے پر ونے کے دل میں طرح طرح کے اندیشے
پیدا ہونے لگے۔ نفس ایک بزدل دشمن ہے جو ہمیشہ پس پشت وار

کرتا ہے۔ جب تک صوفیا سامنے بیٹھی تھی۔ اُسے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ صوفیا کے پیٹھ پھیرتے ہی اُس نے خم ٹھوکنا شروع کر دیا۔ نہ جانے میری باتوں کا صوفیا پر کیا اثر ہوا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھ گئی کہ میں نے زندگی بھر کے لئے قومی خدمت کا عہد کر لیا ہے۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اُسے ماتاجی کی ناراضگی کا خوف دلانے لگا۔ جیسے بھولے بھالے بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر بات پر ماں سے کہہ دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ جب وہ میرے لئے اتنی قربانیاں کر رہی ہے یہاں تک کہ مذہب جیسی پاک شے کو ترک کر دینے سے بھی اُس کو عار نہیں۔ تو اس کے سامنے قومی خدمت اور فرض ادائی کا ڈھونگ رچنا بالکل خلاف قاعدہ ہے۔ مجھے وہ اپنے دل میں کتنا بیدرد۔ کتنا کم ہمت۔ کتنا بے انس سمجھ رہی ہوگی۔ مانا کہ دوسروں کے مفاد کی کوشش کرنا معیار زندگی ہے لیکن ذاتی مفاد کا خیال بھی تو یک دم قابل ترک نہیں۔ بڑے سے بڑا قومی خادم بھی ذاتی مفاد کی طرف جھکتا ہے۔ اس مفاد کا صرف ایک جزو ترک کر دینا قوم پرستی کے لئے کافی ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔ آہ میں نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی ماری۔ وہ کتنی مغرور ہے۔ پھر بھی اُس نے میرے لئے کیا کیا ذلتیں برداشت نہیں کیں۔ میری ماں نے اُسے جتنا ذلیل کیا اتنا شاید اُس کی ماں نے کیا ہوتا تو وہ اس کا مُنہ نہ دیکھتی مجھے آخر سوجھی کیا۔ بے شک میں اُس کے قابل نہیں ہوں۔ اُس کی جذباتی رفعت مجھے خائف کرتی ہے مگر کیا میری عقیدت میری کمزوری کی تلافی نہیں کر سکتی؟ جہانگیر جیسا [illegible] شخص اگر

نور جہان کو خوش رکھ سکتا ہے تو میں اپنی بے نفسی اپنی محبت سے اُسے آسودہ نہیں کر سکتا؟ کہیں وہ میری اُداسی سے ناخوش ہو کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے مُنہ نہ پھیر لے۔ اگر میری قوم پرستی اور ماں کی فرمانبرداری اور پس و پیش کا یہ انجام ہوا تو یہ زندگی ناقابل برداشت ہو جائے گی ۔

"آہ کتنا بے نظیر حُسن ہے! اعلےٰ تعلیم و تخیل سے چہرہ پر کیسی متانت آ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی دیوی جنت سے اتر آئی ہے۔ گویا ظاہری دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں بلکہ وہ صرف باطنی دنیا میں چلتی پھرتی ہے۔ پاکیزہ خیالی قدرتی حُسن کو کتنا دلفریب بنا دیتی ہے۔ وہی حُسن کا اصلی سنگار ہے۔ پوشاکوں اور زیوروں سے تو اس کی قدرتی رونق ہی زایل ہو جاتی ہے۔ وہ مصنوعی اور خواہش انگیز ہو جاتی ہے (بے ڈھنگا) کا لفظ ہی اس مفہوم کو خوب ادا کرتا ہے۔ قہقہہ اور تبسم میں جو فرق ہے دھوپ اور چاندنی میں جو فرق ہے۔ موسیقی اور شاعری میں جو فرق ہے وہی فرق مرصّع اور مہذب حُسن میں ہے۔ اُس کا تبسم کتنا دلآویز ہے۔ جیسے بسنت کی ٹھنڈک ہو یا کسی شاعر کا اچھوتا خیال۔ یہاں کسی حسینہ سے باتیں کرنے لگو تو طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے۔ یا تو شین قاف درست نہیں یا تذکیر و تانیث کا خیال نہیں۔ صوفیا کے لئے عہد قاعدہ یا اصول سے انحراف کرنا قابل عفو ہی نہیں بلکہ زینت بخش بھی ہے۔ یہ میرے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اُس کے بغیر میری زندگی ایک سوکھے پیڑ کی طرح ہوگی جس کو لگاتار بارش بھی سرسبز نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کا مفاد اور مفہوم ہی باقی نہ رہے گا۔ زندگی ہے

گی مگر محبت اور خوشی اور مقصد سے خالی!

ونے اسی قسم کے خیالات میں غرق تھا کہ داروغہ جی آکر بیٹھ گئے اور بولے "معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ بلا سر سے جلد ہی ٹلے گی۔ ایجنٹ صاحب یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں۔ سردار صاحب نے شہر میں منادی کرا دی ہے کہ اب کسی کو بستی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے میم صاحب نے یہ حکم دیا ہے"۔

ونے۔ میم صاحب بہت دور اندیش ہیں۔

داروغہ۔ یہ نہایت اچھا ہوا ورنہ فساد ضرور ہو جاتا اور سینکڑوں جانیں تلف ہوتیں۔ جیسا تم نے کہا۔ میم صاحب نہایت دُور اندیش ہیں حالانکہ عمر ابھی کچھ نہیں ہے۔

ونے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کل یہاں سے چلی جائیں گی۔

داروغہ۔ ہاں اور کیا۔ سُنی بات کہتا ہوں۔ حکام کی باتوں کی گھنٹہ گھنٹہ بھر میں خبر ملتی رہتی ہے۔ رسد اور بیگار جو ایک ہفتہ کے لئے لے جانے والی تھی بند کر دی گئی ہے۔

ونے۔ یہاں پھر نہ آئیں گی؟

داروغہ۔ تم تو اتنے بیقرار ہو رہے ہو گویا اُن پر عاشق ہو۔

ونے نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "مجھ سے اُنہوں نے کہا تھا کہ کل تمہیں دیکھنے آؤں گی"۔

داروغہ۔ کہا ہوگا پر اب تو اُن کی تیاری ہے۔ یہاں تو خوش ہیں کہ بے داغ بچ گئے ورنہ اور سب جگہ جیلر دل پر جرمانے ہوتے ہیں۔

داروغہ جی چلے گئے تو ونے سوچنے لگے "صوفیا نے کل آنے

کا وعدہ کیا تھا۔ کیا اپنا وعدہ بھول گئی؟ اب نہ آئے گی؟ اگر ایکبار آ جاتی تو میں اس کے قدموں پر گر کر کہتا۔ صوفیا۔ میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ دیوی اپنے پرستش کرنے والے سے اس لئے تو ناراض نہیں ہوتی کہ وہ اس کے قدموں کو چھوتے ہوئے بھی جھجکتا ہے؟ یہ تو پوجنے والے کی ناعقیدت مندی کا نہیں بلکہ عین عقیدت مندی کا ثبوت ہے۔"

جوں جوں دن گزرتا تھا ونے کی بیتابی بڑھتی جاتی تھی۔ مگر اپنے دل کی بات کس سے کہے؟ اس نے سوچا۔ رات کو یہاں سے کسی طرح بھاگ کر صوفیا کے پاس جا پہنچوں۔ وائے قسمت کہ وہ میری رہائی کا حکم نامہ تک لے کر آئی تھی۔ اس وقت میرے سر پر نہ جانے کون سا شیطان سوار تھا؟

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ونے سر جھکائے دفتر کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا۔ کیوں نہ پھر بیہوشی کا بہانہ کر کے گر پڑوں؟ یہاں سب لوگ پریشان ہو جائیں گے اور صوفیا کو میری خبر ضرور مل جائے گی۔ اگر اس کی موٹر تیار ہو گی تو بھی وہ ایک بار مجھے دیکھنے ضرور آ جائے گی۔ مگر مجھے تو سوانگ بھرنا بھی نہیں آتا اپنے اوپر خود ہی ہنسی آ جائے گی۔ کہیں ہنسی رک نہ سکی تو خفت اٹھانی پڑے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے بنا ہوا ہے۔ کاش اس قدر موسلادھار بارش ہونے لگتی کہ وہ گھر سے باہر ہی نہ نکل سکتی۔ مگر شاید بارش کے دیوتا اندر کو بھی مجھ سے دشمنی ہے۔ آسمان پر بادل کا کہیں نام و نشان نہیں۔ گویا کسی قاتل کا بے رحم دل ہو۔ کلارک ہی کو کچھ ہو

جاتا تو آج اُس کا جانا رک جاتا ۔

جب اندھیرا ہوگیا تو اُسے صوفیا پر غصہ آنے لگا۔ جب آج ہی اُس کو یہاں سے چلا جانا تھا تو اُس نے مجھ سے کل آنے کا وعدہ ہی کیوں کیا؟ مجھ سے دیدہ دانستہ جھوٹ کیوں کہا؟ کیا اب کبھی ملاقات ہی نہ ہوگی۔ جبھی پوچھوں گا۔ اُسے خود ہی سمجھ جانا چاہئے تھا کہ یہ اِس وقت پریشان ہے۔ اُس سے میرے دل کی حالت مخفی نہیں ہے وہ اُس کشمکش سے بخوبی واقف ہے جس میں مبتلا ہوں۔ ایک طرف محبت و عقیدت ہے تو دوسری طرف اپنا عہد ماں کی ناخوشی کا خوف اور بدنامی کا خیال۔ اس قدر مختلف جذبات کے یکجا ہونے پر اگر کوئی بے معنی گفتگو کرنے لگے تو اُس میں تعجب ہی کیا ہے۔ اُس کو اس حالت میں مجھ سے ناخوش ہونا چاہئے تھا بلکہ اپنی محبت آمیز ہمدردی سے میرے دل کی آگ کو فرو کرنا چاہئے تھا۔ اگر اُس کی یہی مرضی ہے کہ میں اسی حالت میں گھُل گھُل کر مر جاؤں تو یہی سہی۔ یہ دل کی جلن زندگی کے ساتھ ہی جل جائے گی۔ آہ۔ یہ دو دن کتنے خوشی کے دن تھے! رات ہو رہی ہے۔ پھر اُسی تاریک اور گندی کوٹھڑی میں بند کیا جاؤں گا۔ کون پوچھے گا کہ مرتے ہو یا جیتے۔ اِس تاریکی میں چراغ کی روشنی نظر بھی آئی تو جب تک میں وہاں پہنچوں وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ۔

اتنے میں داروغہ پھر آئے۔ مگر اب کے وہ تنہا نہ تھے۔ اُن کے ساتھ ایک پنڈت جی بھی تھے۔ ونے سنگھ کو خیال آیا کہ میں نے ان پنڈت جی کو کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہ آتا تھا کہ کہاں۔ داروغہ جی دیر تک کھڑے

پنڈت جی سے باتیں کرتے رہے۔ ونے سے کوئی نہ بولا۔ بس اُس نے سمجھا کہ مجھے دھوکا ہوا ہے۔ کوئی اور آدمی ہوگا ٭

رات کو سب قیدی کھانا کھا کر لیٹے۔ چاروں طرف کے دروازے بند کر دئے گئے۔ ونے کانپ رہا تھا کہ مجھے بھی اپنی کوٹھڑی میں جانا پڑے گا مگر نہ جانے کیوں اس کو وہیں پڑا رہنے دیا گیا ٭

روشنی گُل کر دی گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ونے اسی حالتِ اضطراب میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیسے یہاں سے نکلوں۔ جانتا تھا کہ چاروں طرف کے دروازے بند ہیں۔ نہ رسّی ہے نہ کوئی اوزار۔ نہ کوئی رفیق۔ نہ مددگار۔ تاہم وہ منتظر سا دروازہ پر کھڑا تھا کہ شاید کوئی تدبیر سُوجھ جائے۔ مایوسی میں انتظار اندھے کی لاٹھی کا کام دیتا ہے ٭

دفعتاً سامنے سے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ ونے نے سمجھا۔ کوئی چوکیدار ہوگا۔ وہ ڈر گیا کہ مجھے یہاں کھڑا دیکھ کر کہیں اُس کے دل میں کوئی شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ آہستہ کمرہ کی طرف چلا۔ اتنا بزدل وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ توپ کے سامنے کھڑا ہوا سپاہی بھی بچھو کو دیکھ کر خائف ہو جاتا ہے ٭

ونے کمرہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے وہ آدمی بھی اندر آ پہنچا۔ ونے نے چونک کر پوچھا۔ تم کون ؟

نایک رام بولے :۔ آپ کا غلام ہوں نایک رام پنڈا۔

ونے۔ تم یہاں کہاں ؟ اب یاد آیا۔ آج تمہیں تو دارغہ کے ساتھ لاٹھی باندھے کھڑے تھے ؟ ایسی صورت بنا لی تھی کہ پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ تم یہاں کیسے آ گئے ؟

نایک رام۔ آپ ہی کے پاس آیا ہوں ۔

ونے۔ جھوٹے ہو۔ یہاں کوئی ججمانی ہے کیا؟

نایک رام۔ ججمان کیسے۔ یہاں تو مالک ہی ہیں ۔

ونے۔ کب آئے۔ کب؟ وہاں تو سب خیریت ہے؟

نایک رام۔ ہاں سب خیریت ہی ہے۔ کنور صاحب نے جب سے آپ کا حال سُنا ہے بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ رانی جی بھی بیمار ہیں ۔

ونے۔ اماں جی کب سے بیمار ہیں ۔

نایک رام۔ کوئی ایک مہینہ ہونے آتا ہے۔ بس گھُلی جاتی ہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ نہ کسی سے کچھ بولتی ہیں۔ نہ جانے کون روگ ہے۔ کہ کسی ویّد حکیم ڈاکٹر کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ دور دور سے ڈاکٹر بلائے گئے ہیں پر روگ کی تھاہ نہیں ملتی۔ کوئی کچھ بتاتا ہے۔ کوئی کچھ۔ کلکتہ سے کوئی کبیراج آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ اب یہ بچ نہیں سکتیں۔ ایسی گھُل گئی ہیں کہ دیکھتے ہی ڈر لگتا ہے مجھے دیکھا تو دھیرے سے بولیں "پنڈا جی اب ڈیرا کوچ ہے " میں کھڑا کھڑا رو تا رہا ۔

ونے نے سسکتے ہوئے کہا۔ "ہائے ایشور۔ مجھے ماں کے چرنوں کے درشن بھی نہ ہوں گے کیا؟"

نایک رام۔ میں نے جب بہت پوچھا۔ سرکار کسی کو دیکھنا چاہتی ہو تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں "ایک بار ونے کو دیکھنا چاہتی ہوں پر بھاگ میں دیکھنا بدا نہیں ہے نہ جانے اُس کا کیا حال ہوگا؟"

وسنے اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ جب ذرا آواز قابو میں ہوئی تو بولے۔ "اماں جی کو کبھی کسی نے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اب پریشان ہوں۔ کیسے اُن کے درشن ہوں گے؟ بھگوان نہ جانے کن پاپوں کی یہ سزا مجھے دے رہے ہیں"۔

نایک رام۔ میں نے پوچھا کہ حکم ہو تو جا کر انہیں لاؤں۔ اتنا سُنا تھا کہ وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں "تم اُسے لوالاؤ گے؟ نہیں وہ نہ آئے گا! وہ مجھ سے روٹھا ہوا ہے۔ کبھی نہ آئے گا۔ اُسے ساتھ لاؤ تو تمہارا بڑا احسان ہوگا"۔ اتنا سُنتے ہی میں وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ اب دیر نہ کیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماتا کی خواہش دل کی دل ہی میں رہ جائے اور آپ کو جنم بھر پچھتانا پڑے۔

ونے۔ کیسے چلوں گا؟

نایک رام۔ اس کی چنتا مت کیجئے۔ لے تو میں چلوں گا۔ جب یہاں تک آ گیا تو یہاں سے نکلنا کیا مُشکل ہے۔

ونے نے کچھ سوچ کر بولے۔ پنڈا جی میں تو چلنے کو تیار ہوں۔ پر اندیشہ یہی ہے کہ کہیں اماں جی ناراض نہ ہو جائیں۔ تم اُن کے سوبھاؤ کو نہیں جانتے۔

نایک رام۔ بھیّا۔ اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اُنھوں نے تو کہا ہے کہ جیسے بنے ویسے لاؤ۔ اُنھوں نے تو یہاں تک کہا کہ ماپھی (معافی) بھی مانگنی پڑے تو اس وقت مانگ لینی چاہئے۔

ونے۔ تو چلو کیسے چلتے ہو؟

نایک رام۔ دیوال پھاند کر نکل جائیں گے۔ یہ کون مُشکل ہے۔

ونے سنگھ کو خیال ہوا کہ کہیں کسی کی نگاہ پڑ جائے تو صوفیا اس بات کو سن کر کیسے گی۔ سارے حکام مجھ پر تالیاں پیٹیں گے۔ صوفیا سوچے گی کہ بڑے سچے بنتے تھے۔ اب وہ سچائی کہاں گئی؟ کسی طرح صوفیا کو یہ خبر دی جاسکتی تو وہ ضرور حکم نامہ بھیج دیتی۔ پر یہ بات نایک رام سے کیسے کہوں؟ بولے۔ پکڑے گئے تو؟

نایک رام۔ پکڑے گئے تو۔ پکڑے کا کون؟ کہیں کچی گولی نہیں کھیلے ہیں۔ سب آدمیوں کو پہلے ہی سے گانٹھ رکھا ہے۔

ونے۔ خوب سوچ لو پکڑے گئے تو پھر کسی طرح چھٹکارا نہ ہوگا۔

نایک رام۔ پکڑے جانے کا تو نام ہی نہ لو۔ یہ دیکھو سامنے کئی اینٹیں دیوار سے ملا کر رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے پہلے ہی سے وہ انتظام کر لیا ہے۔ میں اینٹوں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ میرے کندھے پر چڑھ کر اس رسی کو لئے ہوئے دیوار پر چڑھ جائے گا۔ رسی اس طرف پھینک دیجئے گا۔ میں اسے ادھر مضبوط پکڑے رہوں گا۔ آپ ادھر دھیرے سے اتر جائے گا۔ پھر وہاں آپ رسی کو مضبوط پکڑے رہئے گا۔ میں بھی ادھر سے چلا آؤں گا۔ رسی بڑی مضبوط ہے۔ ٹوٹ نہیں سکتی۔ مگر ہاں چھوڑ نہ دیجئے گا۔ نہیں تو میری ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی۔

یہ کہہ کر نایک رام رسی کا پلندہ لئے ہوئے اینٹوں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ ونے بھی آہستہ آہستہ چلے۔ دفعتاً کسی چیز کے کھٹکنے کی آواز آئی۔ ونے نے چونک کر کہا۔ بھائی میں نہ جاؤں گا۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ ماتا جی کے درشن کرنا مجھے بدا نہیں ہے۔

نایک رام۔ گھبرایئے مت۔ کچھ نہیں ہے ٭

ونے۔ میرے تو پیر تھرتھرا رہے ہیں ٭

نایک رام۔ تو اسی جیوٹ پہ چلے تھے سانپ کے مُنہ اُنگلی ڈالنے ٭ خطرہ کے وقت حفظ مراتب کا خیال جاتا رہتا ہے ٭

ونے۔ تم مجھے ضرور پھنساؤ گے ٭

نایک رام۔ مرد ہو کر پھنسنے سے اتنا ڈرتے ہو؟ پھنس ہی گئے تو کون چوڑیاں میلی ہو جائیں گی۔ دُشمن کی قید سے بھاگنے میں لاج نہیں جاتی۔ یہ کہہ کر وہ اینٹوں پر کھڑا ہو گیا اور ونے سے بولا۔ میرے کندھے پر آ جاؤ ٭

ونے۔ کہیں تم گر پڑے تو؟

نایک رام۔ تمہارے جیسے پانچ سوار ہو جائیں تو لے کر دوڑوں۔ دھرم کی کمائی میں بل ہوتا ہے ٭

یہ کہہ کر اُس نے ونے کا ہاتھ پکڑ کر اُس کو اپنے کندھے پر ایسی آسانی سے اُٹھا لیا گویا کوئی بچہ ہے ٭

ونے۔ کوئی آ رہا ہے ٭

نایک رام۔ آنے دو۔ یہ رسّی کمر میں باندھ لو اور ڈال پکڑ کر چڑھ جاؤ ٭

اب ونے نے ہمّت مضبوط کی۔ یہی فیصلہ کُن موقع تھا۔ صرف ایک جست کی ضرورت تھی۔ اوپر پہنچ گئے تو بیڑا پار ہے۔ نہ پہنچ سکے تو ذلت۔ بدنامی۔ سزا سب کچھ ہے۔ اوپر بہشت ہے نیچے دوزخ۔ اوپر نجات ہے۔ نیچے قید۔ دیوار پر چڑھنے میں ہاتھوں کے سوا اور کسی

چیز سے مدد نہ مل سکتی تھی۔ کمزور ہونے پر بھی فطرتاً مضبوط آدمی تھے۔ چھلانگ ماری اور بیڑا پار ہو گیا۔ دیوار پر جا پہنچے اور رسّی پکڑ کر نیچے اُتر پڑے۔ بدقسمتی سے پیچھے ہی دیوار سے ملی ہوئی گہری خندق تھی۔ جس میں برساتی پانی بھرا ہوا تھا۔ ونے نے جیوں ہی رسّی چھوڑی۔ گردن تک پانی میں ڈوب گئے اور پھر بڑی مشکل سے باہر نکلے۔ پھر رسّی پکڑ کر نایک رام کو اشارہ کیا۔ وہ مشّاق کھلاڑی تھا۔ دم زدن میں نیچے آ پہنچا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ دیوار ہی پر بیٹھا تھا اور صرف اُترنے کی دیر تھی ؎

ونے۔ دیکھنا کھائی ہے ؎

نایک رام۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ تم سے بتانے کی یاد ہی نہ رہی ؎

ونے۔ تم اس کام میں ہوشیار ہو۔ میں کبھی نہ نکل سکتا۔ اب کدھر چلوگے ؟

نایک رام۔ سب سے پہلے تو دیبی کے مندر میں چلوں گا اور وہاں سے پھر موٹر پر بیٹھ کر اسٹیشن کو۔ ایشور نے چاہا تو آج کے تیسرے دن گھر پہنچ جائیں گے۔ دیبی کی مدد نہ ہوتی تو اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے یہ کام نہ ہوتا۔ اُنہیں نے یہ سنکٹھ ہرا ہے۔ ان پر اپنا خون چڑھاؤں گا ؎

اب دونوں آزاد تھے۔ ونے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے پیر خود بخود اُٹھے جاتے ہیں۔ وہ اتنے ہلکے ہو گئے تھے۔ ذرا دیر میں دونوں سڑک پر آ گئے ؎

ونے۔ صبح ہوتے ہی دوڑ دھوپ شروع ہو جائے گی ۔
نایک رام۔ تب تک ہم لوگ یہاں سے سو کوس پر ہوں گے ۔
ونے۔ گھر سے بھی تو وارنٹ کے ذریعہ پکڑ منگا سکتے ہیں ۔
نایک رام۔ وہاں کی چنتا مت کرو وہ اپنا راج ہے ۔

آج سڑک پر بڑی ہل چل تھی۔ سینکڑوں آدمی لالٹینیں لئے بستی سے چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک غول ادھر سے آتا تھا، دوسرا اُدھر سے۔ عموماً لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ونے سنگھ کو حیرت ہوئی کہ آج یہ بھیڑ کیسی۔ عوام پر وہ سکون نما پریشانی چھائی ہوئی تھی جو کسی خوفناک جوش کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن وہ کسی سے کچھ پوچھ نہ سکتے تھے۔ کہ پہچان نہ لئے جائیں ۔

نایک رام۔ دیبی کے مندر تک تو پیدل ہی چلنا پڑے گا ۔
ونے۔ پہلے ان آدمیوں سے تو پوچھو کہاں دوڑے جا رہے ہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہو گئی ۔
نایک رام۔ ہو گی۔ ہمیں ان باتوں سے کیا مطلب چلو اپنی راہ چلیں ۔
ونے۔ نہیں نہیں۔ ذرا پوچھو تو کیا بات ہے ۔

نایک رام نے ایک آدمی سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ نو بجے کے وقت ایجنٹ صاحب اپنی میم کے ساتھ موٹر پر بیٹھے ہوئے بازار کی طرف سے نکلے۔ موٹر بڑی تیزی سے جا رہا تھا۔ چوراہے پر پہنچا تو ایک آدمی جو بائیں طرف سے آتا تھا موٹر کے نیچے آ گیا۔ صاحب نے آدمی کو دبتے ہوئے دیکھا مگر موٹر کو نہ روکا۔ یہاں تک کہ کئی آدمی موٹر کے پیچھے دوڑے۔ بازار کے اس سرے تک آتے آتے موٹر کو

۱

بہت سے آدمیوں نے گھیر لیا۔ صاحب نے آدمیوں کو ڈانٹا کہ ابھی ہٹ جاؤ۔ جب لوگ نہ ہٹے تو اُنھوں نے پستول داغ دی۔ ایک آدمی فوراً گر پڑا۔ اب لوگ غصہ سے پاگل ہو کر صاحب کے بنگلہ کی طرف جا رہے تھے۔

ونے نے پوچھا۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک آدمی۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ یہی ہوگا نہ مارے جائیں گے۔ مارے تو یونہی جا رہے ہیں۔ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ دس پانچ آدمی مر گئے تو کون سنسار سُونا ہو جائے گا۔

ونے کے ہوش اُڑ گئے۔ یقین ہو گیا کہ آج کوئی فساد ضرور برپا ہوگا۔ بگڑی ہوئی رعایا وہ پانی کا سیلاب ہے جو کسی کے رُکے نہیں رُک سکتا۔ یہ لوگ جھلّائے ہوئے ہیں۔ اِس حالت میں اِن سے صبر و عفو کی باتیں کرنا فضول ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ بنگلہ کو گھیر لیں۔ صوفیا بھی وہیں ہے۔ کہیں اُس پر حملہ نہ کر بیٹھیں۔ غصہ میں شرافت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نایک رام سے بولے۔ پنڈا جی۔ ذرا بنگلہ تک ہوتے چلیں۔

نایک رام۔ کس کے بنگلے تک؟

ونے۔ پولیٹکل ایجنٹ کے۔

نایک رام۔ اُن کے بنگلہ پہ جا کر کیا کیجئے گا؟ کیا ابھی تک پر اُپکار سے جی نہیں بھرا۔ یہ جانیں وہ جانیں۔ ہم سے آپ سے مطلب؟

ونے۔ نہیں موقع نازک ہے۔ وہاں جانا ضروری ہے۔

نایک رام۔ ناحق اپنی جان کے دُشمن ہوئے ہو۔ وہاں کچھ دنگا

ہوجائے تو؟ آخر مرد ہیں۔ چپ چاپ کھڑے مُنہ تو دیکھتے نہ رہیں گے۔ دو چار ہاتھ اِدھر یا اُدھر چلا ہی دیں گے۔ بس دھر پکڑ ہو جائے گی اس سے کیا فائدہ؟

وِنے۔ کچھ ہی ہو میں یہاں یہ ہنگامہ ہوتے دیکھ کر اسٹیشن نہیں جا سکتا۔

نایک رام۔ رانی جی پَل پَل بھر میں پوچھتی ہوں گی۔

وِنے۔ تو یہاں ہمیں کون دو چار دن لگے جاتے ہیں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔

نایک رام۔ جب تمہیں کوئی ڈر نہیں ہے تو یہاں کون ڈرنے والا بیٹھا ہوا ہے؟ میں آگے آگے چلتا ہوں۔ دیکھنا میرا ساتھ نہ چھوڑنا یہ تم لے لو۔ جوکھم کا معاملہ ہے۔ میرے لئے یہ لکڑی کافی ہے۔

یہ کہہ کر نایک رام نے ایک دونلی پستول کمر سے نکال کر ونے کے ہاتھ میں رکھ دی۔ ونے پستول لئے ہوئے آگے بڑھے۔ جب شاہی محل کے نزدیک پہنچے تو اتنی بھیڑ دیکھی کہ ایک ایک قدم چلنا مشکل ہو گیا اور محل سے ایک گولی کے فاصلہ پر تو اُنہیں مجبور ہو کر رُک جانا پڑا۔ سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ محل کے سامنے ایک برقی لالٹین جل رہی تھی اور اُس کی صاف روشنی میں ہلتا مچلتا۔ رُکتا ٹھٹھکتا ہوا لوگوں کا ہجوم اس طرح محل کی طرف چلا جا رہا تھا گویا اُسے نگل جائے گا۔ محل کے سامنے اس ہجوم کو روکنے کے لئے وردی پوش سپاہیوں کی ایک قطار سنگین چڑھائے ہوئے خاموش کھڑی تھی اور اونچے چبوترہ پر کھڑی ہوئی صوفیا کچھ کہہ رہی تھی مگر اس شور وغل میں اُس

کی آواز کچھ سُنائی نہ دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دیوی کی مورت ہے جو صرف اشاروں سے کچھ کہہ رہی ہے ÷

دفعتاً صوفیا نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ صوفیا نے اونچی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں آخری مرتبہ تم لوگوں کو جتائے دیتی ہوں کہ یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ ورنہ سپاہیوں کو مجبور ہو کر گولیاں چلانی پڑیں گی۔ ایک لمحہ میں یہ میدان صاف ہونا چاہیئے"÷

بیر پال سنگھ نے سامنے آ کر کہا۔ "رعایا اس قسم کی بدعتیں اب نہیں برداشت کر سکتی"÷

صوفیا۔ اگر لوگ دیکھ بھال کر راستہ میں چلیں تو ایسے واقع کیوں ہوں؟

بیر پال سنگھ۔ موٹر والوں کے لئے بھی کوئی قانون ہے یا نہیں؟

صوفیا۔ اِن کیلئے قانون بنانا تمہارے اختیار میں نہیں ہے ÷

بیر پال سنگھ۔ ہم قانون نہیں بنا سکتے مگر اپنی جانوں کی حفاظت تو کر سکتے ہیں ÷

صوفیا۔ تم بغاوت پر آمادہ ہو اور تم خود اُس کے بُرے نتائج کے ذمہ دار ہوگے ÷

بیر پال سنگھ۔ ہم باغی نہیں ہیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا ایک بھائی کسی موٹر کے نیچے دب جائے چاہے وہ موٹر مہارانا ہی کا کیوں نہ ہو۔ اور ہم مُنہ نہ کھولیں ÷

صوفیا۔ وہ محض اتفاق تھا ÷

بیر پال سنگھ۔ احتیاط اُس اتفاقی حادثہ کو ٹال سکتی تھی۔ اب ہم اُس وقت

تک یہاں سے نہ جائیں گے جب تک ہم سے وعدہ نہ کیا جائے گا کہ آیندہ ایسے ناگوار واقعات کے لئے مجرم کو مناسب سزا دی جائے گی چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

صوفیا۔ اتفاقیہ باتوں کے لئے کوئی وعدہ نہیں کیا جا سکتا لیکن....

صوفیا کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ کسی نے ایک پتھر اُس کی طرف پھینکا جو اُس کے سر میں اتنے زور سے لگا کہ وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اگر ونے فوراً کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر عوام کو سمجھاتے تو شاید فساد نہ ہوتا اور لوگ چپ چاپ اپنے اپنے گھر چلے جاتے صوفیا کا زخمی ہو جانا عوام کا غصہ فرد کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر جو پتھر صوفیا کے سر میں لگا وہی کئی گنا زور کے ساتھ ونے کے سینہ پر دل پر آ کر لگا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جامہ سے باہر ہو گیا۔ مجمع کو زبردستی ہٹاتا آدمیوں کو دھکے دیتا کچلتا ہوا صوفیا کی بغل میں جا پہنچا۔ پستول کمر سے نکالی اور بیرپال سنگھ پر گولی چلا دی۔ پھر کیا تھا۔ سپاہیوں کو گویا حکم مل گیا۔ اُنھوں نے بندوقیں سر کرنی شروع کر دیں۔ کہرام مچ گیا لیکن پھر بھی لوگ کئی منٹ تک وہیں کھڑے گولیوں کا جواب اینٹ پتھر سے دیتے رہے۔ دو چار بندوقیں اُدھر سے بھی چلیں۔ بیرپال سنگھ بال بال بچ گیا اور ونے کے نزدیک ہونے کے سبب اُنھیں پہچان کر بولا ــــ آپ بھی اُنھیں میں ہیں!

ونے۔ قاتل!

بیرپال سنگھ۔ پرماتما ہم سے روٹھ گیا ہے۔

ونے۔ تمھیں ایک عورت پر ہاتھ اُٹھاتے شرم نہیں آتی؟

چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں — ونے سنگھ ہیں۔ یہ کہاں سے آ گئے؟ یہ بھی اُدھر مل گئے۔ انہیں نے تو پستول چھوڑی تھی۔

"بنا ہوا تھا۔ گھر کا بھیدی لنکا داہ"۔

"شاید شرط پر چھوڑے گئے ہیں"۔

"دولت کی ہوس سر پر سوار ہے"۔

"مار دو ایک پتھر، سر پھٹ جائے۔ یہ بھی ہمارا دشمن ہے"۔

"دغا باز ہے"۔

"اتنا بڑا آدمی اور تھوڑے سے روپیوں کے لئے ایمان بیچ بیٹھا"۔

بندوقوں کی باڑھ کے سامنے نہتے لوگ کب تک ٹھہرتے۔ جب اپنی طرف کئی آدمی لگاتار گرے تو بھگدڑ پڑ گئی۔ کوئی اِدھر بھاگا کوئی اُدھر۔ مگر بیرپال سنگھ اور اس کے ساتھی پانچوں سوار جن کے پاس بندوقیں تھیں۔ محل کے پیچھے کی طرف سے ونے سنگھ کے سر پر جا پہنچے۔ تاریکی میں کسی کی نگاہ اُن پر نہ پڑی۔ ونے نے اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپ سنی تو چونکے۔ پستول چلائی مگر وہ خالی تھی۔

بیرپال سنگھ نے طنز سے کہا۔ آپ تو رعایا کے دوست بنتے تھے۔

ونے۔ تم جیسے قاتلوں کی مدد کرنا میرا قاعدہ نہیں۔

بیرپال۔ مگر ہم اُس سے اچھے ہیں جو حکام سے مل کر رعایا کی گردن پر چھُری چلائے۔

ونے سنگھ غضبناک ہو کر باز کی طرح جھپٹے کہ اُس کے ہاتھ سے

بندوق چھین لیں مگر بیر پال کے ایک ساتھی نے جھپٹ کر ودنے سنگھ کو نیچے گرا دیا اور دوسرا ساتھی تلوار لے کر اُن کی طرف لپکا ہی تھا کہ صوفیا جو اب تک بیہوش سی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ چیخ مار کر اُٹھی اور ودنے سنگھ سے لپٹ گئی۔ تلوار اپنے نشانہ پر نہ پہنچ کر صوفیا کے ماتھے پر پڑی۔ اتنے میں نایک رام لاٹھی لئے ہوئے آ پہنچا اور لاٹھی چلانے لگا۔ دو باغی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ بیر پال سنگھ اب تک ششدر اور ساکت کھڑا تھا۔ نہ اُسے معلوم تھا کہ صوفیا کو پتھر کس نے مارا۔ نہ اُس نے اپنے ساتھیوں ہی کو ودنے پر حملہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ یہ سب کچھ اُس کی آنکھوں کے سامنے مگر اُس کی مرضی کے خلاف ہی ہو رہا تھا۔ مگر اب اپنے ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر وہ بے لاگ نہ رہ سکا۔ اُس نے بندوق کا کندا تان کر اتنی زور سے نایک رام کے سر پر مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا اور ایک لمحہ میں اُس کے تینوں ساتھی اپنے زخمی ساتھیوں کو لے کر بھاگ نکلے۔ ودنے سنگھ سنبھل کر اُٹھے تو دیکھا کہ بغل میں نایک رام خون سے شرابور بیہوش پڑا ہے اور صوفیا کا کہیں پتہ نہیں۔ اسے کون لے گیا۔ کیوں لے گیا۔ کیسے لے گیا۔ ان باتوں کی اُنہیں مطلق خبر نہ تھی۔ میدان میں ایک آدمی بھی نہ تھا۔ دو چار لاشیں البتہ اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں ٭

مسٹر کلارک کہاں تھے ؟ طوفان اُٹھا اور گیا۔ آگ لگی اور بجھی۔ مگر اُن کا کہیں پتہ تک نہیں۔ وہ شراب کے نشہ میں مخمور۔ دین دُنیا سے بے خبر۔ اپنی خوابگاہ میں پڑے ہوئے تھے۔ باغیوں کا شور

سُن کر صوفیا محل سے نکل آئی تھی۔ مسٹر کلارک کو اس لئے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اُن کے آنے سے عوام کے قتل کئے جانے کا اندیشہ تھا۔ اُس نے پُرامن ذرائع سے امن قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی کا یہ انجام تھا۔ وہ پہلے ہی سے ہوشیار ہو جاتی تو شاید حالت اتنی نازک نہ ہونے پاتی ٭

ونے نے نایک رام کو دیکھا۔ نبض کا پتہ نہ تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ فکر۔ رنج اور پشیمانی سے دِل اتنا بیقرار ہوا کہ وہ رو پڑے۔ فکر تھی ماں کی کہ اُن کے درشن بھی نہ کرنے پایا۔ غم تھا صوفیا کا کہ نہ جانے اُسے کون لے گیا۔ پشیمانی تھی اپنے غصّہ پر کہ مَیں ہی اس بغاوت اور قتل کا سبب ہوں ٭

آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مگر ونے کے قلبی آسمان پر چھائی ہوئی غم کی گھٹا اُس سے کہیں زیادہ کالی اور گھنگھور تھی ٭

(۲۹)

مسٹر ولیم کلارک اپنے دیگر ہموطنوں کی طرح شراب کے شایق ضرور تھے۔ مگر اُس کے عادی نہ تھے۔ وہ ہندوستانیوں کی طرح پی کر بدمست ہونا نہ چاہتے تھے۔ گھوڑے پر سوار رہنا جانتے تھے مگر اُس کو قابو سے باہر نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن آج صوفیا نے دیدہ و دانستہ اُن کو معمول سے زیادہ پلادی تھی۔ حوصلہ دلاتی جاتی تھی "واہ اتنی ہی۔ ایک گلاس اور تو لو۔ اچھا یہ میری خاطر سے۔ وہ ابھی تم نے میرا جامِ صحت تو پیا ہی نہیں"۔ صوفیا نے ونے سے کل ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر اُن کی باتیں اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی چین نہ لینے دیتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی:-

ونے نے آج یہ نئے بہانے کیوں ڈھونڈ نکلے ؟ میں نے اُن کے لئے مذہب کی بھی پرواہ نہیں کی پھر بھی وہ مجھ سے بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب میرے پاس اور کون سی تابیر ہے ؟ کیا محبت کا دیوتا اتنا سنگدل ہے۔ کیا وہ بڑی سے بڑی بھینٹ پاکر بھی راضی نہیں ہوتا؟ ماں کی ناراضگی کا اتنا خوف اُنہیں کبھی نہ تھا۔ کچھ نہیں۔ اب اُن کی محبت گھٹ گئی ہے۔ مردوں کا دل ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اس کا ایک اور ثبوت مل گیا۔ اپنی ناقابلیت کا تذکرہ اُن کے منہ سے کتنا غیر فطری معلوم ہوتا تھا۔ وہ جو اتنے پر اوپکاری اتنے تیاگی اتنے سچے اتنے فرض شناس ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں ہائے وہ کیا جانتے ہیں کہ میں اُن سے کتنی گہری عقیدت رکھتی ہوں۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ اُن کے قدم چھو سکوں۔ کتنا پاک دل ہے۔ کتنا اونچا خیال۔ کتنا روحانی ایثار! نہیں۔ وہ مجھ سے دور رہنے ہی کے لئے یہ حیلہ کر رہے ہیں۔ اُنہیں خوف ہے کہ میں اُن کے پیروں کی زنجیر بن جاؤں گی۔ اُنہیں فرض کے راستہ سے ہٹا دوں گی۔ اُن کو معیار سے الگ کر دوں گی۔ میں اُن کے اِس خوف کو کیسے رفع کروں؟

دن بھر انہیں خیالات میں غرق رہنے کے بعد شام کو وہ اتنی مضطرب ہوئی کہ اُس نے رات ہی کو ونے سے پھر ملنے کا قصد کیا۔ اس نے کلارک کو شراب پلا کر اسی لئے بیہوش کر دیا تھا کہ اس کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ جیل کے حکام سے اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ وہ اس دفعہ کو ونے سے منت وسماجت کرنے میں ان کی سوئی ہوئی محبت کو جگانے میں ان کے شکوک کو رفع کرنے میں گزارنا چاہتی تھی۔ مگر اُس

کی کوشش اُسی کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ مسٹر کلارک موقع پر پہنچ سکتے تو شاید معاملہ اتنا سنگین نہ ہونے پاتا۔ کم از کم صوفیا کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ کلارک صاحب اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر بھی اُس کی حفاظت کرتے۔ صوفیا نے اُس سے دغا کرکے اپنا ہی ستیا ناس مار لیا اب وہ نہ جانے کہاں اور کس حالت میں تھی۔ عموماً لوگوں کا خیال تھا کہ باغیوں نے اُسے قتل کر دیا اور اُس کی لاش کو زیورات کے طمع سے اپنے ساتھ لے گئے۔ صرف ونے سنگھ اس بات سے متفق نہ تھے انہیں یقین تھا کہ صوفیا ابھی زندہ ہے۔ باغیوں نے ضمانت کے طور پر اُس کو اپنے یہاں قید کر رکھا ہے کہ انہیں صلح کی شرائط طے کرنے میں انہیں آسانی ہو۔ صوفیا ریاست کو دبا دینے کے لئے اُن کے ہاتھوں میں ایک آلہ کی طرح تھی ؎

اس سانحہ سے ریاست میں تہلکہ مچ گیا۔ حکّام آپ سے ڈرتے تھے اور رعایا اپنے لئے۔ اگر ریاست کے ملازموں ہی تک معاملہ رہتا تو زیادہ تشویش کی بات نہ تھی۔ ریاست خون کا بدلہ خون سے لے کر مطمئن ہو جاتی۔ زیادہ سے زیادہ ایک کی جگہ چار کو قتل کر ڈالتی۔ مگر صوفیا کے درمیان میں پڑ جانے سے معاملہ زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا۔ وہ اب ریاست کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ خود ریاست پر کوئی زوال نہ آ جائے۔ اس لئے ملزموں کی گرفتاری میں غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی سے کام لیا جا رہا تھا۔ ذرا سا شبہ ہونے پر بھی لوگوں کو ماخوذ کر لیا جاتا تھا اور انہیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ گواہ اور ثبوت کی کوئی پوچھ نہ تھی۔ ان ملزموں

کا مواخذہ کرنے کے لئے ایک علیحدہ عدالت قائم کردی گئی تھی۔ وہاں انصاف کرنے کے لئے (۹) رعایا کے چُنے چُنے دشمنوں کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ عدالت کسی کو چھوڑنا نہ جانتی تھی۔ کسی ملزم کو سزائے موت دینے کے لئے ایک سپاہی کی شہادت کافی تھی۔ سردار نیلکنٹھ بلا کھائے پیئے صبح سے شام تک ملزموں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے یہاں تک کہ ہز ہائینس مہاراجہ صاحب خود ہی شملہ۔ دہلی اور اودے پور ایک کئے ہوئے تھے۔ پولیس کے اہلکاروں کے نام روزانہ تاکیدیں بھیجی جاتی تھیں اور اُدھر شملہ سے بھی تاکیدوں کا تانتا بندھا ہُوا تھا۔ تاکیدوں کے بعد دھمکیاں آنے لگیں۔ اُسی مناسبت سے یہاں رعایا کے ساتھ بھی حکّام کی سختیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ مسٹر کلارک کو یقین تھا کہ اِس معاملہ میں ریاست کا ہاتھ بھی ضرور تھا۔ اگر ریاست نے پیشتر ہی سے باغیوں کا رہنا ناممکن کردیا ہوتا تو وہ ہرگز اس طرح سر نہ اُٹھا سکتے تھے۔ ریاست کے بڑے بڑے حکّام بھی اُن کے سامنے جاتے ہوئے کانپتے تھے۔ وہ دورہ پر نکلتے تو ایک اور انگریزی رسالہ ساتھ لے لیتے۔ علاقے کے علاقے اُجڑوا دیتے۔ گاؤں کے گاؤں تباہ کرا دیتے یہاں تک کہ عورتوں پر بھی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ریاست اور کلارک کی ان تمام بداعمالیوں میں دونے بھی دل وجان سے شرکت کرتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اُن پر دیوانگی سی طاری تھی۔ خدمت وایثار کے خیالات اُن کے دل سے یک قلم محو ہو گئے تھے۔ صوفیا اور اُس کے دشمنوں کا سُراغ [illegible] نے کی کوشش۔ بس یہی ایک کام اُن کے لئے رہ گیا تھا۔ مجھے دنیا کیا کہتی

ہے۔ میری زندگی کا کیا مقصد ہے۔ ماتا جی کا کیا حال ہوا۔ اِن باتوں کی طرف اب اُن کا دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ اب تو وہ ریاست کے دستِ راست بنے ہوئے تھے۔ حُکام انہیں وقتاً فوقتاً اور بھی اشتعال دیتے رہتے تھے۔ باغیوں کے دبانے میں کوئی پولیس کا اہل کار یا ریاست کا نوکر اتنا بے اُنس بے انصاف اور بے پرواہ نہ بن سکتا تھا۔ اُن کی وفاداری کی کوئی حد نہ تھی یا یوں کہئے کہ اس وقت وہ ریاست کے ایک خاص رکن بنے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ سردار نیلکنٹھ بھی اُن سے دبتے تھے۔ مہاراناصاحب کو ان پر اتنا اعتبار تھا کہ اُن کی رائے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اُن کے لئے آنے جانے میں کوئی روک نہ تھی۔ اور مسٹر کلارک سے تو اُن کی گہری دوستی ہوگئی تھی۔ دونوں ایک ہی بنگلہ میں رہتے تھے۔ اور در پردہ سردار صاحب کی جگہ پر ونے کی تقرری کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔

تقریباً ایک سال تک تمام ریاست میں یہی حال رہا۔ جب جسونت نگر باغیوں سے پاک وصاف ہوگیا یعنی وہاں کوئی جوان شخص باقی نہ رہ گیا تو ونے نے خود ہی صوفیا کے پتہ لگانے پر آمادہ ہوا۔ اُن کی مدد کے لئے خفیہ پولیس کے کئی تجربہ کار اہلکار تعینات کئے گئے۔ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نایک رام ابھی تک کمزور تھے۔ اُن کے بچنے کی تو کوئی امید ہی باقی نہ رہی تھی مگر زندگی باقی تھی بچ گئے اُنہوں نے ونے کو جانے پر آمادہ دیکھا تو ہمراہ جانے کا ارادہ کیا۔ جاکر بولے بھیا۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں یہاں اکیلا نہ رہوں گا۔

ونے۔ میں کہیں پردیس تھوڑا جاتا ہوں۔ ساتویں روز یہاں آجاؤنگا

تم سے ملاقات ہو جائے گی ۔

سردار نیلکنٹھ وہاں بیٹھے ہوئے تھے بولے ۔ ابھی تم جانے کے قابل نہیں ہو ۔

نایک رام ۔ سردار صاحب ۔ آپ بھی اِنہیں کی سی کہتے ہیں ۔ اُن کے ساتھ نہ رہوں گا تو رانی جی کو کون سا مُنہ دکھاؤں گا ۔

ونے ۔ تم یہاں زیادہ آرام سے رہ سکو گے ۔ تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں ۔

نایک رام ۔ سردار صاحب اب آپ ہی بھیا کو سمجھائیے ۔ آدمی ایک گھڑی کی نہیں چلاتا ۔ ایک ہفتہ تو بہت ہوتا ہے ۔ پھر مورچہ لینا ہے بیرپال سنگھ سے جس کا لوہا میں بھی مانتا ہوں ۔ میری کئی لاٹھیاں اُس نے ایسی روک لیں کہ ایک بھی پڑ جاتی تو کام تمام ہو جاتا ۔ پکا پھینکیت ہے ۔ کیا میری جان تمہاری جان سے زیادہ پیاری ہے ۔

نیلکنٹھ ۔ ہاں بیرپال ہے تو ایک ہی شیطان ۔ نہ جانے کب کدھر سے کتنے آدمیوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے ۔ اُس کے گوئندے ساری ریاست میں پھیلے ہوئے ہیں ۔

نایک رام ۔ تو ایسے جوکھم میں کیسے اِن کا ساتھ چھوڑ دوں ؟ مالک کی چاکری میں جان بھی نکل جائے تو کیا غم ہے ۔ اور یہ زندگی ہے کس لئے ؟

ونے ۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے لئے کسی غیر کی جان جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا ۔

نایک رام ۔ ہاں جب آپ مجھے غیر سمجھتے ہیں تو دوسری بات ہے ۔

ہاں غیر تو ہوں ہی۔ غیر نہ ہوتا تو رانی جی کے اشارہ پر یہاں کیسے دوڑا آتا۔ جیل میں جا کر کیسے باہر نکال لاتا اور سال بھر تک کھاٹ کیوں سیتا سردار صاحب۔ حضور ہی اب انیائے کیجئے۔ میں غیر ہوں؟ جس کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرتا ہوں وہی غیر سمجھتا ہے ❖

نیلکنٹھ۔ ونے سنگھ یہ آپ کا انیائے ہے۔ آپ انہیں غیر کیوں کہتے ہیں؟ اپنے خیر خواہوں کو غیر کہنے سے اُنہیں رنج پہنچتا ہے ❖

نایک رام۔ بس سردار صاحب۔ حضور نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی۔ پولیس کے آدمی غیر نہیں ہیں اور میں غیر ہوں!

ونے۔ اگر غیر کہنے سے تمہیں رنج ہوتا ہے تو میں یہ لفظ واپس لیتا ہوں میں نے غیر صرف اس خیال سے کہا تھا کہ تمہاری نسبت مجھے گھر والوں کو جواب دینا پڑے گا۔ پولیس والوں کے لئے تو کوئی مجھ سے جواب نہ طلب کرے گا ❖

نایک رام۔ سردار صاحب اب آپ ہی اس کا جواب دیجئے۔ یہ ہیں کیسے کہوں کہ مجھے کچھ ہو گیا تو کنور صاحب کچھ پوچھ تانچھ نہ کریں گے۔ اُن کا بھیجا ہوا آیا ہی ہوں۔ بھیا کو جواب دہی تو ضرور کرنی پڑے گی ❖

نیلکنٹھ۔ یہ مانا کہ تم اُن کے بھیجے ہوئے آئے ہو۔ مگر تم اتنے نادان نہیں ہو کہ تمہارے نفع نقصان کی ذمہ داری ونے سنگھ کے سر ہو۔ تم اپنا بھلا بُرا آپ سمجھ سکتے ہو۔ کیا کنور صاحب اتنا بھی نہ سمجھیں گے؟

نایک رام۔ اب کہئے دھرماوتار۔ اب تو مجھے [illegible] پڑے گا۔ سردار صاحب نے میری ڈگری کر دی۔ میں کوئی نابالک (نابالغ) نہیں ہوں کہ سرکار کے سامنے آپ کو جواب دینا پڑے ❖

بالآخر و نے سنگھ نے نایک رام کو ساتھ لے جانا منظور کر لیا۔ اور دو تین دن کے بعد دس آدمیوں کی ایک جماعت بھیس بدل کر سب طرح تیار رہو کر سراغرساں کُتّوں کو ساتھ لئے آمد و رفت کے ناقابل پہاڑی راستوں میں داخل ہوئی۔ پہاڑوں سے آگ نکل رہی تھی۔ اکثر کوسوں تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ملتا۔ راستے پتھریلے۔ درختوں کا پتہ نہیں۔ دوپہر کو لوگ غاروں میں آرام کرتے تھے۔ رات کو بستی سے الگ کسی چوپال یا مندر میں سو رہتے۔ دو دو آدمی ایک ساتھ رہتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار سب آدمیوں کو ایک ہی جگہ پر جمع ہونا پڑتا تھا۔ دوسرے روز کا دستورالعمل طے کر کے لوگ پھر الگ الگ ہو جاتے تھے۔ نایک رام اور و نے سنگھ کی ایک جوڑی تھی۔ نایک رام ابھی تک چلنے پھرنے میں کمزور تھا۔ پہاڑوں کی چڑھائی میں تھک کر بیٹھ جاتا۔ خوراک کی مقدار بہت کم ہو گئی تھی۔ کمزور اتنا ہو گیا تھا کہ پہچاننا مشکل تھا۔ لیکن و نے سنگھ پر جان قربان کرنے کو تیار رہتا تھا۔ پہچانتا تھا کہ دیہاتیوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ مختلف مزاج اور رتبہ کے لوگوں سے واقف تھا۔ جس گاؤں میں پہنچتا دھوم مچ جاتی کہ کاشی سے پنڈا جی آئے ہیں۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ نائی کہار آ پہنچتے۔ دودھ گھی۔ پھل پھول۔ سبزی ترکاری وغیرہ کی افراط ہو جاتی بچے۔ بوڑھے۔ مرد عورت۔ بیدھڑک پنڈا جی کے پاس آتے اور انہیں حسب مقدور دکشنا دیتے۔ پنڈا جی باتوں باتوں میں اُن سے گاؤں کا سارا حال دریافت کر لیتے۔ و نے سنگھ کو اب معلوم ہوا کہ نایک رام ساتھ نہ ہوتے تو مجھے کتنی دقتیں پیش آتیں۔ وہ خود کم سخن متین اور

شرمیلے آدمی تھے۔ اُن میں وہ تحکمانہ انداز نہ تھا جو عوام پر اپنا رعب جما لیتا ہے۔ نہ اُن میں وہ شیریں کلامی تھی جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے۔ ایسی حالت میں نایک رام کا ساتھ ہونا اُن کے لئے خدائی مدد سے کم نہ تھا۔

راستہ میں کبھی کبھی خونخوار درندوں سے مُٹھ بھیڑ ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر نایک رام سینہ سپر ہو جاتا تھا۔ ایک روز چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ دور تک آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ دھوپ کی شدت سے ایک ایک قدم چلنا مشکل تھا۔ کوئی کنواں یا تالاب بھی نظر نہ آتا تھا۔ دفعتاً ایک اونچا ٹیکرا دکھائی دیا۔ نایک رام اس پر چڑھ گیا کہ شاید اوپر سے کوئی گاؤں یا کنواں نظر آئے۔ اُس نے چوٹی پر پہنچ کر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو دُور پر ایک آدمی جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی اور پیٹھ پر ایک تھیلی تھی۔ کوئی بغیر وردی کا سپاہی معلوم ہوتا تھا۔ نایک رام نے اُس کو کئی بار زور زور سے پکارا تو اُس نے گردن پھیر کر دیکھا۔ نایک رام اُسے پہچان گئے۔ یہ ونے سنگھ کے ساتھ کا ایک رضاکار تھا۔ اُسے اشارہ سے بُلایا اور ٹیلے سے اُتر کر اُس کے پاس گئے۔ اس قومی رضاکار کا نام اندردت تھا۔

اندر دت نے پوچھا۔ تم یہاں کیسے آپھنسے جی؟ تمہارے کنور کہاں ہیں؟

نایک رام۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی گاؤں بھی ہے۔ کہیں دانہ پانی مل سکتا ہے؟

اندر دت۔ جس کے رام دھنی اُسے کون کمی۔ کیا راج دربار نے

بھوجن کی رسد نہیں لگائی؟ تیلی سے بیاہ کر کے تیل کا رونا۔

نایک رام۔ کیا کروں بھائی۔ بُرا پھنس گیا ہوں۔ نہ رہتے بنتا ہے نہ جاتے۔

اندر دت۔ اُن کے ساتھ تم بھی اپنی مٹی خراب کر رہے ہو۔ کہاں ہیں آج کل؟

نایک رام۔ کیا کروگے؟

اندر دت۔ کچھ نہیں۔ ذرا ملنا چاہتا تھا۔

نایک رام۔ ہیں تو وہ بھی۔ یہیں بھینٹ ہو جائے گی۔ تھیلی میں کچھ ہے؟

اس طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں ونے سنگھ کے پاس پہنچے۔ ونے نے اندر دت کو دیکھا تو غصّہ سے بولا۔ "اندر دت تم کہاں؟ گھر کیوں نہیں گئے؟"

اندر دت۔ آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ آپ سے کتنی ہی باتیں کرنی ہیں۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے یہ چولا کیوں بدلا؟

نایک رام۔ پہلے تم اپنی تھیلی میں سے کچھ نکالو۔ پھر باتیں ہوں گی۔

ونے سنگھ اپنی کایا پلٹ کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بولے:۔ "اس لئے کہ مجھے اپنی بھول معلوم ہوگئی۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ رعایا بڑی متحمل اور امن پسند ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ کمینہ اور پاجی ہے۔ اُس کو جوں ہی اپنی طاقت کا کچھ احساس ہو جاتا ہے وہ اُسے بُرے طریقہ پر استعمال کرنے لگتی ہے۔ جو آدمی طاقت کے پیدا ہوتے ہی پاگل ہو جائے اُس کا کمزور اور پامال رہنا ہی اچھا ہے

گزشتہ بغاوت کا ہونا اس امر کا ایک بین ثبوت ہے۔ ایسی حالت میں مَیں نے جو کچھ کیا اور کر رہا ہوں وہ بالکل قرین انصاف اور قرین مصلحت ہے۔

اندر دت۔ کیا آپ کی رائے میں رعایا کو چاہیئے کہ خواہ اُس پر کتنے ہی مظالم کئے جائیں پر وہ زبان نہ ہلائے؟

ونے۔ ہاں موجودہ حالت میں اُس کا یہی فرض ہے۔

اندر دت۔ اُس کے رہنماؤں کو بھی یہی معیار اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

ونے۔ بے شک!

اندر دت۔ تو جب آپ نے رعایا کو بغاوت پر آمادہ دیکھا تو اُس کے سامنے کھڑے ہو کر تحمل اور امن کا وعظ کیوں نہیں دیا؟

ونے۔ بالکل فضول تھا۔ اُس وقت کوئی میری نہ سنتا۔

اندر دت۔ اگر نہ سُنتا تو کیا آپ کا یہ فرض نہیں تھا کہ دونوں صفوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر پہلے آپ خود ہی گولی کا نشانہ بن جاتے؟

ونے۔ میں اپنی زندگی کو اتنی ہیچ نہیں سمجھتا۔

اندر دت۔ جو زندگی قومی خدمت کے لئے وقف ہو چکی اُس کے لئے اس سے بہتر اور کون موت ہو سکتی تھی؟

ونے۔ آگ میں کود نے کا نام خدمت نہیں ہے۔ اس پر تشدد کرنا ہی اُس کی خدمت کرنا ہے۔

اندر دت۔ اگر یہ خدمت نہیں ہے تو غریب رعایا کو اپنے نفس پر قربان کر دینا بھی خدمت نہیں ہے۔ بہت ممکن تھا کہ صوفیا نے اپنے دلائل سے

بیر پال سنگھ کو لاجواب کر دیا ہوتا۔ مگر آپ نے مغلوب النفس ہو کر پستول کا پہلا وار کیا اور اس لئے اس کشت و خون کا سارا الزام آپ ہی کی گردن پر ہے اور جلد یا دیر میں آپ کو اس کا کفارہ کرنا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں رعایا کو آپ کے نام سے کتنی نفرت ہے؟ اگر کوئی شخص آپ کو یہاں دیکھ کر پہچان جائے تو اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ آپ کے اوپر تیر چلائے۔ آپ نے یہاں کی رعایا کے ساتھ اپنے رفیقوں کے ساتھ۔ اپنی قوم کے ساتھ اور سب سے زیادہ اپنی قابل تعظیم ماں کے ساتھ جو دغا کی ہے اس کا الزام کبھی آپ کے سر سے دور نہ ہوگا۔ شاید رانی جی آپ کو دیکھیں تو اپنے ہاتھوں سے آپ کی گردن پر تلوار پھیر دیں۔ آپ کی زندگی سے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ انسان کا کتنا اخلاقی زوال ہو سکتا ہے۔

ونے نے کسی قدر نرم لہجہ میں کہا۔ اندردت۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں نے خود غرضی سے حکام کی مدد کی تو تم میرے ساتھ سخت ناانصافی کر رہے ہو۔ رعایا کا ساتھ دینے میں جتنی آسانی سے نیکنامی مل سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ آسانی سے حکام کا ساتھ دینے میں بدنام ہو جانا یقینی ہے یہ میں جانتا تھا۔ لیکن خادم کا فرض نیکنامی اور بدنامی کا لحاظ کرنا نہیں ہے۔ اس کا فرض سچائی کے راستہ پر چلنا ہے۔ میں نے قومی خدمت کا عہد کیا ہے اور ایشور نہ کرے کہ میں وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رہوں جب میرے خدمتی جذبہ میں خود غرضی کا شائبہ ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں رعایا کی نامناسب روش دیکھ کر بھی اس کی حمایت کروں۔ میرا عہد میری عقل کا خون نہیں کر سکتا۔

اندردت - کم از کم اتنا تو آپ مانتے ہی ہیں کہ اپنے فایدہ کے لئے عوام کو نقصان نہ پہنچانا چاہئے ٭
وسنے - جو شخص اتنا بھی نہ مانے وہ انسان کہلانے کے قابل نہیں ٭
اندردت - کیا آپ نے صرف صوفیا کے لئے ریاست کی ساری رعایا کو مصیبت میں نہیں مبتلا کر دیا؟ اور کیا اب بھی آپ اُسے تباہ کر دینے کی فکر نہیں کر رہے ؟
وسنے - تم مجھ پر جھوٹا الزام لگاتے ہو - میں عوام کے لئے سچائی سے دست بردار نہیں ہو سکتا - سچائی مجھ کو ملک و قوم دونوں سے زیادہ عزیز ہے - جب تک میں سمجھتا تھا کہ رعایا حق بجانب ہے میں اُس کی حفاظت کرتا تھا - جب مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے حق سے انحراف کیا ہے تو میں نے بھی اُس سے اپنا منہ موڑ لیا - مجھے ریاست کے حکّام سے کوئی دلی عناد نہیں ہے - میں وہ شخص نہیں ہوں کہ حکّام کو راہ حق پر دیکھ کر بھی خواہ مخواہ اُن سے دشمنی کروں اور نہ مجھ سے یہی ہو سکتا ہے کہ رعایا کو بغاوت اور سرکشی پر آمادہ دیکھ کر بھی اس کی مدد کروں ٭ اگر کوئی شخص مس صوفیا کے موٹر کے نیچے دب گیا تو یہ ایک اتفاقی بات تھی - صوفیا نے جان بوجھ کر تو اُس پر سے اپنا موٹر چلا نہیں دیا - ایسی حالت میں رعایا کا یوں برانگیختہ ہو جانا اِس امر کا بین ثبوت تھا کہ وہ حکّام کو بزور اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے ٭
آپ صوفیا کے تعلق سے میرے اطوار پر حملہ کر کے صرف میرے ساتھ بے انصافی نہیں کر رہے ہیں بلکہ خود اپنے کو بھی ذلیل کر رہے ہیں ٭
اندردت - یہ ہزاروں آدمی بلا کسی قصور کے کیوں قتل ہوئے ؟

کیا یہ بھی رعایا ہی کا قصور تھا؟
وسلنے۔ اگر آپ حکّام کی مشکلات سے ذرا بھی واقف ہوتے تو ہرگز یہ سوال نہ کرتے۔ میں اس کے لئے آپ کو معاف کرتا ہوں۔ ایک سال قبل جب حکّام سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ شاید میں بھی ایسا ہی خیال کرتا۔ لیکن اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ اُنہیں ایسے مواقع پر انصاف سے کام لینے میں کتنی دقتیں پیش آتی ہیں۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ذی اختیار رہوتے ہی انسان کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ انسان فطرتاً انصاف پسند ہوتا ہے۔ اُسے کسی کو خواہ مخواہ ایذا پہنچانے سے خوشی نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ اُتنا ہی رنج ہوتا ہے جتنا کسی خادم قوم کو۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ خادم قوم کسی غیر کو مورد الزام قرار دے کر اپنے کو خوش کر لیتا ہے۔ یہیں اُس کا فرض تمام ہو جاتا ہے حکّام کو یہ موقع ملتا نہیں۔ وہ خود اپنے روّیہ کی صفائی پیش نہیں کر سکتے۔ آپ کو خبر نہیں کہ حکّام نے ملزموں کو ڈھونڈھ نکالنے میں کتنی دقتیں اُٹھائیں۔ رعایا ملزموں کو چھپا لیتی تھی اور کسی سیاسی اصول کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اس لئے ملزموں کے ساتھ بیگناہوں کا ماخوذ ہو جانا ممکن ہی تھا۔ پھر آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اِس بغاوت نے ریاست کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ انگریزی سرکار کو شک ہے کہ دربار ہی کی وجہ سے یہ ساری سازش ہوئی۔ اب دربار کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو اس الزام سے بری کرے اور جب تک مس صوفیا کا سُراغ نہیں مل جاتا۔ ریاست کی حالت نہایت نازک اور تشویشناک ہے۔ ہندوستانی ہونے کے سبب میرا فرض ہے کہ ریاست کے چہرہ

سے اِس داغ کو مٹا دوں۔ خواہ اِس کے لئے مجھے کتنی ہی ذلّت کتنی ہی بدنامی کتنی ہی سخت کلامی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ خادمِ قوم کی حالت کوئی مستقل صورت نہیں رکھتی۔ گردوپیش کے حالات کے مطابق اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کل میں ریاست کا جانی دشمن تھا۔ آج اُس کا جان نثار خادم ہوں اور اُس کے لئے مجھے ذرا بھی ندامت نہیں ہے۔

اندردت۔ ایشور نے آپ کو بحث کے لئے عقل دی ہے اور اُس سے آپ دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کی کوئی تاویل رعایا کے دل سے یہ خیال دور نہیں کر سکتی کہ آپ نے اُس کے ساتھ دغا کی اور اُس دغا کی جو سزا آپ کو صوفیا کے ہاتھوں ملے گی اُس سے آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

ونے نے اس طرح جھپٹ کر اندردت کا ہاتھ پکڑ لیا گویا وہ کہیں بھاگا جا رہا ہو اور بولے۔ تمہیں صوفیا کا پتہ معلوم ہے؟

اندردت۔ نہیں۔

ونے۔ جھوٹ بولتے ہو۔

اندردت۔ ہو سکتا ہے۔

ونے۔ تمہیں بتانا پڑے گا۔

اندردت۔ آپ کو اب مجھ سے یہ پوچھنے کا حق نہیں رہا۔ آپ کا یا دربار کا مقصد پورا کرنے کے لئے میں دوسروں کی جان عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ آپ نے ایک مرتبہ دغا کی ہے اور پھر کر سکتے ہیں۔

نایک رام۔ بتا دیں گے۔ آپ کیوں اتنے گھبرائے جاتے ہیں۔ اتنا

تو بتا ہی دو بھیّا اندردت۔ کہ میم صاحب کُسل (خیریت) سے ہیں نا؟

اندردت۔ ہاں اچھی طرح ہیں اور خوش ہیں۔ کم سے کم ونے سنگھ کے لئے کبھی بیچین نہیں ہوتیں۔ سچ پوچھو تو اُنہیں اب ان کے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔

ونے۔ اندردت ہم اور تم بچپن کے دوست ہیں تمہیں ضرورت ہو تو میں اپنی جان تک دے دوں مگر تم اتنی ذرا سی بات بتلانے سے انکار کر رہے ہو۔ یہی دوستی ہے؟

اندردت۔ دوستی کے پیچھے دوسروں کی جان کیوں عذاب میں ڈالوں۔

ونے۔ میں ماتا کے چرنوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اسے مخفی رکھوں گا۔ میں صرف ایک مرتبہ صوفیا سے ملنا چاہتا ہوں۔

اندردت۔ کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی۔

ونے۔ اندر میں تمام عمر تمہارا احسان مانوں گا۔

اندردت۔ جی نہیں بلی بخشے مُرغا بانڑا ہی اچھا۔

ونے۔ مجھ سے جو قسم چاہے لے لو۔

اندردت۔ جس بات کے بتلانے کا مجھے اختیار نہیں ہے اُسے بتلانے کے لئے آپ مجھ سے ناحق اصرار کر رہے ہیں۔

ونے۔ تم سنگدل ہو۔

اندردت۔ میں اُس سے بھی زیادہ سخت ہوں۔ مجھے جلنا چاہیے کوس لیجئے پر صوفیا کے بارہ میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔

نایک رام۔ ہاں بھیّا۔ بس یہی ٹیک چلی جلتے۔ مردوں کا یہی کام

ہے۔ دو ٹوک کہہ دیا کہ جانتے ہیں پر بتلائیں گے نہیں۔ چاہے کسی کو بھلا لگے چاہے بُرا ؎

اندر دت۔ اب تو قلعی کھل گئی نا؟ کیوں کنور صاحب مہاراج اب تو بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کروگے؟

وسلے۔ اندر دت۔ جلے پر نمک نہ چھڑکو جو بات پوچھتا ہوں بتلا دو۔ ورنہ میری جان کو رونا پڑے گا۔ تمہاری جتنی خوشامد کر رہا ہوں اُتنی آج تک کسی کی نہیں کی تھی۔ مگر تمہارے اوپر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا ؎

اندر دت۔ میں ایک بار کہہ چکا کہ مجھے جس بات کے بتلانے کا اختیار نہیں وہ کسی طرح نہ بتلاؤں گا۔ بس اس بارہ میں تمہارا اصرار بے فائدہ ہے۔ یہ لو میں اپنی راہ جاتا ہوں۔ تمہیں جہاں جانا ہو جاؤ ؎

نایک رام۔ سیٹھ جی بھاگو مت۔ مِس صاحب کا پتہ بتائے بنا نہ جانے پاؤگے ؎

اندر دت۔ کیا زبردستی پوچھوگے؟

نایک رام۔ ہاں زبردستی پوچھوں گا۔ براہمن ہو کر تم سے بھیک مانگ رہا ہوں اور تم انکار کرتے ہو۔ اسی پر دھرماتما اور سیوک بنتے ہو۔ یہ سمجھ لو۔ براہمن بھیک لئے بنا در وا جے سے نہیں جاتا نہیں پاتا تو دھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر لیک کر ہی اُٹھتا ہے ؎

اندر دت۔ مجھ سے یہ پنڈ ئی چالیں نہ چلو۔ سمجھے۔ ایسے بھیک دینے والے کوئی اَور ہوں گے ؎

نایک رام - کیوں باپ دادوں کا نام ڈباتے ہو بھیا؟ کہتا ہوں۔ یہ بھیک دئے بنا اب تمہارا گلا نہیں چھوٹ سکتا۔

یہ کہتے ہوئے نایک رام فوراً زمین پر بیٹھ گئے۔ اندردت کے دونوں پیر پکڑ لئے۔ اُن پر اپنا سر رکھ دیا اور بولے — "اب تمہارا جو دھرم ہو وہ کرو۔ میں مورکھ ہوں گنوار ہوں پَر براہمن ہوں۔ تم سامرتھی آدمی ہو۔ جیسا مناسب سمجھو کرو"۔

اندردت اب بھی نہ پسیجے۔ اُنہوں نے اپنے پیروں کو چھڑا کر چلے جانے کی کوشش کی۔ مگر اُن کے چہرہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑے پس و پیش میں پڑے ہوئے ہیں اور اس عاجزانہ التماس کا لحاظ نہ کرنے پر نہایت شرمندہ ہیں۔ وہ طاقتور شخص تھے۔ رضا کاروں میں کوئی اُن کا سا ڈیل ڈول والا نوجوان نہ تھا۔ نایک رام ابھی کمزور تھے۔ قریب تھا کہ اندردت اپنے پیروں کو چھڑا کر نکل جائیں کہ نایک رام نے ونے سے کہا — "بھیا کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ پکڑ لو اُن کے پاؤں۔ پھر دیکھوں یہ کیسے نہیں بتاتے"۔

ونے سنگھ کسی ذاتی غرض کے لئے بھی کسی کی خوشامد کرنا بُرا سمجھتے تھے۔ پھر پاؤں پر گرنے کی تو بات ہی کیا۔ کسی سادھو مہاتما کے سامنے عاجزی کرنے سے اُنہیں عار نہ تھا۔ بشرطیکہ اُس سے دلی عقیدت ہو۔ صرف اپنا کام نکالنے کے لئے اُنہوں نے سر جھکانا سیکھا ہی نہ تھا۔ مگر جب اُنہوں نے نایک رام کو اندردت کے پیروں پر گرتے دیکھا تو خودداری کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ سوچا کہ جب میری خاطر نایک رام براہمن ہو کر یہ ذلت برداشت کر رہا ہے

تو میرا دور ہی کھڑے ہوئے شان دکھلانا مناسب نہیں۔ اگرچہ ابھی ذرا پہلے اندر دت سے اُنھوں نے سخت کلامی سے گفتگو کی تھی اور ان کی خوشامد کرتے ہوئے شرم آتی تھی مگر صوفیا کا حال بھی اس کے سوا اور کسی تدبیر سے معلوم ہونا غیر ممکن تھا۔ اُنھوں نے اپنی خودداری کو بھی صوفیا پر قربان کر دیا۔ "میرے پاس بھی ایسی ایک چیز تھی جسے میں نے ابھی تک تیرے ہاتھ میں نہ دیا تھا۔ آج اُسے بھی تیرے حوالہ کرتا ہوں۔ آتما اب بھی سر نہ جھکانا چاہتی تھی پر کمر جھک گئی" اور ایک لمحہ میں اُن کے ہاتھ اندر دت کے پیروں پر جا پہنچے۔ اندر دت نے فوراً پیر کھینچ لئے اور دنے کو اُٹھاتے ہوئے بولے۔ "دنے یہ کیا غضب کر رہے ہو"؟

دنے کی حالت اُس نوکر کی سی تھی جسے اُس کے مالک نے تھوک کر چاٹنے کا حکم دیا ہو۔ انہیں اپنی اس ذلت پر رونا آگیا۔

نایک رام نے اندر دت سے کہا۔ "بھیا مجھے بھکاری سمجھ کر دھتکار سکتے تھے مگر اب بتاؤ"۔

اندر دت نے مخمصہ میں پڑ کر کہا۔ "دنے کیوں مجھے اتنا نادم کر رہے ہو۔ میں زبان دے چکا ہوں کہ میں کسی سے یہ بھید نہ بتاؤں گا"۔

نایک رام۔ تم سے کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہے۔ جو اپنا دھرم سمجھو وہ کرو۔ تم آپ بڈھیان (عقل مند) ہو۔

اندر دت نے جھنجھلا کر کہا۔ "زبردستی نہیں تو اور کیا ہے؟ غرض باولی ہوتی ہے پر آج معلوم ہوا کہ وہ اندھی بھی ہوتی ہے۔ دنے تم مفت ہی اپنی آتما پر یہ ظلم کر رہے ہو۔ بھلے آدمی کیا خودداری کو بھی

گھول کر پی گئے؟ تمہارا فرض تھا کہ جان دے کر بھی آتما کی حفاظت کرتے اب تمہیں معلوم ہؤا ہوگا کہ خود غرضی انسان کو کتنا ذلیل کر دیتی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ایک سال قبل ساری دُنیا مِل کر بھی تمہارا سر نہ جُھکا سکتی تھی۔ آج تمہارا یہ اخلاقی تنزّل ہو رہا ہے!! اب اُٹھو مجھے گنہگار نہ کرو۔"

وسنے کو اتنا غصّہ آیا کہ اس کے پیروں کو کھینچ لوں اور سینہ پر چڑھ بیٹھوں۔ ظالم اس حالت میں بھی نیش زنی سے باز نہیں آتا۔ مگر یہ خیال کر کے کہ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا مغموم ہو کر بولے "اندردت تم مجھے جتنا ذلیل سمجھتے ہو اُتنا نہیں ہوں۔ مگر صوفیا کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میری خودداری۔ میری دانائی۔ میری زندگی میرا فرض سب کچھ محبت کی آگ میں بھسم ہو چکا۔ اگر تمہیں اب بھی مجھ پر ترس نہ آئے تو میری کمر سے پستول نکال کر میرا کام تمام کر دو۔"

یہ کہتے ہوئے وسنے سنگھ آب دیدہ ہو گئے۔ اندردت نے اُنہیں اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ ترحمانہ انداز سے بولے۔ "وسنے معاف کرو۔ اگرچہ تم نے قوم کی بدخواہی کی ہے پر میں جانتا ہوں کہ تم نے وہی کیا جو شاید تمہاری جیسی حالت میں میں یا اور کوئی شخص بھی کرتا۔ مجھے تمہاری تحقیر کرنے کا حق نہیں ہے۔ تم نے اگر محبت کے لئے خودداری کو فنا کر دیا تو میں بھی دوستی اور شرافت کے لئے اپنے وعدہ سے مکر جاؤں گا۔ جو تم چاہتے ہو وہ میں بتلا دوں گا۔ مگر اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ مس صوفیا کی نگاہوں سے تم گر گئے ہو۔ اسے اب تمہارے نام سے نفرت ہے۔ اُس سے مل کر تمہیں رنج ہوگا۔"

نایک رام۔ بھیّا تم اپنی سی کر دو۔ مس صاحب کو منانا چنانا اِن کا کام ہے۔ عاسک (عاشق) لوگ بڑے چلتے پُرزے ہوتے ہیں چھٹے ہوئے شُہدے۔ دیکھتے ہی کو سیدھے ہوتے ہیں معسوک (معشوق) کو چٹکی بجاتے اپنا کر لیتے ہیں۔ جرا آنکھوں میں پانی بھر کر دیکھا اور وہ پانی ہوا ٭

اندردت۔ مس صوفیا مجھے کبھی معاف نہ کریں گی۔ لیکن اب اُن کا سا دل کہاں سے لاؤں؟ ہاں ایک بات بتلا دو۔ یہ جانے بغیر میں کچھ بھی نہ بتلا سکوں گا ٭

ونے۔ پوچھو ٭

اندردت۔ تمہیں وہاں اکیلے جانا پڑے گا۔ وعدہ کرو کہ خفیہ پولیس کا کوئی آدمی تمہارے ساتھ نہ ہوگا ٭

ونے۔ اس سے تم بیفکر رہو ٭

اندردت۔ اگر تم پولیس کے ساتھ گئے تو صوفیا کی لاش کے سوا اَور کچھ نہ پاؤ گے ٭

ونے۔ میں ایسی حماقت ہی کیوں کروں گا ٭

اندردت۔ یہ سمجھ لو کہ میں صوفیا کا پتہ بتلا کر اِن لوگوں کی جانیں تمہارے ہاتھ میں رکھے دیتا ہوں جن کی کھوج میں تم نے کھانا پینا حرام کر رکھا ہے ٭

نایک رام۔ بھیّا چاہے اپنی جان نکل جائے اُن پر کوئی آنچ نہ آنے پائے گی لیکن یہ بھی بتا دو کہ وہاں ہم لوگوں کی جان کا جوکھم تو نہیں ہے؟

اندردت۔ (ونے سے) اگر وہ لوگ تم سے دشمنی برتنا چاہتے تو اب

تک تم لوگ زندہ نہ ہوتے۔ ریاست کی ساری سکت بھی تمہیں بچا نہ
سکتی۔ انہیں تمہاری ایک ایک بات کی خبر ملتی رہتی ہے۔ بس یہ سمجھ لو
کہ تمہاری جان اُن کی مٹھی میں ہے۔ رعایا کے ساتھ اتنی بُرائی کرنے
پر اگر تم ابھی زندہ ہو تو صرف مس صوفیا کی بدولت۔ اگر مس صوفیا تم
سے ملاقات کرنا چاہتیں تو اس سے زیادہ آسان کوئی بات نہ تھی۔ لیکن
وہ تو اب تمہارے نام سے چڑتی ہیں۔ اگر اب بھی تمہیں اُن سے ملنے
کی خواہش ہو تو میرے ساتھ آؤ۔

دنے سنگھ کو اپنی قلبی تالیف کر دینے والی قوت پر کامل اعتماد تھا۔
اس کی اُنہیں ذرا بھی فکر نہ تھی کہ صوفیا مجھ سے بات چیت نہ کرے گی۔
ہاں فکر اس بات کی تھی کہ میں نے صوفیا ہی کے لئے حکّام کی جو مدد
کی اُس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ صوفیا کو میرا
یہ طرزِ عمل پسند نہیں ہے۔ وہ دوستوں کے درمیان میں ہے اور خوش
ہے تو میں یہ طریقہ اختیار ہی کیوں کرتا؟ مجھے رعایا سے کوئی عداوت
تو تھی نہیں۔ صوفیا پر بھی تو اُس کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری ہے۔ وہ میرے
مزاج سے واقف ہے تو کیا ایک خط بھیج کر مجھے اپنے [illegible]لات سے آگاہ
نہ کر سکتی تھی؟ جب اُس نے ایسا نہیں کیا تو اُسے اب مجھ سے برہم ہونے
کا کیا حق ہے؟

یہ سوچتے ہوئے وہ اندروت کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ بھوک
پیاس سب جاتی رہی۔

(۳۰)

چلتے چلتے شام ہو گئی۔ کوہستان کی شام میدان کی راتوں سے کہیں

زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ ہر سہ اشخاص چلے جارہے تھے لیکن ابھی منزلِ مقصود کا پتہ نہ تھا۔ پہاڑیوں کے سائے لمبے ہوگئے۔ سورج ڈوبنے کے پہلے ہی دن ختم ہوگیا۔ راستہ مشکل سے نظر آتا تھا۔ دونوں آدمی بار بار اندردت سے پوچھتے اب کتنی دُور ہے مگر یہی جواب ملتا کہ چلے آؤ۔ اب پہنچے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنے نے ایک بار جھنجھلا کر کہا۔ اندردت! اگر تم ہمارے خون کے پیاسے ہو تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟ اس طرح گڑھا گڑھا کر کیوں مارتے ہو؟ اندردت نے اس کا بھی یہی جواب دیا کہ چلے آؤ۔ اب دُور نہیں ہے۔ ہاں ذرا ہوشیار رہنا۔ راستہ خطرناک ہے ؎

دنے کو اب بار بار پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ اندردت کے ساتھ کیوں آیا؟ کیوں نہ پہلے اُس کے ہاتھوں صوفیا کو ایک خط بھیج دیا؟ جواب ملنے پر جب صوفیا کی تحریر پہچان لیتا تو بےخوف ہوکر اس طرف آتا۔ صوفیا اتنی سنگدل تو ہے نہیں کہ خط کا جواب ہی نہ دیتی۔ یہ عجلت کرنے میں مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اندردت کی نیّت درست نہیں معلوم ہوتی۔ ان تفکرات کی وجہ سے اُس کا راستہ اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ یہ لوگ جیوں جیوں آگے بڑھتے تھے۔ راستہ بیہڑ اور ناہموار ہوتا جاتا تھا۔ کبھی ٹیلوں پر چڑھنا پڑتا۔ کبھی اتنا نیچے اُترنا پڑتا کہ معلوم ہوتا۔ تحت الثریٰ کو جا رہے ہیں۔ کبھی دائیں بائیں گہرے غاروں کے درمیان میں ایک تنگ سی پگ ڈنڈی مل جاتی۔ آنکھیں بالکل کام نہ دیتی تھیں۔ صرف اٹکل کا سہارا تھا جو دراصل چشمِ باطن ہے۔ دنے پستول چڑھائے ہوئے تھے۔ دل میں عہد کرلیا تھا کہ ذرا بھی شک ہوا

تو اندردت پر پہلا وار کروں گا ؎

دفعتًا اندردت رُک گئے اور بولے "یہیئے آ گئے۔ بس آپ لوگ یہیں ٹھہریئے۔ میں جا کر ان لوگوں کو اطلاع دے دوں"؎

دسنے نے متحیر ہو کر کہا "یہاں گھر تو کوئی نظر نہیں آتا۔ بس سامنے ایک درخت ہے"؎

اندردت۔ باغیوں کے لئے ایسے ہی پوشیدہ مقامات کی ضرورت ہوتی ہے جہاں ملک الموت کے فرشتے بھی نہ پہنچ سکیں ؎

دسنے۔ بھئی یوں اکیلے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ کیوں نہ یہیں سے آواز دو۔ یا چلو۔ میں بھی چلتا ہوں ؎

اندردت۔ یہاں سے تو شاید سنگھ کی آواز بھی نہ پہنچے اور دوسروں کو لے چلنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ گھر میرا نہیں ہے اور دوسرے کے گھر میں میں آپ کو کیونکر لے جا سکتا ہوں؟ اِن غریبوں کے پاس یہاں کوئی فوج یا قلعہ نہیں ہے۔ صرف راستہ کی پیچیدگی اُنکی حفاظت کرتی ہے۔ مجھے دیر نہ لگے گی ؎

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا اور کئی قدم چل کر درخت کے نیچے غائب ہو گیا۔ دسنے سنگھ کچھ دیر تک تو اندیشہ میں پڑے ہوئے اُس کی راہ دیکھتے رہے پھر نایک رام سے بولے "اس ظالم نے تو بُرا پھنسایا۔ یہاں اس سنسان مقام پر لا کر کھڑا کر دیا کہ بے موت ہی مر جائیں۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا"؎

نایک رام۔ تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے؟ عاشق لوگ تو جان ہتھیلی پر لئے ہی رہتے ہیں۔ مرے تو ہم کہ شکوکے ہی پر رہتے ہے ؎

وسنے۔ میں اُس کی نیت کو تاڑ گیا تھا ؎

نایک رام۔ تو پھر کیوں ہنا کان پونچھ ہلائے چلے آئے ؟ اپنے ساتھ مجھے بھی ڈبویا۔ کیا عِسک (عشق) میں بدھی گھن چکر ہو جاتی ہے ؟

وسنے۔ آنہ گھنٹہ تو ہوا ابھی تک کسی کا پتہ نہیں ہے۔ یہاں سے بھاگنا بھی چاہیں تو کہاں جائیں ؟ اس نے ضرور دغا کی۔ زندگی کا یہیں تک ساتھ تھا ؎

نایک رام۔ عاسک ہو کر مرنے سے ڈرتے ہو ؟ مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ آج ہی سہی۔ ڈر کیا ؟ جب اُکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا غم ؟ مارے اُس کا جتنا جی چاہے ؎

وسنے۔ کہیں سچ مچ صوفیا آجائے !

نایک رام۔ پھر کیا کہنے ؟ لپک کر ٹانگ لینا۔ مزہ تو جب آئے کہ تم ہائے ہائے کر کے رونے لگو اور وہ آنچل سے تمہارے آنسو پونچھے ؎

وسنے۔ بھئی دیکھنا۔ میں اُسے دیکھ کر رو پڑوں تو ہنسنا مت۔ اُسے دیکھتے ہی دوڑ دوں گا اور اتنی زور سے پکڑ دوں گا کہ چھڑا نہ سکے ؎

نایک رام۔ میرا انگوچھا لے لو۔ جھٹ پٹ اُس کے پاؤں باندھ دینا ؎

وسنے۔ تم ہنسی اڑا رہے ہو اور میرا دل دھڑک رہا ہے کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ آہا میں سمجھ گیا۔ میں ادھر سے ایک بار گیا ہوں۔ ہم جسونت نگر کے آس پاس ہی کہیں ہیں۔ اندردت ہم کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے اتنا چکر دے کر لایا ہے ؎

نایک رام۔ جسونت نگر یہیں ہو تو ہمیں کیا ؟ ہم یہاں چلائیں تو کون سنے گا ؟

ونے۔ کیا سچ مچ اُس نے دھوکا دیا۔ کیا؟ میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہاں سے کسی طرف کو چل دوں۔ اگر صوفیا نے سخت باتیں کہنا شروع کیں تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ جس کے لئے اتنے اَدھرم اور پاپ کئے اُس کی بیدردی کیسے سہی جائے گی؟ ایسی ہی باتوں سے دُنیا سے جی کھٹا ہو جاتا ہے۔ جس کے لئے چور بنے وہی پکارے چور۔

نایک رام۔ عورتوں کا یہی حال ہے۔

ونے۔ ہاں جو سُنا کرتا تھا وہ آنکھوں کے آگے آیا۔

نایک رام۔ میں یہ انگوچھا بچھائے دیتا ہوں۔ پتھر ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ آرام سے لیٹو۔ مس صاحب آئیں تو بڑا اچھا۔ نہیں تو تڑکے یہاں سے چل دیں گے۔ کہیں نہ کہیں راہ مل ہی جائے گی۔ میں یہ پستول لئے بیٹھا ہوں۔ کوئی کھٹکا ہوا تو دیکھ جائے گا۔ میرا تو اب یہاں سے جی بھر گیا نہ جانے وہ کون دن ہو گا کہ پھر گھر کے درسن ہوں گے۔

ونے۔ میرا تو گھر سے ناتا ہی ٹوٹ گیا۔ صوفیا کے ساتھ جاؤں گا تو گھسنے ہی نہ پاؤں گا۔ صوفیا نہ ملی تو جاؤں گا ہی نہیں۔ یہیں دھونی رماؤں گا۔

نایک رام۔ بھیّا تمہارے سامنے بولنا چھوٹا منہ [illegible] بات ہے پر ساتھ رہتے رہتے ڈھیٹھ ہو گیا ہوں۔ مجھے تو مس صاحب ایسی کوئی ی اپسرا نہیں معلوم ہوتیں۔ یہاں تو بھگوان کی دیا سے روز ہی ایسی ہی صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ مس صاحب اُن کے آگے پانی بھریں۔ ڑا دیکھو تو جیسے ہیرا دمک رہا ہو۔ اور اُن کے لئے [illegible] راج پاٹ چھوڑنے کو تیار ہو۔ سچ کہتا ہوں۔ رانی جی کو بڑا دُکھ ہو گا۔ ماں کا دل دکھانا اچھا ہے۔ کچھ حال بھی تو نہیں ملا۔ نہ جانے [illegible] کہ ہیں۔

ونے - پنڈاجی - میں صوفیا کے روپ کا اُپاسک (پرستار) نہیں ہوں۔ مَیں خود نہیں جانتا کہ اُس میں وہ کون سی بات ہے جو مجھے اتنا کھینچ رہی ہے - میں اُس کے لئے راج پاٹ تو کیا - اپنا دھرم تک چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر میں تمام دُنیا کا مالک ہوتا تو میں اُسے بھی صوفیا کی بھینٹ دیتا۔ اگر آج مجھے معلوم ہو جائے کہ صوفیا اس دُنیا میں نہیں ہے تو تم مجھے جیتا نہ پاؤ گے - اُس سے ملنے کی اُمید ہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ اُس کے چرنوں پر جان نچھاور کر دینا ہی میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے۔"

درخت کی طرف لالٹین کی روشنی نظر آئی - دو شخص آرہے تھے ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں جاجم - ونے نے دونوں کو پہچان لیا - ایک تو بیر پال سنگھ تھا اور دوسرا اُس کا ساتھی۔ بیر پال نے سامنے آکر لالٹین رکھ دی اور ونے کو پرنام کر کے دونوں چپ چاپ جاجم بچھانے لگے - جاجم بچھا کر بیر پال بولا "آئیے - بیٹھ جائیے - آپ کو بڑی تکلیف ہوئی - مِس صاحب ابھی آرہی ہیں"۔

اُمید اور نا اُمیدی کے مخالف حالات میں پڑ کر ونے کا دل بیٹھا جاتا تھا - انہیں شرم آرہی تھی کہ جن آدمیوں کو میں نے حکام کی مدد سے تباہ کر دینے کی کوشش کی بالآخر انہیں دروازہ کا مجھے گدا ہونا پڑا - مزہ تو جب آتا کہ یہ سب ہتھکڑیاں پہنے ہوئے میرے سامنے آتے اور میں اُن کو معاف کر دیتا - واقعی فتح کا سہرا تو انہیں کے سر رہا - آہ جنہیں میں بدمعاش اور قاتل سمجھتا تھا وہی آج میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

جب وہ جاجم پر جا بیٹھے اور نایک رام ہوشیار ہو کر ٹہلنے لگے۔

تو بیر پال نے کہا۔ کنور صاحب میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آج
آپ کو اپنے سامنے عدالت کی کرسی پر بیٹھے نہ دیکھ کر اپنے دروازہ پر
بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں ورنہ اُن بدنصیبوں کے ساتھ میری گردن پر بھی
چھری چل جاتی جنہوں نے مار کھا کر رونے کے سوا اور کوئی قصور نہیں
کیا تھا!؛

ونے۔ بیر پال سنگھ اُن باتوں کی چرچا کر کے مجھے نادم نہ کرو۔ اگر
اُن کا کچھ کفارہ ہو سکتا ہے تو میں کرنے کو تیار ہوں؛

بیر پال۔ سچے دل سے؟

ونے۔ ہاں اگر مس صوفیا کی تم نے حفاظت کی ہے؛

بیر پال۔ انہیں تو آپ ابھی خود دیکھیں گے؛

ونے۔ تو میں بھی تمہیں معاف کرا دینے کی حتی الامکان کوشش کروں گا؛

بیر پال۔ آپ جانتے ہیں۔ میں مس صاحب کو کیوں لایا؟ اسی لئے
کہ ہم اُنہیں کی خدمت اور سفارش سے اپنے بچاؤ کی اُمید رکھتے
تھے۔ ہمیں اُمید تھی کہ ہم مس صاحب کے ذریعہ اپنی جانوں کی امان
پانے میں کامیاب ہوں گے۔ مگر بدقسمتی سے اُنہیں ہمارے قیاس
کی بہ نسبت کہیں زیادہ گہرا زخم لگا تھا جس کے بھرنے میں پورے
نو مہینے لگ گئے۔ اپنے مُنہ سے کیا کہیں پر جتنی دلی لگن کے ساتھ
ہم نے اُن کی تیمارداری کی وہ ہمیں جانتے ہیں۔ یہی سمجھئے کہ مجھے
ہ مہینے تک گھر سے نکلنے کا موقع نہ ملا۔ اتنے دنوں تک جسونت نگر
ں رعایا اور انصاف دونوں کا خون ہوتا رہا۔ روز روز کی خبریں سُنتا
اور اپنا ماتھا ٹھونک کر رہ جاتا تھا۔ مس صاحب کو اپنی حفاظت

کے لئے لایا تھا۔ اُن کے پیچھے سارا علاقہ تباہ ہوگیا۔ خیر جو کچھ ایشور کو منظور تھا ہوا۔ اب میری آپ سے یہی التجا ہے کہ میرے اوپر رحم کی نگاہ ہونی چاہئے۔ آپ کو پرماتما نے اس قابل بنایا ہے۔ آپ کے ایک اشارہ سے ہم لوگوں کی جان بچ جائے گی ۔

ونے نے کھلے دل سے کہا۔ کہ مجھے تو پورا یقین ہے کہ دربار تمہارا قصور معاف کر دے گا۔ ہاں تم کو بھی یہ عہد کرنا پڑے گا کہ اب سے ریاست کے ساتھ تم کسی قسم کی عداوت نہ رکھو گے ۔

بیر پال۔ میں یہ عہد کرنے کو تیار ہوں۔ کنور صاحب سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ہمیں بالکل مجبور بنا دیا۔ یہ آپ ہی کا تشدد ہے جس نے ہمیں اتنا کمزور کر دیا۔ جن جن آدمیوں پر ہمیں بھروسہ تھا وہ سب دغا دے گئے۔ دوست دشمن میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کے لئے اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے یا حکام کا اعتماد پانے کے لئے ہماری آستین کا سانپ ہوگیا۔ وہی میں ہوں جس نے جسونت نگر میں سرکاری خزانہ لوٹا تھا اور وہی میں ہوں۔ کہ آج چوہے کی طرح بل میں چھپا ہوا ہوں۔ ہر لمحہ یہی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں پولیس نہ آ جائے ۔

ونے۔ مس صوفیا کبھی مجھے یاد کرتی ہیں ؟

بیر پال۔ مس صاحب کو آپ سے جتنی محبت ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ (اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے) ان کے وار سے آپ کو مس صاحب ہی نے بچایا تھا اور مس صاحب ہی کی خاطر سے آپ اتنے دنوں تک ہمارے ہاتھوں سے بچے رہے۔ ہمیں آپ سے ملنے

کا موقع نہ تھا پر بھاری بندوقوں کو تھا۔ مس صاحب آپ کو یاد کر کے گھنٹوں رو دیا کرتی تھیں پر اب اُن کا دل آپ سے ایسا پھٹ گیا ہے کہ آپ کا کوئی نام بھی لے لیتا ہے تو چڑھ جاتی ہیں۔ وہ تو کہتی ہیں کہ مجھے ایشور نے اپنا مذہب ترک کرنے کی یہ سزا دی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اب بھی اُنہیں آپ کی ذات سے گہری عقیدت ہے۔ محبت کی طرح روٹھنا بھی گہرے تعلقات کے سبب ہوا کرتا ہے۔ آپ اُن کی جانب سے ناامید نہ ہوں۔ آپ راجہ ہیں۔ آپ کے لئے سب کچھ زیبا ہے۔ مذہب کی بندش تو چھوٹے آدمیوں کے لئے ہے۔

دفعتاً اُسی درخت کی طرف دوسری لالٹین کی روشنی دکھائی دی۔ ایک بُڑھیا لوٹا لئے ہوئے آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے صوفیا تھی۔ ہاتھ میں ایک تھالی لئے ہوئے جس میں ایک گھی کا چراغ جل رہا تھا۔ وہی صوفیا تھی۔ وہی حُسن منوّر کا مجسمہ۔ البتہ نورِ حُسن کی کمی نے اُسے ایک ناقابل بیان معابیز اور روحانی نمود دے رکھی تھی۔ گویا اُس کا وجود عناصر سے نہیں بلکہ پاکیزہ نور کے ذرّات سے ہُوا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی ونے کے دل میں ایسا حوصل پیدا ہوا کہ دوڑ کر اُس کے قدموں پر گر پڑوں۔ حُسن پر شکوہ فریفتہ نہیں کرتا بلکہ فتح کر لیتا ہے۔

بُڑھیا نے لوٹا رکھ دیا اور لالٹین لئے چلی گئی۔ بیرپال سنگھ اور اُس کا ساتھی بھی وہاں سے ہٹ کر دور چلے گئے۔ نایک رام بھی اُنہیں کے ساتھ ہو لئے۔ اب وہ بیخوف تھے۔

ونے نے کہا۔ صوفیا۔ آج میری زندگی کا مبارک دن ہے۔ میں تو مایوس

ہو چلا تھا ؂

صوفیا۔ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ آپ کے درشن ہوئے۔ آپ کا درشن بدا تھا ورنہ مرنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی ؂

ونے کو اپنے شکوک محض موہوم سے معلوم ہونے لگے۔ اندرد اور بیر پال نے مجھے خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ملاقات محبت کو بیدار کر دیتی ہے۔ دلی اُمنگ کے بہاؤ میں اُن کی معصوم عقل کسی پھولوں کی مالا کی طرح بہتی ہوئی چلی جا رہی تھی اس فقرہ میں کتنا بڑا طنز تھا۔ یہ اُن کی سمجھ میں نہ آیا ؂

صوفیا نے تھال میں سے دہی اور چاول نکال کر ونے کی پیشانی پر ٹیکا لگایا اور مسکرا کر بولی۔ "اب آرتی کروں گی" ؂

ونے نے متاثر ہو کر کہا ۔ پیاری یہ کیا ڈھکوسلا کر رہی ہو؟ تم بھی اِن رسمیات کے جال میں پھنس گئیں ؟

صوفیا۔ واہ۔ آپ کی خاطر تواضع کیسے نہ کروں۔ آپ میرے نجات دہندہ ہیں۔ مجھے اِن ڈاکوؤں اور قاتلوں کے پنجہ سے چھڑا رہے ہیں آپ کا خیر مقدم کیسے نہ کروں ؟ میرے لئے آپ نے ریاست میں اندھیر مچا دیا۔ سینکڑوں بیگناہوں کا خون کر دیا کتنے ہی گھر بے چراغ کر دئے۔ ماؤں کو بیٹوں کے سوگ کا مزہ چکھا دیا۔ سہاگ والیوں کو بیوگی کی گود میں بٹھا دیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے ضمیر کا اپنے اصولوں کا اپنے زندگی کے معیار کا ستیاناس مار دیا۔ اتنی نیکنامیاں پیدا کرنے پر بھی میں آپ کی مناسب تعظیم نہ کروں؟ میں اتنی احسان فراموش نہیں ہوں۔ اب آپ ایک حقیر خادم نہیں بلکہ

ریاست کا داہنا ہاتھ ہیں۔ راجے مہاراجے آپ کی عزت کرتے ہیں۔ میں آپ کی عزت کیسے نہ کروں؟

اب دنے کی آنکھیں کھلیں۔ طنز کا ایک ایک لفظ دل میں تیر کی طرح لگا۔ بولے۔ "صوفیا میں تمہارا وہی شیدائی اور قوم کا وہی قدیم خادم ہوں۔ تم اس طرح میری تضحیک کرکے میرے ساتھ ناانصافی کر رہی ہو۔ ممکن ہے کہ سہو کے سبب میری ذات سے دوسروں کو ایذا پہنچی ہو مگر میرا اصلی مقصد محض تمہاری حفاظت کرنا تھا"

صوفیا نے بگڑ کر کہا۔ "بالکل جھوٹ ہے۔ غلط ہے مجھ پر متہم کرنا ہے۔ یہ سب میری خاطر نہیں اپنی خاطر تھا۔ اس کا مقصد محض اس کینہ خودسری کو آسودہ کرنا تھا۔ جو تمہارے دل میں خدمت کا سوانگ بھرے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے تمہاری حکومت پسندی پر اپنے کو قربان نہیں کیا تھا بلکہ تمہاری خدمت۔ ہمدردی اور حب الوطنی پر۔ میں نے اس لئے تمہیں اپنا معبود بنایا تھا کہ تمہاری زندگی کا معیار بلند تھا۔ تم میں عیسٰے کا رحم۔ بدھ کا تیاگ۔ لوتھر کی سچائی۔ ان اوصاف کا شائبہ نظر آتا تھا۔ کیا غریبوں کو ستانے والے بیدرد خود غرض حکام کی دنیا میں کمی تھی؟ تمہاری معیار پرستی نے مجھے تمہارے قدموں پر جھکایا۔ جب میں ساری خلقت کو نفس پرستی میں مبتلا دیکھ کر دنیا سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اس وقت تمہاری بےنفسی نے مجھے اپنا شیدا بنا لیا۔ لیکن اتفاقات دنیوی کے ایک ہی پلٹے نے تمہاری اصلی حالت ظاہر کر دی۔ میرا سراغ لگانے کے لئے تم نے برائی بھلائی کا خیال بھی ترک کر دیا۔ جو شخص اپنی ذاتی غرض کے لئے اس قدر زیادتی کر

سکتا ہے۔ وہ بُرا سے بُرا کام بھی کر سکتا ہے۔ تم اپنے معیار سے اُسی وقت گر گئے جب تم نے اُس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے غیر اشتدادی ذرائع کی بہ نسبت جبر و تشدد سے کام لینا زیادہ مناسب خیال کیا۔ شیطان نے پہلی مرتبہ تم پر وار کیا اور تم پھر نہ سنبھلے برابر گرتے ہی چلے گئے۔ ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے کھاتے اب تم اتنا گر گئے ہو کہ تم میں شرافت تمیز اور مردانگی کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ تمہیں دیکھ کر میرا سر خود بخود جھک جاتا تھا۔ میری محبت کی بنیاد عقیدت تھی۔ وہ بنیاد اب جڑ سے ہل گئی۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ آہ مجھے جتنا مغالطہ ہُوا اُتنا کبھی کسی کو نہ ہوا ہوگا۔ جس شخص کے لئے اپنے والدین سے منحرف ہوئی۔ اپنا گھر بار چھوڑا۔ جس پر اپنے دیرینہ اصولوں کو قربان کر دیا۔ جس کے لئے ذلت رسوائی بدنامی سب باتیں برداشت کیں۔ وہ اتنا خود غرض۔ اتنا نفس پرست۔ اتنا کم فہم نکلا۔ کوئی دوسری عورت تمہارے ان اوصاف (؟) پر فریفتہ ہو سکتی ہے محبت کے معاملہ میں عورتیں معیار کا لحاظ نہیں کرتیں۔ لیکن میری تعلیم میری صحبت میرا مطالعہ اور سب سے زیادہ میرے طبعی میلان نے مجھے ان باتوں کی قدر کرنا نہیں سکھلایا۔ اگر آج تم ریاست کے ہاتھوں ظلم ذلت اور سزا سے تکلیف پا کر میرے سامنے آتے تو میں تمہاری بلائیں لیتی۔ تمہارے پیروں کی خاک اپنے ماتھے پر لگاتی اور اپنے نصیبوں کو سراہتی لیکن مجھے اس چیز سے نفرت ہے جسے لوگ کامیاب زندگی کہتے ہیں۔ کامیاب زندگی مترادف ہے خوشامد ظلم اور دغا کی۔ میں جن مہاتماؤں کو دنیا میں بزرگ ترین خیال کرتی ہوں۔ اُن کی زندگیاں

کامیاب نہ تھیں۔ دُنیاوی نقطۂ خیال سے وہ لوگ معمولی آدمیوں سے بھی گئے گزرے تھے۔ جنہوں نے تکلیفیں اُٹھائیں جو جلاوطن ہوئے ٹھوکروں سے مارے گئے کوسے گئے اور بالآخر دنیا نے اُن کو بلا ایک بوند آنسو گرائے بھی اپنے یہاں سے رخصت کر دیا۔ بہشت کو بھیج دیا۔ تم پولیس کی ایک جماعت لے کر مجھے کھوجنے نکلے ہو۔ اس کا مقصد یہی کہ رعایا پر رعب قائم کیا جائے۔ میری رائے میں جس ریاست کا وجود ہی ظلم پر مبنی ہو۔ اُس کا نشان جتنا ہی جلد مٹ جائے اُتنا ہی اچھا۔ خیر اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ تمہیں اپنی یہ عزت و شوکت مبارک ہو۔ میں تو اپنے اسی حال میں خوش ہوں۔ جن کے ساتھ ہوں وہ دردمند ہیں جو کسی بیکس کی حمایت میں اپنی جان تک دے سکتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں تم سے کہیں زیادہ خدمت وایثار کے جذبات موجود ہیں۔

ونے آزردہ خاطر ہو کر بولے۔ صوفیا ایشور کے لئے میرے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کرو۔ اگر میں منصب و وقار کا خواہشمند ہوتا تو آج میری حالت ایسی قابل رحم نہ ہوتی۔ میں نے وہی کیا جو مجھے قرین انصاف معلوم ہوا۔ میں حتے الامکان ایک لمحہ کے لئے بھی حق سے منحرف نہیں ہوا۔

صوفیا۔ یہی تو افسوس ہے کہ تمہیں وہ بات کیوں قرین انصاف معلوم ہوئی جو خلاف انصاف تھی۔ اس سے تمہارے دلی میلان کا پتہ چلتا ہے۔ تم فطرتاً خود غرض واقع ہوئے۔ انسانوں کو سبھی چیزیں یکساں عزیز نہیں ہوتیں۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو نام کے لئے دولت کو ٹھیکروں کی طرح لٹاتے ہیں وہ اپنے کو بیغرض نہیں کہہ سکتے۔ خود غرضی کا بلند

معیاری سے کیا تعلق؟ جس کے ارادے اتنے کمزور رہیں اُس کی کم از کم ہیں ذرا بھی عزت نہیں کر سکتی اور عزت کے بغیر محبت محض بدنامی کا سبب ہوتی ہے۔

دنے اُن لوگوں میں نہ تھے جن پر مخالف حالات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اُن کے دل پر مایوسی جلد ہی قبضہ کر لیتی تھی۔ بیقرار ہو کر بولے۔ صوفی مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اُسے حق سمجھ کر یا حالاتِ گردو پیش سے مجبور ہو کر کیا ہے۔

صوفیا۔ دُنیا میں جتنے بُرے کام ہوتے ہیں۔ وہ سب سہواً یا ضرورتاً ہوتے ہیں۔ کوئی تیسرا سبب میں نے آج تک نہیں سُنا۔

دنے۔ صوفیا اگر میں جانتا کہ میری طرف سے تمہارا دل اتنا سخت ہو گیا ہے تو تمہیں مُنہ نہ دکھاتا۔

صوفیا۔ میں تمہارے مُنہ دیکھنے کی بہت شایق نہ تھی۔

دنے۔ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ مگر ان لوگوں نے مظالم ہی کئے تو کیا مجھے تمہارے ہاتھوں یہ سزا ملنی چاہیئے؟ یہ خوف مجھے ماتا جی سے تھا تم سے نہ تھا۔ آہ صوفی! اس محبت کا یوں خاتمہ نہ ہونے دو۔ یوں میری زندگی کو برباد نہ کرو۔ اُسی محبت کے تعلق سے جو تم کو کبھی میرے ساتھ تھی مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ یہ تکلیف میرے لئے ناقابل برداشت ہے تمہیں یقین نہ آئے گا کیونکہ اس وقت تمہارا دل میری طرف سے پتھر ہو گیا ہے لیکن یہ صدمہ میرے لئے مہلک ثابت ہوگا اور اگر موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے تو اُس زندگی میں بھی یہی صدمہ میرے دل کو تڑپاتا رہے گا۔ صوفیا میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بھالے کی نوک کو سینہ پر لے

سکتا ہوں۔ مگر تمہاری یہ روکھی نظر۔ تمہارا یہ بیدردانہ برتاؤ واقعی سوہانِ روح ہے۔ اس سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ تم مجھے زہر دے دو۔ میں اُس پیالہ کو آنکھیں بند کر کے یوں پی جاؤں گا جیسے کوئی بھگت چرنامرت پیتا ہے۔ مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ یہ زندگی جسے تمہاری نذر کر چکا تھا تمہارے ہی کام آ گئی ؎

یہ عشقیہ الفاظ شاید اور کسی وقت ونے کے مُنہ سے نہ نکلتے۔ شاید اُنہیں پھر یاد کر کے اُن کو حیرت ہوتی کہ یہ الفاظ میرے مُنہ سے کیونکر نکلے۔ مگر اس وقت خیالات کے جوش نے اُنہیں زیادہ لسان بنا دیا تھا۔ صوفیا بے اعتنائی کے ساتھ سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر بیدردانہ لہجہ میں بولی ـــ ونے میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے دل میں ابھی جو کچھ تمہاری عزت باقی ہے اُسے بھی پامال نہ کرو۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ الفاظ تمہارے دل سے نہیں نکل رہے۔ بلکہ تم سوچ رہے ہو کہ کیونکر اس سے اپنی توہین کا بدلہ لوں۔ مجھے تعجب ہوگا اگر صبح ہوتے ہوتے یہ مقام خفیہ پولیس کے سپاہیوں سے بھر نہ جائے۔ یہاں کے رہنے والے حراست میں لے نہ لئے جائیں۔ اور اُنہیں بالآخر سزائے موت نہ دی جائے۔ میری سزا کے لئے تم نے کوئی اور ہی طریقہ سوچ رکھا ہوگا۔ میں نہیں خیال کر سکتی کہ وہ کیا ہے۔ لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اگر مجھے بدنام کر کے یا میری چال چلن کو بُرا بتلا کر تم مجھے جسمانی خواہ روحانی تکلیف پہنچا سکو گے تو تمہیں ایسا کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو مگر میں اس کو دل سے نہیں نکال سکتی۔ کوئی ایسا جادو

کوئی ایسا معجزہ نہیں ہے جو تمہیں پھر میری نگاہوں میں قابل احترام بنا سکے۔ جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوں اُس کے لئے میرے دل میں جگہ نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے ان باتوں سے دُکھ نہیں ہو رہا ہے۔ ایک ایک لفظ میرے دل پر آرہ کا کام کر رہا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھو کہ تمہیں دل سے نکال کر میں پھر کسی دوسری صورت کو اُس میں جگہ دوں گی۔ حالانکہ تمہارے دل میں ایسا خیال ہو تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ نہیں یہی میری محبت کا اول اور آخر دور ہے۔ اب یہ زندگی اِس سے زیادہ بہتر کاموں میں صرف ہوگی۔ کون جانے ایشور نے مجھے راہِ حق سے منحرف ہونے کی تمہارے ہی ہاتھوں یہ سزا دلائی ہو۔ تمہارے لئے میں نے وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہئے تھا۔ مکر۔ فریب۔ چالاکی۔ تریا چرتر ایک سے بھی عار نہیں کیا کیونکہ میری معصوم نگاہوں میں تم ایک بے لوث اور پاک روحانی وجود تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مسٹر کلارک کے ساتھ آنے میں مجھے کتنی روحانی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم میری زندگی کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دو گے۔ میری زندگی کو سُدھارو گے سُنوارو گے۔ کامیاب بناؤ گے آخر مجھ میں کون سا ایسا وصف ہے جس پر تم مفتون ہو؟ اگر حُسن کے طالب ہو تو حُسن کی دنیا میں کمی نہیں ہے تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ حسین عورتیں مِل سکتی ہیں۔ اگر میری باتیں تمہیں میٹھی معلوم ہوتی ہیں تو تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ شیریں کلام عورتیں مِل سکتی ہیں۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جلد یا دیر میں تمہیں اپنی پسند اور طبیعت کے موافق کوئی حسینہ مل ہی جائے گی جس کے ساتھ تم اپنی ثروت

شوکت کا لطف اُٹھا سکو گے۔ کیونکہ خادم قوم بننے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ میرا دل تو بھول کر بھی عشق کے لئے دوسرے کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے گا۔ میں اب پھر یہ روگ نہ پاؤں گی۔ تم نے مجھے تارک الدنیا بنا دیا۔ میری نفسانی خواہشات کا خاتمہ کر دیا۔ مذہبی کتب کے دائمی مطالعہ سے جو راستہ نہ ملا اُسے مایوسی نے دکھلا دیا۔ اس کے لئے میں تمہاری ممنون ہوں۔ مذہب اور راستی کی خدمت سے کون سا موتی ہاتھ لگا؟ لامذہبی۔ اب لامذہبی کی خدمت نہ کروں گی۔ جانتے ہو کیا کروں گی؟ اُن گناہگاروں سے خون کا انتقام لوں گی جنہوں نے رعایا کی گردنوں پر چھریاں پھیری ہیں۔ ایک ایک کو دوزخ کی آگ میں جھونک دوں گی۔ جبھی میرے دل کو تسکین ہو گی۔ جو لوگ آج بے گناہوں کا خون بہا کر عزت اور نیک نامی بھوگ رہے ہیں اُنہیں دوزخ کے آتشکدہ میں جلاؤں گی۔ اور جب تک ظالموں کی اس جماعت کو تباہ نہ کر دوں گی۔ دم نہ لوں گی خواہ اس کام میں مجھے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ خواہ ریاست میں انقلاب کیوں نہ رونما ہو جائے خواہ ریاست کا نشان ہی کیوں نہ مٹ جائے۔ میرے دل میں یہ خونیں ارادہ تمہیں نے پیدا کیا ہے۔ اور اس کا الزام تمہاری ہی گردن پر ہے۔ عیسیٰ کا عفو و رحم بدھ کا استقلال اور تزکیہ نفس۔ کرشن کی محبت اور بے تعلقی کی غیر فانی شہرت بھی اب میرے اس خون کی پیاس کو نہیں بجھا سکتی۔ برسوں کا غور و خوض مطالعہ اور خیال تمہاری بداعمالیوں کے ہاتھوں رائیگاں ہو گیا۔ بس اب جاؤ۔ میں جو کچھ کرنا تھا وہ تم سے کہہ چکی۔ تمہاری جو مرضی ہو وہ تم بھی کرو۔ میں آج سے باغیوں

کے گروہ میں شامل ہوتی ہوں تم خفیہ پولیس کے دامن میں پناہ لو۔ جاؤ ایشور پھر ہم کو نہ ملائے!

یہ کہہ کر صوفیا نے طشت اُٹھا لیا اور چلی گئی۔ جیسے امید دل سے نکل جائے۔ ونے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جو درد بھری صدا سے کم دلسوز نہ تھی اور زمین پر بیٹھ گئے جیسے کوئی بدنصیب بیوہ اپنے پیارے شوہر کی لاش اُٹھ جانے کے بعد ایک آہ سرد بھر کر بیٹھ جائے

تینوں آدمی جو دور کھڑے تھے آکر ونے کے پاس کھڑے ہو گئے

نایک رام نے کہا۔ "بھیا آج تو خوب خوب باتیں ہوئیں۔ تم نے بھی پکڑ پایا تو اتنے دنوں کی کسر نکال لی۔ آگئی پنجہ میں نا؟ وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ عاشق لوگ بڑے چکمہ باز ہوتے ہیں۔ پہلے تو خوب آرتی اُتاری۔ وہی چاول کا ٹیکہ لگایا۔ ہم ہیں تو کیا۔ ہم لوگوں کی رگیں جانتے ہیں۔ کب چلنا طے ہوا؟ جلدی چلو میرا بھی گھر بسے"۔

ونے کی آنکھیں اشک آلودہ تھیں مگر اس جملہ پر ہنس پڑے۔ بولے بس اب دیر نہیں ہے۔ گھر کو خط لکھ دو تیاری کریں"۔

نایک رام۔ بھیا آنند تو جب آئے جب دونوں بارا تیں ساتھ ہی نکلیں۔

ونے۔ ہاں جی۔ ساتھ ہی نکلیں گی۔ پہلے تمہاری۔ پیچھے میری۔

نایک رام۔ ٹھاکر اب سواری کا بندوبست کرو جس میں ہم لوگ کل سویرے ٹھنڈے ٹھنڈے نکل جائیں۔ یہاں پالکی تو مل جائے گی نا؟ بیرپال۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ اب بھوجن کر کے آرام کیجئے۔ دیر ہو گئی ہے۔

وسنے۔ یہاں سے حسونت نگر کتنی دور ہے؟

بیر پال۔ یہ پوچھ کر کیا کیجئے گا؟

وسنے۔ مجھے اسی وقت وہاں پہنچنا چاہئے۔

بیر پال۔ (متفکر ہو کر) آپ دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں۔ راستہ خراب ہے۔

وسنے۔ کوئی ہرج نہیں۔ چلا جاؤں گا۔

نایک رام۔ بھیا۔ مس صاحب بھی رہیں گی نا؟ رات کو کیسے چلو گے؟

وسنے۔ تمہیں تو خبط سا ہو گیا ہے۔ مس صاحب میری کون ہوتی ہیں۔ اور میرے ساتھ کیوں جانے لگیں؟ اگر آج میں مر جاؤں تو شاید اُن سے زیادہ خوشی اور کسی کو نہ ہوگی۔ تمہیں تھکاوٹ معلوم ہوتی ہو تو آرام کرو مگر میں تو یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے کانٹوں بھری راہ بھی یہاں کی پھولوں والی سیج سے زیادہ آرام دہ ہوگی۔ آپ لوگوں میں سے کوئی راستہ دکھلا سکتا ہے؟

بیر پال۔ چلنے کو تو میں خود حاضر ہوں۔ لیکن راستہ نہایت خطرناک ہے۔

وسنے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے اُسی وقت پہنچا دیجئے اور ہو سکے تو آنکھوں پر پٹی باندھ دیجئے۔ مجھے اب اپنے اوپر ذرا بھی اعتبار نہیں رہا۔

بیر پال۔ بھوجن تو کر لیجئے۔ اتنی خاطر تو کیجئے۔

وسنے۔ اگر مہمان نوازی کرنی ہے تو مجھے گولی مار دیجئے۔ اس سے بڑھ کر آپ میری خاطر نہیں کر سکتے۔ میں نے آپ کے ساتھ کتنی برائی کی

ہے۔ اگر آپ نے اُس کا سواں حصّہ بھی میرے ساتھ کیا ہوتا تو مجھے کسی ترغیب کی ضرورت نہ پڑتی۔ میں شیطان ہوں۔ قاتل ہوں زمین میرے بوجھ سے جس قدر جلد ہلکی ہو جائے اُتنا ہی اچھا ۔

نایک رام۔ معلوم ہوتا ہے۔ مس صاحب سچ مچ پھرنٹ ہو گئیں۔ مگر کہے دیتا ہوں کہ وہ دو ہی چار دن میں تمہارے پیچھے پیچھے دوڑتی پھریں گی۔ عاسک کی ہائے بُری ہوتی ہے ۔

بیرپال۔ کنور صاحب۔ میرا اتنا کہنا مانئیے کہ ابھی نہ جائیے مجھے خوف ہے کہ کہیں مس صاحب آپ کے یوں چلے جانے سے گھبرا نہ جائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل سورج نکلنے تک آپ جسونت نگر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت کچھ بھوجن کر لیجئے ۔

ونے۔ میرے لئے اب یہاں کا پانی بھی حرام ہے۔ اگر تمہیں نہیں چلنا ہے تو نہ سہی۔ مجھے تم سے اتنی خاطرداری کرانے کا حق نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا ۔

بیرپال مجبور ہو کر ساتھ جانے کو تیار ہوا۔ نایک رام کا بھوک سے بُرا حال تھا۔ مگر کیا کرتے۔ ونے کو جاتا دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہر سہ اشخاص روانہ ہو گئے ۔

نصف گھنٹہ تک تینوں آدمی چپ چاپ چلتے رہے۔ ونے کو صوفیا کی اور سب باتیں تو یاد نہ تھیں مگر اُن کی نیت پر اُس نے حملے کئے تھے اور اُن کے بارہ میں جو نفرت بھری پیشینگوئی کی تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ اُن کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ صوفیا مجھے اتنا کم ظرف سمجھتی ہے۔ وقتی حالات پہ ذرا بھی توجہ نہیں دینا چاہتی

دل کی اتفاقیہ تحریک کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑتی ⁂

دفعتاً اُنہوں نے بیر پال سے پوچھا "تمہاری رائے میں میں جوش میں آکر یہ بے انصافی کر بیٹھا یا جیسا مس صوفیا کہتی ہیں میں فطرتاً کمینہ ہوں؟"

بیر پال۔ کنور صاحب۔ مس صوفیا کی اس وقت کی باتوں کا ذرا بھی بُرا نہ مانئے۔ جس طرح جوش میں آپ کے حواس بجا نہیں رہ سکے ویسے ہی وہ بھی جوش میں واہیات بک گئی ہوں گی۔ جب آپ نے سیدا اور پر اُپکار کے لئے راج کو چھوڑ دیا تو کس کا منہ ہے کہ آپ کو خود غرض کہہ سکے ⁂

ونے۔ نہ جانے اس نے اتنی سخت کلامی کہاں سیکھ لی؟ آدمی بھکاری کو بھی جواب دے تو نرمی سے۔ اُس نے تو مجھے اس طرح دھتکارا جیسے کُتے کو ⁂

نایک رام۔ کسی انگریز کو بیاہے گی اور کیا۔ یہاں کالے آدمیوں کے پاس کیا دھرا ہے۔ مُرغی کا انڈا کہاں ملے گا؟

ونے۔ تم بالکل بیوقوف ہو۔ تمہیں مُرغی کے انڈے ہی کی پڑی ہے ⁂

نایک رام۔ ایک بات کہتا تھا۔ تمہارے ساتھ وہ آزادی کہاں؟ لے جا کر رانی بنا دوگے۔ پردہ میں بٹھا دو گے۔ گھوڑی پر سوار کرا کر شکار کھیلنے تو نہ جاؤ گے؟ کمر میں ہاتھ ڈال کر ٹمٹم پر تو نہ بٹھاؤ گے؟ ٹوپی اُتار کر ہُرّے ہُرّے تو نہ کرو گے ⁂

ونے۔ پھر وہی حماقت کی باتیں۔ ارے بونگا مہاراج۔ صوفیا کو تم نے کیا سمجھا ہے۔ ہمارے مذہب سے جتنی وہ واقف ہے اُتنا کوئی

پنڈت بھی نہ ہوگا۔ وہ ہمارے یہاں کی دیویوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اُسے تو کسی راجہ کے گھر پیدا ہونا چاہئے تھا۔ نہ جانے عیسائی گھرانے میں کیوں پیدا ہوئی؟ مجھ سے منہ پھیر کر وہ اب کسی کو منہ نہیں لگا سکتی اس کا مجھے اُتنا ہی یقین ہے جتنا اپنی آنکھوں کا۔ وہ اب شادی نہ کریگی
بیر پال۔ آپ بہت سچ کہتے ہیں۔ واقعی وہ دیوی ہیں ÷
ونے۔ سچ کہنا۔ کبھی میرا تذکرہ بھی کرتی تھیں؟
بیر پال۔ اس کے سوا تو اُنہیں اور کوئی بات ہی نہ تھی۔ زخم گہرا تھا بیہوش پڑی رہتی تھیں۔ مگر چونک چونک کر آپ کو پکار اُٹھتی تھیں کہتی تھیں کہ ونے کو بلا دو اُنہیں دیکھ کر مروں گی۔ کبھی کبھی تو کئی کئی دن تک آپ ہی کی رٹ لگی رہتی۔ جب کسی کو دیکھتیں یہی پوچھتیں کہ ونے آ گئے؟ کہاں ہیں؟ میرے سامنے لانا۔ اُن کے چرن کہاں ہیں ہم لوگ اُن کی حالت دیکھ دیکھ کر رونے لگتے تھے۔ جرّاح چیر پھاڑ کی کہ آپ سے کیا کہوں۔ یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس کو دیکھتے ہی سُوکھ جاتی تھیں۔ لیکن ہم جیوں ہی کہہ دیتے کہ آج ونے سنگھ کے آنے کی خبر ہے تو بس فوراً دل مضبوط کر کے مرہم پٹی کرا لیتی تھیں۔ جرّاح سے کہتی تھیں۔ جلدی کر وہ آنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو آ جائیں۔ بس یہ سمجھئے کہ آپ کے نام نے اُنہیں موت کے مُنہ سے نکال لیا ÷
ونے سنگھ نے دردناک لہجہ میں کہا۔ بس کرو اب اور کچھ نہ کہو دُکھ بھری کہانی نہیں سُنی جاتی۔ کلیجہ مُنہ کو آتا ہے ÷
بیر پال۔ ایک روز اُسی حالت میں آپ کے پاس جانے کو تیار ہو گئیں۔

...دو کر کہنے لگیں اُنہیں لوگوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں اُنہیں چھڑانے جا رہی ہوں . . . . . .

دمنے۔ رہنے دو۔ بیرپال! ورنہ دل پھٹ جائے گا۔ اُس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مجھے ذرا آنکھیں لٹا دو۔ نہ جانے کیوں دل ڈوبا جاتا ہے۔ مجھ جیسے بدنصیب کے لئے یہی مناسب سزا ہے۔ دیوتاؤں سے سکھ نہ دیکھا گیا۔ اِن سے کسی کا کبھی بھلا نہیں ہوا۔ چلے چلو۔ نہ ...ں گا۔ مجھے اُسی وقت جسونت نگر پہنچنا ہے ؂

پھر لوگ چپ چاپ چلنے لگے۔ دمنے اتنی تیزی سے چل رہے ۔ گویا دوڑ رہے ہیں۔ دُکھتے ہوئے اعضا میں عجیب پھرتی آ گئی ۔ بیچارے نایک رام دوڑتے دوڑتے ہانپ رہے تھے۔ رات ۔ دو بجے ہوں گے۔ ہوا میں جان بخش تازگی آ گئی تھی۔ کم سن ...ب پوری جوانی پر پہنچ گئی تھی۔ جب اُس کی شوخی دلکشی میں ...یل ...اتی ہے۔ جب اُس کی جادو بھری طاقت کا مقابلہ نہیں کیا سکتا۔ نایک رام تو کئی بار اونگھ کر گرتے گرتے بچ گئے۔ دمنے کو ...رام کرنے کی خواہش ہونے لگی کہ بیرپال بولے۔ لیجئے جسونت نگر ...گئے ؂

...نے۔ ارے اتنی جلد! ابھی تو چلتے ہوئے کُل چار ہی گھنٹے ہوئے ...وں گے ؂

بیرپال۔ آج سیدھے آئے ؂

...مے۔ آؤ۔ آج یہاں کے حکام سے تمہاری صفائی کرا دوں ؂

بیرپال۔ آپ سے صفائی ہو گئی تو اب کسی کا غم نہیں ہے۔ اب

مجھے یہیں سے رخصت کیجئے ۔

وِنے ۔ ایک روز اکیلے تو میرے مہمان ہو جائیے ۔

بیر پال ۔ ایشور نے چاہا تو جلد ہی آپ کے درشن ہوں گے ۔ مجھ پر نظرِ عنایت رکھیئے گا ۔

وِنے ۔ صوفیا سے میرا کچھ ذکر نہ کیجئے گا ۔

بیر پال ۔ جب تک وہ خود نہ چھیڑیں گی میں نہ کروں گا ۔

وِنے ۔ میری یہ گھبراہٹ یہ دیوانگی اُس کا ذکر تو بھول کر بھی نہ کیجئے گا ۔ میں نہ جانے کیا کیا بک رہا ہوں ۔ اپنی زبان اور خیالات پر مجھے ذرا بھی قابو نہیں رہا ۔ بیجان سا ہو رہا ہوں ۔ آپ اُن سے اتنا ہی کہہ دیجئے گا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں بولے ۔ اس کا وعدہ کیجئے ۔

بیر پال ۔ اگر وہ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں گی تو میں کچھ نہ کہوں گا ۔

وِنے ۔ میری خاطر سے اتنا ضرور کہہ دیجئے گا کہ آپ کا ذرا بھی ذکر نہ کرتے تھے ۔

بیر پال ۔ جھوٹ تو نہ بولوں گا ۔

وِنے ۔ جیسی تمہاری مرضی ۔

(۱۳)

بھیرو کے گھر سے نکل کر سورداس اپنی جھونپڑی میں آ کر سوچنے لگا کیا کروں کہ دفعتاً دیا گر آگئے اور بولے ــــ سورداس آج تو لوگ تمہارے اوپر بہت گرم ہو رہے ہیں ۔ کہتے ہیں اسے گھمنڈ ہو گیا ہے ۔ تم اس مایا جال میں کیوں پڑے ہو ؟ کیوں نہیں میرے ساتھ کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلتے ؟

سورداس۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ چلو تو میں بھی نکل پڑوں۔

دیاگر۔ ہاں۔ چلو۔ تب تک میں بھی مندر کا کچھ ٹھکانا کر لوں۔ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جو میرے پیچھے یہاں دیا بتی تک کر دے۔ بھوگ لگانا تو دور رہا۔

سورداس۔ تمہیں مندر سے کبھی چھٹی نہ ملے گی۔

دیاگر۔ بھائی یہ بھی تو نہیں ہوتا کہ مندر کو یونہی بلا حفاظت چھوڑ کر چلا جاؤں۔ پھر نہ جانے کب لوٹوں۔ تب تک تو یہاں گھاس جم جائے گی۔

سورداس۔ تو جب تم آپ ہی ابھی اس مایا جال میں پھنسے ہوئے ہو تو مجھے کیونکر چھڑا سکو گے؟

دیاگر۔ نہیں جلد ہی چلوں گا۔ ذرا پوجا کے لئے پھول لیتا آؤں۔

دیاگر چلے گئے تو سورداس پھر سوچ میں پڑ گیا۔ سنسار کی بھی کیا لیلا ہے کہ ہوم کرتے ہاتھ جلتے ہیں۔ میں تو نیکی کرنے گیا تھا۔ اُس کا یہ پھل ملا۔ محلہ والوں کو یقین آگیا۔ بُری باتوں پر لوگوں کو کتنی جلد یقین آجاتا ہے۔ مگر نیکی بدی کبھی چھپی نہیں رہتی۔ کبھی نہ کبھی تو اصلی بات معلوم ہی ہو جائے گی۔ ہار جیت تو زندگانی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کبھی جیتوں گا تو کبھی ہاروں گا۔ اُس کی چنتا ہی کیا؟ ابھی کل بڑے بڑے لوگوں سے جیتا تھا۔ آج جیت میں بھی ہار گیا۔ یہ تو کھیل میں ہوا ہی کرتا ہے۔ اب بیچاری سبھاگی کہاں جائے گی؟ محلہ والے تو اب اسے یہاں رہنے نہ دیں گے اور رہے گی کس کے سہارے پر؟ کوئی اپنا تو ہو۔ میکے میں بھی تو کوئی نہیں ہے۔ جوان عورت

اکیلی کہیں رہ بھی نہیں سکتی۔ زمانہ ایسا بُرا آگیا ہے۔ اُس کی آبرو کیسے بچے گی؟ بھیرو کو کتنا چاہتی ہے۔ سمجھتی تھی کہ میں اُسے مارنے گیا ہوں اُسے ہوشیار رہنے کے لئے کتنا زور دے رہی تھی۔ وہ تو اتنا پریم کرتی ہے اور بھیرو کا کبھی مُنہ ہی نہیں سیدھا ہوتا۔ اُبھاگنی ہے اور کیا۔ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اُس کے چرن دھو دھو کر پیتا۔ پر بھیرو کو جب دیکھو اُس پر تلوار ہی کھینچے رہتا ہے۔ میں کہیں چلا گیا تو اُس کا کوئی پُوچھنے والا بھی نہ رہے گا۔ محلہ والے اُس کی چھیچھا لیدر ہوتے دیکھیں گے اور ہنسیں گے۔ کہیں نہ کہیں ڈوب مرے گی۔ کہاں تک صبر کرے گی۔ اس آنکھوں والے اندھے بھیرو کو تھوڑا بھی خیال نہیں ہے کہ میں اسے نکال دوں گا تو کہاں جائے گی۔ کل کو مسلمان [ایا] کرستان ہو جائے گی تو سارے نگر میں ہل چل مچ جائیگی۔ پر ابھی اُس کے آدمی کو کوئی سمجھانے والا نہیں ہے۔ کہیں بھرتی والوں کے ہاتھ پڑ گئی تو پتہ بھی نہ لگے گا کہ کہاں گئی۔ سبھی لوگ جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔ وہ یہی سوچتا ہُوا سڑک کی طرف چلا تھا کہ سُبھاگی آ کر بولی — سُورداس میں کہاں رہوں گی؟

سُورداس نے ظاہری بے رُخی سے کہا۔ میں کیا جانوں کہاں رہے گی۔ ابھی تو ہی تو بھیرو سے کہہ رہی تھی کہ لاٹھی لے کر جاؤ۔ تو کیا یہ سمجھتی تھی کہ میں بھیرو کو مارنے آیا ہوں؟

سُبھاگی۔ ہاں سُورداس۔ جھوٹ کیوں بولوں۔ مجھے وہ کھٹکا تو ہوا تھا۔

سُورداس۔ جب تیری سمجھ میں مَیں اتنا بُرا ہوں تو پھر مجھ سے کیوں

بولتی ہے؟ اگر وہ لاٹھی لے کر آتا اور مجھے مارنے لگتا تو تو تماشا دیکھتی اور ہنستی۔ کیوں؟ سبھے تو بھیروں ہی اچھا کہ لاٹھی پا ٹھی لے کر نہیں آیا۔ جب تو نے مجھ سے بیر ٹھان رکھا ہے تو میں تجھ سے کیوں نہ بیر ٹھانوں؟
سُبھاگی (روتی ہوئی) سُورداس تم بھی ایسا کہو گے تو یہاں کون ہے جس کی آڑ میں میں چھن بھر بھی بیٹھوں گی؟ اُس نے ابھی مارا ہے مگر پیٹ نہیں بھرا۔ کہ رہا ہے کہ جا کر تھانہ میں لکھائے دیتا ہوں میرے کپڑے لتے سب باہر پھینک دئیے ہیں۔ اس جھونپڑی کے سوا اب میرا اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔
سُورداس۔ مجھے بھی اپنے ساتھ محلہ سے نکلوائے گی کیا؟
سُبھاگی۔ تم جہاں جاؤ گے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔
سُورداس۔ تب تو تو مجھے کہیں مُنہ دکھانے لائق نہ رکھے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ اندھا اُسے بھگا کر لے گیا۔
سُبھاگی۔ تم تو بدنامی سے بچ جاؤ گے لیکن میری آبرو کیسے بچے گی؟ ہے کوئی محلہ میں ایسا جو کسی کی آبرو جاتے دیکھے تو اُس کی بانہہ پکڑ لے؟ یہاں تو ایک ٹکڑا روٹی بھی مانگوں تو نہ ملے۔ تمہارے سوا اب میرا کوئی نہیں ہے۔ پہلے میں تمہیں آدمی سمجھتی تھی۔ اب دیوتا سمجھتی ہوں۔ چاہے تو رہنے دو نہیں تو کہہ دو کہیں منہ میں کالکھ لگا کر ڈوب مروں۔
سورداس نے دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ سُبھاگی تو آپ سمجھ دار ہے۔ جیسا جی میں آئے کر۔ مجھے تیرا کھلانا پہنانا بھاری نہیں ہے۔ ابھی سہر میں اتنا مان ہے کہ جس کے دروازے پر کھڑا ہو

جاؤں وہ تاہیں نہ کرے گا۔ لیکن میرا من کہتا ہے کہ تیرے یہاں رہنے سے ہمارا کلیان نہ ہوگا۔ ہم دونوں ہی بدنام ہو جائیں گے۔ میں تجھے اپنی بہن سمجھتا ہوں لیکن اندھا سنسار تو کسی کی نیت نہیں دیکھتا ابھی تو نے دیکھا لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے رہے۔ پہلے بھی گالی اُٹھ چکی ہے۔ جب تو کھلم کھلا میرے گھر میں رہے گی تب تو انرتھ ہی ہو جائے گا۔ لوگ گردن کاٹنے پر اُوتارو ہو جائیں گے۔ بتا کیا کروں؟

سُبھاگی۔ جو چاہے کرو پر میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔

سُورداس۔ یہی تیری مرجی (مرضی) ہے تو یہی سہی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ کہیں چلا جاؤں۔ نہ آنکھوں دیکھوں گا نہ پیڑ ہوگی۔ لیکن تیری ہیپت دیکھ کر اب جانے کا من نہیں ہوتا۔ آ، پڑی رہ۔ جیسی کچھ سر پر آئے گی دیکھی جائے گی۔ تجھے منجھدار میں چھوڑ دینے سے بدنام ہونا اچھا ہے۔

یہ کہہ کر سُورداس بھیک مانگنے چلا گیا۔ سُبھاگی جھونپڑی میں آ بیٹھی۔ دیکھا تو اُس مختصر گھر کی مختصر گرہستی اِدھر اُدھر پھیلی پڑی تھی۔ کہیں لوٹیا اَوندھی پڑی تھی۔ کہیں گھڑے لڑھکے ہوئے تھے۔ مہینوں سے اندر صفائی نہ ہوئی تھی۔ زمین پر منوں گرد جمی ہوئی تھی۔ پھوس کے چھپر میں مکڑیوں نے جالے لگا لئے تھے۔ ایک چڑیا کا گھونسلا بھی بن گیا تھا۔ سُبھاگی تمام دن جھونپڑے کی صفائی کرتی رہی۔ شام کو وہی گھر جو "بن گھرنی گھر بھوت کا ڈیرا" والی کہاوت کو مجسم دکھلا رہا تھا صاف ستھرا لپا پُتا نظر آتا تھا کہ اُسے دیکھ کر رہنے کے لئے دیوتاؤں کا بھی جی للچا سکے۔ بھیرو تو اپنی دکان پر چلا گیا تھا

سُبھاگی گھر جا کر اپنی گٹھڑی اُٹھا لائی۔ سورداس شام کو واپس آیا تو سُبھاگی نے تھوڑا سا چرن اُسے جل پان (ناشتہ) کرنے کو دیا۔ لوٹیا میں پانی لاکر رکھ دیا اور اُسے آنچل سے ہوا کرنے لگی۔ سُورداس کو اپنی زندگی میں کبھی ایسا سُکھ نہ ملا تھا۔ گرہستی کے سُکھ کا اُسے پہلی مرتبہ تجربہ ہُوا دن بھر سڑک کے کنارے لُو اور لپیٹ میں جلنے کے بعد یہ سُکھ اُس کو بیکنٹھ کا سا سُکھ معلوم ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں ایک نئی تحریک سا پیدا ہو گئی۔ سوچنے لگا ـــــ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ کاش یہ میری عورت ہوتی تو زندگی کتنے مزہ سے کٹتی۔ اب تو بھیرو نے اسے گھر سے نکال ہی دیا۔ مَیں رکھ لوں تو اس میں کون سی بُرائی ہے؟ اس سے کہوں کیسے۔ نہ جانے اپنے دل میں کیا خیال کرے۔ میں اندھا ہوں تو کیا آدمی نہیں ہوں۔ بُرا تو نہ مانے گی؟ مجھ سے اسے محبت نہ ہوتی تو میری اتنی سیوا کیوں کرتی؟

کُل انسانوں کو بلکہ کُل جانداروں کو محبت کی خواہش ہوتی ہے نفس پرست لوگوں کے لئے یہ نفس پرستی کا ذریعہ ہے اور سادگی پسندوں کے لئے قلبی تسکین کا۔

سُبھاگی نے سُورداس کی پوٹلی کھولی تو اُس میں گیہوں کا آٹا نکلا۔ تھوڑے سے چاول کچھ چنے اور تین آنے کے پیسے سُبھاگی بنئے کے یہاں سے دال لائی اور روٹیاں بنا کر سورداس کو کھانے کے لئے بُلایا۔

سورداس۔ مِٹھوا کہاں ہے؟

سُبھاگی۔ کیا جانوں۔ کہیں کھیلتا ہوگا۔ دن میں ایک بار پانی پینے آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر چلا گیا۔

سُورداس۔ تجھ سے شرماتا ہوگا۔ دیکھ میں اُسے بُلائے لاتا ہوں ٭

یہ کہہ کر سُورداس باہر جاکر مٹھوا کو پُکارنے لگا۔ مٹھوا اور دن جب جی چاہتا تھا گھر میں جاکر دانہ نکال لاتا اور بھُنوا کر چباتا۔ آج سارا دن بھُوکوں مرا۔ اس وقت مندر میں پرشاد کے لالچ سے بیٹھا ہوا تھا۔ آواز سُنتے ہی دوڑا۔ دونوں کھانے بیٹھے۔ سُبھاگی نے سورداس کے سامنے چاول اور روٹیاں رکھ دیں اور مٹھوا کے سامنے صرف چاول۔ آٹا بہت کم تھا۔ صرف دو روٹیاں بن سکی تھیں ٭

سُورداس نے کہا۔ مٹھوا۔ اور روٹی لوگے؟

مٹھو۔ مجھے تو روٹی ملی ہی نہیں ٭

سُورداس۔ تو مجھ سے لے لو۔ میں چاول ہی کھالوں گا ٭

یہ کہہ کر سُورداس نے دونوں روٹیاں مٹھو کو دے دیں۔ سُبھاگی خفا ہوکر مٹھو سے بولی ـــ دن بھر سانڈ کی طرح پھرتے ہو۔ کہیں مجوری کیوں نہیں کرتے؟ اسی چکّی گھر میں کام کرو تو پانچ چھ آنے روز ملیں ٭

سُورداس۔ ابھی وہ کون کام کرنے کے لایک ہے؟ اسی عمر میں مجوری کرنے لگے گا تو کلیجہ ٹوٹ جائے گا ٭

سُبھاگی۔ مجوروں کے لڑکوں کا کلیجہ اتنا نرم نہیں ہوتا۔ سبھی تو کام کرنے جاتے ہیں۔ کسی کا کلیجہ نہیں ٹوٹتا ٭

سُورداس۔ جب اُس کا جی چاہے گا آپ کام کرے گا ٭

سُبھاگی۔ جیسے ہاتھ پیر ہلائے کھانے کو مل جاتے اس کی بلا کام کرے ٭

سُورداس۔ اُونہہ۔ مجھے کون کسی دِن دھن کا سوچ ہے۔ مانگ کر لاتا ہوں کھاتا ہوں۔ جب یہ دیکھ نہ چلے گا تب دیکھی جائے گی۔ اُس کی چنتا (فکر) ابھی سے کیوں کروں؟

سُبھاگی۔ میں اِسے کام پر بھیجوں گی۔ دیکھوں کیسے نہیں جاتا۔ یہ مُٹ مَردی ہے کہ اندھا مانگے اور آنکھوں والے مسٹنڈے بیٹھے کھائیں۔ سُنتے ہو مِٹھو۔ کل سے کام کرنا پڑے گا۔

مِٹھو۔ تیرے کہنے سے نہ جاؤں گا۔ دادا کہیں گے تو جاؤں گا۔

سُبھاگی۔ موسل کی طرح گھومنا اچھا لگتا ہے۔ اتنا نہیں سُوجھتا کہ اندھا آدمی تو مانگ کر لاتا ہے اور میں چین سے کھاتا ہوں۔ جنم بھر لڑکے ہی بنے رہو گے۔

مِٹھو۔ تجھ سے کیا مطلب؟ میرا جی چاہے گا جاؤں گا۔ نہ جی چاہے گا نہ جاؤں گا۔

اسی طرح دونوں میں دیر تک حجت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مِٹھو جھلا کر چوکے پر سے اُٹھ گیا۔ سورداس نے بہت منایا پر وہ کھانے نہ بیٹھا۔ آخر سُورداس بھی آدھا ہی پیٹ کھا کر اُٹھ گیا۔

جب وہ لیٹا تو خانہ داری کی ایک دوسری تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ یہاں نہ وہ سکون تھا نہ وہ آرام نہ وہ خوشی کی اُمنگ پہلے ہی روز یہ جھگڑا شروع ہوا۔ بسم اللہ ہی غلط ہوئی تو آگے کون جانے کیا ہوگا۔ اُسے سُبھاگی کی وہ سخت پسندی نامناسب معلوم ہوتی تھی۔ جب تک میں کمانے کو تیار رہوں لڑکے پر کیوں گرہستی کا بوجھ ڈالوں؟ جب میں مر جاؤں گا تو اُس کے سر پہ جیسی پڑے گی ویسی

جھیلے گا۔

وہ ننھا سا پودا جو ایک حقیر تمنا کی صورت میں شام کے وقت اُس کے دل میں اُگا تھا اس آگ کی لپٹ سے جل گیا۔ جل کر خاکستر ہو گیا۔

سُبھاگی کو نئی فکر سوار ہوئی۔ مٹھو کو کام پر کیسے لگاؤں؟ میں کچھ اُس کی لونڈی نہیں ہوں کہ اُس کی تھالی دھوؤں۔ اُس کا کھانا پکاؤں اور وہ مفت گست کرے۔ مجھے بھی کوئی بیٹھا کر نہ کھلائے گا۔ میں کھاؤں ہی کیوں؟ جب سب کام کریں گے تو یہ کیوں چھیلا بنا گھومے گا۔

صبح جب وہ جھونپڑی سے گھڑا لے کر پانی بھرنے نکلی تو کھیسو کی ماں نے دیکھ کر سینہ پر ہاتھ رکھ لیا اور بولی ––– کیوں ری۔ آج رات تو یہیں رہی تھی کیا؟

سُبھاگی نے کہا۔ ہاں رہی تو پھر –––

جمنی۔ اپنا گھر نہیں تھا؟

سُبھاگی۔ اب لات کھانے کا بُوتہ نہیں ہے

جمنی۔ تو تو دو چار سر کتا کر تب چین سے لے گی! اس اندھے کی بھی مت ماری گئی ہے کہ جان بوجھ کر سانپ کے مُنہ میں اُنگلی دیتا ہے۔ بھیروں گلا کاٹ لینے والا آدمی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چلی جا گھر کو!

سُبھاگی۔ اُس گھر میں تو اب پاؤں نہ رکھوں گی چاہے کوئی مار ہی ڈالے۔ سُور داس میں اتنی دیا تو ہے کہ ڈوبتے ہوئے کی بانہہ پکڑ لی اور دوسرا یہاں کون ہے؟

جمنی۔ جس گھر میں کوئی مہریا (عورت) نہیں وہاں تیرا رہنا اچھا نہیں۔

سُبھاگی۔ جانتی ہوں۔ پر کِس کے گھر جاؤں؟ تمہارے گھر آؤں۔ رہنے دو گی؟ جو کچھ کرنے کو کہو گی کر دوں گی۔ گوبر پاتھوں گی۔ بھینسوں کو گھاس چارا دوں گی۔ پانی ڈالوں گی۔ تمہارا آٹا پیسوں گی۔ رکھو گی؟

جمنی۔ نا بابا۔ یہاں کون بیٹھے بٹھائے رار (جھگڑا) مول لے۔ اپنا کھلاؤں بھی اُس پر بدُّو بھی بنوں ❊

سُبھاگی۔ تو روج گالی مار کھایا کروں؟

جمنی۔ اپنا مرد ہے۔ مارتا ہی ہے تو کیا گھر چھوڑ کر کوئی نکل جاتا ہے؟

سُبھاگی۔ کیوں بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کرتی ہو جمنا! بل گیا ہے بیل۔ جس کل چاہتی ہو بیٹھاتی ہو۔ رات دن ڈنڈا لئے سر پر سوار رہتا تو دیکھتی کہ کیسے گھر میں رہتیں۔ ابھی اُس دن دودھ میں پانی ملانے کے لئے مارنے اُٹھا تھا تو چادر لے کر میکے بھاگی جاتی تھیں۔ دوسروں کو اُپدیس کرنا سہل ہے۔ جب اپنے سر پڑتی ہے تو آنکھیں کھلتی ہیں ❊

یہ کہتی ہوئی سُبھاگی کنوئیں پر پانی بھرنے چلی گئی۔ یہاں بھی اُس نے نکتہ چینوں کو ایسا ہی اکھڑ جواب دیا۔ پانی لا کر برتن دھوئے۔ چوکا لگایا اور سورداس کو سڑک پر پہنچانے چلی گئی۔ اب تک وہ لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا اکیلے ہی چلا جایا کرتا تھا مگر سبھاگی سے یہ نہ دیکھا گیا۔ تنہا آدمی کہیں گر پڑے تو۔ لڑکے ہی دِق کرتے ہیں۔ میں بیٹھی ہی تو ہوں۔ اُس سے پھر کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ یہ رائے قائم کر لی گئی کہ سورداس نے اُسے اپنے گھر ڈال لیا۔ اب قیل و قال یا طعن تشنیع کی کہیں گنجایش نہ تھی۔ ہاں سورداس سب کی نگاہوں میں سبک ہو گیا

سورداس ... روپے نہ لوٹا دیتا تو کیا کرتا؟ ڈرتا ہوگا کہ سبھاگی سب ... سے کہہ ہی دے گی۔ میں پہلے ہی سے کیوں نہ ہوشیار رہوں ... سبھاگی کیوں اپنے گھر سے روپے اُڑا لے گئی؟ واہ اس میں ... کی کون سی بات ہے۔ بھیرو اُسے روپے پیسے نہیں دیتا ... دبڑھیا ہے۔ سوچا ہوگا کہ روپے اُڑا لوں۔ میرے پاس کچھ ہو ... ہو جائے گی۔ اپنے پاس کہاں رکھتی۔ سورداس کو بھلا آدمی سمجھ کر اس کے پاس رکھ آئی ہوگی۔ یا کون جانے دونوں میں پہلے ہی سے ساٹھ گانٹھ رہی ہو۔ سورداس نے روپے اُٹھوا لئے ہوں پھر ... ہو ... اس طرح میرا بھرم بنا رہے گا۔ اندھے پیٹ کے بڑے ... ہوتے ہیں۔ اُنہیں بڑی دور کی سوجھتی ہے۔

اس طرح کئی دنوں تک کدسے بازیاں ہوا کیں۔ مگر لوگوں کی یہ عادت ... نی کہ کسی معاملہ پر عرصہ تک رائے زنی کرتے رہیں نہ انہیں اتنی فرصت ہوتی ہے کہ اِن باتوں میں سر کھپائیں۔ نہ اتنی عقل ہی کہ ان گتھیوں کو سلجھائیں۔ انسان فطرتاً عملی ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ چھان بین کی سکت کہاں؟ سبھاگی سے بولنے چالنے اس کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے میں کسی کو اعتراض نہ رہا۔ نہ کوئی اُس سے کچھ پوچھتا اور نہ اُس پر آوازے کستا۔ ہاں سورداس کی عزت میں فرق آگیا۔ پہلے محلّہ بھر میں اُس کی دھاک تھی۔ لوگوں کو اس پر اُس کی حیثیت سے کہیں زیادہ اعتبار تھا۔ اس کا نام ادب کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ اب اُس کا شمار بھی عام آدمیوں میں ہونے لگا۔ کوئی خصوصیت نہ رہی۔

لیکن بھیرو کے دل میں یہ کانٹا ہمیشہ کھٹکتا
اس جیتی جاگتی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ دو
افسروں سے شکایت بھی ہوئی کہ یہ ٹھیکہ دار
پینے والوں کو مایوس ہو کر واپس جانا پڑتا ہے محکمہ
نے بھیرو کو نکال دینے کی دھمکی بھی دی مگر اس نے
پرواہ نہیں ہے آپ جسے چاہیں رکھ لیں۔ لیکن
پالیسی نہ ملا اور افسروں نے ایک دکان ٹوٹ جانے
کوئی سختی کرنا مناسب نہ سمجھا۔

رفتہ رفتہ بھیرو کو سورداس ہی سے نہیں بلکہ
عداوت ہو گئی۔ اس کے خیال میں محلہ والوں کا یہ فرض
پر کمر بستہ ہو جاتے اور سورداس کو کوئی ایسی سزا دیتے
یاد رکھتا۔ ایسے محلہ میں کوئی کیا رہے جہاں انص
دونوں ایک ہی بھاؤ بکیں۔ برے کام کرنے والوں سے کوئی
نہیں۔ سورداس اکڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ چڑیل آنکھوں میں کاجل
لگائے پھرا کرتی ہے۔ کوئی ان دونوں کے منہ میں کالکھ نہیں لگاتا۔
ایسے گاؤں میں تو آگ لگا دینی چاہیئے۔ مگر کسی وجہ سے اس کی عملی
قوت سست پڑ گئی تھی۔ وہ راستہ میں سبھاگی کو دیکھ لیتا تو کترا کر
نکل جاتا۔ سورداس کو دیکھتا تو ہونٹ چبا کر رہ جاتا۔ وار کرنے کی
ہمت نہ ہوتی وہ اب کبھی مندر میں بھجن گانے نہ جاتا۔ میلوں تماشوں
سے بھی اسے نفرت ہو گئی۔ نشہ کا چسکا خود بخود چھوٹ گیا۔ توہین سے
پیدا ہونے والا تیز درد دل میں برابر ہوتا رہتا۔ اس نے سوچا تھا کہ

سُبھاگی مُنہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جائے گی۔ میرے کلنک کا داغ مٹ جائے گا۔ مگر وہ ابھی تک وہاں اُس کی چھاتی پر مونگ ہی نہیں دل رہی تھی بلکہ اُسی شخص کے ساتھ عیش کر رہی تھی جو اُس کا خاص مخالف تھا۔ سب سے زیادہ رنج اُسے اس بات کا تھا کہ محلّے کے لوگ اُن دونوں کے ساتھ پہلا ہی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ نہ کوئی اُنھیں ڈانٹتا تھا نہ پھٹکارتا تھا۔ اُسے اپنی ذلّت سامنے بیٹھی مُنہ چڑھاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب اُسے گالی گلوچ سے تسکین نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اس فکر میں تھا کہ اِن دونوں کا کام تمام کر دوں۔ اس طرح ماروں کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں۔ پانی کی بوند بھی نہ ملے۔ لیکن اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑاتا پر کہیں سے مدد ملنے کی امید نظر نہ آتی۔ محلّہ ایسے چھوٹے کا کوئی آدمی نہ تھا۔ سوچتے سوچتے اُسے خیال آیا کہ اندھے نے چتاری کے راجہ صاحب کو بہت بدنام کیا تھا۔ کارخانہ والے صاحب کو بھی بدنام کرتا پھرتا تھا۔ بس اِنھیں لوگوں سے چل کر فریاد کروں۔ اندھے سے دل میں تو دونوں خار کھائے بیٹھے ہی ہوں گے۔ چھوٹے آدمی کے مُنہ لگنا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر چپ رہ گئے ہوں گے۔ میں جو سامنے کھڑا ہو جاؤں تو میری آڑ سے وہ ضرور نشانہ ماریں گے۔ بڑے آدمی ہیں۔ وہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ لیکن جو کہیں میری پہنچ ہو گئی اور اُنھوں نے میری سُن لی تو پھر ان بچّہ کی ایسی خبر لیں گے کہ سارا اندھا پن نکل جائے گا۔ (اندھے پن کے سوا وہاں اور رکھا ہی کیا تھا!)

کئی دن تک وہ اسی حیص بیص میں پڑا رہا کہ ان لوگوں کے

پاس کیسے پہنچوں۔ جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں اُلٹا مجھی کو مار بیٹھیں نکلوا دیں تو اور بھی بھدّ ہو۔ آخر ایک دن وہ دل مضبوط کر کے ساجہ صاحب کے پاس گیا۔ اور سائیس کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ سائیس نے دیکھا تو کرخت لہجہ میں بولا ــ کون ہو؟ یہاں کیا اُچکوں کی طرح جھانک رہے ہو؟

بھیرو نے نہایت عاجزی سے کہا ـــ بھیّا۔ ڈانٹو مت۔ گریب دُکھی آدمی ہوں ٭

سائیس۔ گریب دُکھی ہو تو کسی سیٹھ ساہوکار کے گھر جاتے۔ یہاں کیا رکھا ہے ٭

بھیرو۔ گریب ہوں پر بھیک منگا نہیں ہوں۔ اِجّت آبرو سبھی کی ہوتی ہے۔ تمہاری ہی برادری میں کوئی کسی کی بہو بیٹی لے کر نکل جائے تو کیا اُسے پنچایت یوں ہی چھوڑ دے گی؟ کچھ نہ کچھ ڈنڈ تو دے ہی گی۔ پنچایت نہ دے گی تو عدالت کچہری سے تو کچھ ہوگا ٭

سائیس ذات کا چمار تھا جہاں اِس قسم کے ناگوار واقعے روز ہی ہوتے رہتے ہیں اور جن کی وجہ سے برادری کو نشہ پانی کا سامان ملتا رہتا ہے۔ اس کے گھر میں روز یہی چرچا رہتی تھی اور ان باتوں سے اُسے جتنی دلچسپی تھی اُتنی اور کسی بات سے نہ ہو سکتی تھی۔ بولا۔ آؤ بیٹھو۔ چلم پیو۔ کون بھائی ہو؟

بھیرو۔ پاسی ہوں۔ یہیں پانڈے پور میں رہتا ہوں ٭

وہ سائیس کے پاس جا بیٹھا اور دونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں گویا کوئی وہاں کان لگائے اُن کی باتیں سُن رہا ہو۔ بھیرو نے

اپنی پوری بپتا سنائی اور کمر سے ایک روپیہ نکال کر سائیس کے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا — بھائی کوئی ایسی جگت نکالو کہ راجہ صاحب کے کانوں میں یہ بات پڑ جائے پھر تو میں اپنا سب حال آپ ہی کہہ لوں گا۔ تمہاری ذرا سے بولنے چالنے میں ایسا بدھو نہیں ہوں۔ درگا سے تو کبھی ڈرنا ہی نہیں ٭

سائیس تو نقرئی سکہ کے درشن نصیب ہوئے تو مگن ہو گیا کہ آج سبیرے سبیرے اچھی بوہنی ہوئی۔ بولا — "میں راجہ صاحب سے تمہاری اطلاع کئے دیتا ہوں۔ بُلا دیں تو چلے جانا۔ راجہ صاحب کو گھمنڈ تو چھو ہی نہیں گیا مگر دیکھنا بہت دیر نہ لگانا نہیں تو مالک چڑھ جائیں گے۔ بس جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہہ ڈالنا۔ بڑے آدمیوں کو بات چیت کرنے کی چھٹی نہیں رہتی۔ میری طرح تھوڑے ہی ہیں کہ دن بھر بیٹھے ہوئے گپّیں لڑایا کریں ٭

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ راجہ صاحب اس وقت حجامت بنوا رہے تھے جو اُن کا روزانہ معمول تھا۔ سائیس نے پہنچ کر سلام کیا ٭

راجہ۔ کیا کہتے ہو؟ میرے پاس طلب کے لئے مت آیا کرو ٭

سائیس۔ نہیں حجور طلب کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ جو سورداس پانڈے پور میں رہتا ہے ٭

راجہ۔ اچھا وہ بدمعاش اندھا ٭

سائیس۔ ہاں حجور وہ ایک عورت کو نکال لے گیا ہے ٭

راجہ۔ اچھا۔ اُسے تو لوگ کہتے تھے کہ بڑا بھلا آدمی ہے۔ اب یہ سوانگ رچنے لگا ٭

سائیس۔ ہاں ہجور۔ اُس عورت کا آدمی پھر یاد کرنے آیا ہے۔ حکم ہو تو لاؤں؟

راجہ صاحب نے سر ہلا کر منظوری دے دی اور ایک لمحہ میں بھیرو دبکتا ہوا سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

راجہ۔ تمہاری عورت ہے؟

بھیرو۔ ہاں ہجور ابھی کچھ دن پہلے تو میری ہی تھی۔

راجہ۔ پہلے سے کچھ آمدورفت تھی؟

بھیرو۔ ہو گی سرکار۔ مجھے معلوم نہیں۔

راجہ۔ لے کر کہاں چلا گیا؟

بھیرو۔ کہیں گیا نہیں سرکار۔ اپنے گھر میں ہے۔

راجہ۔ بڑا ڈھیٹ ہے۔ محلہ والے کچھ نہیں بولتے؟

بھیرو۔ کوئی نہیں بولتا۔ ہجور۔

راجہ۔ عورت کو مارتے بہت ہیں؟

بھیرو۔ سرکار۔ عورت سے بھول چوک ہوتی ہے تو کون نہیں مارتا؟

راجہ۔ بہت مارتے ہو کہ کم؟

بھیرو۔ ہجور گُستاخی ہے۔ بچارے کہاں رہتا ہے؟

راجہ۔ کیسی عورت ہے؟ خوب صورت؟

بھیرو۔ ہاں ہجور۔ دیکھنے سُننے میں بُری نہیں ہے۔

راجہ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خوب صورت عورت نے اندھے کو کیوں پسند کیا۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ تم نے دال میں نمک زیادہ ہو جانے پر عورت کو مار کر نکال دیا ہو اور اندھے نے اُسے رکھ لیا ہو؟

بھیرو۔ سرکار۔ عورت میرے روپے چرا کر سورداس کو دے آئی۔ سبیرے سورداس روپے لوٹا گیا۔ میں نے چکمہ دے کر پوچھا تو اُس نے چور کو بھی بتا دیا۔ اس بات پر مارتا نہ تو کیا کرتا؟

راجہ۔ اور کچھ ہو پر اندھا ہے دل کا صاف۔

بھیرو۔ ہجور نیّت کا اچھا نہیں۔

اگرچہ مہین رکمار سنگھ بہت منصف مزاج تھے اور اپنے بُرے خیالوں کو ظاہر کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جیسا کہ شہرت پسند انسان کو عموماً اپنی زبان پر پورا قابو ہوتا ہے۔ مگر وہ سورداس سے اتنے جلے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھوں اتنی ردحانی تکلیفیں اُنہیں مل چکی تھیں کہ وہ اس وقت اپنے خیالات کو پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ بولے "اجی اُس نے یہاں مجھے اتنا بدنام کیا کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ کلارک صاحب نے اُسے ذرا منہ کیا لگا لیا کہ وہ سر چڑھ گیا۔ یوں میں کسی غریب کو ستانا نہیں چاہتا مگر یہ بھی نہیں دیکھ سکتا کہ وہ بھلے آدمیوں کے بال نوچے۔ اجلاس تو میرا ہی ہے۔ تم اُس پر دعوے کر دو۔ گواہ تو مل جائیں گے نا!"

بھیرو۔ ہجور۔ سارا محلہ جانتا ہے۔

راجہ۔ سب کو پیش کرو۔ یہاں لوگ اُس کے مرید ہو گئے ہیں۔ سمجھتے ہیں یہ کوئی دیوتا ہے۔ میں اُس کی قلعی کھول دینا چاہتا ہوں۔ اتنے دنوں کے بعد یہ موقع میرے ہاتھ لگا ہے۔ میں نے اگر اب تک کسی سے بچا دیکھا تو اسی اندھے سے۔ اُس پر نہ پولیس کا زور تھا نہ عدالت کا۔ اُس کی بیکسی اور کمزوری اُس کی زرہ بکتر بنی ہوئی تھی۔ یہ مقدمہ

اُس کے لئے وہ گہرا گڑھا ہوگا جس میں سے وہ نکل نہ سکے گا۔ مجھے اُس کی جانب سے اندیشہ تھا۔ مگر ایکبار جہاں پردہ کُھلا کہ میں بیفکر ہوجاؤں گا۔ زہر کے دانت ٹوٹ جانے پر سانپ سے کون ڈرتا ہے؟ ہوسکے تو جلد ہی یہ مقدمہ دائر کردو۔

کسی بڑے آدمی کو روتے دیکھ کر ہمیں اُس سے محبت ہوجاتی ہے۔ اُسے ذی اقتدار سمجھ کر ہم تھوڑی دیر کے لئے بُھول جاتے ہیں کہ وہ بھی انسان ہے۔ ہم اُسے عام انسانی کمزوریوں سے بالا خیال کرتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے ایک حیرت کی چیز بن جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ وہ نہ جانے کیا کھاتا ہوگا۔ نہ جانے کیا پڑھتا ہوگا نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ اُس کے دل میں ہمیشہ اونچے اونچے خیالات آتے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف تو اُس کا دھیان ہی نہ جاتا ہوگا۔ اسی حیرت کی پاکیزہ شکل ہی احترام ہے۔

بھیرو کو راجہ صاحب کے سامنے جاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا تھا لیکن اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ بھی ہمیں جیسے انسان ہیں۔ گویا اُسے آج ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ ذرا بیدھڑک ہوکر بولا۔ "بجور ہے تو اندھا پر بڑا گھمنڈی ہے۔ اپنے آگے تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ محلّہ والے جبرا سُور داس سُور داس کہہ دیتے ہیں تو بس پھُول اُٹھتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہوں میں ہی ہوں۔ بجور اُس کی ایسی سنجا (سزا) کردیں کہ چکّی پیستے پیستے دن جائیں۔ تب اُس کی سیکھی (شیخی) کرکری ہوگی"۔ راجہ صاحب نے تیور بدلے۔ دیکھا کہ یہ گنوار اب زیادہ بھکنے لگا۔ بولے ـــــ اچھا اب جاؤ۔

بھیرو دل میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے راجہ صاحب کو اپنی مٹھی میں کر لیا۔ اگر اُسے چلے جانے کا حکم نہ ہوا ہوتا تو ایک لمحہ میں اُس کا ہجور۔ آپ میں بدل جاتا۔ شام تک اُس کی باتوں کا سلسلہ نہ ختم ہوتا۔ وہ نہ جانے کتنی جھوٹی باتیں گھڑتا۔ غیبت کا انسان کی زبان پر کبھی اتنا قابو نہیں چلتا جتنا بڑے لوگوں کے سامنے۔ نہ جانے کیوں ہم اُن کی نظر نوازش کے اتنے متمنّی ہوتے ہیں؟ ہم ایسے لوگوں پر بھی جن سے ہمیں ذرا بھی رنجش نہیں۔ حملے کرنے لگتے ہیں۔ کوئی غرض نہ رکھتے ہوئے ہم اُن کی نگاہوں میں رسوخ پانا چاہتے ہیں۔ ان کا اعتماد حاصل کرنے کی ہمارے دل میں ایک بے اختیارانہ تحریک ہوتی ہے۔ ہماری زبان اس وقت قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔

بھیرو یہاں سے کچھ نادم ہو کر نکلا مگر اُسے اب اس بات میں شبہ نہ تھا کہ میری مُراد پوری ہو گئی۔ گھر جا کر اُس نے بجرنگی سے کہا — تمہیں گواہی دینی پڑے گی۔ نکل نہ جانا۔

بجرنگی۔ کیسی گواہی؟

بھیرو۔ یہی میرے معاملے کی۔ اس اندھے کی ہیکڑی اب نہیں دیکھی جاتی۔ اتنے دنوں تک صبر کئے بیٹھا رہا کہ اب بھی وہ سُبھاگی کو نکال دے۔ اُس کا جہاں جی چاہے چلی جائے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جائے۔ پر دیکھتا ہوں تو دن دن اُس کی پینگ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اندھا چھیلا بنا جاتا ہے۔ جہیندوں بدن پر پانی نہیں پڑتا تھا۔ اب نت نہاتا ہے۔ وہ پانی لاتی ہے۔ اُس کی دھوتی چھانٹتی ہے۔ اس کے سر میں تیل لگاتی ہے۔ یہ اندھیر نہیں

دیکھا جاتا ۔

بجرنگی۔ اندھیر تو ہے ہی۔ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ سورداس کو اتنا چھچھورا نہ سمجھتا تھا۔ پر میں کہیں گواہی ساکھی کرنے نہ جاؤں گا۔

جمنی۔ کیوں کچہری میں کوئی تمہارے کان کاٹ لے گا؟

بجرنگی۔ اپنا من ہے۔ نہیں جاتے۔

جمنی۔ اچھا تمہارا من ہے۔ بھیرو۔ تم میری گواہی لکھا دو۔ میں چل کر گواہی دوں گی۔ سانچ کو آنچ کیا؟

بجرنگی۔ (ہنس کر) تو کچہری جائے گی؟

جمنی۔ کیا کروں گی؟ جب مردوں کی وہاں جاتے چوڑیاں میلی ہوتی ہیں تو عورتیں ہی جائیں گی۔ کسی طرح اس کمین کے منہ میں کالکھ تو لگے۔

بجرنگی۔ بھیرو بات یہ ہے کہ سورداس نے برائی جو درکی پر تم بھی تو بری راہ پر ہی چلتے تھے۔ کوئی اپنے گھر کے آدمی کو اتنی بیدردی سے نہیں مارتا۔ پھر تم نے مارا ہی نہیں۔ مار کر نکال بھی دیا۔ جب گائے کے پگہیا نہ رہے گی تو وہ دوسروں کے کھیت میں چر رہی جائے گی اس میں اس کا کیا دکھ؟

جمنی۔ تم انہیں بکنے دو بھیرو۔ میں تمہاری گواہی دوں گی۔

بجرنگی۔ تو سوچتی ہوگی۔ یہ دھمکی دینے سے میں کچہری جاؤں گا لو میں اتنا بدھو نہیں ہوں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ سورداس لاکھ برا ہو۔ مگر اب بھی ہم سبھوں سے اچھا ہے۔ روپیوں کی تھیلی لوٹا دینا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔

جمنی۔ بس چپ رہو۔ میں تمہیں کھوب جانتی ہوں۔ تم بھی جا کر چار گال ہنس بول آتے ہو نا۔ کیا اتنی یاری بھی نہ نبا ہوگے؟ سبھا گی کو سجا ہوگئی تو تمہیں بھی تو نجر (نظر) لڑانے کے لئے کوئی نہ رہے گا۔
بجرنگی یہ سن کر تلملا اٹھا (جمنی اُسے راہ پر لانا جانتی تھی) بولا ــــ منہ میں کیڑے پڑ جائیں گے۔
جمنی۔ تو پھر گواہی دینے کیوں کو رُدتی ہے؟
بجرنگی۔ لکھا دو بھیرو میرا نام۔ یہ چڑیل مجھے جینے نہ دے گی۔ میں اگر ہارنا ہوں تو اسی سے۔ میری پیٹھ میں اگر دھول لگاتی ہے تو یہی۔ نہیں تو یہاں کبھی کسی سے دب کر نہیں چلے۔ جاؤ۔ لکھا دو۔
بھیرو یہاں سے ٹھاکردین کے پاس گیا اور وہی بات کہی۔
ٹھاکردین نے کہا۔ "ہاں ہاں۔ میں گواہی دینے کو تیار ہوں۔ میرا نام سب سے پہلے لکھا دو۔ اندھے کو دیکھ کر میری تو اب آنکھیں پھوٹتی ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ جرور (ضرور) کوئی جادو جانتا ہے نہیں تو کیا سبھاگی اُس کے پیچھے یوں دوڑی دوڑی پھرتی۔"
بھیرو۔ چکی پیسیں گے تو بچا کو معلوم ہوگا۔
ٹھاکردین۔ نا بھیا۔ اُس کا اکبال بھاری ہے۔ وہ کبھی چکی نہ پیسے گا۔ وہاں سے بھی بے لاگ لوٹ آئے گا۔ ہاں گواہی دینا میرا دھرم ہے۔ وہ میں جرور کروں گا۔ جو آدمی جادو سے دوسروں کا اَن بھل کرے اُس کی گردن کاٹ لینی چاہئے۔ نہ جانے بھگوان کیوں سنسار میں چوروں اور پاپیوں کو جنم دیتے ہیں۔ یہی سمجھ لو کہ جب سے میری چوری ہوئی کبھی نیند بھر نہیں سویا۔ روج وہی چنتا بنی رہتی ہے۔ یہی کھٹکا لگا

رہتا ہے کہ کہیں پھر نہ وہی نوبت آ جائے۔ تم تو ایک حساب سے مجے (مزہ) میں رہے کہ روپے سب مل گئے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا ۔

بھیرو۔ تو تمہاری گواہی پکّی رہی ۔

ٹھاکر دین۔ ہاں ایک بار نہیں۔ سو بار پکّی۔ ارے میرا بس چلتا تو میں اسے کھود کر گاڑ دیتا۔ یوں مجھ سے سیدھا کوئی نہیں ہے۔ لیکن بدمعاشوں کے حق میں مجھ سے ٹیڑھا بھی کوئی نہیں ہے۔ ان کو ڈنڈ دلانے کے لئے میں جھوٹی گواہی بھی دینے کو تیار ہوں۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ اس اندھے کو ہو کیا گیا۔ کہاں تو دھرم کرم کا اتنا بچار اور کہاں یہ بُرا کام ۔

بھیرو یہاں سے جگدھر کے پاس گیا جو ابھی خوانچہ فروخت کر کے واپس آیا تھا اور دھوتی لئے ہوئے نہانے جا رہا تھا ۔

بھیرو۔ تم بھی میرے گواہ ہو نہ؟

جگدھر۔ تم حک ناحک (حق ناحق) بیچارے سورداس پر ما ملہ چلا رہے ہو۔ سورداس بیگناہ ہے ۔

بھیرو۔ کسم کھاؤ گے ۔

جگدھر۔ ہاں جو کسم کہو کھا جاؤں۔ تم نے سُبھاگی کو اپنے گھر سے نکال دیا سُور نے اسے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ نہیں تو اب تک وہ نہ جانے کس گھاٹ لگی ہوتی۔ جوان عورت ہے۔ سُندر ہے۔ اُسکے سینکڑوں گاہک ہیں۔ سُورداس نے تو اُس کے ساتھ نیکی کی کہ کہیں بھٹکنے نہ دیا۔ اگر تم پھر اُسے گھر میں لا کر رکھنا چاہو اور وہ اُسے نہ آنے دے تم سے لڑنے پر تیار ہو جائے تب میں کہوں گا کہ اُس کا کسور ہے۔

میں نے اپنے کانوں سے اُسے سُبھاگی کو سمجھاتے سُنا ہے۔ وہ آتی نہیں۔ تو بیچارا کیا کرے؟

بھیرو سمجھ گیا کہ یہ لوٹا جل سے آسودہ ہونے والا دیوتا نہیں ہے اِسے کچھ بھینٹ دینی پڑے گی۔ اُس کے لالچی سُبھاؤ سے وہ واقف تھا۔ بولا۔ "بھائی۔ معاملہ اِجّت کا ہے۔ ایسی اُڑن گھاٹیاں نہ بتاؤ۔ پڑوسی کا حق بہت ہوتا ہے۔ پر میں تم سے باہر نہیں ہوں۔ جو کچھ دس بیس کہو۔ حاجر ہے پر گواہی تمہیں دینی پڑے گی"۔

جگدھر۔ بھیرو۔ میں بہت نیچ ہوں لیکن اتنا نہیں کہ جان بوجھ کر کسی بھلے مانس کو بے کسُور پھنساؤں۔

بھیرو نے بگڑ کر کہا۔ "تو کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ہی نام کُھدائی (خُدائی) لکھ گئی ہے۔ جس بات کو سارا گاؤں کہے گا اُسے ایک تم نہ کہو گے تو کیا بگڑ جائے گا؟ بالی کے روکے آندھی نہیں رُک سکتی۔

جگدھر۔ تو بھائی اُسے پیس کر پی جاؤ۔ میں کب کہتا ہوں کہ میں اُسے بچاؤں گا۔ ہاں میں اُسے پیسنے میں تمہاری مدد نہ کروں گا۔

بھیرو تو اُدھر گیا اِدھر وہی خود غرض۔ لالچی۔ حاسد۔ بدمزاج جگدھر اُس کے گواہوں کے پھوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے سُورداس سے اتنی عقیدت نہیں تھی جتنا بھیرو سے حسد۔ بھیرو اگر کسی نیک کام میں بھی اُس سے مدد مانگتا تو بھی وہ اتنی ہی سرگرمی سے اُس کی مخالفت کرتا۔

اُس نے بجرنگی کے پاس جاکر کہا۔ "کیوں بجرنگی تم بھی بھیرو کی گواہی کر رہے ہو؟"

بجرنگی۔ ہاں جاتا تو ہوں ؎

جگدھر۔ تم نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا ہے؟

بجرنگی۔ کیسی باتیں کرتے ہو؟ روج ہی دیکھتا ہوں۔ کوئی بات چھپی تھوڑے ہی ہے ؎

جگدھر۔ کیا دیکھتے ہو؟ یہی نہ کہ سُبھاگی سورداس کے جھونپڑے میں رہتی ہے؟ اگر کوئی ایک اناتھ (بے کس) عورت کا پالن کرے تو کوئی بُرائی ہے؟ اندھے آدمی کے جیوٹ کی سرا ہنا تو نہ کروگے کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکا وہ اُس نے کر دکھایا۔ اُلٹا اُس سے اور بَیر کرتے ہو۔ جانتے ہو۔ سُورداس اُسے گھر سے نکال دے گا تو اُس کی کیا گت ہوگی؟ محلّہ کی آبرو ننگی گھر کے مجوروں کے ہاتھ بِکے گی۔ دیکھ لینا میرا کہنا مانو۔ گواہی ساکھی کے پھیر میں نہ پڑو۔ بھلائی کے بدلے بُرائی ہو جائے گی۔ بھیرو تو سُبھاگی سے اِس لئے جَل رہا ہے کہ اُس نے اُس کے چُرائے ہوئے روپیے سُورداس کو کیں لوٹا دئے۔ بس ساری جلن اِسی کی ہے۔ ہم بِنا جانے بُوجھے کیوں کسی کی بُرائی کریں۔ ہاں گواہی دینے ہی جاتے ہو تو پہلے کھوب پتہ لگالو کہ دونوں کیسے رہتے ہیں ؎

بجرنگی (جمنی کی طرف اشارہ کرکے) اِسی سے پوچھو۔ یہی سب کے مَن کی جانتی ہے۔ اِسی نے مجھے مجبور کیا ہے ؎

جمنی۔ ہاں کیا تو ہے۔ کیا اب بھی دل کانپ رہا ہے؟

جگدھر۔ عدالت میں جاکر گواہی دینا کیا تم نے ہنسی سمجھ لی ہے؟ گنگا جلی اُٹھانی پڑتی ہے۔ تلسی دل لینا پڑتا ہے۔ بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی سے تو بال بچے والے لوگ ڈرتے ہیں کہ آڑ کچھ ؎

جمنی۔ سچ کہو۔ یہ سب قسمیں بھی کھانی پڑتی ہیں ؟
جگدھر۔ بنا قسم کے تو گواہی لگتی ہی نہیں ۔
جمنی۔ تو بھیا۔ باج آئی ایسی گواہی سے کان پکڑتی ہوں ۔ چولھے میں جائے سورداس اور بھاڑ میں جائے بھیرو۔ کوئی بُرے دن کام نہ آئے گا۔ تم رہنے دو ۔
بجرنگی۔ سورداس کو لڑکپن سے دیکھ رہے ہیں۔ ایسی عادت تو اس میں نہیں تھی ۔
جگدھر۔ نہ تھی نہ ہے اور نہ ہوگی۔ اس کی بُرائی نہیں کرتا پر اُسے لاکھ روپیے بھی دو تو بُرائی میں ہاتھ نہ ڈالے گا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو گیا ہوا دھن پا کر چپکے سے رکھ لیتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ نہیں تو جا کر سب روپیے دے آیا۔ اس کی صفائی تو اتنے ہی سے ہو جاتی ہے ۔

بجرنگی کو چھوڑ کر جگدھر نے ٹھاکر دین کو گھیرا۔ وہ پوجا کر کے کھانا کھانے جا رہا تھا۔ بھیرو کی آواز سن کر بولا ـــــ بیٹھو، بھوجن کر کے آتا ہوں ۔
جگدھر۔ میری بات سن لو تو کھانے بیٹھو۔ کھانا کہیں بھاگا نہیں جاتا۔ تم بھی بھیرو کی گواہی دینے جا رہے ہو؟
ٹھاکر دین۔ ہاں جاتا ہوں۔ بھیرو نے نہ کہا ہوتا تو آپ ہی جاتا۔ مجھ سے یہ ربنیت (بُرا کام) نہیں دیکھا جاتا۔ جمانا دوسرا ہے نہیں تو ابی ہوتی تو ایسے آدمی کا سر کاٹ لیا جاتا۔ کسی کی بہو بیٹی کو نکال لے جانا کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے ؟

جگدھر۔ جانا پڑتا ہے۔ دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے تم بھی انتر جامی (عالم الغیب) ہو گئے ہو۔ پوچھتا ہوں۔ کس بات کی گواہی دو گے؟
ٹھاکر دین۔ کوئی لکی چھپی بات ہے۔ سارا دیس تو جانتا ہے۔
جگدھر۔ سوروداس بڑا گبرو جوان ہے۔ اسی سے سُناری کا مَن اُس پر لوٹ پوٹ ہو گیا ہو گا۔ یا اُس کے گھر میں روپے پیسے گہنے جیور کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اسی سے عورت لالچ میں پڑ گئی ہو گی۔ بھگوان کو دیکھا نہیں پر اکل سے تو پہچانا ہے۔ آہ کیا دیکھ کر سُبھاگی نے بھیرو کو چھوڑ دیا اور سُور کے گھر پڑ گئی؟
ٹھاکر دین۔ کوئی کسی کے مَن کی بات کیا جانے اور عورت کے من کی بات تو بھگوان بھی نہیں جانتے۔ اُس سے دیوتا لوگ تک تراہ تراہ کرتے ہیں (پناہ مانگتے ہیں)
جگدھر۔ اچھا تو جاؤ پر کہے دیتا ہوں کہ اس کا پھل بھوگنا پڑے گا۔ کسی گریب پر جھوٹھا اپرادھ لگانے سے بڑا دوسرا پاپ نہیں ہوتا۔
ٹھاکر دین۔ جھوٹھا اپرادھ ہے؟
جگدھر۔ جھوٹا ہے سراسر جھوٹا۔ رتی بھر بھی سچ نہیں۔ بے بس کی دہائی پڑے گی کہ عمر بھر یاد کرو گے۔ جو آدمی اپنا گیا ہوا دھن پاکر لوٹا دے وہ اتنا نیچ نہیں ہو سکتا۔
ٹھاکر دین۔ (ہنس کر) یہی تو اندھے کی چالاکی ہے۔ کیسی دُور کی سُوجھی ہے کہ جو سُنے چکر میں آجائے۔
جگدھر۔ مَیں نے جتا دیا۔ آگے تم جانو تمہارا کام جانے۔ رکھو گے سُبھاگی کو اپنے گھر میں؟ میں اُسے سور کے گھر سے لوائے لاتا ہوں۔ اگر پھر کبھی

سُورداس کو اُس سے باتیں کرتے دیکھنا تو جو چاہنا وہ کرنا۔ بولو۔ رکھو گے؟

ٹھاکردین۔ میں کیوں رکھنے لگا؟

جگدھر۔ تو اگر بھادو جی نے سنسار بھر کا بِس (زہر) ماتھے چڑھا لیا تو کیا بُرا کیا؟ جس کے لئے کہیں ٹھکانا نہیں تھا اُسے سُورداس نے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اِس نیکی کی اُسے یہ سچا ملنی چاہئے؟ یہی نیائے ہے؟ اگر تم لوگوں کے دباؤ میں پڑکر سُورداس نے سُبھاگی کو گھر سے نکال دیا اور اُس کی آبرو بگڑی تو اُس کا پاپ تمہارے سر بھی پڑے گا۔ یہ خُوب یاد رکھنا۔

ٹھاکردین شکی اور ڈرپوک تھا پس و پیش میں پڑ گیا۔ جگدھر نے یہ بات تاڑ لی۔ اسی ڈھنگ کی دو چار باتیں اَور کیں۔ آخر ٹھاکردین گواہی دینے سے انکار کرنے لگا۔ جگدھر کا حسد کسی سادھو کی نصیحت کا کام کر گیا۔ شام ہوتے ہوتے بھیرو کو معلوم ہو گیا کہ محلّہ میں کوئی گواہ نہ ملے گا۔ دانت پیس کر رہ گیا۔ چراغ جل رہے تھے۔ بازار کی اور دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔ تاڑی کی دوکان کھولنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ گاہک جمع ہوتے جا رہے تھے۔ بڑھیا گزک کے لئے مٹر کی دال موٹ اور چرپھری پکوڑیاں بنا رہی تھی اور بھیرو دروازہ پر بیٹھا ہوا جگدھر کو محلّہ والوں کو اور ساری دُنیا کو صلواتیں سُنا رہا تھا۔ سب کے سب نامردے ہیں۔ آنکھ کے اندھے۔ جبھی تو یہ دُردسا ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں سُوکھا کیوں پڑتا ہے۔ پلیگ کیوں آتی ہے۔ ہیضہ کیوں پھیلتا ہے؟ جہاں ایسے ایسے بے ایمان۔ پاپی۔ دُشٹ۔

بسیں گے وہاں اَور ہو گا ہی کیا؟ بھگوان اِس دیس کو گارت کیوں
نہیں کر دیتے۔ یہی اچرج (تعجب) ہے۔ خیر۔ جنگا نی ہے تو ہم اور
جگدھر اسی جگہ رہتے ہیں۔ دیکھی جائے گی ؛
غصہ کے جوش میں اپنی نیکیاں بہت یاد آتی ہیں۔ بھیرو اُن
احسانات کا بیان کرنے لگا۔ جو اُس نے جگدھر پر کئے تھے ــــــ
اس کی گھر والی مر رہی تھی۔ کسی نے بتا دیا کہ تاجی تاڑی پئے تو بچ جائے
مُنہ اندھیرے پیڑ پر چڑھتا تھا اور تاجی تاڑی اُتار کر اُسے پلاتا
تھا۔ کوئی پانچ روپے بھی دیتا تو اُتنے تڑکے پیڑ پر نہ چڑھتا۔ ٹکوں
تاڑی پلا دی ہو گی۔ تمبا کو پینا ہوتا ہے تو یہیں آتا ہے۔ روپے پیسے کا
کام لگتا ہے تو میں ہی کام آتا ہوں۔ اور میرے ساتھ یہ گھاٹ! جمانا ہی
ایسا ہے ؛
جگدھر کا گھر ہلا ہوا تھا۔ یہ سب سُن رہا تھا اور مُنہ نہ کھولتا تھا۔ وہ
سامنے سے وار کرنے میں نہیں۔ پیچھے سے وار کرنے میں طاق تھا ؛
اتنے میں مِل کا ایک مستری نیم آستین پہنے کوئلے کی بھبھوت
لگائے اور کوئلہ ہی کا سا رنگ۔ ہاتھ میں ہتھوڑا لئے چمرودھا جوتہ
ڈاٹے۔ آکر بولا ــــــ چلتے ہو دوکان پر کہ اسی جھنجھٹ میں پڑے
رہو گے؟ دیر ہو رہی ہے۔ ابھی صاحب کے بنگلہ پر جانا ہے ؛
بھیرو۔ اجی جاؤ۔ تمہیں دوکان کی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں ایسا جی جل رہا
ہے کہ گاؤں میں آگ لگا دوں ؛
مستری۔ کیا ہے کیا؟ کس بات پر بگڑ رہے ہو؟ میں بھی تو سنوں ؛
بھیرو نے مختصراً ساری داستان سُنا دی اور گاؤں والوں کی بُزدلی

اور کمینہ پن کا دُکھڑا رونے لگا ؛

مستری۔ گائیں والوں کو مارو گولی۔ تمہیں کتنے گواہ چاہئے۔ جتنے گواہ کہو دے دوں۔ ایک۔ دو۔ دس۔ بیس۔ بھلے آدمی۔ پہلے ہی کیوں نہ کہا؟ آج ہی ٹھیک ٹھاک کئے دیتا ہوں۔ بس سبھوں کو بھر پیٹ پلا دینا؟

بھیرو کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا ـــ تاڑی کی کون بات ہے۔ دوکان تمہاری ہی ہے۔ جتنی چاہو پیو پر جرا معتبر گواہ دلانا ؛

مستری۔ اجی کہو تو بابو لوگوں کو حاضر کر دوں۔ بس ایسی پلا دینا کہ سب یہیں سے گرتے پڑتے گھر پہنچیں ؛

بھیرو۔ اجی کہو تو اتنی پلا دوں کہ دو چار لاشیں اُٹھ جائیں ؛

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں دوکان پر پہنچے۔ وہاں بیس پچیس آدمی جو اسی کارخانہ کے ملازم تھے۔ بڑے شوق سے بھیرو کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بھیرو نے تو پہنچتے ہی تاڑی ناپنی شروع کی اور ادھر مستری نے گواہوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ سرگوشیاں ہونے لگیں ؛

ایک۔ موقع اچھا ہے۔ اندھے کے گھر سے نکل کر جائے گی کہاں؟ بھیرو اب اُسے نہ رکھے گا ؛

دوسرا۔ آخر ہمارے دل بہلاؤ کا بھی تو کوئی سامان ہونا چاہئے ؛

تیسرا۔ بھگوان نے آپ ہی بھیج دیا۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ؛

ادھر تو یہ مشورے ہو رہے تھے۔ اُدھر سُبھاگی سُور داس سے کہہ رہی تھی ـــ "تمہارے اوپر دعوے ہو رہا ہے"۔ سُور داس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیسا دعوے"؟

سبھاگی۔ مجھے بھگالانے کا۔ گواہ ٹھیک کٹے جا رہے ہیں۔ گاؤں کا تو کوئی آدمی نہیں ملا لیکن پُتلی گھر کے بہت سے مجورے تیار ہیں۔ مجھ سے ابھی جگدھر کہہ رہے تھے کہ پہلے گاؤں کے سب آدمی گواہی دینے جا رہے تھے ⁂

سُور داس۔ پھر رُک کیسے گئے؟

سبھاگی۔ جگدھر نے سب کو سمجھا بُجھا کر روک لیا ⁂

سُورداس۔ جگدھر بڑا بھلا مانس ہے۔ مجھ پر بڑی مہربانی کرتا رہتا ہے ⁂

سُبھاگی۔ تو اب کیا ہوگا؟

سُور داس۔ دعوے کرنے دو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تو یہی کہہ دینا کہ مَیں بھیرو کے ساتھ نہ رہوں گی۔ کوئی جرح پوچھے تو تو صاف صاف کہہ دینا کہ مجھے بہت مارتا ہے ⁂

سُبھاگی۔ مگر اِس میں تمہاری کتنی بدنامی ہوگی ⁂

سُور داس۔ بدنامی کی چنتا نہیں۔ جب تک وہ تجھے رکھنے کو راجی نہ ہوگا میں تجھے جانے ہی نہ دوں گا ⁂

سُبھاگی۔ وہ راجی بھی ہوگا تو اُس کے گھر نہ جاؤں گی۔ وہ دل کا بڑا کھوٹا آدمی ہے۔ اُس کی کسر جرور نکالے گا۔ تمہارے گھر سے بھی چلی جاؤنگی ⁂

سُور داس۔ میرے گھر سے کیوں چلی جائے گی؟ میں تو تجھے نہیں نکالتا ⁂

سُبھاگی۔ میرے کارن تمہاری کتنی جگ ہنسائی ہوگی۔ محلّہ والوں کا تو مجھے کوئی ڈر نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ کسی کو تمہارے اوپر سبھا (شبہ) نہ ہوگا۔ اور ہوگا بھی تو چھن بھر میں دور ہو جائے گا۔ لیکن یہ پُتلی گھر کے اوچڈ مجورے تمہیں کیا جانیں۔ بھیرو کے یہاں سب کے سب تاڑی

پیتے ہیں۔ وہ اُنہیں ملا کر تمہاری آبرو بگاڑ دے گا۔ میں یہاں نہ رہوں گی تو اُس کا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ بس کی گانٹھ تو میں ہی ہوں ✤

سُورداس۔ جائے گی کہاں؟

سبھاگی۔ جہاں اُس کے مُنہ میں کالکھ لگا سکوں۔ جہاں اُس کی چھاتی پر مونگ دل سکوں ✤

سُورداس۔ اُس کے مُنہ میں کالکھ لگے گی تو میرے مُنہ میں پہلے ہی نہ لگ جائے گی۔ تو میری بہن ہی تو ہے ✤

سُبھاگی۔ نہیں۔ مَیں تمہاری کوئی نہیں ہوں۔ مجھے بہن بیٹی نہ بناؤ ✤

سُورداس۔ میں کہے دیتا ہوں کہ اس گھر سے نہ جانا ✤

سُبھاگی۔ میں اب تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں بدنام نہ کروں گی ✤

سُورداس۔ مجھے بدنامی قبول ہے لیکن جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ تو کہاں جائے گی تب تک میں تجھے جانے ہی نہ دوں گا ✤

بھیرو نے رات تو کسی طرح کاٹی۔ علے الصباح کچہری دوڑا۔ وہاں ابھی دروازے بند تھے۔ مہتر جھاڑو لگا رہے تھے۔ پس وہ ایک درخت کے نیچے دھیان لگا کر بیٹھ گیا۔ نو بجے سے عملے بستے بغل میں دبائے ہوئے آنے لگے اور بھیرو دوڑ دوڑ کر اُنہیں سلام کرنے لگا۔ گیارہ بجے راجہ صاحب اجلاس پر تشریف لائے۔ اور بھیرو نے محرر سے لکھا کر اپنا استغاثہ دائر کر دیا۔ شام کو گھر واپس آیا تو پھیرنے لگا۔ اب دیکھتا ہوں۔ کون مائی کا لال اُن کی مدد کرتا ہے۔ دونوں کے مُنہ میں کالکھ لگوا کر یہاں سے نکال نہ دیا تو اپنے باپ کا نہیں ✤

پانچویں دن سُورداس اور سُبھاگی کے نام سمن آ گیا۔ تاریخ پڑ گئی

جیوں جیوں پیشی کا دن نزدیک آتا جاتا تھا سبھاگی کے ہوش اُڑے جاتے تھے۔ وہ بار بار سُورداس سے اُلجھتی۔ تمہیں یہ سب کرا رہے ہو۔ اپنی مٹی خراب کر رہے ہو اور اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ رہے ہو۔ مجھے چلا جانے دیا ہوتا تو کوئی تم سے کیوں بیر ٹھانتا۔ وہاں بھری کچہری میں جانا سب کے سامنے کھڑی ہونا مجھے زہر ہی سا لگ رہا ہے۔ میں اُس کا مُنہ نہ دیکھوں گی چاہے عدالت مجھے مار ہی ڈالے۔

آخر کار پیشی کی مقررہ تاریخ آ گئی۔ محلہ میں اس مقدمہ کی اتنی دھوم تھی کہ لوگوں نے اپنے اپنے کام بند کر دئے اور عدالت میں جا پہنچے۔ مل کے مزدور سینکڑوں کی تعداد میں گئے۔ شہر میں سُورداس کو کتنے ہی لوگ جان گئے تھے۔ اُن کی رائے میں سُورداس بے گناہ تھا۔ ہزاروں آدمی تماشا دیکھنے کی غرض سے عدالت میں کٹہرے پر پہنچ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ رانی اندو اور اندردت بھی مقدمہ پیش ہوتے ہوتے آ پہنچے۔ عدالت میں یوں ہی کیا کم بھیڑ رہتی ہے اور پھر یہاں عورت کا آنا تو منڈوے میں دولھن کا آنا ہے۔ عدالت میں ایک بازار سا لگا ہوا تھا۔ اجلاس پر دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تو چتاری کے راجہ صاحب۔ دوسرے ایک مسلمان جنہوں نے یورپ کی جنگ عظیم میں رنگروٹ بھرتی کرنے میں سعی مشکور کی تھی۔ بھیرو کی طرف سے ایک وکیل بھی تھا۔

بھیرو کا بیان ہوا۔ گواہوں کا بیان ہوا۔ پھر وکیل نے دعویٰ کی تائید میں اُن سے اپنی مرضی کے موافق سوالات کئے۔ زاں بعد

سُورداس کا بیان ہُوا۔ اُس نے کہا۔ میرے ساتھ اِدھر کچھ دنوں سے بھیرو کی گھروالی رہتی ہے۔ میں کسی کو کیا کھلاؤں پلاؤں گا۔ کھلانے پلانے والا بھگوان ہے۔ وہ میرے گھر میں رہتی ہے۔ اگر بھیرو اُسے رکھنا چاہے اور وہ رہے تو آج ہی چلی جائے۔ یہی تو میں چاہتا ہوں اسی لئے میں نے اُسے اپنے یہاں رکھا ہے نہیں تو نہ جانے کہاں ہوتی ✤

بھیرو کے وکیل نے مسکرا کر کہا۔ سُورداس تم بڑے فیاض معلوم ہوتے ہو لیکن نوجوان اور خوب صورت عورتوں کے ساتھ اکثر ایسی فیاضیاں کی جاتی ہیں ✤

سُورداس۔ اِسی سے نہ یہ معاملہ چلا ہے۔ میں نے کوئی بُرائی نہیں کی۔ ہاں دنیا جو چاہے سمجھے۔ میں تو بھگوان کو جانتا ہوں۔ وہی سب کی کھری کھوٹی کا پرکھنے والا ہے۔ اگر بھیرو اُسے اپنے گھر نہ رکھے گا اور نہ سرکار ہی کوئی ایسی جگہ بتا دے گی۔ جہاں یہ عورت عزت آبرو کے ساتھ رہ سکے تو میں اُسے اپنے گھر سے نکلنے نہ دوں گا۔ وہ نکلنا بھی چاہے گی تو نہ جانے دوں گا۔ اس نے تو جب سے اس محلہ کی خبر سنی ہے۔ یہی کہا کرتی ہے کہ مجھے جانے دو پر میں اُسے جانے نہیں دیتا ✤

وکیل۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں نے اُسے رکھ لیا ہے؟

سُورداس۔ ہاں رکھ لیا ہے۔ جیسے بھائی اپنی بہن کو رکھ لیتا ہے۔ یا باپ اپنی بیٹی کو رکھ لیتا ہے۔ اگر سرکار نے اُسے جبر جستی میرے گھر سے نکال دیا تو اُس کی آبرو کی جواب دہی اُسی کے سر ہوگی

سُبھاگی کا بیان ہوا۔ بھیرو مجھے بیکسور مارتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ نہ رہوں گی۔ سُور داس بھلا آدمی ہے اس لئے اُس کے ساتھ رہتی ہوں۔ بھیرو یہ نہیں دیکھ سکتا۔ سُور داس کے گھر سے مجھے نکالنا چاہتا ہے ❖

وکیل۔ تو پہلے بھی سُور داس کے گھر آتی جاتی تھی ؟

سُبھاگی۔ جبھی اپنے گھر مار کھاتی تھی تبھی جان بچا کر اُس کے گھر بھاگ جاتی تھی۔ وہ میرے آڑے آجاتا تھا۔ میرے کارن اُس کے گھر میں آگ لگی۔ اُس پر مار پڑی۔ اُس کی کون کون سی درگت نہیں ہوئی۔ عدالت کی کسر تھی وہ بھی پوری ہو گئی ❖

راجہ۔ بھیرو تم اپنی عورت کو رکھو گے ؟

بھیرو۔ ہاں سرکار۔ رکھوں گا ❖

راجہ۔ مارو گے تو نہیں ؟

بھیرو۔ بُری چال نہ چلے گی تو کیوں ماروں گا ❖

راجہ۔ سُبھاگی تو اپنے آدمی کے گھر کیوں نہیں جاتی ؟ وہ تو کہتا ہے نہ ماروں گا ❖

سُبھاگی۔ اُس پر مجھے بسواس نہیں ہے۔ آج ہی مار مار کر بے حال کر دے گا ❖

وکیل۔ حضور معاملہ صاف ہے۔ اب مزید ثبوت کی ضرورت نہیں رہی سُور داس پر جرم ثابت ہو گیا ❖

عدالت نے فیصلہ سُنا دیا۔ سُور داس پر دو سو روپیہ جُرمانہ ادا جُرمانہ نہ ادا کرنے پر چھ ماہ کی قید سخت۔ سُبھاگی پر سو روپیہ جُرمانہ

عرض ہے کہ کیا آپ بھی مجھے اپرادھی (مجرم) سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کو بسواس ہو گیا کہ میں نے سبھاگی کو بہکایا اور اسے اپنی عورت بنا کر رکھے ہوئے ہوں؟ اگر آپ کو بسواس ہو گیا ہے تو میں اسی میدان میں سر جھکا کر بیٹھتا ہوں۔ آپ سب لوگ مجھے پانچ پانچ لات ماریں۔ اگر میں لات کھاتے کھاتے مر بھی جاؤں تو مجھے دکھ نہ ہوگا۔ ایسے پاپی کا یہی ڈنڈ ہے۔ کیا اسے کیا ہوگا؟ اور اگر آپ کی سمجھ میں میں بے قصور ہوں تو پکار کر کہہ دیجئے کہ ہم تجھے بے قصور سمجھتے ہیں۔ پھر میں کڑی سے کڑی کیسہ بھی ہنس کر کاٹ دوں گا۔

عدالت کے کمرہ میں سناٹا چھا گیا۔ راجہ صاحب۔ وکیل۔ عملے۔ تماشائی لوگ سب کے سب متحیر ہو گئے۔ کسی کو ہوش نہ رہا کہ اس وقت کیا کرنا چاہئے۔ سپاہی درجنوں تھے مگر بُت بنے کھڑے تھے۔ معاملہ نے ایک عجیب صورت اختیار کر لی تھی۔ جس کی عدالت کی تاریخ میں کوئی نظیر نہ تھی۔ دشمن نے ایسا چھپا ہوا وار کیا تھا کہ مخالف فوج کا تجویز شدہ پروگرام القط ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے راجہ صاحب سنبھلے۔ حکم دیا۔ اسے باہر لے جاؤ۔ سپاہیوں نے دونوں طرفوں کو گھیر لیا اور عدالت کے باہر لے چلے چلے۔ ہزاروں تماشائی پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔

کچھ دور چل کر سوجان داس زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔ میں پنچوں کا حکم سن کر ہی آگے بڑھوں گا!

عدالت کے باہر عدالت کی توہین کا خوف نہ تھا۔ کئی ہزار لوگوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا۔ تم بے قصور ہو۔ ہم سب تمہیں بے قصور

سمجھتے ہیں ؞
آندردت - عدالت بے ایمان ہے !
کئی ہزار آوازوں نے مکرّر کہا - ہاں عدالت بے ایمان ہے !
اندردت - عدالت نہیں ہے - غریبوں کی قربان گاہ ہے !
کئی ہزار گلوں سے ایک گونج پیدا ہوئی - امیروں کے ہاتھ میں ظلم کا آلہ ہے ؞
سپاہیوں نے دیکھا کہ ہر لحہ بھیڑ بڑھتی جاتی ہے اور لوگ مشتعل ہوتے جاتے ہیں - تو اُنھوں نے لپک کر ایک بگھی والے کو پکڑا اور ہر دو ملزمین کو اُس میں بٹھا کر روانہ ہوگئے - لوگوں نے کچھ دور تک تو گاڑی کا پیچھا کیا - اُس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے ؞
اِدھر بھیرو اپنے گواہوں کے ساتھ گھر چلا تو راستہ میں عدالت کے اردلی نے گھیرا - اُسے دو روپیے نکال کر دئے - دوکان میں پہنچتے ہی مٹکے کھل گئے اور تاڑی کا دور چلنے لگا - بڑھیا پکوڑیاں اور پکانے لگی ؞
ایک بولا - بھیرو - یہ بات ٹھیک نہیں - تم بھی بیٹھو - پیو اور پلاؤ - ہم تم برابر کر بیٹھیں ؞
دوسرا - آج اتنی پیوں گا کہ چاہے یہیں ڈھیر ہو جاؤں - بھیرو یہ کلھڑ بھر بھر کر کیا دیتے ہو - ہانڈی ہی بڑھا دو ؞
بھیرو - اجی مٹکے میں منہ ڈال دو - ہانڈی کلھڑ کی کیا بساط ہے ! آج مدعی کا سر نیچا ہوا ہے ؞
تیسرا - دونوں حراست میں پڑے رو رہے ہوں گے - مگر بھئی سُوردا س

کو سچا ہو گئی تو کیا وہ ہے بے کسور ۔

بھیرو ۔ آ گئے تم بھی اُس کے دھوکے میں ۔ اِسی سوانگ کی تو وہ روٹی کھاتا ہے ۔ دیکھو بات کی بات میں کیسا ہجاروں آدمیوں کا مَن پھیر دیا ۔

چوتھا ۔ اُسے کسی دیوتا کا اشٹ ہے ۔

بھیرو ۔ اشٹ تو تب ۔ جب جانیں کہ جیل سے نکل آئے ۔

پہلا ۔ میں بِد کر کہتا ہوں ۔ وہ کل جیل در جیل سے نکل آئے گا ۔

دوسرا ۔ بڑھیا ۔ پکوڑیاں لا !

تیسرا ۔ اب بہت نہ پی ۔ نہیں تو مَر جائے گا ۔ ہے کوئی گھر میں سُننے والا ؟

چوتھا ۔ کچھ گانا ہو ۔ اُتارو ڈھول مجیرا ۔

سب نے ڈھول مجیرا سنبھالا اور کھڑے ہو کر گانے لگے ۔

"چھتیسی کیا نینا چمکاوے" ۔

تھوڑی دیر میں ایک بڈھا مستری اُٹھ کر ناچنے لگا ۔ بڑھیا سے اب نہ رہا گیا ۔ اُس نے بھی گھونگھٹ نکال لیا اور ناچنے لگی ۔ نیچ ذاتوں میں گانا اور ناچنا عادت میں داخل ہے ۔ سیکھنے کی ضرورت نہیں بڈھا اور بڑھیا دونوں خوش طریقہ پر کر ہلا کر تھرکنے لگے ۔ اُن کے اعضاء کی لچک تعجب انگیز تھی ۔

بھیرو ۔ محلّے والے سمجھتے تھے کہ مجھے گواہ ہی نہ ملیں گے ۔

ایک ۔ سب گیدڑ ہیں گیدڑ ۔

بھیرو ۔ چلو ۔ ذرا سبھوں کے منہ میں کالکھ لگا آئیں ۔

سب کے سب چلّا اُٹھے ۔ ہاں ہاں ۔ ناچ ہوتا چلے

ایک لمحہ میں جلوس چلا۔ سب کے سب ناچتے گاتے ڈھول بجا
اناپ شناپ بکتے۔ سہو حق کرتے لڑکھڑاتے ہوئے روانہ ہوئے۔ پہلے
بجرنگی کا گھر ملا۔ یہاں سب رُک گئے اور سب نے یوں گایا۔

"گوالن کی گیا ہرانی تب دودھ میں ڈالے پانی"

رات زیادہ جا چکی تھی۔ بجرنگی کے دروازے بند تھے۔ لوگ یہاں سے
ٹھاکر دین کے دروازہ پر گئے۔ پھر سب نے گایا۔

"تمولن کے نیتار سیلے یاد دن سے نجر ملاوے"

ٹھاکر دین کھانا کھا رہا تھا مگر خوف کے مارے باہر نہ نکلا۔ جلوس
آگے بڑھا تو سورداس کی جھونپڑی ملی۔ بھیرو بولا۔ بس یہیں ڈٹ
جاؤ۔

"ڈھول ڈھیلی پڑ گئی"

"سینکو سینکو۔ جھونپڑے میں سے پھوس لے لو"

ایک آدمی نے تھوڑا سا پھوس نکالا۔ دوسرے نے اور زیادہ
نکالا۔ تیسرے نے ایک بوجھ کھینچ لیا۔ پھر کیا تھا۔ نشہ کی ترنگ مشہور
ہے۔ ایک نے جلتا ہوا پھوس جھونپڑی میں ڈال دیا اور بولا "ہولی
ہے ہولی ہے" کئی آدمیوں نے کہا "ہولی ہے۔ ہولی ہے!"
بھیرو۔ یارو۔ یہ تم لوگوں نے بُرا کیا۔ بھاگ چلو نہیں تو دھر لئے
جاؤ گے۔

خوف نشہ میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سب کے سب رفو
چکر ہو گئے۔

ادھر آگ زیادہ تیز ہوئی تو محلے کے لوگ دوڑ پڑے۔ لیکن پھوس

کی آگ کس کے بس کی تھی۔ جھونپڑا جل رہا تھا اور لوگ کھڑے ہوئے رنج اور غصّہ سے یوں باتیں کر رہے تھے :۔

ٹھاکر دین۔ میں تو جوجن پر بیٹھا تبھی سبھوں کو آتے دیکھا ؛

بجرنگی۔ ایسا جی چاہتا ہے کہ جاکر بھیرو کو مارتے مارتے بیدم کر دوں ؛

جگدھر۔ جب تک ایک دفعہ اچھّی طرح مار نہ کھا جائے گا اس کے سر سے بھوت نہ اُترے گا ؛

بجرنگی۔ ہاں اب یہی ہوگا۔ گھسوا۔ جرا لاٹھی تو نکال لا۔ آج دو چار کھون ہو جائیں گے۔ تبھی یہ آگ بجھے گی ؛

جمنی۔ تمہیں کیا پڑی ہے۔ چل کر لیٹو۔ جو جیسا کرے گا۔ ویسا پھل آپ بھگوان سے پا دے گا ؛

بجرنگی۔ بھگوان چاہے پھل دیں یا نہ دیں پر میں تو اب نہیں مانتا۔ جیسے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے ؛

جگدھر۔ آگ لگنے کی بات ہی ہے۔ ایسے پاپی کا تو سر کاٹ لینا بھی پاپ نہیں ہے ؛

ٹھاکر دین۔ جگدھر آگ پر تیل چھڑکنا اچھّی بات نہیں ہے۔ اگر تم کو بھیرو سے بَیر ہے تو آپ جا کر اُسے کیوں نہیں للکارتے۔ دوسروں کو کیوں اُکساتے ہو۔ یہی چاہتے ہو کہ یہ دونوں لڑیں مریں اور میں تماسا دیکھوں۔ ہو بڑے نیچ ؛

جگدھر۔ اگر کوئی بات کہنا اُکسانا ہے تو لو چُپ رہوں گا ؛

ٹھاکر دین۔ ہاں چُپ رہنا ہی اچھّا ہے۔ تم بھی جا کر سوؤ۔ بجرنگی! بھگوان آپ پاپی کو ڈنڈ دیں گے۔ اُنھوں نے تو راون جیسے پرتاپی راجہ

کونہ چھوٹا۔ یہ کس کھیت کی مولی ہے؟ یہ اندھیر اُن سے بھی نہ دیکھا جائے گا۔

بجرنگی۔ مارے گھمنڈ کے پاگل ہو گیا ہے۔ چلو جگدھر جما اِن سبوں سے دو دو باتیں کر لیں۔

جگدھر۔ نا بھیا۔ مجھے ساتھ نہ لے جاؤ۔ کون جانے۔ وہاں مارپیٹ ہو جائے تو سارا انجام میرے سر جائے کہ اِسی نے لڑا دیا۔ میں تو آپ جھگڑے سے کوسوں دور رہتا ہوں۔

اتنے میں مٹھوا دوڑا ہوا آیا۔ بجرنگی نے پوچھا۔ کہاں سویا تھا رے؟

مٹھو۔ پنڈا جی کے دالان میں تو۔ ارے یہ تو میری جھونپڑی جل رہی ہے! کس نے آگ لگائی؟

ٹھاکردین۔ اتنی دیر میں جاگے ہو۔ سُن نہیں رہے ہو۔ گانا بجانا ہو رہا ہے۔

مٹھو۔ بھیرو نے لگائی ہے کیا؟ اچھا بچّا۔ سمجھوں گا۔

جب لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ گئے تو مٹھو آہستہ آہستہ بھیرو کی دوکان کی طرف گیا۔ محفل برخاست ہو چکی تھی۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جاڑے کی رات۔ پتّا تک نہ کھڑکتا تھا۔ دوکان کے دروازہ پر اوپلے جل رہے تھے۔ تاڑی خانوں میں آگ کبھی نہیں بجھتی۔ پارسی مجاور بھی اتنی خبرداری سے آگ کی حفاظت نہ کرتا ہوگا۔ مٹھو نے ایک جلتا ہوا اوپلا اُٹھایا اور دوکان کے چھپّر پر پھینک دیا۔ چھپّر میں آگ لگ گئی تو مٹھو بگ ٹُٹ بھاگا اور پنڈا جی کے دالان میں

مُنہ ڈھانپ کر سو رہا گویا اُسے کچھ خبر ہی نہیں۔ ذرا دیر میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ سارا محلّہ روشن ہوگیا۔ چڑیاں درختوں پر سے اُڑ اُڑ کر بھاگنے لگیں۔ پیڑوں کی ڈالیاں ہلنے لگیں۔ تالاب کا پانی سنہرا ہوگیا۔ اور بانسوں کی گانٹھیں زور زور سے چٹکنے لگیں۔ نصف گھنٹہ تک لنکا واہ کا تماشا ہوتا رہا مگر وہاں اس کا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ دوکان آبادی سے فاصلہ پر تھی۔ بھیرو نشہ میں بیخبر پڑا تھا۔ بڑھیا ناچتے ناچتے تھک گئی تھی۔ اور کون تھا جو اس وقت آگ بجھانے جاتا۔ آگ نے بلا کسی روک ٹوک کے اپنا کام ختم کیا۔ مٹکے ٹوٹ گئے۔ تاڑی بہہ گئی۔ جب ذرا آگ ٹھنڈی ہوئی تو کئی کتّوں نے جا کر اپنا ڈیرا جمایا۔

علی الصباح بھیرو اُٹھا تو دوکان سامنے نظر آئی۔ دوکان اور اُس کے گھر کے درمیان میں دو فرلانگ کا فاصلہ تھا مگر کوئی درخت نہ ہونے کے سبب دوکان صاف نظر آتی تھی۔ اُس کو تعجب ہُوا کہ دوکان کہاں گئی۔ ذرا اور آگے بڑھا تو راکھ کا ڈھیر دکھائی دیا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دوڑا۔ دوکان میں تاڑی کے علاوہ بکری کے روپے بھی تھے۔ ڈھول مجیرا بھی وہیں رکھا تھا۔ ہر چیز جل کر خاک ہوگئی محلّہ والے اُدھر تالاب میں منہ ہاتھ دھونے جایا کرتے تھے۔ سب آ پہنچے۔ دوکان سڑک پر تھی۔ راہ گیر بھی کھڑے ہوگئے۔ میلا لگ گیا۔ بھیرو نے رو کر کہا۔ میں تو مٹّی میں مل گیا۔

ٹھاکر دین۔ بھگوان کی لیلا ہے۔ اُدھر وہ تماشا دکھایا۔ اِدھر یہ تماشا دکھایا۔ دھنیہ ہو مہاراج!

بجرنگی۔ کسی مستری کی سرارت ہوگی۔ کیوں بھیرو کسی سے عداوت تو نہیں تھی؟

بھیرو۔ عداوت تو سارے محلّے سے ہے۔ کس سے نہیں ہے؟ مَیں جانتا ہوں جس کی یہ بدماسی ہے۔ بندھوا نہ دیا تو کہنا۔ ابھی ایک کو لیا ہے اب دوسرے کی باری ہے ❖

جگدھر دور ہی سے لطف اُٹھا رہا تھا۔ نزدیک نہ آیا کہ کہیں بھیرو کچھ کہہ نہ بیٹھے تو بات بڑھ جائے۔ ایسی دلی مسرت اُسے اپنی زندگی میں کبھی نہ نصیب ہوئی تھی ❖

اتنے میں مل کے کئی مزدور آ گئے۔ کالا مستری بولا۔ بھائی کوئی مانے یا نہ مانے میں تو یہی کہوں گا کہ اندھے کو کسی کا اِشٹ ہے ❖

ٹھاکر دین۔ اشٹ کیوں نہیں ہے۔ میں برابر یہی کہتا آتا ہوں۔ اُس سے جس نے بَیر ٹھانا اُس نے نیچا دیکھا ❖

بھیرو۔ اُس کے اِشٹ کو میں جانتا ہوں۔ جرا تھانہ دار آ جائیں تو بتا دوں کون اِشٹ ہے ❖

بجرنگی۔ جل کر بولا۔ اپنی بیر کیسی سُوجھ رہی ہے۔ کیا وہ جھونپڑا نہ تھا جس میں پہلے آگ لگی۔ اینٹ کا جواب پتھر ملتا ہی ہے۔ جو کسی کے لئے گڑھا کھودے گا اُس کے لئے کنواں تیار ہے۔ کیا اُس جھونپڑے میں آگ لگاتے وقت سمجھے تھے کہ سورداس کا کوئی ہے ہی نہیں؟

بھیرو۔ اُس کے جھونپڑے میں مَیں نے آگ لگائی؟

بجرنگی۔ اور کس نے لگائی؟

بھیرو۔ جھوٹے ہو ❖

ٹھاکر دین۔ کیوں بیٹے چوری کرتے ہو؟ تم نے لگائی یا تمہارے کسی یار نے لگائی۔ ایک ہی بات ہے۔ بھگوان نے اُس کا بدلہ چکا دیا تو روتے کیوں ہو؟

بھیرو۔ سب کسی سے سمجھوں گا۔

ٹھاکر دین۔ یہاں کوئی تمہارا دَبَیل نہیں ہے۔

بھیرو ہونٹ چباتا ہوا چلا گیا۔ انسانی فطرت کتنی پیچیدہ ہے۔ ہم دوسروں کا نقصان کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتے مگر دوسروں کے ہاتھوں ہمیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو ہمارا خون اُبلنے لگتا ہے۔

(۳۲)

سُورداس کے مقدمہ کا فیصلہ سننے کے بعد اندردت چلے تو راستے میں پربھوسیوک سے ملاقات ہو گئی۔ باتیں ہونے لگیں۔

اندردت۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ سُورداس بے قصور ہے یا نہیں؟

پربھوسیوک۔ بالکل بے قصور ہے۔ میں تو آج اُس کی پاک نفسی کا قایل ہو گیا۔ فیصلہ سُنانے کے وقت تک مجھے یقین تھا کہ اندھے نے ضرور اس عورت کو بہکایا ہے مگر اُس کے آخری الفاظ نے جادو کا سا کام کیا۔ میرا ارادہ ہے کہ اُس کے متعلق ایک نظم لکھوں۔

اندردت۔ صرف نظم لکھ ڈالنے سے کام نہ چلے گا۔ راجہ صاحب کو زک دینی ہو گی۔ اُنہیں اس بات سے مطمئن نہ ہونے دینا چاہئے کہ مَیں نے اندھے سے جکّی پسوائی۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ اندھا روپے کہاں سے لائے گا۔ دو دنوں پر تین سو روپیہ جرمانہ ہوا ہے۔ ہمیں کسی طرح جرمانہ آج ہی ادا کر دینا چاہئے۔ سُورداس جیل سے نکلے تو سارے

شہر میں اُس کا جلوس نکالنا چاہئے۔ اُس کے لئے دو سو کی اور ضرورت ہوگی۔ کُل پانچ سو ہوں تو کام چل جائے گا۔ بولو۔ کیا دیتے ہو؟

پربھو سیوک۔ جو مناسب سمجھو۔ لکھ لو۔

اندر دت۔ تم پچاس روپے بغیر کسی دِقّت کے دے سکتے ہو۔

پربھو سیوک۔ اور تم نے اپنے نام کتنا لکھا ہے؟

اندر دت۔ میری حیثیت دس روپے سے زیادہ دینے کی نہیں۔ رانی جاہنوی سے سو روپے لے لوں گا۔ کنور صاحب زیادہ نہیں تو دس بیس ہی دے دیں گے۔ جو کچھ بھی کمی رہ جائے گی وہ دوسروں سے مانگ کر پوری کر لی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر گنگولی سب روپے خود ہی دے دیں۔ کسی سے کچھ مانگنا ہی نہ پڑے۔

پربھو سیوک۔ سُورداس کے محلّے والوں سے بھی کچھ مل جائے گا۔

اندر دت۔ اُسے سارا شہر جانتا ہے۔ اُس کے نام پر دو چار ہزار روپے مل سکتے ہیں مگر اس چھوٹی سی رقم کے لئے میں کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آگے بڑھے کہ دفعتاً اندو اپنی فٹن پر آتی ہوئی دکھائی دی۔ اندر دت کو دیکھ کر رک گئی اور بولی۔ تم کب لوٹے؟ میرے یہاں نہیں آئے۔

اندر دت۔ آپ آسمان پر ہیں۔ میں زمین پر ہوں۔ کیا باتیں ہوں؟

اندو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔

اندر دت فٹن پر جا بیٹھا۔ پربھو سیوک نے جیب سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور چپکے سے اندر دت کے ہاتھ میں رکھ کر

کلب کو چل دئے ؎

اندر۔ اپنے دوستوں سے بھی کہنا ؎

پربھو سیوک۔ نہیں بھئی میں اس کام کا نہیں ہوں۔ مجھے مانگنا نہیں آتا۔ کوئی دیتا بھی ہوگا تو میری صورت دیکھ کر مٹھی بند کرے گا ؎

اندردت (اندو سے) آج تو یہاں خوب تماشا ہوا ؎

اندو۔ مجھے تو ناٹک کا سا لطف آیا۔ سورداس کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟

اندر۔ مجھے تو وہ سادہ سچا اور صاف دل معلوم ہوتا ہے ؎

اندو۔ بس بس۔ یہی میرا بھی خیال ہے۔ میں سمجھتی ہوں اُس کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ فیصلہ سناتے وقت تک میں اُسے قصوروار سمجھتی تھی مگر اس کی اپیل نے میرے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی۔ میں اب تک اُسے مکار۔ فریبی۔ رنگا ہوا سیار سمجھتی تھی۔ ان دنوں اُس نے ہم لوگوں کو کتنا بدنام کیا۔ جبھی سے مجھے اُس سے نفرت ہوگئی تھی۔ میں اُسے مزہ چکھانا چاہتی تھی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ میں نے اُس کا چال چلن سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ اپنی دُھن کا پکا نڈر سیدھا لوث اور سچا آدمی ہے۔ کسی سے دبنا نہیں جانتا ؎

اندردت۔ تو اِس ہمدردی کا کچھ عملی اظہار بھی کیجئے گا۔ ہم لوگ آپس میں چندہ کر کے جرمانہ ادا کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ بھی اِس کارِ خیر میں مدد دیں گی؟

اندو نے مسکرا کر کہا۔ میں زبانی ہمدردی کا اظہار ہی کافی سمجھتی ہوں ؎

اندر دت۔ آپ ایسا کریں گی تو میرا یہ خیال پختہ ہو جائے گا کہ ہمارے رئیسوں میں اخلاقی جُرأت نہیں ہے۔ ہمارے روساء ہر ایک جا و بیجا کام میں حُکام کی مدد کرتے رہتے ہیں اسی لئے عوام کا اُن پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ وہ اُنہیں اپنا دوست نہیں دشمن سمجھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا شمار بھی اُنہیں روساء میں ہو۔ کم از کم میں نے آپ کو اب تک اُن روساء سے الگ سمجھا ہے ؛

اندو نے متانت سے کہا۔ اندر دت۔ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں اس کا سبب تمہیں معلوم ہے۔ راجہ صاحب سُنیں گے تو اُنہیں کتنا رنج ہو گا۔ میں اُن سے چھپا کر کوئی کام نہیں کرنا چاہتی ؛

اندر دت۔ راجہ صاحب سے اس بارہ میں مجھ سے ابھی گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اُن کے خیالات بھی ہمارے خیالات ہی کے مشابہہ ہوں گے۔ اُنہوں نے اُس وقت قانونی فیصلہ کیا ہے۔ سچا فیصلہ تو اُن کے دل نے کیا ہو گا۔ شاید اُن کی طرح عدالت کی کُرسی پر بیٹھ کر میں بھی وہی فیصلہ کرتا جو اُنہوں نے کیا۔ لیکن وہ میرے دل کا فیصلہ نہیں بلکہ صرف قانون کا فیصلہ ہوتا۔ مجھے اُن سے اتنی بے تکلفی نہیں ہے ورنہ اُن سے بھی کچھ نہ کچھ لے ہی لیتا۔ اُن کے لئے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا ؛

اندو۔ ممکن ہے۔ راجہ صاحب کے متعلق تمہارا قیاس درست ہو۔ میں آج اُن سے دریافت کروں گی ؛

اندر دت۔ دریافت کیجئے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اتنی آسانی سے نہ کُھلیں گے ؛

اندو۔ تمہیں اندیشہ ہے اور مجھے یقین ہے۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ ہمارے دلی جذبات مشابہہ حالتوں میں مشابہہ ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو انتظار کی تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ یہ لیجئے۔ یہ میرا ناچیز ہدیہ ہے۔
یہ کہہ کر اندو نے ایک ساورن نکال کر اندردت کو دے دیا۔

اندردت۔ اسے لیتے ہوئے مجھے اندیشہ ہوتا ہے۔

اندو۔ کس بات کا۔

اندردت۔ کہ کہیں راجہ صاحب کے خیالات کچھ اور ہی ہوں۔

اندو نے غرور سے سر اونچا کرکے کہا۔ "اس کی کچھ پرواہ نہیں"۔

اندردت۔ ہاں آپ نے اس وقت رانیوں کی سی بات کہی۔ یہ ساورن سورداس کی اخلاقی فتح کا نشان ہے۔ آپ کا دلی شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ ابھی بہت چکر لگانا ہے۔ جرمانے کے علاوہ اور جو کچھ مل جائے اسے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔

اندردت اتر کر جانا ہی چاہتے تھے کہ اندو نے جیب سے دوسرا ساورن نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ یہ لو۔ شاید اس سے تمہارے چکر میں کچھ کمی ہو جائے۔

اندردت نے ساورن جیب میں رکھا اور خوش خوش روانہ ہوئے۔ لیکن اندو کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اسے خیال آیا کہ کہیں راجہ صاحب واقعی سورداس کو قصوروار سمجھتے ہوں تو مجھے ضرور آڑے ہاتھوں لیں گے۔ خیر ہوگا۔ میں اتنا دبنا بھی نہیں چاہتی۔ میرا کام ہے اچھے کاموں میں اُن سے دبنا۔ اگر وہ بدنیتی سے رعایا پر ظلم کرنے لگیں تو مجھے اُن سے اختلاف کرنے کا پورا حق ہے۔ بُرے کاموں میں دبنا تو انسان

کے درجہ سے گر جاتا ہے - مَیں پہلے انسان ہوں اور پیچھے بیوی - ماں - بہن یا بیٹی ✣

آندو انہیں خیالات میں محو تھی کہ مسٹر جان سیوک معہ مسز سیوک کے مل گئے - جان سیوک نے ٹوپ اُتارا - مسز سیوک بولیں - ہم لوگ تو آپ ہی کی طرف جا رہے تھے - اِدھر کئی روز سے ملاقات نہ ہوئی تھی - جی لگا ہوا تھا - اچھا ہوا - راستہ ہی میں مِل گئیں ✣

اندو - جی نہیں - میں راستہ میں نہیں ملی - یہ دیکھئے جاتی ہوں - آپ جہاں جاتی ہوں وہاں جائیے ✣

جان سیوک - میں تو ہمیشہ (COMPROMISE) (سمجھوتہ) پسند کرتا ہوں - یہ آگے پارک ہے - آج بینڈ بھی ہوگا - بس وہیں جا بیٹھیں

اندو - یہ آپ کے (COMPROMISE) کمپرومائز غیر جانبدارانہ نہیں ہے لیکن خیر ✣

پارک میں تینوں آدمی اُترے اور کرسیوں پر جا بیٹھے - آندو نے پُوچھا - صوفیا کا کوئی خط آیا تھا ؟

مسز سیوک - میں نے تو سمجھ لیا کہ وہ مر گئی - مسٹر کلارک جیسا آدمی اُسے نہ ملے گا - جب تک یہاں رہی جیل حوالہ کرتی رہی - وہاں جا کر باغیوں سے مل بیٹھی - نہ جانے اُس کی تقدیر میں کیا ہے - کلارک سے رشتہ نہ قائم ہونے کا غم مجھے ہمیشہ رُلاتا رہے گا ✣

جان سیوک - میں تم سے ہزار بار کہہ چکا وہ کسی سے شادی نہ کریگی - وہ زن و شوئی کی زندگی کے لئے بنائی ہی نہیں گئی - وہ معیار پسند ہے اور معیار پسند ہمیشہ خوشی کے خواب ہی دیکھا کرتا ہے - اُسے خوشی

ملتی نہیں۔ اگر وہ کبھی شادی کرے گی بھی تو کنور ونے سنگھ سے ۔

مسز سیوک۔ تم میرے سامنے کنور ونے سنگھ کا نام نہ لیا کرو۔ معاف کیجئے گا رانی اندو مجھے ایسی بیجوڑ شادیاں کبھی پسند نہیں ۔

جان سیوک۔ ایسی بیجوڑ شادیاں کبھی کبھی ہو ہی جاتی ہیں ۔

مسز سیوک۔ میں تم سے کہے دیتی ہوں اور رانی اندو آپ گواہ رہئے گا۔ کہ صوفیا کی شادی کبھی ونے سنگھ سے نہ ہوگی ۔

جان سیوک۔ آپ کا اس معاملہ میں کیا خیال ہے۔ رانی اندو؟ دل کی بات کہئے گا ۔

اندو۔ میں خیال کرتی ہوں کہ لیڈی سیوک کا قیاس صحیح ہے۔ ونے کو صوفیا سے کتنی ہی محبّت ہو مگر وہ ماتاجی کی اتنی دل شکنی نہ کرینگے ماتاجی جیسی دکھی عورت آج دنیا میں نہ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ انہیں زندگی میں اب کوئی اُمید ہی نہیں رہی۔ گم شم رہتی ہے۔ اگر کسی نے بھول کر بھی ونے کا تذکرہ چھیڑ دیا تو غصّہ سے اُن کے تیور ون پر بل پڑ جاتے ہیں۔ اپنے کمرہ سے ونے کی تصویر الگ کرا دی ہے اُن کے کمرہ کا دروازہ بھی بند کر دیا ہے۔ نہ کبھی آپ اُس میں جاتی ہے نہ اور کسی کو جانے دیتی ہے۔ اور مس صوفیا کا نام لینا تو انہیں چٹکی کاٹ لینے کے برابر ہے۔ پتاجی کو بھی اب رضا کاروں کی جماعت سے کوئی محبّت نہیں رہی۔ قومی کاموں سے اُنہیں کچھ نفرت سی ہو گئی ہے آہا۔ آج بہت اچھی ساعت گھر سے چلی تھی۔ وہ ڈاکٹر گنگولی چلے آ رہے ہیں۔ کہئے ڈاکٹر صاحب شملہ سے کب لوٹے ؟

گنگولی۔ سردی پڑنے لگی۔ اب وہاں سے سب کوئی کا کوچ ہو گیا ہم

تو ابھی آپ کی ماتا جی کے پاس گیا تھا۔ کنور رونے سنگھ کے حال پر اُن کو بڑا دُکھ ہے ؎

جان سیلوک۔ اب کے تو آپ نے کونسل میں دھوم مچا دی ؎

گنگو لی۔ ہاں۔ اگر وہاں تقریر کرنا۔ سوالات کرنا۔ بحث کرنا کام ہے۔ تو آپ ہمارا جتنی بڑائی کرنا چاہتا ہے کرے۔ پر میں تو اُسے کام نہیں سمجھتا۔ یہ تو پانی پیٹنا ہے۔ کام اُس کو کہنا چاہئے جس سے دیس اور جاتی کا اُپکار ہو۔ ایسا تو ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ ہمارا تو اب وہاں جی نہیں لگتا۔ پہلے تو سب آدمی ایک نہیں ہوتا اور کبھی ہو بھی گیا تو گورنمنٹ ہمارا تجویز خارج کر دیتا ہے۔ ہمارا محنت کھراب ہو جاتا ہے۔ یہ تو لڑکوں کا کھیل ہے۔ ہم کو نئے قانون سے بڑا اُمید تھا۔ پر تین چار سال اس کا کام کرکے دیکھ لیا کہ اُس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم جہاں تب تھا وہیں اب بھی ہے۔ ملٹری کا کھرچ بڑھتا جاتا ہے اُس پر کوئی عذر کرے تو سرکار بولتا ہے۔ آپ کو ایسا بات نہیں کہنا چاہئے۔ بجٹ بنانے لگتا ہے تو ہر ایک (Item) (رقم) میں دو چار لاکھ بیادہ رکھ دیتا ہے جو کونسل میں سب پاس نہ دیتا ہے تو ہمارا بات رکھنے کے لئے وہی پھالتو روپیہ نکال دیتا ہے۔ ہم۔ کھوسی سے پھول جاتا ہے۔ ہم جیت گیا ہم جیت گیا۔ پوچھو تم کیا جیت گیا؟ تم کیا جیتنے گا؟ تمہارے پاس جیتنے کا سادھن (ذریعہ) ہی نہیں ہے۔ تم کیسے جیت سکتا ہے؟ کبھی ہمارے بہت بل دینے پر کفایت کیا جاتا ہے تو ہمارے ہی بھائیوں کا نقصان ہوتا ہے جیسے اب کی ہم نے پولیس کی مد میں پانچ لاکھ کاٹ دیا۔ مگر یہ کمی بجٹ

بڑے حاکموں کے بھتّے یا طلب میں نہیں کیا گیا۔ بچارہ چوکی دار، کانسٹبل تھانہ دار کا طلب گھٹا سنے گا۔ جگہ توڑے گا۔ اس سے اب کپھایت کا بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ اس سے ہمارے ہی بھائیوں کا گردن کٹتا ہے۔ سارا کونسل جور دیتا رہا کہ بنگال کے باڑھ کے ستائے ہوئے آدمیوں کی مدد کو بیس [illegible] منجور کیا جائے۔ سارا کونسل کہتا رہا کہ کلارک کا اودسے پورسے بدلی کر دیا جائے۔ پر سرکار نے نہیں مانا۔ کونسل کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک پتّی تک نہیں توڑ سکتا۔ جو آدمی کونسل کو بنا سکتا ہے وہی اُس کو بگاڑ بھی سکتا ہے۔ بھگوان جلاتا ہے تو بھگوان ہی مارتا ہے۔ کونسل کو سرکار بناتا ہے اور وہ سرکار کی مٹھی میں ہے۔ جب دیس کے لوگ کونسل بنا دیں گے تب اُس سے دیس کا کلیان (بھلائی) ہوگا۔ یہ سب جانتا ہے پر کچھ نہ کرنے سے تو کچھ کرتے رہنا اچھا ہے۔ مرنا بھی مرنا ہے اور کھاٹ پر پڑے رہنا بھی مرتا ہے لیکن ایک حالت میں کوئی اُمید نہیں رہتا۔ دوسری حالت میں کچھ اُمید رہتا ہے۔ بس اتنا ہی پھرک ہے اور کچھ نہیں۔

اندو نے چھیڑ کر پوچھا۔ جب آپ جانتے ہیں کہ وہاں جانا بیفائدہ ہے تو کیوں جاتے ہیں؟ کیا آپ باہر رہ کر کچھ نہیں کر سکتے؟

گنگولی۔ (ہنس کر) وہی تو بات ہے اندو رانی۔ ہم کھاٹ پر پڑا ہے ہل نہیں سکتا۔ بات نہیں کر سکتا۔ کھا نہیں سکتا۔ لیکن بابا جمراج کو دیکھ کر ہم تو اُٹھ بھاگے گا۔ رو ئے گا کہ جمراج کچھ دن اور رہنے دو۔ ہمارا جندگانی کونسل میں بیت گیا۔ اب ہم کو کوئی دوسرا راستہ نہیں دکھائی دیتا۔

اندو۔ میں تو ایسی زندگی سے مر جانا بہتر سمجھوں۔ کم سے کم یہ تو اُمید ہوگی کہ شاید آگے والی زندگی اِس سے اچھی ہو ٭

گنگولی۔ (ہنس کر) ہم کو کوئی کہہ دے کہ مر کر تم پھر اسی دیس میں آئے گا اور پھر کونسل میں جا سکے گا تو ہم جمراج سے بولے گا۔ بابا جلدی کر۔ اِپَر ایسا تو کہتا نہیں ٭

جان سیوک۔ میرا ارادہ ہے کہ نئے چناؤ میں ایوان تجارت کی طرف سے کھڑا ہو جاؤں ٭

گنگولی۔ آپ کس پارٹی میں رہے گا؟

جان سیوک۔ میری نہ تو کوئی پارٹی ہے اور نہ ہوگی۔ میں اسی ارادہ اور مقصد سے جاؤں گا کہ مُلکی تجارت کی حفاظت کر سکوں۔ میں کوشش کروں گا کہ غیر مُلکی اشیاء پر بھاری ٹیکس عاید کیا جائے۔ اس طریقہ پر کام کئے بغیر ہماری تجارت کو کبھی فروغ نہ ہوگا ٭

گنگولی۔ انگلینڈ کو کیا کرے گا؟

جان سیوک۔ اُس کے ساتھ بھی غیر ملکوں کا سا برتاؤ ہونا چاہئے۔ میں تجارتی غلامی کا سخت مخالف ہوں ٭

گنگولی (گھڑی دیکھ کر) بہت اچھا بات ہے۔ آپ کھڑا ہو۔ ابھی ہم کو یہاں سے اکیلا جانا پڑتا ہے۔ تب دو آدمی ساتھ ساتھ جائے گا۔ اچھا اب جاتا ہے۔ کئی لوگوں سے ملنا ہے ٭

ڈاکٹر گنگولی کے بعد جان سیوک نے بھی گھر کی راہ لی ٭

اندو مکان پر پہنچی تو راجہ صاحب بولے۔ تم کہاں رہ گئیں؟

اندو۔ راستہ میں ڈاکٹر گنگولی اور مسٹر جان سیوک مل گئے۔ باتیں ہونے

لگیں ۔

مہیندر۔ گنگولی کو ساتھ کیوں نہ لائیں؟

اندو۔ جلدی میں تھے۔ آج تو اس اندھے نے کمال کر دیا۔

مہیندر۔ ایک ہی مکار ہے۔ جو اُس کے مزاج سے واقف نہ ہوگا۔ ضرور دھوکے میں آ گیا ہوگا۔ اپنی بیگناہی کا اعلان کرنے کے لئے اِس سے بڑھ کر اَور کوئی طریقہ دھیان ہی میں نہیں آ سکتا۔ اسے معجزہ کہنا چاہئے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ انسانی فطرت سے خوب واقف ہے۔ اَن پڑھ ہو کر بھی آج اُس نے کتنے ہی پڑھے لکھے لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ یہاں لوگ اُس کا جرمانہ ادا کر دینے کے لئے جمع کر رہے ہیں سُنا ہے جلوس بھی نکالنا چاہتے ہیں۔ مگر میرا تو یقین واثق ہے کہ اُس نے اس عورت کو بہکایا اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے زیادہ سخت سزا کیوں نہ دی۔

اندو۔ تو آپ نے چندہ بھی نہ دیا ہوگا؟

مہیندر۔ کبھی کبھی تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ چندہ کیسے دیتا؟ اپنے منہ میں آپ طمانچہ مارتا؟

اندو۔ لیکن میں نے تو دیا ہے۔ مجھے......

مہیندر۔ اگر تم نے دیا ہے تو بُرا کیا ہے۔

اندو۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ......

مہیندر۔ فضول باتیں نہ بناؤ۔ اپنا نام پوشیدہ رکھنے کو تو کہہ دیا ہے؟

اندو۔ نہیں میں نے کچھ نہیں کہا۔

مہیندر۔ تو تم سے زیادہ بیوقوف آدمی دُنیا میں نہ ہوگا۔ تم نے

اندر دت کو روپیے دئے ہوں گے۔ اندر دت یوں تو بہت ہی منکسر مزاج اور غریب دوست نوجوان ہے اور میں اُس کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ لیکن اس موقع پر دوسروں سے چندہ وصول کرنے کے لئے وہ تمہارا نام تمثیلاً پیش کرتا پھرے گا۔ ذرا دل میں سوچو۔ لوگ کیا سمجھیں گے ؟ افسوس ! اگر میں اس وقت دیوار سے سر نہیں ٹکرا لیتا تو سمجھ لو کہ بڑے ضبط سے کام لے رہا ہوں۔ تمہارے ہاتھوں مجھے ہمیشہ ذلت ہی ملی اور تمہارا یہ کام تو میرے ماتھے پر کلنک کا وہ نشان ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتا ۔

یہ کہہ کر مہیندر کمار مایوس ہو کر کرسی پر لیٹ گئے اور چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ اُنہوں نے دیوار سے سر ٹکرانے میں چاہے انتہائی ضبط سے کام لیا ہو یا نہ لیا ہو مگر اندو نے اپنے دلی جذبات کے دبانے میں انتہائی ضبط سے ضرور کام لیا۔ جی میں آتا تھا۔ کہہ دوں کہ میں آپ کی غلام نہیں ہوں۔ مجھے یہ بات ممکن ہی نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی ایسا انسان بھی ہو سکتا ہے جس کے دل پر ایسی دردناک اپیل کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ اُس نے چاہا کہ کمرہ سے چلی جاؤں اور بیدرد قسمت کو جس نے میرے سکون میں خلل ڈالنے کا اجارہ سا لے لیا ہے۔ پیروں تلے کچل ڈالوں اور دکھا دوں کہ ضبط و تحمل سے قسمت کے سخت ترین حملوں کی مدافعت کی جا سکتی ہے۔ لیکن جوں وہ دروازہ کی طرف چلی۔ مہیندر کمار پھر تن کر بیٹھ گئے اور بولے۔ جاتی کہاں ہو ؟ کیا میری صورت سے بھی نفرت ہو گئی ؟ میں تم سے بہت صفائی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم

اتنی خود رائی سے کیوں کام کرتی ہو؟ میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ جن باتوں کا تعلق مجھ سے ہو۔ وہ مجھ سے پوچھے بغیر نہ کیا کریں۔ ہاں اپنے ذاتی معاملوں میں تم خود مختار رہو۔ مگر تمہارے اوپر میری منت وسماجت کا کوئی اثر کیوں نہیں ہوتا؟ کیا تم نے قسم کھالی ہے کہ مجھے بدنام کرکے میری عزّت کو خاک میں ملاکر میرے وقار کو پیروں سے کچل کر جبھی دم لوگی؟

اندو نے گڑگڑا کر کہا۔ ایشور کے لئے اس وقت مجھے کچھ کہنے پر مجبور نہ کیجئے۔ مجھ سے غلطی ہوئی یا نہیں۔ اُس پر میں کچھ بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں مانے لیتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی اور ضرور ہوئی۔ میں اُس کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اب بھی آپ کی طبیعت نہ آسودہ ہوئی ہو تو لیجئے۔ بیٹھی جاتی ہوں۔ آپ جتنی دیر تک اور جو کچھ جی چاہے کہیں۔ مَیں سر نہ اُٹھاؤں گی؛

مگر غصّہ نہایت بیدرد ہوتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرا ایک ایک لفظ نشانہ پر بیٹھتا ہے یا نہیں۔ وہ خاموشی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اُس کی طاقت لامحدود ہے۔ ایسا کوئی مہلک سے مہلک ہتھیار نہیں ہے جس سے بڑھ کر مہلک ہتھیار اس کے اسلحہ خانہ میں نہ ہوں۔ لیکن خاموشی وہ منتر ہے جس کے آگے اُس کی تمام طاقت زائل ہوجاتی ہے۔ خاموشی اس کے لئے ناقابل فتح ہے؛

مہیندر نے کمار چڑ کر بولے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے بکواس کا روگ ہوگیا ہے اور کبھی کبھی اُس کا دورہ ہوجایا کرتا ہے!

اندو۔ یہ آپ خود کہتے ہیں؛

اندو سے غلطی ہوئی کہ وہ اپنی بات کو نبھا نہ سکی۔ غصہ کو ایک تازیانہ اور ملا۔ مہیندر نے آنکھیں نکال کر کہا۔ یہ میں نہیں کہتا۔ تم کہتی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ میں تم سے تحقیق کرنے کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ تم کیوں بار بار وہی کام کرتی ہو جن سے میری بدنامی اور تضحیک ہو۔ میری عزت آبرو خاک میں مل جائے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لایق نہ رہوں؟ میں جانتا ہوں تم ضد سے ایسا نہیں کرتیں۔ میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ تم میری مرضی کے مطابق چلنے کی کوشش بھی کرتی ہو۔ لیکن پھر جو یہ سہو ہو جاتا ہے اُس کا کیا سبب ہے؟ کیا یہ بات تو نہیں کہ اگلے جنم میں ہم اور تم ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ یا تقدیر نے میری تمام آرزوؤں اور حوصلوں کو برباد کرنے کے لئے تمہیں میرے دامن سے وابستہ کر دیا ہو؟ میں اکثر اسی سوچ میں پڑا رہتا ہوں۔ پر بھید نہیں کھلتا۔

اندو۔ مجھے علمِ غیب جاننے کا تو دعویٰ نہیں۔ ہاں اگر آپ کی مرضی ہو تو میں جا کر اندر دت کو تاکید کر دوں کہ میرا نام ظاہر ہونے نہ پائے۔

مہیندر۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو! تمہیں یہ سوچنا چاہئے تھا کہ یہ چندہ کس نیت سے جمع کیا جا رہا ہے۔ اُس کا مقصد ہے میرے انصاف کی تحقیر کرنا۔ میری نیکنامی کی جڑ کھودنا۔ اگر میں اپنے ملازم کو سخت سُست کہوں اور تم اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرو تو میں اُس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا ہوں کہ تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو۔ چندہ تو خیر ہوگا ہی۔ مجھے اُس کے روکنے کا اختیار نہیں ہے۔ جب تمہارے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے تو دوسروں کا کیا کہنا۔ لیکن میں جلدی کبھی

نہ نکلنے دوں گا۔ میں اُسے اپنے حکم سے بند کر دوں گا۔ اور اگر لوگوں کو زیادہ آمادہ دیکھوں گا تو فوجی امداد لینے میں بھی دریغ نہ کروں گا۔

اندو۔ آپ جو چاہیں کریں۔ مجھ سے یہ سب باتیں کیوں کہتے ہیں؟

مہیندر۔ تم سے اس لئے کہتا ہوں کہ تم بھی اس انارتھ کے عقیدتمندوں میں ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تم نے اس سے گرومنتر لینے کا ارادہ نہیں کر لیا ہے؟ آخر ریدا اس بھگت کے چیلے اونچی ذاتوں میں بھی تو ہیں۔

اندو۔ میں گرومنتر کو نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتی اور شاید کبھی وہ منتر نہ لوں گی۔ مگر ہاں۔ آپ چاہے جتنا بُرا سمجھیں مگر بدقسمتی سے مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ سورداس بے قصور ہے۔ اگر یہی اُس سے عقیدت کرنا ہے تو میں ضرور عقیدتمند ہوں۔

مہیندر۔ تم کل جلوس میں نہ جاؤ گی؟

اندو۔ جانا تو چاہتی تھی۔ پر اب آپ کی خاطر سے نہ جاؤں گی۔ اپنے سر پر ہمیشہ ننگی تلوار لٹکتے نہیں دیکھ سکتی۔

مہیندر۔ اچھی بات ہے۔ اس کے لئے میں تمہارا بیحد ممنون ہوں۔

اندو اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ گئی۔ وہ بہت آزردہ خاطر ہو رہی تھی۔ وہ دیر تک راجہ صاحب کی باتوں پر غور کرتی رہی پھر آپ ہی آپ بولی۔ بھگوان یہ زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ یا تو تم اُن کے دل کو زیادہ فراخ بنا دو یا مجھے دنیا سے اُٹھا لو۔ اندردت اس وقت نہ جانے کہاں ہوگا۔ کیوں نہ اُس کے پاس ایک رقعہ بھیج دوں کہ خبردار۔ میرا نام ظاہر نہ ہونے پاوے؟ میں نے اُن سے ناحق کہہ دیا کہ چندہ دیا۔ کیا جانتی تھی کہ یہ گل کھلے گا۔

اُس نے فوراً گھنٹی بجائی۔ نوکر اندر آ کر کھڑا ہوگیا۔ اندو نے رقعہ لکھا۔ ڈیر اندر۔ میرے چندہ کو کسی پر ظاہر نہ کرنا ورنہ مجھے رنج ہوگا۔ مجھے بہت مجبور ہوکر یہ الفاظ لکھنے پڑے ہیں ۔

پھر رقعہ نوکر کو دے کر بولی۔ اندر دت بابو کا مکان جانتا ہے؟

نوکر۔ ہوئی تو کہوں سہر سے ماں نا؟ پوچھ لیبے ۔

اندو۔ شہر میں تو شاید عمر بھر اُن کے گھر کا پتہ نہ لگے ۔

نوکر۔ اب چٹھی تو دیں پتا تو ہم لگا وب۔ لگی نا کاکہی ۔

اندو۔ تانگہ لے لینا۔ کام جلدی کا ہے ۔

نوکر۔ ہمار گوڑ تانگا سے کم تھوڑے ہیں۔ کا ہم کو نو تانگا سُر سے کم چلت ہے؟

اندو۔ بازار چوک سے ہوتے ہوئے میرے گھر تک جانا۔ بہیں بسوے وہ تمہیں میرے گھر ہی پر ملیں گے۔ اندر دت کو دیکھا ہے پہچانتا ہے نا؟

نوکر۔ جہہ کا ایک بیر دیکھ لیئی وَہی کا جنم بھر نہ بُھولی۔ اندر بابو کا تو سیکرن بیر دیکھا ہے ۔

اندو۔ کسی کو یہ خط مت دکھانا ۔

نوکر۔ کوئی دیکھی کس کس؟ پہلے وہکی آنکھی نہ پھوڑ ڈارب ۔

اندو نے رقعہ دیا۔ نوکر لے کر چلا گیا۔ وہ پھر لیٹ گئی اور وہیں باتیں سوچنے لگی۔ میری یہ ذلت اِنہیں کے سبب ہو رہی ہے۔ اندر اپنے دل میں کیا سوچے گا؟ یہی نہ کہ راجہ صاحب نے اِسے ڈانٹا ہوگا۔ گویا میں لونڈی ہوں۔ جب چاہتے ہیں ڈانٹ بتا دیتے ہیں۔ مجھے

کوئی کام کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ انہیں اختیار ہے جو چاہیں کریں
میں اُن کے اشاروں پہ چلنے کے لئے مجبور ہوں۔ کتنی ذلت ہے!

یہ سوچتے وہ تیزی سے اُٹھی۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ لونڈی آکر
کھڑی ہوئی۔ اندو بولی۔ دیکھ بھیکا چلا تو نہیں گیا۔ میں نے اُسے
ایک رقعہ دیا ہے جا کر مانگ لا۔ اب نہ بھیجوں گی۔ چلا گیا ہو تو کسی کو
سائیکل پہ دوڑا دینا۔ چوک کی طرف مل جائے گا۔

لونڈی چلی گئی اور ذرا دیر میں بھیکا کو لئے ہوئے آپہنچی۔
بھیکا بولا۔ جو چھن بھر اور نہ جات تو ہم گھر ماں نا ملت۔
اندو۔ کام تو تم نے جرمانہ کا کیا ہے کہ اتنا ضروری خط اور تم گھر میں
پڑے رہے۔ لیکن اس وقت یہی اچھا ہوا۔ وہ رقعہ اب نہ جائے گا۔
مجھے دو۔

اُن سے رقعہ لے کر چاک کر ڈالا۔ پھر آج کا روزنامہ کھول کر دیکھنے
لگی۔ پہلی ہی سُرخی تھی "شاستری جی کی معرکتہ الآرا تقریر"۔ اندو
نے اخبار کو نیچے ڈال دیا۔ اور کہنے لگی۔ یہ حضرت تو شیطان سے زیادہ
مشہور ہو گئے۔ جہاں دیکھو شاستری جی! ایسے آدمی کی قابلیت کی
خواہ کتنی تعریف کی جائے مگر اُس کی توقیر نہیں کی جا سکتی۔ شاستری
کا نام آتے ہی مجھے اِن کی یاد آجاتی ہے۔ جو آدمی ذرا ذرا سے اختلافات
پر کبھی سَر ہو جائے۔ دال میں ذرا سا نمک زیادہ ہو جانے پر بیوی کو گھر
سے نکال دے۔ جسے دوسروں کے دلی جذبات کا ذرا بھی لحاظ نہ ہو
جسے ذرا بھی خیال نہ ہو کہ میری باتوں سے کسی کے دل پہ کیا گذرے گی
وہ بھی کوئی آدمی ہے! ہو سکتا ہے کہ کل کو کہنے لگیں۔ اپنے پتا سے

مِلنے نہ جاؤ۔ گویا میں اُن کے ہاتھوں یک دم بِک گئی ہوں ؂

دوسرے روز علی الصباح اُس نے گاڑی تیار کرائی اور دو شالا اوڑھ کر گھر سے نکلی۔ مہیندر کمار باغ میں ٹہل رہے تھے۔ یہ اُن کا ہر روز کا معمول تھا۔ اندو کو جاتے دیکھا تو پُوچھا۔ اتنے سویرے کہاں ؟

اندو نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جاتی ہوں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے۔ اندر دت سے روپے واپس لینے ؂

مہیندر۔ اندو۔ سچ کہتا ہوں تم مجھے پاگل بنادو گی ؂

اندو۔ آپ مجھے کٹھ پتلیوں کی طرح نچانا چاہتے ہیں۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر ؂

یکایک اندر دت سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ اندو اُن کی طرف لپک کر چلی اور پھاٹک پر پہنچ کر بولی ــــ اندر دت۔ سچ کہنا تم نے کسی سے میرے چندے کا ذکر تو نہیں کیا ؟

اندر سہم سا گیا جیسے کوئی شخص دوکان دار کو پیسے کی جگہ روپئے دے آئے۔ بولا ــــ "آپ نے مجھے منع تو نہیں کیا تھا" ؟

اندو۔ تم جھوٹے ہو میں نے منع کیا تھا ؂

اندر دت۔ اندو رانی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے منع نہیں کیا تھا ہاں مجھے خود ہی عقل سے کام لینا چاہئے تھا۔ اتنی غلطی ضرور میری ہے

اندو (آہستہ سے) تم مہیندر سے اتنا کہہ سکتے ہو کہ میں نے ان کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا ؟ مجھ پر تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ میں روحانی عذاب میں مبتلا ہوں ؂

یہ کہتے کہتے اندو کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ اندر دت

موقع تاڑ گیا۔ بولا ـــــ ہاں کہہ دوں گا۔ آپ کی خاطر سے ۔

ایک لمحہ میں اندر راجہ صاحب کے پاس جا پہنچا۔ اندو گھر میں چلی گئی ۔

مہیندر کمار نے پوچھا ـــــ کہئے مہاشے۔ اس وقت آپ نے کیسے تکلیف کی؟

اندر دت۔ مجھے تو تکلیف نہیں ہوئی۔ آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ اگرچہ خلاف قاعدہ ہے مگر میری آپ سے التجا ہے کہ سورداس اور سبھاگی کا جرمانہ آپ اُسی وقت مجھ سے لے لیں اور اُن دونوں کی رہائی کا حکم دے دیں۔ کچہری ابھی دیر میں کھلے گی۔ میں اسے آپ کی خاص عنایت سمجھوں گا ۔

مہیندر کمار۔ ہاں خلاف قاعدہ تو ہے لیکن تمہارا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ روپے منیم کو دے دو۔ میں رہائی کا حکم لکھے دیتا ہوں۔ کتنے روپے جمع کئے ؟

اندر دت۔ بس شام کو خاص خاص آدمیوں کے پاس گیا تھا۔ کوئی پانچ سو روپے ہو گئے ۔

مہیندر کمار۔ تب تو تم اس فن میں ماہر ہو۔ اندو رانی کا نام دیکھ کر نہ دینے والوں نے بھی دئے ہوں گے ۔

اندر دت۔ میں اندو رانی کے نام کی اس سے زیادہ عزت کرتا ہوں۔ اگر اُن کا نام دکھاتا تو پانچ سو روپے نہ لاتا۔ پانچ ہزار لاتا ۔

مہیندر کمار۔ اگر یہ سچ ہے تو تم نے میری آبرو رکھ لی ۔

اندر دت۔ مجھے آپ سے ایک التجا اور کرنی ہے۔ کچھ لوگ سورداس

کو عزت کے ساتھ اُس کے گھر پہنچانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے دو چار سو لوگ جمع ہو جائیں۔ میں آپ سے اُس کی اجازت چاہتا ہوں ٭

مہیندر کمار۔ جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بدامنی واقع ہونے کا احتمال ہے ٭

اندر دت۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پتا تک نہ ہلے گا ٭

مہیندر کمار۔ یہ غیر ممکن ہے ٭

اندر دت۔ میں اس کی ضمانت دے سکتا ہوں ٭

مہیندر کمار۔ یہ نہیں ہو سکتا ٭

اندر دت سمجھ گیا کہ راجہ صاحب سے اب زیادہ اصرار کرنا بیفائدہ ہے۔ جا کر منیم کو روپے دئے اور تانگہ کی طرف چلا۔ دفعتاً راجہ صاحب نے پوچھا ــــ جلوس تو نہ نکلے گا نہ؟

اندر دت۔ نکلے گا۔ میں روکنا چاہوں تو بھی نہیں روک سکتا ٭

اندر دت وہاں سے اپنے دوستوں کو خبر دینے چلے۔ جلوس کا انتظام کرنے میں گھنٹوں کی دیر ہو گئی۔ اِدھر اُن کے جاتے ہی راجہ صاحب نے جیل کے داروغہ کو ٹیلیفون کر دیا کہ سورداس اور سبھاگی چھوڑ دئے جائیں اور اُنہیں بندگاڑی میں بٹھا کر اُن کے گھر پہنچا دیا جاوے۔ جب اندر دت سواری باجے وغیرہ لئے ہوئے جیل پہنچے۔ تو معلوم ہوا کہ پنجرا خالی ہے۔ چڑیاں اُڑ گئیں۔ وہ کف افسوس مل کر رہ گئے۔ اُنہیں پاؤں پانڈے پور کو چلے۔ دیکھا تو سورداس ایک نیم کے نیچے راکھ کے ڈھیر کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ایک طرف سبھاگی سر جھکائے کھڑی ہے۔ اندر دت کو دیکھتے ہی جگدھر اور دیگر اشخاص

اِدھر اُدھر سے آ کر جمع ہو گئے ؎

اندر دت۔ سورداس۔ تم نے تو بڑی جلدی کی۔ وہاں لوگ تمہارا جلوس نکالنے کی تیاریاں کئے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب نے بازی مار لی۔ اب بتاؤ اُن روپیوں کا کیا کیا جائے جو جلوس کے لئے جمع کئے گئے تھے؟

سورداس۔ اچھا ہی ہوا کہ میں یہاں چُپکے سے آ گیا۔ نہیں تو شہر بھر میں گھومنا پڑتا۔ جلوس بڑے بڑے آدمیوں کا نکلتا ہے کہ اندھے بھکاریوں کا؟ آپ لوگوں نے جریبانہ دے کر چھڑا دیا یہی کون کم پُن کیا ؎

اندر دت۔ اچھا بتاؤ یہ روپے کیا کئے جائیں؟ تمہیں دے دوں؟

سورداس۔ کتنے روپے ہوں گے؟

اندر دت۔ کوئی تین سو ہوں گے ؎

سورداس۔ بہت ہیں۔ اتنے میں بھیرو کی دوکان مجے میں بن جائیگی ؎

جگدھر کو بُرا معلوم ہوا۔ بولا۔ پہلے اپنے جھونپڑے کی تو فکر کرو ؎

سورداس۔ میں اسی پیڑ کے نیچے پڑا رہا کروں گا یا پنڈا جی کے دالان میں ؎

جگدھر۔ جس کی دوکان جلی ہے وہ بنوائے گا۔ تمہیں کیا چنتا ہے؟

سورداس۔ جلی تو ہے میرے کارن ؎

جگدھر۔ (۱۸۸) گھر بھی تو جلا ہے ؎

سورداس۔ یہ بھی بنے گا مگر پیچھے سے۔ دوکان نہ بنی تو بھیرو کو کتنا گھاٹا ہو گا۔ میری بھیک تو ایک دن بھی بند نہ ہو گی ؎

جگدھر۔ بہت سراہنے سے بھی آدمی کا من بگڑ جاتا ہے۔ تمہاری بھلمنسی کا لوگ بکھان کرنے لگے تو اب تم سوچتے ہو گے کہ ایسا کام کروں۔ جس میں اور بڑائی ہو۔ اِس طرح دوسروں کی تالی پر ناچنا نہ چاہئیے ◆

اندردت۔ سُورداس تم اِن لوگوں کو بکنے دو۔ تم گیانی ہو۔ یہ روپے تمہارے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ جو جی میں آوے کرنا ◆

اندردت چلا گیا تو سُبھاگی نے سُورداس سے کہا۔ اُس کی دوکان بنوانے کا نام نہ لینا ◆

سُورداس۔ میرے گھر سے پہلے اُس کی دوکان بنے گی۔ یہ بدنامی سر پر کون لے کہ سُورداس نے بھیرو کا گھر جلوا دیا؟ میرے مَن میں یہ بات سما گئی ہے کہ ہمیں میں سے کسی نے اُس کی دوکان جلائی ◆

سُبھاگی۔ اُس سے تم کتنے ہی دَبو پر وہ تمہارا دشمن ہی بنا رہے گا کُتّے کی پونچھ کبھی سیدھی نہیں ہوتی ◆

سُورداس۔ تم دونوں پھر ایک ہو جاؤ گے تب تجھ سے پوچھوں گا ◆

سبھاگی۔ بھگوان مار ڈالیں پر اُس کا مُنہ نہ دکھاویں ◆

سُورداس۔ میں کہے دیتا ہوں تو ایک دن بھیرو کے گھر کی دیبی بنے گی ◆

سُورداس روپے لئے ہوئے بھیرو کے گھر کی طرف چلا۔ بھیرو رپٹ کرنے کو جانا تو چاہتا تھا پر ڈرتا تھا کہ کہیں سُورداس کے جھونپڑے کی بھی بات چلی تو کیا جواب دوں گا۔ بار بار ارادہ کر کے رُک جاتا تھا۔ اتنے میں سُورداس کو سامنے آتے دیکھا تو ہکّا بکّا رہ گیا۔ تعجب سے بولا ــــ ارے کیا جریبانہ دینے آیا کیا؟

بڑھیا بولی۔ بیٹا۔ اِسے جرور کسی دیوتا کا اِشٹ ہے نہیں تو دہاں سے کیسے بھاگ آتا؟

شوُرداس نے بڑھ کر کہا۔ بھیرو میں ایشور کو ساکھی دے کر کہتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تمہاری دوکان کس نے جلائی۔ تم مجھے چاہے جتنا نیچ سمجھو پر میری جانکاری میں یہ بات کبھی نہ ہونے پاتی۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ کسی میرے ہتو (خیر خواہ) کا کام ہے

بھیرو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم چھوٹ کیسے آئے؟ مجھے تو یہی بڑا اچرج ہے۔

شوُرداس۔ بھگوان کی اِچھّا۔ سہر کے کچھ دھرماتما لوگوں نے آپس میں چندہ کر کے میرا جرمانہ بھی دے دیا۔ اور کوئی تین سو روپے جو بچ رہے ہیں مجھے دے گئے ہیں۔ میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ یہ روپے لے کر اپنی دوکان بنواؤ جس میں تمہارا ہرج نہ ہو۔ میں سب روپے لے آیا ہوں۔

بھیرو ششدر ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی آدمی آسمان سے موتیوں کی بارش ہوتی ہوئی دیکھے۔ اُسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ اِن کو لوں یا نہیں۔ اِن میں کوئی بھید تو نہیں ہے۔ ان میں کوئی زہریلا کیڑا تو نہیں چھپا ہے۔ کہیں اُن کے لینے سے مجھ پر کوئی آفت تو نہ آ جائے گی؟ اُس کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ اندھا سچ مچ مجھے روپے دینے کو لایا ہے یا مجھے طعنہ دے رہا ہے۔ ذرا اس کا دل ٹٹولنا چاہیئے۔ بولا — تم اپنے روپے رکھو۔ یہاں کوئی روپوں کے بھوکے نہیں ہیں۔ پیاسوں مرتے بھی ہوں تو دشمن کے ہاتھ سے

پانی نہ پئیں ۔

سُورداس۔ بھیرو تمہاری دُشمنی کیسی؟ میں تو کسی کو اپنا دُشمن نہیں دیکھتا۔ چار دن کی جندگانی کے لئے کیا کسی سے دُشمنی کی جائے! تم نے میرے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا اور سمجھتا کہ تم میری گھر والی کو بھگائے لئے جاتے ہو تو میں بھی یہی کرتا جو تم نے کیا۔ اپنی آبرو کس کو پیاری نہیں ہوئی؟ جسے اپنی آبرو پیاری نہ ہو اُس کی گنتی آدمیوں میں نہیں۔ جانوروں میں ہے۔ مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ مَیں نے تمہارے ہی لئے یہ روپے لئے ہیں نہیں تو میرے لئے تو پیڑ چھانہ بہت تھی۔ میں جانتا ابھی تمہیں میرے اوپر سنبھا ہو رہا ہے پر کبھی نہ کبھی تمہارا مَن میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ یہ روپے لو اور بھگوان کا نام لے کر دکان بنوانے میں ہاتھ لگا دو۔ تم پڑیں گے تو جس بھگوان نے اتنی سہاتیا دی ہے وہی بھگوان اور بھی سہاتیا دیں گے ۔

بھیرو کو ان الفاظ میں ہمدردی اور شرافت کی جھلک دکھائی دی۔ سچائی اعتبار کو پیدا کر دیتی ہے۔ نرم ہو کر بولا: آؤ بیٹھو۔ چلم پیو۔ کچھ باتیں ہوں تو سمجھ میں آئے۔ تمہارے مَن کا بھید نہیں کھلتا۔ دُشمن کے ساتھ تو کوئی بھلائی نہیں کرتا۔ تم میرے ساتھ کیوں اتنی مہربانگی کرتے ہو؟

سُورداس۔ تم نے میرے ساتھ کون سی دُشمنی کی؟ تم نے وہی کیا جو تمہارا دھرم تھا۔ مَیں رات بھر حوالات میں بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہو۔ میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی بُرائی

نہیں کی تو مجھے معلوم ہوا کہ تم میرے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کر رہے ہو۔ یہی تمہارا دھرم ہے۔ عورت کے پیچھے تو کھون ہو جاتا ہے۔ تم نے نالس ہی کر دی تو کون بُرا کام کیا۔ بس اب تم سے میری یہی بنتی ہے کہ جس طرح کل بھری عدالت میں پنچوں نے مجھے بے کسور کہہ دیا اسی طرح تم بھی میری طرف سے اپنا من صاف کر لو۔ میری اِس سے بھی اَدھیک (زیادہ) دُرگت ہو اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی گھات کیا ہو۔ ہاں مجھ سے ایک ہی بات نہیں ہو سکتی۔ میں سبھاگی کو اپنے گھر سے نکال نہیں سکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کوئی آڑ نہ رہے گی تو نہ جانے اُس کی کیا دسا ہو۔ میرے یہاں رہے گی تو کون جانے کبھی تمہیں لے رکھ لو۔

بھیرو کا کدورت بھرا دل اِس باطنی صفائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آج پہلی مرتبہ اُسے سُوردا س کی نیک نیتی کا یقین ہو گیا۔ سوچا۔ اگر اس کا دل صاف نہ ہوتا تو مجھ سے ایسی باتیں کیوں کرتا؟ میرا کوئی ڈر تو اِسے ہے ہی نہیں۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا کر چکا۔ اس کے ساتھ تو سارا سہر ہے۔ سبھوں نے جرمانہ ادا کر دیا۔ اوپر کئی سو روپے اور دے گئے۔ محلہ میں بھی اُس کی دھاک بیٹھ گئی۔ چاہے تو بات کی بات میں مجھے بگاڑ سکتا ہے۔ نیت صاف نہ ہوتی تو اب سُبھاگی کے ساتھ آرام سے رہتا۔ اندھا ہے۔ اپاہج ہے بھیکھ مانگتا ہے پر اُس کی کتنی مرجاد ہے۔ بڑے بڑے آدمی اُس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ میں کتنا کمینہ نیچ آدمی ہوں کہ پیسے کے لئے رات دن دگا پھریب کرتا رہتا ہوں۔ کون سا پاپ ہے جو میں نے نہیں کیا؟

اِس بیچارے کا گھر جلایا۔ ایک بار نہیں دو بار۔ اس کے روپے اُٹھا لے گیا۔ یہ میرے ساتھ نیکی ہی کرتا چلا آتا ہے۔ سبھاگی کے بارے میں مجھے شک ہی شک تھا۔ اگر کچھ نیّت بد ہوتی تو اس کا ہاتھ کیں نے پکڑا تھا۔ سبھاگی کو کھلے کھجانے رکھ لیتا۔ اب تو عدالت کچہری کا بھی ڈر نہیں رہا۔ یہ سوچتا ہوا وہ سُورداس کے پاس آ کر بولا۔ سُورداس اب تک میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ بھلائی بُرائی کی اُسے ماپھ کرو۔ آج سے اگر تمہارے ساتھ کوئی بُرائی کروں تو بھگوان مجھ سے سمجھیں۔ یہ روپے مجھے مت دو۔ میرے پاس روپے ہیں۔ دوکان بنوالوں گا۔ سبھاگی پر بھی اب مجھے کوئی شک نہیں رہا۔ مَیں بھگوان کو بیچ میں ڈال کر کہتا ہوں کہ اب میں کبھی اُسے کوئی کڑی بات تک نہ کہوں گا۔ میں اب تک دھوکے میں پڑا ہوا تھا۔ سُبھاگی کو میرے یہاں آنے پر راجی کردو۔ وہ تمہاری بات کو ناہیں نہ کرے گی ؞

سُورداس۔ راجی ہی ہے۔ بَس اُسے یہی ڈر ہے کہ تم پھر مارنے پیٹنے لگو گے ؞

بھیرو۔ نہیں سُورداس۔ اب مَیں اُسے بھی پہچان گیا۔ میں اُس کے لائک نہیں تھا۔ اُس کا بیاہ تو کسی دھرماتما آدمی سے ہونا چاہئے تھا۔ (آہستہ) آج تم سے کہتا ہوں۔ پہلی بار بھی مَیں نے ہی تمہارے گھر میں آگ لگائی تھی اور تمہارے روپے چُرائے تھے ؞

سُورداس۔ اُن باتوں کو بھول جاؤ بھیرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔ دُنیا میں کون ہے جو کہے کہ مَیں گنگا جل ہوں۔ جب بڑے بڑے سادھو سنیاسی ماہ موہ میں پھنسے ہوتے ہیں تو ہماری تمہاری کیا

بات ہے۔ ہماری بڑی بھول یہی ہے کہ کھیل کو کھیل کی طرح نہیں کھیلتے۔ کھیل میں دھاندلی کر کے کوئی جیت ہی جائے تو کیا ہاتھ آئے گا۔ کھیلنا تو اس طرح چاہئے کہ نگاہ جیت پر رہے پر ہار سے گھبرائے نہیں۔ ایمان کو نہ چھوڑے۔ جیت کر اتنا نہ اُترائے کہ اب کبھی ہار ہوگی ہی نہیں۔ یہ ہار جیت تو زندگانی کے ساتھ ہی ہے۔ ہاں ایک صلاح کی بات کہتا ہوں۔ تم تاڑی کی دوکان چھوڑ کر کوئی دوسرا روجگار کیوں نہیں کرتے؟

بھیرو۔ جو کہو وہ کروں۔ وہ روجگار ہے کھراب۔ رات دن جواری چور۔ بدماس آدمیوں ہی کا ساتھ رہتا ہے۔ اُنہیں کی باتیں سُنو۔ اُنہیں کے ڈھنگ سیکھو۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اسی روجگار نے مجھے چوپٹ کیا۔ بتاؤ کیا کروں؟

سُورداس۔ لکڑی کا روجگار کیوں نہیں کر لیتے؟ بُرا نہیں ہے۔ آج کل یہاں پردیسی بہت آئیں گے۔ بکری بھی اچھی ہوگی۔ جہاں تاڑی کی دوکان تھی وہیں ایک باڑا بنوا دو اور ان روپیوں سے لکڑی کا کام کرنا سرو کر دو۔

بھیرو۔ بہت اچھی بات ہے۔ مگر یہ روپیے اپنے ہی پاس رکھو۔ میرے مَن کا کیا ٹھکانا۔ روپیے پا کر کوئی اور بُرائی نہ کر بیٹھوں۔ میرے جیسے آدمی کو تو کبھی آدھے پیٹ کے سوا بھوجن نہ مِلنا چاہئے۔ پیسے ہاتھ میں آئے اور سنک سوار ہوئی۔

سُورداس۔ میرے گھر نہ دوار۔ رکھوں گا کہاں؟

بھیرو۔ اس سے تم اپنا گھر بنوا لو۔

سُورداس ۔ تمہیں لکڑی کی دکان سے نپھا ہو تو بنوا دینا ۔
بھیرو ۔ سُبھاگی کو سمجھا دو ۔
سُورداس ۔ سمجھا دوں گا ۔
شورداس چلا گیا ۔ بھیرو گھر میں گیا تو بُڑھیا بولی ۔ تجھے میل کرنے آیا تھا نا؟
بھیرو ۔ ہاں کیوں نہ میل کرے گا ۔ مَیں بڑا لاٹ ہوں نا ۔ بُڑھاپے میں تجھے اور کچھ نہیں سُوجھتا ۔ یہ آدمی نہیں سادھو ہے ۔

(۳۴)

فیکٹری (کارخانہ) قریب قریب تیار ہو گئی تھی ۔ اب مشینیں گڑنے لگیں ۔ پہلے تو مزدور مستری وغیرہ عموماً مل کے برآمدوں ہی میں رہتے تھے ۔ وہیں پیڑوں کے نیچے کھانا پکاتے اور سوتے تھے ۔ لیکن جب ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تو محلّہ میں مکان لے لے کر رہنے لگے ۔ پانڈے پور چھوٹی سی بستی تو تھی ہی ۔ وہاں اتنے مکانات کہاں تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محلّہ والے کرایہ کی لالچ سے پردیسیوں کو اپنے اپنے گھروں میں ٹھہرانے لگے ۔ کوئی پردہ کی دیوار کھنچوا لیتا تھا ۔ کوئی خود جھونپڑا بنا کر اس میں رہنے لگتا اور مکان کرایہ داروں کو دے دیتا ۔ بھیرو نے لکڑی کی دکان کھول لی تھی ۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہنے لگا ۔ اور اپنا رہائشی مکان کرایہ پر اُٹھا دیا ۔ ٹھاکر دین نے اپنی دکان کے سامنے ایک ٹٹی لگا کر گزر کرنا شروع کیا ۔ اُس کے گھر میں ایک اور سیر صاحب آ جمے ۔ جگدھر سب سے زیادہ لالچی تھا ۔ اُس نے سارا مکان اُٹھا دیا اور آپ ایک پھوس کے چھپر میں نباہ کرنے لگا ۔ نائیک رام

کے برآمدہ میں تو روز ایک بارات ٹھہرتی تھی۔ لالچ نے لوگوں کو یہاں تک گھیرا کہ بجرنگی نے بھی مکان کا ایک حصہ اُٹھا دیا۔ ہاں سُورداس نے کسی کو نہیں ٹھہرایا۔ وہ اپنے نئے مکان میں جو رانی آندو کے مخفی عطیہ سے بنا تھا۔ سُبھاگی کے ساتھ رہتا تھا۔ سُبھاگی ابھی تک بھیرو کے ساتھ رہنے میں راضی نہ ہوئی تھی۔ ہاں بھیرو کی آمدورفت اب سُورداس کے گھر میں زیادہ تر رہتی تھی۔

کارخانہ میں ابھی مشینیں نہ گڑی تھیں مگر اُس کی وسعت روزبروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ سُورداس کی بقیہ پانچ بیگھے زمین بھی اسی قاعدہ کے مطابق مل کے تصرف میں آگئی۔ سُورداس نے سُنا تو ہاتھ مل کر رہ گیا۔ پچھتانے لگا کہ جان صاحب ہی سے کیوں نہ سودا کر لیا۔ پانچ ہزار دیتے تھے۔ اب بہت ملیں گے تو دو چار سو روپے مل جائیں گے۔ اب کسی قسم کی تحریک کرنا اُسے بیفائدہ معلوم ہوتا تھا۔ جب پہلے ہی کچھ نہ کر سکا تو اب کیا کر لوں گا۔ پہلے ہی یہ اندیشہ تھا۔ وہ درست نکلا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سُورداس ایک درخت کے نیچے بیٹھا جھپکیاں لے رہا تھا۔ کہ تحصیل کے ایک چپڑاسی نے آکر اُسے پکارا اور ایک سرکاری پروانہ دیا۔ سورداس سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو زمین ہی کا کچھ جھگڑا ہے۔ پروانہ لئے ہوئے مل میں آیا کہ کسی بابو سے پڑھوائے۔ مگر کچہری کی خوشخط تحریر مل کے بابوؤں سے کیا پڑھی جاتی۔ کوئی کچھ نہ بتلا سکا۔ مجبوراً واپس آرہا تھا کہ پربھو سیوک نے دیکھ لیا۔ فوراً اپنے کمرہ میں بُلا لیا اور پروانہ کو دیکھا۔ لکھا ہوا تھا۔ اپنی زمین کے معاوضہ

کے ایک ہزار روپے تحصیل میں آ کر لے جاؤ ۔

سُورداس۔ کُل ایک ہزار ہے؟

پربھوسیوک۔ ہاں اتنا ہی تو لکھا ہے ۔

سُورداس۔ تو مَیں روپے لینے نہ جاؤں گا۔ صاحب نے پانچ ہجار دینے کہے تھے اُس کے ایک ہی ہجار رہے۔ گُھوس گھاس میں سو پچاس اور اُڑھ جائیں گے۔ سرکار کا کھجانا کھالی ہے۔ بھر جائے گا ۔

پربھوسیوک۔ روپے نہ لو گے تو ضبط ہو جائیں گے۔ یہاں تو سرکار اسی تاک میں رہتی ہے کہ کسی طرح رعایا کا دھن اُڑا لے۔ کچھ ٹیکس کے بہانے سے کچھ روزگار کے بہانے سے کچھ کسی بہانہ سے ہضم کر لیتی ہے ۔

سُورداس۔ گریبوں کی چیج لیتی ہے تو باجار بھاؤ سے دام نہ دینا چاہئے؟ ایک تو جبر جستی دھرتی لے لی اُس پر من مانا دام دے دیا۔ یہ کوئی نیائے نہیں ہے ۔

پربھوسیوک۔ سرکار یہاں نیائے کرنے نہیں آئی ہے۔ بھائی راج کرنے آئی ہے۔ نیائے کرنے سے اُسے کچھ ملتا ہے؟ کوئی وقت وہ تھا جب نیائے کو راج کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ وقت نہیں ہے۔ اب تجارت کا راج ہے اور جو اس راج کو منظور نہ کرے اُس کے لئے ستاروں کا نشانہ مارنے والی توپیں ہیں۔ تم کیا کر سکتے ہو؟ دیوانی میں مقدمہ دائر کرو گے؟ وہاں بھی سرکار ہی کے نوکر چاکر انصاف کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔

سُورداس۔ میں کچھ نہ لوں گا۔ جب راجہ ہی ادھرم کرنے لگا تو پرجا

کہاں تک جان بچاتی پھرے گی؟

پربھوسیوک۔ اس سے فائدہ کیا؟ ایک ہزار ملتے ہیں لے لو۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی بھلی۔

یکایک اندردت آپہنچے اور بولے۔ پربھو۔ آج ڈیرا کوچ ہے۔ راجپوتانہ جارہا ہوں۔

پربھوسیوک۔ فضول جاتے ہو۔ ایک تو ایسی سخت گرمی دوسرے وہاں کی حالت اب بہت نازک ہو رہی ہے۔ ناحق کہیں پھنس پھنسا جاؤ گے۔

اندردت۔ بس ایک بار ونے سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُن کے مزاج اخلاق اور اصول میں اتنا تغیر بلکہ انقلاب کیسے واقع ہوگیا۔

پربھوسیوک۔ ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ طمعے میں پڑنے والا آدمی تو نہیں ہے۔ میں تو اُس کا دل و جان سے معتقد ہوں۔ اگر وہ منحرف ہوئے تو میں سمجھ جاؤں گا کہ مذہب وراستی کا دُنیا سے فقدان ہوگیا۔

اندردت۔ یہ نہ کہو پربھو۔ انسانی فطرت ایک معمہ ہے۔ اُس کا جاننا نہایت دشوار ہے۔ مجھے تو ونے کی کایا پلٹ پر اتنا غصہ آتا ہے کہ پاؤں تو گولی مار دوں۔ ہاں اطمینان اس بات کا ہے کہ اُن کے نکل جانے کا اس جماعت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ تمہیں تو معلوم ہے۔ ہم لوگوں نے بنگال میں مصیبت زدوں کو قرار واقعی مدد دینے کی کتنی زبردست کوشش کی ہے۔ کئی کئی دنوں تک تو ہم لوگوں کو ایک دانہ تک نہ میسر ہوتا تھا۔

سُورداس۔ بھیا کون لوگ اس طرح غریبوں کا پالن کرتے ہیں؟

اندردت - ارے شوردا س - تم یہاں گوشہ میں کھڑے ہو - میں نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں - کہو سب خیریت ہے نا؟

شوردا س - سب بھگوان کی دیا ہے - تم ابھی کن آدمیوں کی بات کر رہے تھے؟

اندردت - اپنے ہی ساتھیوں کی - کنور بھرت سنگھ نے کچھ نوجوانوں کو جمع کر کے ایک ٹولی بنا دی ہے اور اُس کے خرچ کے لئے تھوڑی سی زمین بھی دان کر دی ہے - آج کل ہم لوگ کوئی سو آدمی ہیں - دیش کی حتے المقدور خدمت کرنا ہی ہم لوگوں کا خاص فرض ہے - اس وقت ہم میں سے کچھ لوگ تو راجپوتانہ کو گئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ پنجاب کو - جہاں سرکاری فوج نے رعایا پر گولیاں چلا دی ہیں +

شوردا س - بھیا یہ تو بڑے پُن کا کام ہے - ایسے مہاتما لوگوں کے تو درسن کرنا چاہئے - تو بھیا تم لوگ چندے بھی اُگاہتے ہو گے؟

اندردت - ہاں جس کی مرضی ہوتی ہے چندہ بھی دے دیتا ہے - لیکن ہم لوگ خود نہیں مانگتے پھرتے +

شوردا س - میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں تو آپ مجھے رکھیں گے؟ یہاں پڑے پڑے اپنا پیٹ پالتا ہوں - آپ کے ساتھ رہوں گا تو آدمی ہو جاؤں گا +

اندردت نے پربھوسیوک سے انگریزی میں کہا - کتنا بھولا آدمی ہے - خدمت اور ایثار کا مجسّم نمونہ ہونے پر بھی غرور چھُو تک نہیں گیا - اپنے نیک کاموں کی کچھ قدر ہی نہیں سمجھتا - پر اپکار اب اس کے لئے کوئی اختیاری فعل نہیں رہا - وہ اُس کی عادت ہی میں داخل ہو گیا ہے +

سُور داس نے پھر کہا۔ اور کچھ تو نہ کرسکوں گا۔ اپڑھ گنوار ٹھہرا۔ پر جس کے سرہانے بٹھا دیجیے گا پنکھا جھلتا رہوں گا۔ پیٹھ پر جو کچھ لاد دیجئے گا لئے پھروں گا ۔

اندردت۔ تم معمولاً جو کچھ کرتے ہو وہ اُس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جیسے ہم لوگ کبھی کبھی خاص موقعوں پر کرتے ہیں۔ دشمن کے ساتھ نیکی کرنا مریضوں کی تیمارداری سے کسی طرح کم نہیں بلکہ زیادہ اچھا ہے ۔

سُور داس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا جیسے کسی شاعر کے کسی سخن فہم سے داد پائی ہو۔ بولا ـــــ بھیّا ہماری کیا بات چلاتے ہو؟ جو آدمی پیٹ پالنے کے لئے بھیک مانگے گا وہ پُن دھرم کیا کرے گا؟ بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ چھوٹا مُنہ بڑی بات ہے مگر آپ کا حکم ہو تو مجھے ماوجہ (معاوضہ) کے جو روپے ملے ہیں انہیں آپ کی سنگت کے بھینٹ کردوں ؟

اندردت۔ کیسے روپے ؟

پربھوسیوک۔ اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ پاپا نے راجہ مہیندر کمار کی مدد سے اُس کی جو زمین لے لی تھی اُس کا ایک ہزار روپیہ معاوضہ اسے دیا گیا ہے۔ یہ بل اُسی لُوٹ کے مال پر بن رہی ہے ۔

اندردت۔ تم نے اپنے پاپا کو منع نہیں کیا؟

پربھوسیوک۔ قسم خدا کی میں اور صوفی دونوں ہی نے پاپا کو بہت روکا۔ پر تم اُن کی عادت جانتے ہی ہو۔ کوئی دھن سوار ہو جاتی ہے۔

توکسی کی نہیں سنتے ۔

اندر دت۔ میں تو اپنے باپ سے لڑ جاتا۔ مل بنتی یا پہاڑ میں جاتی۔ ایسی حالت میں تمہارا کم از کم یہ فرض تھا کہ مل سے بالکل علحدہ رہتے۔ باپ کا حکم ماننا بیٹے کا فرض ہے۔ یہ میں مانتا ہوں۔ لیکن جب باپ بے انصافی کرنے لگے تو بیٹا اس کی تقلید کرنے کے لئے مجبور نہیں۔ تمہاری نظموں کے تو ایک ایک لفظ سے اخلاق جو ہر ٹپکتا ہے۔ ایسی پرواز کرتے ہو کہ ہریشچندر اور حسین بھی مات ہو جائیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری ساری طاقت نظموں کی بندش ہی میں صرف ہو جاتی ہے عمل کے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ واقعی بات تو یہ ہے کہ تم اپنے کلام کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ بس زبان ہی کے شیر ہو۔ سورداس ہم لوگ تم جیسے غریبوں سے چندہ نہیں لیتے۔ ہمارے داتا امیر لوگ ہیں ۔

سورداس۔ بھیا تم نہ لوگے تو کوئی چور لے جائے گا۔ میرے پاس روپوں کا کام ہی کیا ہے؟ تمہاری دیا سے پیٹ بھر اناج مل ہی جاتا ہے۔ رہنے کو جھونپڑی بن ہی گئی ہے۔ اور کیا چاہئے؟ کسی اچھے کام میں لگ جانا اس سے کہیں اچھا ہے کہ چور اٹھا لے جائیں۔ میرے اوپر اتنی دیا کرو ۔

اندر دت۔ اگر دینا ہی چاہتے ہو تو کوئی کنواں کھدوا دو۔ بہت دنوں تک تمہارا نام رہے گا ۔

سورداس۔ بھیا مجھے نام کی بھوک نہیں ہے۔ بہانے مت کرو۔ یہ روپے لے کر اپنی سنگت میں دے دو۔ میرے سر سے بوجھ ٹل جائے گا

پربھو سیوک (انگریزی میں) دوست اس کے روپے لے لو ورنہ

اسے چین نہ آئے گا۔ اِس فیاضی کو فرشتوں کی فیاضی کہنا اس کی تحقیر
کرنا ہے۔ میرا تو تخیل بھی وہاں تک نہیں پہنچتا۔ ایسے ایسے لوگ بھی دنیا
میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اپنے بھرے ہوئے تھال میں سے
ایک نوالہ اٹھاکر پھینک دیتے ہیں۔ تو دوسرے روز اخباروں میں اپنا
نام دیکھنے کو دوڑتے ہیں۔ اڈیٹر اگر اس خبر کو جلی حروف میں نہ شائع
کرے تو اُسے گولی مار دیں۔ یہ واقعی مقدس ہستی ہے!

اندردت۔ سُورداس اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں روپے لے لوں
گا مگر اس شرط پر کہ تمہیں جب کبھی کوئی ضرورت ہو ہمیں فوراً مطلع
کرو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی ہی تمہاری کُٹی ایک تیرتھ
کا مقام ہو جائے گی اور لوگ تمہارے درشن کو آیا کریں گے۔

سُورداس۔ تو میں آج روپے لاؤں گا۔

اندردت۔ اکیلے نہ جانا۔ ورنہ کچہری کے کُتّے تمہیں بہت دق کریں گے
میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔

سُورداس۔ اب ایک بنتی (عرض) آپ سے بھی ہے صاحب۔
آپ پُتلی گھر کے مجوروں کے لئے گھر کیوں نہیں بنوا دیتے۔ ساری
بستی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور روز اودھم مچاتے رہتے ہو۔ ہمارے
محلّہ میں کسی نے عورتوں کو نہیں چھیڑا تھا! نہ کبھی اتنی چوریاں ہوئیں
نہ کبھی اتنے دھڑلے سے جُوا ہوا۔ نہ سرابیوں کا ایسا ہُلڑ رہا۔ جب تک
مجور لوگ یہاں کام پر نہیں آجاتے۔ عورتیں گھروں سے پانی بھرنے
نہیں نکلتیں۔ رات کو اتنا سور ہوتا ہے کہ نیند نہیں آتی۔ کسی کو سمجھاؤ تو
لڑنے پر اُدتار (آمادہ) ہو جاتا ہے۔

یہ کہہ کر سُور داس چپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میں بات کو بہت بڑھا کر تو نہیں کہا۔ اندر دت نے پربھو سیوک کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بھئی یہ تو اچھی بات نہیں۔ اپنے پاپا سے کہو۔ اِس کا جلد بندوبست کریں۔ نہ جانے تمہارے وہ سب اصول کیا ہو گئے ؟ بیٹھے بیٹھے یہ ساری تماشیاں دیکھ رہے ہو اور کچھ کرتے دھرتے نہیں ۔

پربھو سیوک۔ مجھے تو یک دم اِس کام سے نفرت ہے۔ میں نہ اِسے پسند کرتا ہوں۔ نہ اس کے قابل ہوں۔ میری زندگی کا مسرت انگیز بہشت تو یہی ہے کہ کسی پہاڑی کے دامن میں ایک چشمہ کے کنارہ پر چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر پڑا رہوں۔ نہ دنیا کی فکر ہو۔ نہ عاقبت کی۔ نہ اپنے نام کو کوئی رونے والا ہو نہ ہنسنے والا۔ یہی میری زندگی کی معراج ہے۔ مگر اُس معراج پر پہنچنے کے لئے جس باقاعدگی اور کوشش کی ضرورت ہے اُس سے محروم ہوں۔ خیر سچ بات تو یہ ہے کہ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ میرا تو یہاں آنا نہ آنا دونوں برابر ہے۔ صرف پاپا کے لحاظ سے چلا آتا ہوں۔ وقت کا زیادہ حصہ یہی سوچنے میں صرف کرتا ہوں کہ اس قید سے کیونکر نجات ملے۔ آج ہی پاپا سے کہوں گا ۔

اندر و۔ ہاں آج ہی کہنا۔ تمہیں تامّل ہو تو میں کہہ دوں ۔

پربھو سیوک۔ نہیں جی۔ اِس میں کیا تامّل ہو سکتا ہے۔ اس سے تو میرا رنگ اور جم جائے گا۔ پاپا کو خیال ہو گا کہ اب اِس کا جی لگنے لگا۔ کچھ اِس نے کہا تو اُن کا تو مجھ سے یہی رونا ہے کہ میں کسی بات میں بولتا ہی نہیں ۔

اندر دت یہاں سے چلے تو سُور داس بہت دور تک اُن کے

ساتھ اُسی خدمت جماعت کی باتیں پوچھتا ہوا چلا گیا۔ جب اندردت
نے بہت اصرار کیا تو لوٹا۔ اندردت وہیں سڑک پہ کھڑا ہوا اُس
نحیف عاجز انسان کو ہوا کے جھونکوں سے لڑکھڑاتے اور درختوں
کے سایہ میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ شاید یہ تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ
یہ انسان ہے یا فرشتہ!

(۳۴)

پربھو سیوک نے گھر آتے ہی مکانوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ جان سیوک
یہ سُن کر بہت خوش ہوئے کہ اب اس نے کارخانہ کی طرف دھیان
دینا شروع کیا۔ بولے ـــــ ہاں مکانوں کا بننا بہت ضروری ہے۔
انجینئر سے کہو ایک نقشہ بنائیں۔ میں انتظامی کمیٹی کے سامنے اس تجویز
کو پیش کروں گا۔ قلیوں کے لئے علحدہ علحدہ مکانات بنوانے کی ضرورت
نہیں۔ لمبی لمبی بارکیں بنوا دی جائیں تاکہ ایک ایک کمرہ میں دس
بارہ مزدور رہ سکیں ؎

پربھو سیوک۔ لیکن بہت سے قلی ایسے بھی تو ہوں گے جو بال بچوں
کے ساتھ رہنا چاہیں گے ؎

مسز سیوک۔ قلیوں کے بال بچوں کو وہاں جگہ دی جائے گی تو ایک شہر
آباد ہو جائے گا۔ تمہیں اُن سے کام لینا کہ اُنہیں آباد کرنا ہے۔ جیسے
فوج کے سپاہی رہتے ہیں اُسی طرح قلی لوگ بھی رہیں گے۔ ایک چھوٹا
سا چرچ ضرور ہونا چاہئے۔ پادری کے لئے ایک مکان کا ہونا بھی
ضروری ہے ؎

ایشور سیوک۔ خدا تجھے سلامت رکھے بیٹی۔ تیری یہ رائے مجھے

بہت پسند آئی۔ قلیوں کے لئے روحانی غذا جسمانی غذا سے کم ضروری نہیں خداوند یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا۔ کتنی عمدہ تجویز ہے۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ دن کب آئے گا جب قلیوں کے دل مسیح کے کلام پاک سے آسودہ ہو جائیں گے۔

جان سیوک۔ لیکن یہ تو خیال کیجئے کہ میں اس مذہبی تحریک کی تجویز کو کمیٹی کے سامنے کیوں کر رکھ سکوں گا؟ میں اس کا مختار کل تو نہیں ہوں۔ دیگر ممبران کمیٹی نے مخالفت کی تو اس کا کیا جواب دوں گا؟ میرے سوا کمیٹی میں اور کوئی عیسائی نہیں ہے۔ میں اس تجویز کو کمیٹی کے روبرو ہرگز نہ رکھوں گا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس تجویز میں کتنی مذہبی جانبداری ہے۔

مسز سیوک۔ جب کوئی مذہبی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو تم خواہ مخواہ اس میں اعتراض کرتے ہو۔ ہندو قلی تو جلا ہی کسی درخت کے نیچے دو چار اینٹ پتھر رکھ کر انہیں پوجنا شروع کر دیں گے۔ مسلمان لوگ بھی کھلے میدان میں نماز پڑھ لیں گے۔ تو پھر چرچ سے کسی کو کیا خصومت ہو سکتی ہے؟

ایشور سیوک۔ خداوند یسوع مجھ پر اپنی برکتوں کی بارش کر۔ بائبل مقدس کی بشارتیں تو ہر شخص کے لئے راحت بخش ہیں۔ اُن کی اشاعت میں کسی کو کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کچھ اعتراض ہو بھی تو تم اس دلیل سے اُسے رد کر سکتے ہیں بادشاہ کا مذہب ہی مذہبوں کا بادشاہ ہے۔ آخر سرکار نے مذہبی اشاعت کا محکمہ کھولا ہے تو کون اعتراض کرتا ہے اور کرے بھی تو کون سنتا ہے؟ میں

آج ہی اِس معاملہ کو چرچ میں پیش کروں گا اور حکام کو مجبور کروں گا کہ وہ کمپنی پر دباؤ ڈالیں۔ مگر یہ تمہارا کام ہے میرا نہیں۔ تمہیں خود اِن باتوں کا خیال ہونا چاہئے۔ نہ ہوئے مسٹر کلارک اُس وقت!

مسز سیوک۔ وہ ہوتے تو پھر کوئی دقت ہی نہ ہوتی۔

جان سیوک۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس تجویز کو کیسے پیش کروں۔ اگر کمپنی کوئی مندر یا مسجد بنوانے کی تجویز کرتی تو میں بھی چرچ کی تعمیر پر زور دیتا۔ لیکن جب تک اور لوگ پیش قدمی نہ کریں میں کچھ نہیں کر سکتا اور نہ کرنا مناسب ہی سمجھتا ہوں۔

ایشور سیوک۔ ہم اوروں کے پیچھے پیچھے کیوں چلیں؟ ہمارے ہاتھوں میں چراغ ہے۔ کندھے پر لاٹھی ہے۔ کمر میں تلوار ہے۔ پیروں میں طاقت ہے۔ ہم کیوں نہ آگے چلیں؟ کیوں دوسروں کا منہ تاکیں؟

مسٹر جان سیوک نے اپنے والد سے زیادہ بحث مباحثہ فضول سمجھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ آدھی رات تک پربھو سیوک کے ساتھ بیٹھے ہوئے مختلف طریقوں پر نقشے بناتے اور بگاڑتے رہے۔ کدھر کی زمین لی جائے۔ کتنی زمین کافی ہوگی۔ کتنا صرفہ ہوگا۔ کتنے مکان بنیں گے۔ پربھو سیوک "ہاں ہاں" کرتا جاتا تھا۔ ان باتوں میں جی نہ لگتا تھا۔ کبھی اخبار دیکھنے لگتا کبھی کوئی کتاب اُلٹنے پلٹنے لگتا۔ کبھی اُٹھ کر برآمدہ میں چلا جاتا۔ لیکن انہاک باریک بین نہیں ہوتا۔ مقرر اپنی تقریر کے جوش میں یہ کب دیکھتا ہے کہ سامعین میں کتنوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ پربھو سیوک کو اس وقت ایک نیا عنوان سوجھا تھا اور اس نظم لکھنے کے لئے وہ بیتاب ہو رہا تھا۔ نئی نئی

تشبیہیں نئی نئی بندشیں کسی چشمہ پر تہہ کرآنے والے پھولوں کی طرح اُس کے دماغ میں دوڑتی چلی آرہی تھیں۔ وہ اُن کو جمع کرنے کے لئے بیقرار تھا۔ کیونکہ وہ ایک بار آکر۔ ایک بار اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے غائب ہوجاتی ہیں۔ بارہ بجے تک وہ اسی پریشانی میں مبتلا رہا۔ نہ بیٹھے بنتا تھا۔ نہ اُٹھتے۔ یہاں تک کہ اُسے جھپکیاں آنے لگیں۔ جان سیوک نے بھی اب آرام کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن جب پربھو سیوک پلنگ پر گیا تو نیند روٹھ چکی تھی۔ کچھ دیر تک تو اُس نے اُسے منانے کی کوشش کی۔ پھر لیمپ کے سامنے بیٹھ کر اسی عنوان پر نظم لکھنے لگا۔ ایک لمحہ بعد وہ کسی دوسری ہی دنیا میں تھا۔ وہ دیہاتیوں کی طرح صرافہ میں پہنچ کر اُس کی چمک دمک پر فریفتہ نہ ہوجاتا تھا۔ اگر اُس دنیا کی ہر چیز مزین معطر۔ دلکش اور خوش گوار معلوم ہوتی تھی۔ مگر کتنی ہی چیزوں کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر صرف سنہرا پرت چڑھا ہوا ہے۔ اصل میں وہ یا تو پرانی ہے یا مصنوعی۔ ہاں جب اُسے واقعی کوئی نیا جواہر مل جاتا تھا تو اُس کا چہرہ شگفتہ ہوجاتا تھا۔ صناع اپنی صنعت کا بہترین نقاد ہوتا ہے۔ پربھو سیوک کے تخیل نے کبھی اتنی بلند پروازی نہ دکھائی تھی۔ ایک ایک شعر لکھ کر وہ اُسے گا گا کر پڑھتا اور جھومتا۔ جب نظم ختم ہوگئی تو وہ سوچنے لگا ـــــ دیکھوں شعرائے وقت اِسے کتنا پسند کرتے ہیں۔ اڈیٹروں کی تعریف کی تو کوئی وقعت نہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سخن فہم ہوں۔ کسی نئے ناآشنا شاعر کی بڑھیا سے بڑھیا نظم قبول نہ کریں گے۔ مگر پرانے شعراء کی سڑی گلی۔ گھٹیا اور بھرتی والی نظمیں بھی منظور کرلیں گے۔

شعراء کا یہ حال کہ وہ سخن فہم ہوتے ہوئے بھی کنجوس ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹے موٹے تک بندوں کی چاہے تعریف کر دیں مگر جسے اپنا مخالف سمجھتے ہیں اُس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ کنور صاحب تو فرد پھڑک جائیں گے۔ کاش ونے سنگھ یہاں ہوتے تو میرا قلم چوم لیتے۔ کل کنور صاحب سے کہوں گا کہ میرے کلام کا مجموعہ شائع کرا دیجئے۔ زمانہ حال کے نئے طرز والے شعراء میں تو کسی کو مجھ سے مقابلہ کرنے کا دعوےٰ ہو نہیں سکتا اور پُرانے طرز کے شعراء سے میرا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ میرے اور اُن کے تخیل کے دائرے جُدا جُدا ہیں۔ اُن کے یہاں زبان کی دلکشی ہے۔ عروض کی کوئی غلطی نہیں۔ کھوجنے پر بھی کوئی نقص نہ ملے گا۔ لیکن مضمون آفرینی کا نام ہی نہیں۔ اصلیت کا کہیں پتہ نہیں۔ وہی پُرانی زمینیں ہیں وہی پامال مضامین۔ خیالات کی تازگی عموماً نظر نہیں آتی۔ دس بیس اشعار پڑھنے پر کہیں ایک بات ملتی ہے یہاں تک کہ تشبیہیں بھی وہی پُرانی جو پُرانے شاعروں نے باندھ رکھی ہیں۔ میری زبان اتنی شستہ نہ ہو لیکن بھرتی کے لئے تو میں نے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ ایسا لکھنے سے فائدہ کیا؟

صبح وہ مُنہ ہاتھ دھوکر اور نظم کو جیب میں رکھ کر بلا ناشتہ کئے ہوئے گھر سے چلا تو جان سیوک نے پوچھا۔ کیا ناشتہ نہ کرو گے اتنے سویرے کہاں جاتے ہو؟

پربھو سیوک نے بیرخی سے جواب دیا۔ ذرا کنور صاحب کی طرف جا رہا ہوں۔

جان سیوک۔ تو اُن سے کل کی تجویز کے متعلق گفتگو کرنا۔ اگر وہ متفق ہو جائیں تو پھر کسی کو مخالفت کرنے کی جُرأت نہ ہو ۔

مسز سیوک۔ وہی چرچ کے بارہ میں نا؟

جان سیوک۔ اجی نہیں۔ تمہیں اپنے چرچ ہی کی پڑی ہوئی ہے میں نے تجویز کیا ہے کہ پانڈے پور کی بستی خالی کرا لی جائے اور وہیں قلیوں کے مکانات تعمیر کرائے جاویں۔ اس سے بہتر یہاں کوئی دوسری جگہ نظر نہیں آتی ۔

پربھو سیوک۔ رات کو تو آپ نے اُس بستی کے لینے کا تذکرہ نہ کیا تھا ۔

جان سیوک۔ نہیں آؤ۔ ذرا یہ نقشہ دیکھو۔ بستی کے باہر کی طرف کافی زمین نہیں ہے۔ ایک طرف سرکاری پاگل خانہ ہے دوسری طرف رائے صاحب کا باغ۔ تیسری طرف ہماری مِل۔ بستی کے سوا اور جگہ ہی کہاں ہے؟ اور پھر بستی ہی کون سی بڑی! مشکل سے پندرہ بیس یا زیادہ سے زیادہ تیس گھر ہوں گے۔ اُن کا معاوضہ دے کر زمین لینے کی کیوں نہ کوشش کی جائے؟

پربھو سیوک۔ اگر بستی کو اُجاڑ کر مزدوروں کے لئے مکانات بنوانے ہیں تو رہنے ہی دیجئے۔ کسی نہ کسی طرح گزر تو ہو ہی رہا ہے ۔

جان سیوک۔ اگر ایسی بستیوں کی حفاظت کا خیال کیا گیا ہوتا تو آج یہاں ایک بنگلہ بھی نہ نظر آتا۔ یہ بنگلے اُس میں نہیں بنے ہیں ۔

پربھو سیوک۔ مجھے ایسے بنگلے سے جھونپڑا ہی پسند ہے جس کے لئے کئی غریبوں کے گھر گرانے پڑیں۔ میں کنور صاحب سے اس بارہ

میں کچھ نہ کہوں گا۔ آپ خود کہئے گا۔

جان سیوک۔ یہ تمہاری پست ہمتی ہے۔ میں اسے قناعت اور رحم کہہ کر تمہیں دھوکے میں نہ ڈالوں گا۔ تم زندگی کی آسائشیں تو چاہتے ہو لیکن اُن آسائشوں کے لئے جن ذرائع کی ضرورت ہے اُن سے دور بھاگتے ہو۔ ہم نے تمہیں عملی طریقہ پر کبھی دولت واقتدار سے متنفر ہوتے نہیں دیکھا۔ تم اچھے سے اچھا مکان اچھے سے اچھا کھانا اچھے سے اچھا کپڑا چاہتے ہو لیکن بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہی چاہتے ہو کہ تمہارے منہ میں کوئی شہد اور شربت ٹپکا دے۔

پربھو سیوک۔ رسم ورواج سے مجبور ہو کر انسان کو اکثر اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنا پڑتا ہے۔

جان سیوک۔ جب آسائشوں کے لئے تم رسم ورواج سے مجبور ہو جاتے ہو تو آسائشوں کے وسایل کے لئے کیوں انہیں باتوں سے مجبور نہیں ہوتے؟ تم دل اور زبان سے موجودہ طرز معاشرت کی کتنی ہی بُرائی کیوں نہ کرو۔ مجھے ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا۔ تم اس بارہ میں کچھ دو نظمیں لکھو مضامین تیار کرو۔ میں خوش ہو کر انہیں پڑھوں گا اور تمہاری تعریف کروں گا۔ لیکن عملی دائرہ میں آکر اُن خیالات کو اسی طرح بھول جاؤ جیسے اچھے سے اچھا سوٹ پہن کر موٹر پر سیر کرتے وقت تم قناعت ایثار اور نفس کشی کے اصولوں کو بھول جاتے ہو۔

پربھو سیوک اور کتنے ہی آسایش پسندوں کی طرح اصولاً جمہوریت کے قایل تھے۔ جن حالات میں اُن کی پرورش ہوئی تھی۔ جن طریقوں سے اُن کی دماغی اور روحانی تربیت ہوئی تھی اُن سے آزاد ہو جانے

کے لئے جس اخلاقی جرأت کی جس طاقت کی ضرورت ہے۔ اُس سے وہ محروم تھے۔ وہ خیالی دائرہ میں ایثار کے جذبات کو جگہ دے کر خوش ہوتے تھے اور اُن پر فخر کرتے تھے۔ انہیں شاید کبھی سُوجھا ہی نہ تھا کہ ان جذبات کو عملی جامہ بھی پہنایا جا سکتا ہے۔ وہ باقاعدگی کے اتنے پابند تھے کہ اپنی آسائشوں کو اُن جذبات پر قربان کر دیتے جمہوریت اُن کے لئے تفریح کا ایک مسئلہ تھا اور بس۔ آج تک کبھی کسی نے ان کے طرز عمل کی تنقید نہ کی تھی۔ کسی نے انہیں طنز کا نشانہ نہ بنایا تھا۔ اور دوستوں پر اپنی آزاد خیالی کی دھاک جمانے کے لئے اُن کے ویسے خیالات ہی کافی تھے۔ کنور بھرت سنگھ کے ترکِ تعلق اور ایثار کا اُن پر اس لئے اثر نہ ہوتا تھا کہ وہ اُن کو زیادہ اونچے درجہ کا انسان سمجھتے تھے۔ اشرفیں کی تھیلی مخمل کی ہو یا کھدر کی۔ زیادہ فرق نہیں۔ والد کی زبان سے یہ طنز سُن کر ایسا تلملا اُٹھے گویا تازیانہ لگا یا گیا ہو۔ آگ چاہے پھوس کو نہ جلا سکے۔ آہنی کیل چاہے مٹّی میں نہ سما سکے۔ کانچ چاہے پتھر کی چوٹ سے نہ ٹوٹ سکے۔ طنز شاید ہی کبھی دل کو متحرک کرنے اُس میں چبھنے اور اُسے چوٹ پہنچانے میں ناکامیاب ہوتا ہو۔ خصوصاً جب وہ اُس آدمی کی زبان سے نکلے جو ہماری زندگی کو بنا یا بگاڑ سکتا ہو۔ پربھو کو گویا کالی ناگن نے ڈس لیا جس کے کاٹے کو لہر بھی نہیں آتی۔ اُن کی سوئی ہوئی غیرت جاگ اُٹھی۔ انہیں اپنی پستی کا علم ہوا۔ کنور صاحب کے یہاں جانے کو تیار تھے۔ گاڑی تیار کرائی تھی مگر وہاں نہ گئے۔ آ کر اپنے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ وہ آبدیدہ ہو گئے۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں اتنے دنوں تک مغالطہ میں پڑا رہا بلکہ اس خیال سے کہ والد کو میرا رہنا شاق

گزرتا ہے۔ ان باتوں کے سننے پر اب میرے لئے ڈوب مرنے کی بات ہوگی۔ اگر میں اُن پر اپنی زندگی کا بار ڈالوں۔ مجھے خود اپنی معاش کا مسئلہ حل کرنا چاہئے۔ اُنہیں کیا معلوم نہیں تھا کہ میں رسم و رواج سے مجبور ہو کر ہی اِس عیش پسندی میں پڑا ہوا ہوں؟ ایسی حالت میں مجھے اُن کا طعنہ دینا سراسر بے انصافی ہے۔ اتنے دنوں تک نقلی زندگی بسر کرنے کے بعد اب میرے لئے یکایک اپنا طرزِ معاشرت تبدیل کرنا غیر ممکن ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ میرے دل میں ایسے خیالات پیدا ہوئے۔ اِن خیالات کے ہوتے ہوئے میں کم از کم اوروں کی طرح خود غرض اور لالچی تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں بیفایدہ اس قدر افسوس کر رہا ہوں مجھے تو خوش ہونا چاہئے کہ پاپا نے وہ کام کر دیا جو ارادہ اور اصول سے ممکن نہ ہُوا تھا۔ اب مجھے اُن سے کچھ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں۔ اُنہیں شاید میرے چلے جانے سے رنج بھی نہ ہوگا۔ اُنہیں خوب معلوم ہوگیا ہے میری ذات سے اُن کی دولت پرستی آسودہ نہیں ہو سکتی۔ آج یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ چل کر کنور صاحب سے کہتا ہوں کہ مجھے بھی رضاکاروں میں شامل کر لیجئے۔ کچھ دنوں تک اُس زندگی کا لطف بھی حاصل کر دوں۔ دیکھوں مجھ میں اور بھی کسی کام کی قابلیت ہے یا صرف نظم ہی لکھ سکتا ہوں۔ اب کوہستانی چوٹیوں کی سیر کروں گا۔ دیہاتوں میں گھوموں گا۔ قدرتی مناظر کو دیکھوں گا۔ روز نیا دانہ نیا پانی نئی تفریح نئے منظر۔ اِس سے زیادہ مسرت خیز اور کون زندگی ہو سکتی ہے؟ تکلیف بھی ہوگی۔ دھوپ ہے۔ بارش ہے۔ سردی ہے۔ خوفناک جانور ہیں۔ مگر تکلیفوں سے تو میں کبھی

خوف زدہ نہیں ہوا۔ اُلجھن تو مجھے خانہ داری کے جھنجھٹوں سے ہوتی ہے۔ یہاں کتنی ذلّت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ روٹیوں کے لئے دوسروں کی غلامی اپنی خواہش کو دوسروں کا محتاج بنادیا! نوکر اپنے آقا کو دیکھ کر کیسا دبک جاتا ہے۔ اُس کے چہرہ پر کتنا انکسار کتنا خوف چھا جاتا ہے۔ میں اپنی آزادی کی اب سے زیادہ قدر کرنا سیکھوں گا۔"

دوپہر کو جب گھر کے سب لوگ پنکھوں کے نیچے آرام سے سوئے تو پھر پربھوسیوک نے چپکے نکل کر کنور صاحب کے گھر کا راستہ لیا۔ پہلے تو جی میں آیا کہ کپڑے اُتار دوں اور صرف ایک کُرتہ پہن کر چلا جاؤں۔ مگر ایسے پھٹے جاموں گھر سے کبھی نہ نکلا تھا۔ کپڑے بدل ڈالنے کے لئے شاید خیالات بدل ڈالنے سے زیادہ اخلاقی ہمّت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے صرف اپنی نظموں کی بیاض لے لی اور چل کھڑا ہوا۔ اُسے ذرا بھی ملال نہ ہُوا۔ ذرا بھی پشیمانی نہ تھی۔ ایسا خوش تھا جیسے قید سے چھوٹا ہو۔ "آپ لوگوں کو اپنی دولت مبارک ہو۔ پاپا نے مجھے بالکل بے غیرت۔ بے حس اور آرام پسند سمجھ رکھا ہے۔ جبھی تو ذراسی بات پر اُبل پڑے۔ اب اُنہیں معلوم ہو جائیگا کہ میں بالکل مُردہ نہیں ہوں۔"

کنور صاحب دوپہر کو سونے کے عادی نہ تھے۔ فرش پر لیٹے کچھ سوچ رہے تھے۔ پربھوسیوک جاکر بیٹھ گئے۔ کنور صاحب نے کچھ نہ پوچھا۔ کیسے آئے کیوں اُداس ہو۔ نصف گھنٹہ تک بیٹھے رہنے کے بعد بھی پربھوسیوک کو اُن سے اپنے بارہ میں کچھ کہنے کی ہمّت نہ

پڑی۔ کوئی تمہید نہ سوجھتی تھی۔ کنور صاحب آج تم گم کیوں ہیں؟ کیا میری صورت سے تاڑ تو نہیں گئے۔ کہ کچھ حاجت لے کر آیا ہے؟ یوں تو مجھے دیکھتے ہی خوش ہو جاتے تھے۔ دوڑ کر سینہ سے لگاتے تھے۔ آج مخاطب ہی نہیں ہوتے۔ دوسروں کا منہ تاکنے کی یہی سزا ہے۔ میں بھی گھر سے چلا تو ٹھیک دوپہر کو۔ جب چڑیاں تک گھونسلوں سے نہیں نکلتی۔ آنا تھا تو شام کو آتا۔ اس جلتی ہوئی دھوپ میں کوئی غرض کا باؤلا ہی گھر سے نکل سکتا ہے۔ خیر یہ پہلا تجربہ ہے" وہ مایوس ہو کر چلنے کے لئے اُٹھے کہ بھرت سنگھ بولے۔ کیوں کیوں جلدی کیا ہے؟ کیا اس لئے کہ میں نے باتیں نہیں کیں؟ باتوں کی کمی نہیں ہے۔ اتنی باتیں تم سے کرنی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شروع کیونکر کروں۔ تمہاری رائے میں ونے نے ریاست کا پلّہ پکڑنے میں غلطی کی؟

پربھو سیوک نے پس و پیش میں پڑ کر کہا۔ اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے۔

کنور۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے بُرا کیا۔ اُس کی ماں کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ تو اتنی برہم ہیں کہ اُس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اُس نے جو روش اختیار کی ہے اُس پر شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شاید اُن حالتوں میں میں بھی یہی کرتا۔ صوفیا سے اُسے محبت نہ ہوتی تو بھی اس موقع پر رعایا نے جو بغاوت کی وہ اُس کے جمہوریت کے اصولوں کو متزلزل کر دینے کے لئے کافی تھی۔ مگر جب یہ مسلّمہ ہے کہ صوفیا کی محبت اُس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے تو اُس کا طرزِ عمل صرف قابلِ عفو نہیں بلکہ قابلِ

ستائش ہے۔ وہ مذہب تو محض جماعتی ہے جس کی رو سے اپنی برادری کے باہر شادی کرنا ممنوع ہو کیونکہ اس سے اُسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مذہب اور معرفت دونوں مترادف ہیں اور اس نقطۂ خیال سے دنیا میں صرف ایک مذہب ہے۔ ہندو مسلمان عیسائی یہودی بدھ۔ یہ مذہب نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف اغراض والی گروہ بندیاں ہیں جن سے نقصان کے سوا آج تک کسی کو نفع نہیں پہنچا۔ اگر دنیا اتنا خوش نصیب ہو کہ صوفیا سے رشتۂ عقد قائم کر سکے۔ تو کم از کم مجھے ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا۔

پربھو سیلوک۔ مگر آپ جانتے ہیں اس معاملہ سے رانی صاحبہ جس قدر سخت ہیں اُتنا ہی میری ما ما بھی ہیں۔

کنور۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دونوں کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ یہ دونوں انمول جواہر مذہب کے ہاتھوں مٹی میں مل جائیں گے۔

پربھو سیلوک۔ میں تو خود ان جھگڑوں سے اتنا تنگ آگیا ہوں کہ میں نے گھر سے الگ ہو جانے کا مصمم قصد کر لیا ہے۔ گھر کی مذہبی آب و ہوا معاشرتی قیود سے میری روح کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ گھر سے نکل جانے کے سوا اب مجھے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ مجھے تجارت سے پیشتر ہی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور اب اتنے دنوں کے تجربہ کے بعد تو مجھے اُس سے نفرت ہو گئی ہے۔

کنور۔ لیکن تجارت تو نئی تہذیب کا سب سے بڑا جزو ہے۔ تمہیں اُس سے کیوں اس قدر نفرت ہے؟

پربھو سیلوک۔ اس لئے کہ تجارت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے

جتنی خود غرضی اور مردم آزاری کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ مجھ میں اتنا انہماک ہی نہیں ہے۔ میں فطرتاً تنہائی پسند واقع ہوا ہوں۔ اور زندگی کی کشمکش میں اُس سے زیادہ نہیں پڑنا چاہتا جتنا میرے فن کی تکمیل اور اُس میں واقفیت کا رنگ لانے کے لئے کافی ہو۔ شعراء بالعموم تنہائی پسند ہی ہوا کئے ہیں مگر اس سے اُن کی شاعری میں کوئی نقصان نہیں آنے پایا۔ ممکن تھا کہ وہ زندگی کا وسیع اور کافی تجربہ حاصل کر کے اپنے کلام کو زیادہ دلچسپ بنا سکتے لیکن اُس کے ساتھ یہ اندیشہ بھی تھا کہ زندگی کی کشمکش میں پڑ جانے سے اُن کے تخیل میں کمی واقع ہو جاتی۔ ہومر اندھا تھا۔ سور بھی اندھا تھا ملٹن بھی اندھا تھا۔ مگر یہ سبھی ادبی آسمانی کے روشن ستارے ہیں۔ والمیک اور تلسی جیسے شہرۂ آفاق شعراء دُنیا سے الگ کٹیوں میں بسنے والے لوگ تھے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کی گوشہ نشینی سے اُن کے کلام میں نقص آگیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ میرے خیالات کیسے ہوں گے مگر اُس وقت دولت پرستی سے بیزار ہو رہا ہوں ۔

کنور۔ تم تو اتنے بیزار کبھی نہ تھے۔ آخر بات کیا ہے؟

پربھو سیوک نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ اب تک عملی زندگی کے رموز سے واقف نہ تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ واقعی حالت اُس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔ تجارت کچھ نہیں ہے اگر مردم آزاری نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک انسانوں کو جانور سمجھنا اور اُن سے اُسی طریقہ پر برتاؤ کرنا اس کا اصل اصول ہے۔ جو یہ نہیں کر سکتا وہ کامیاب تاجر نہیں ہو سکتا۔ کارخانہ ابھی بن کر تیار نہیں ہوا اور توسیع

اراضی کی ضرورت پیدا ہوگئی۔ مستری اور کاری گروں کے لئے بستی میں رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ مزدوروں کی تعداد بڑھے گی تو وہاں گذر بھی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے پاپا کی رائے ہے کہ اُسی قانونی دفعہ کے مطابق پانڈے پور پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔ راجہ مہیندر کمار کی پاپا سے دوستی ہے اور موجودہ حاکم ضلع مسٹر سینا پت رئیسوں سے اتنا ہی ربط ضبط رکھتے ہیں جتنا مسٹر کلارک اُن سے دور رہتے تھے۔ پاپا کی تجویز بلا کسی دقت کے منظور ہو جائے گی اور محلہ والے جبراً نکال دیئے جائیں گے۔ مجھ سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔ مگر اتنا تو کر سکتا ہوں کہ اُس سے بالکل الگ رہوں ؎

کنور۔ تمہارے خیال میں کمپنی کو نفع ہوگا؟

پربھو سیوک۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ہی سال ۲۵ فی صدی نفع ہوگا ؎

کنور۔ تو کیا تم نے کارخانہ سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا؟

پربھو سیوک۔ ہاں پورا فیصلہ کر لیا ؎

کنور۔ تمہارے پاپا کام سنبھال سکیں گے؟

پربھو سیوک۔ پاپا تو اس قسم کے نصف درجن کارخانوں کو سنبھال سکتے ہیں۔ اُن میں عجیب قابلیت ہے۔ زمین کی تجویز بہت جلد انتظامیہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوگی۔ میری آپ سے یہ خاص التجا ہے کہ آپ اُسے منظور نہ ہونے دیں ؎

کنور (مسکرا کر) بڈھا آدمی اتنی آسانی سے نئی تعلیم نہیں حاصل کر سکتا۔ بُوڑھا طوطا رام رام کہنا نہیں سیکھتا۔ مجھے تو اس میں کوئی ہرج

نہیں معلوم ہوتا کہ بستی والوں کو معاوضہ دے کر زمین لے لی جاوے۔ ہاں معاوضہ مناسب ہونا چاہئے۔ جب تم کارخانہ سے الگ ہی ہو رہے ہو تو تمہیں ان جھگڑوں سے کیا واسطہ؟ یہ تو دنیا کے دھندے ہیں ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے ۔

پربھوسیوک۔ تو آپ اس تجویز کی مخالفت نہ کریں گے؟

کنور۔ میں کسی ایسی تجویز کی مخالفت نہ کروں گا جس سے کارخانہ کا نقصان ہو۔ کارخانہ سے میری غرض کا تعلق ہے۔ میں اُس کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ ہاں تمہارا وہاں سے نکل آنا میری سیوا سمتی کے لئے مبارک فال ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ سمتی کے منیجر ڈاکٹر گنگولی ہیں مگر کچھ تو سن رسیدہ ہونے کے سبب اور کچھ کونسل کے کاموں میں زیادہ مصروف رہنے کے باعث وہ اس بار سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ تم اس بار کو اپنے کندھوں پر لو۔ سمتی کی کشتی اس وقت منجدھار میں ہے۔ دنے کی ردش نے اُسے اس خوفناک حالت میں ڈال دیا ہے۔ تمہیں ایشور نے علم عقل حوصلہ سب کچھ دیا ہے تم چاہو تو سمتی کو بچا سکتے ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کرو گے؟

پربھوسیوک کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ وہ اپنے کو اس عزت کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ بولے میں اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ مجھ جیسا ناتجربہ کار اور سست آدمی سمتی کو ترقی نہیں دے سکتا۔ یہ آپ کی نوازش ہے کہ مجھے اس قابل خیال کرتے ہیں۔ میرے لئے تو صف ہی کافی ہے ۔

کنور صاحب نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ تم جیسے آدمیوں کو

صف میں نہ رکھوں تو افسر کہاں سے لاؤں ؟ مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں
ڈاکٹر گنگولی کے ساتھ رہ کر تم اس کام میں ہوشیار ہو جاؤ گے۔ شریف لوگ
ہمیشہ اپنی قابلیت کی بیقدری کرتے ہیں پر میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں
تم میں عجیب برقی قوت ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ جتنی تم سمجھتے ہو۔ عربی
گھوڑا ہل میں نہیں چل سکتا۔ اُس کے لئے تو میدان ہی چاہیئے۔ تمہاری
آزاد روح کارخانہ میں تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ دُنیا کے وسیع میدان
میں نکل کر اُس کے پَر لگ جائیں گے۔ میں نے رمنی کو اِس عہدہ کے
لئے منتخب کر رکھا تھا مگر اُس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر مجھے اب اُس
پر اعتماد نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جماعت کو ایسی عمدہ حالت
میں چھوڑ جاؤں کہ وہ بلا کسی رکاوٹ کے اپنا کام کرتی رہے۔ ایسا
نہ ہوا تو میں اطمینان سے مر بھی نہ سکوں گا۔ تمہارے اوپر مجھے بھروسہ
ہے کیونکہ تم بےغرض ہو۔ پربھوسیوک۔ میں نے اپنی زندگی کا بہت بُرا
استعمال کیا ہے۔ اب پیچھے پھر کر اُس پر نظر ڈالتا ہوں تو کوئی جزو ایسا
نہیں دکھائی دیتا جس پر میں فخر کر سکوں۔ ایک ریگستان ہے جہاں
سبزی کا نشان نہیں۔ اس جماعت پر میری زندگی بھر کی بداعمالیوں
کا بار لدا ہوا ہے۔ یہی میرے کفارہ کا ذریعہ اور میری نجات کا وسیلہ
ہے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میرا یہ خدمتی گروہ
دُنیا میں کچھ کر دکھائے۔ اُس میں خدمت کا جوش ہو۔ قربانی کی لگن ہو۔
قومی عزت کا گھمنڈ ہو۔ جب میں ایسے لوگوں کو مُلک پر قربان ہوتے
دیکھتا ہوں جن کے پاس جان کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو مجھے اپنے
اوپر رونا آتا ہے کہ میں نے سب کچھ رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کیا۔ میرے لئے

اِس سے زیادہ مہلک اور کوئی صدمہ نہیں ہے کہ یہ جماعت اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ میں اس کے لئے اپنا سب کچھ ارپن کرنے کو تیار ہوں میں نے دس لاکھ روپے اس کھاتہ میں جمع کر دیئے ہیں اور ارادہ ہے کہ اس پر ایک لاکھ سالانہ کا اضافہ کرتا رہوں۔ کم از کم پانچ سو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر میں دس سال بھی اور زندہ رہا تو شاید میری یہ مُراد پوری ہو جاوے۔ اندردت میں اور سب اوصاف تو ہیں مگر وہ متحمل مزاج نہیں ہے۔ اس وجہ سے میرا دل اُس پر نہیں جمتا۔ میں تم سے باصرار......

ڈاکٹر گنگولی آ پہنچے اور پربھوسیوک کو دیکھ کر بولے۔ اچھا تم یہاں کنور صاحب کو منتر دے رہا ہے۔ تمہارا پاپا مہیندر کمار کو پٹی پڑھا رہا ہے۔ پر میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ ایسا بات نہیں ہو سکتا۔ تمہارا میل ہے۔ اُس کا فائدہ نکسان تم کو اور تمہارے حصّہ داروں کو ہوگا۔ غریبوں کو کیوں اُن کے گھر سے نکالتا ہے۔ پر میری کوئی نہیں سُنتا۔ ہم کڑوا بات کہتا ہے نا۔ وہ کاہے کو اچھا لگے گا ہم کونسل میں اس پر سوال کرے گا۔ یہ کوئی بات نہیں ہے کہ آپ لوگ اپنے فائدہ کے لئے دوسروں پر انیائے کرے۔ سرکار رئیس لوگ ہم سے ناراج ہو جائے گا۔ ہم کو پرواہ نہیں ہے۔ ہم تو وہاں وہی کرے گا جو ہمارا آتما کہے گا۔ تم کو دوسرے کِسم کا آدمی چاہئے تو بابا ہم سے استیپھا استعفاء لے لو۔ پر ہم پانڈے پور کو اُجڑنے نہ دے گا کنور۔ یہ بیچارے تو خود ہی اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں آج اِسی بات پر باپ بیٹے میں بدمزگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ گھر سے چلے آئے

ہیں اور کارخانہ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے ۔

گنگولی ۔ اچھا ایسا بات ہے ۔ بہت اچھا ہُوا ۔ ایسا بچاروان (عقلمند) لوگ میل کا کام نہیں کر سکتا ۔ ایسا لوگ میل میں جائے گا تو ہم لوگ کہاں سے آدمی لائے گا ؟ پربھوسیوک ۔ ہم بُڑھا ہوگیا ۔ کل مرجائے گا ۔ تم ہمارا کام کیوں نہیں سنبھالتا ؟ ہمارا اولنٹیر لوگ تمہارا رسپکٹ کرتا ہے ۔ تم ہمیں اِس بوجھ سے ہلکا کر سکتا ہے ۔ بُڈھا آدمی اور سب کچھ کر سکتا ہے ۔ جوش تو اُس کے بس کا بات نہیں ۔ ہم تم کو اب نہ چھوڑے گا ۔ کونسل میں اتنا کام ہے کہ ہم کو اس کام کے لئے فرصت ہی نہیں ملتا ۔ ہم کاونسل میں نہ گیا ہوتا تو اودے پور میں یہ سب کچھ نہیں ہونے پاتا ۔ ہم جا کر سب کو شانت کر دیتا ۔ تم اتنا وِدّیا پڑھ کر اُس کو دھن کمانے میں لگائے گا ۔ چھی چھی !

پربھوسیوک ۔ میں تو خادموں میں بھرتی ہونے کے لئے گھر سے چلا ہی آیا ہوں پر میں سمتی کا افسر ہونے کے قابل نہیں ہوں ۔ وہ عہدہ تو آپ ہی کے لئے موزوں ہے ۔ مجھے سپاہیوں ہی میں رہنے دیجئے ۔ میں اِسی کو اپنے لئے عزت کی بات سمجھوں گا ۔

گنگولی (ہنس کر) ہاہا کام تو ناقابل لوگ ہی کرتا ہے ۔ قابل آدمی نہیں کرتا ۔ وہ بس باتیں کرتا ہے ۔ قابل آدمی کا مطلب ہے باتونی آدمی کھالی بات بات ۔ جو جتنا ہی بات کرتا ہے اُتنا ہی قابل ہوتا ہے ۔ وہ کام کا ڈھنگ بتا دے گا ۔ کہاں کون بھُول ہو گیا ۔ یہ بتا دے گا پر کام نہیں کر سکتا ۔ ہم ایسا قابل آدمی نہیں چاہتا ۔ ہمارے یہاں باتیں کرنے کا کام نہیں ہے ۔ ہم تو ایسا آدمی چاہتا ہے جو موٹا کھائے ۔ موٹا پہنے

گلی گلی اور نگر نگر دوڑے۔ گریبوں کا اُپکار کرے۔ مصیبت میں اُن کا مدد کرے، تو کب سے آئے گا؟

پربھوسیوک۔ میں تو ابھی سے حاضر ہوں ÷

گنگولی۔ (مسکراکر) تو پہلا لڑائی تم کو اپنے پاپا سے لڑنا پڑے گا ÷

پربھوسیوک۔ میرا خیال ہے کہ پاپا خواہی اس بات کو ترک کر دینگے

گنگولی۔ نہیں نہیں۔ وہ کبھی اپنا بات نہیں چھوڑے گا۔ ہم کو اُس سے لڑائی کرنا پڑے گا۔ تم کو اُس سے لڑنا پڑے گا۔ ہماری سمتی نیائے کو سب سے اوپر مانتا ہے۔ نیائے ہم کو ماں باپ ہے۔ دھن دولت ہے۔ نام اور جس (نیک نامی) ہے۔ سب سے بڑھ کر پیارا ہے۔ ہم اور سب کچھ چھوڑ دے گا پر نیائے کو نہ چھوڑے گا۔ یہی ہمارا برت (عہد) ہے۔ تم کو کھوب سوچ بچار کر تب یہاں آنا ہوگا ÷

پربھوسیوک۔ میں نے خوب سوچ بچار لیا ہے ÷

گنگولی۔ نہیں نہیں۔ جلدی نہیں ہے۔ کھوب سوچ بچار لو۔ یہ تو اچھا نہیں ہوگا کہ ایک بار آکر تم پھر بھاگ جائے ÷

پربھوسیوک۔ اب موت ہی مجھے اِس جماعت سے جُدا کر سکتی ہے ÷

گنگولی۔ مسٹر جان سیوک تم سے کہے گا ہم نیائے انیائے کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ تم ہمارا بیٹا ہے۔ ہمارا حکم ماننا تمہارا دھرم ہے۔ تو تم کیا جواب دے گا؟ (ہنس کر) میرا باپ ایسا کہتا تو میں تو اُس سے کبھی نہ کہہ سکتا کہ ہم تمہارا بات نہ مانے گا۔ وہ ہم سے بولا تم بیرسٹر ہو جائے۔ ہم انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں سے بیرسٹر ہو کر آگیا۔ کئی سال تک کچہری جاکر بیپردکا غذم پڑھا کرتا تھا۔ جب [illegible] باپ کا [illegible] (وفات)

ہو گیا تو ڈاکٹری پڑھنے لگا۔ باپ کے سامنے ہم کو یہ کہنے کا ہمت نہیں ہوا کہ ہم کانون نہیں پڑے گا۔

پر بھوسیلوک۔ باپ کی عزت کرنا دوسری بات ہے اور اصول پر کاربند ہونا دوسری بات۔ اگر آپ کے فادر کہتے کہ جا کر کسی کے گھر میں آگ لگا دو تو آپ آگ لگا دیتے؟

گنگولی۔ نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہم کبھی آگ نہ لگاتا۔ چاہے ہمارا باپ ہمیں کو کیوں نہ جلا دیتا۔ لیکن باپ ایسا حکم دے بھی تو نہیں سکتا۔

دفعتاً رانی جاہنوی وارد ہوئیں۔ غم اور غصہ کی تصویر۔ بھویں تنی ہوئیں ماتھے پر شکن۔ گویا نہا کر پوجا کرنے کے لئے جاتے وقت کُتے نے چھو لیا ہو۔ گنگولی کو دیکھ کر بولیں —— آپ کی طبیعت کا تسلی سے نہیں تھکتی۔ میں تو زندگی سے تھک گئی۔ جو چاہتی ہوں وہ نہیں ہوتا۔ جو نہیں چاہتی وہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! سب کچھ سہا جاتا ہے پر بیٹے کا بُرا برتاؤ نہیں سہا جاتا۔ خاص کر ایسے بیٹے کا جس کے بنانے میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھی گئی ہو۔ نالائق جسونت نگر کے ہنگامہ میں مر گیا ہوتا تو مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔

کنور صاحب اور زیادہ نہ سن سکے۔ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ رانی نے اسی لہجہ میں کہا۔ یہ میرا دکھ کیا سمجھیں گے۔ اُن کی ساری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی ہے۔ نفس پرستی کے سامنے انہوں نے کبھی معیار کی پرواہ نہیں کی۔ دیگر رؤسا کی طرح تن پروری میں مشغول رہے۔ [illegible] کے لئے سخت ریاضت کی ہے۔ آسے ساتھ لے [illegible] میں پیدل چلی ہوں۔ صرف اس لئے کہ بچپن ہی سے

اُسے مشکلات کا عادی بناؤں۔ اُس کی ایک ایک بات اُس کے ایک
ایک کام کو غور سے دیکھتی رہی ہوں کہ اُس میں برائیاں نہ آجائیں۔
اگر وہ کبھی نوکر پر بگڑا ہے تو اُسے فوراً سمجھایا ہے۔ کبھی سچائی سے مُنہ
موڑتے دیکھا ہے تو فوراً تنبیہ کی ہے۔ یہ میرے درد دُکھ کا حال کیا
جانیں گے!

یہ کہتے کہتے رانی صاحبہ کی نگاہ پربھوسیوک پر پڑ گئی جو گوشہ میں
کھڑا کتابیں اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ اُن کی زبان بند ہو گئی۔ آگے کچھ نہ
کہہ سکیں۔ صوفیا کے متعلق جو سخت باتیں دل میں تھیں وہ دل ہی میں
رہ گئیں۔ صرف گنگولی سے اتنا کہا کہ جاتے وقت مجھ سے مل لیجئے گا اور
چلی گئیں ❖

(۳۵)

ونے سنگھ آبادی میں داخل ہوئے تو سویرا ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی
دور چلے تھے کہ ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔
اُنھیں دیکھ کر بولی۔ بیٹا! غریب ہوں۔ بن پڑے تو کچھ دے دو۔ دھرم
ہوگا ❖

نایک رام۔ سویرے سویرے رام نام نہیں لیتی۔ بھیک مانگنے چل کھڑی
ہوئی ہے۔ تجھے تو جیسے رات کو نیند ہی نہیں آتی۔ مانگنے کو تو دن بھر ہے۔

بڑھیا۔ بیٹا دُکھیا ہوں ❖

نایک رام۔ یہاں سکھیا کون ہے؟ رات بھر بھوکوں مرے مچھروں
کی گُھرکیاں کھائیں۔ پیر تو سیدھے [illegible] تمہیں کہاں سے
دے دیں؟

بُڑھیا۔ بیٹا دھوپ میں مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ سر میں چکر آجاتا ہے
نئی نئی بپتت ہے بھیّا۔ بھگوان اُس ادھم پاپی ونے سنگھ کا بُرا کرے
اُسی کے کارن بُڑھاپے میں یہ دن دیکھنا پڑا۔ نہیں تو بیٹا دکان کرتا
تھا۔ گھر میں رانی بنی بیٹھی رہتی تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ کون سا سُکھ نہیں
تھا؟ تم پردیسی ہو۔ نہ جانتے ہو گے۔ یہاں دنگا ہو گیا تھا۔ میرا لڑکا دکان
سے ہلا تک نہیں پر اُس نگوڑے ونے سنگھ نے گواہی دے دی کہ یہ بھی
دنگے میں ملا ہُوا تھا۔ پولیس ہمارے اوپر بہت دنوں سے دانت
لگائے تھی۔ کوئی داؤں نہ پاتی تھی۔ یہ گواہی پاتے ہی دوڑ آگئی۔ لڑکا
پکڑ لیا گیا اور اُسے تین سال کی سجا ہو گئی۔ ایک ہجار جرمانہ ہوا۔ گھر
کی بیس ہزار کی گرہستی تہس نہس ہو گئی۔ گھر میں بہو ہے۔ چھوٹے
چھوٹے بچے ہیں۔ اسی طرح مانگ جانچ کر اُنہیں پالتی پوستی ہوں۔ نہ
جانے اُس نکل مُنہے نے کب کا بیر نکالا۔

ونے نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر بڑھیا کو دیا اور آسمان
کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی۔ ایسی روحانی تکلیف اُنہیں کبھی نہ
ہوئی تھی۔

بُڑھیا نے روپیہ دیکھا تو چونک پڑی۔ سمجھی۔ شاید بھول سے دے دیا
ہے۔ بولی ــــ بیٹا۔ یہ تو روپیہ ہے۔

ونے سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاں لے جاؤ۔ میں نے بھول
سے نہیں دیا ہے۔

بُڑھیا دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ دونوں آدمی اور آگے بڑھے
تو راستے میں ایک کنواں ملا۔ اس پر ایک پیپل کا درخت تھا۔ ایک

چھوٹا سا مندر بھی بنا ہوا تھا۔ نایک رام نے سوچا۔ یہیں ہاتھ منہ دھو لیں۔ دونوں آدمی کنویں پر گئے تو دیکھا کہ ایک پنڈت جی پیپل کے نیچے بیٹھے پاٹھ کر رہے ہیں۔ جب وہ پاٹھ کر چکے تو ونے نے پوچھا۔ آپ کو معلوم ہے۔ سردار نیلکنٹھ آج کل کہاں ہیں؟

پنڈت جی نے سخت لہجہ میں کہا۔ ہم نہیں جانتے ٭

ونے۔ پولیس کے انسپکٹر تو ہوں گے؟

پنڈت۔ کہہ دیا۔ میں نہیں جانتا ٭

ونے۔ مسٹر کلارک تو دورہ پر ہوں گے؟

پنڈت۔ میں کچھ نہیں جانتا ٭

نایک رام۔ پوجا پاٹھ میں دیس، دنیا کی سُدھ ہی نہیں ٭

پنڈت۔ ہاں۔ جب تک منو کامنا (دلی خواہش) نہ پوری ہو جائے۔ تب تک مجھے کسی سے کچھ سروکار نہیں۔ سبیرے سبیرے تم نے ملیچھوں کا نام سُنا دیا۔ نہ جانے دن کیسے کٹے گا؟

نایک رام۔ وہ کون سی منو کامنا ہے؟

پنڈت۔ اپنے اپمان (توہین) کا بدلہ ٭

نایک رام۔ کس سے؟

پنڈت۔ اُس کا نام نہ لوں گا۔ کسی بڑے رئیس کا لڑکا ہے۔ کاسی سے گریبوں کی سہاتیا (مدد) کرنے آیا تھا۔ سینکڑوں گھر اُجاڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اُسی کے لئے یہ اُنشٹھان (پوجا) کر رہا ہوں۔ یہاں آدھا سہر میرا اججمان تھا۔ سیٹھ ساہوکار میرا بڑا آدر کرتے تھے۔ لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ ہاں بُرائی یہ تھی کہ ناجم کو سلام کرنے نہ جاتا

تھا۔ عملوں کی کوئی بُرائی دیکھتا تو اُن کے مُنہ پر کہہ دیتا۔ اِسی سے سب عملے مجھ سے جلتے تھے۔ پچھلے دنوں جب یہاں دنگا ہوا تو سبھوں نے اُسی بنارس کے گُنڈے سے مجھ پر بغاوت کا اپرادھ لگوا دیا۔ سزا ہو گئی۔ بپت پڑ گئے۔ جرمانہ ہو گیا۔ آبرو مٹّی میں مل گئی۔ اب نگر میں کوئی درواجے پر کھڑا نہیں ہونے دیتا۔ نراس ہو کر دیوی کی شرن آیا ہوں۔ پورشچرن کا پاٹھ کر رہا ہوں۔ جس دن سُنوں گا کہ اُس ہتیارے پر دیوی نے کوپ کیا۔ اسی دن میری تپسیا پوری ہو جائے گی۔ براہمن ہوں۔ لڑنا جھگڑنا نہیں جانتا۔ میرے پاس اس کے سوا اور کون سا ہتھیار ہے؟

وہ نے کسی شراب خانہ سے نکلتے ہوئے پکڑے جاتے تو بھی اتنے شرمندہ نہ ہوتے۔ اُنہیں اب اس براہمن کی صورت یاد آئی۔ یاد آیا کہ میں نے ہی پولیس کی ترغیب سے اسے پکڑا دیا تھا۔ جیب سے پانچ روپے نکالے اور پنڈت جی سے بولے — یہ لیجئے میری طرف سے بھی اُس بدمعاش کے لئے پورشچرن کا جاپ کر دیجئے گا۔ اُس نے مجھے بھی تباہ کر دیا ہے۔ میں بھی اُس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوں۔

پنڈت۔ مہاراج۔ آپ کا بھلا ہوگا۔ بیری کے دیہہ (جسم) میں کیڑے نہ پڑ جائیں تو کہئے گا کہ کوئی کہتا تھا۔ کتّوں کی موت مرے گا۔ یہاں سارا نگر اُس کا دُشمن ہے۔ اب تک اِس لئے اُس کی جان بچی کہ پولیس اُس کو گھیرے رہتی ہے۔ مگر کب تک؟ جس دن اکیلا گھر سے نکلا۔ اُسی دن دیوی کا اُس پر کوپ (قہر) گرا۔ ہے وہ اسی راج میں۔ کہیں باہر نہیں گیا ہے اور اب بچ کر جا ہی سکتا ہے۔ کال اس کے سر پر کھیل رہا ہے۔ اتنے دُکھیوں کی ہائے کیا اکارتھ جائے گی؟

جب یہاں سے اور آگے چلے تو ونے نے کہا — پنڈت جی۔ اب
جلد ایک موٹر طے کر دو۔ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے
اپنی جان کا اتنا خوف مجھے کبھی نہ ہُوا تھا۔ اگر ایسے ہی دو ایک نظارے
اور سامنے آئے تو شاید مَیں خود کشی کر لوں۔ آہ۔ میں کتنا گر گیا ہوں۔
اور اب تک میں یہی سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ میں نے
خدمت کا عہد کیا تھا۔ گھر سے دوسروں کی بھلائی کرنے چلا تھا۔ خوب
بھلائی کی۔ شاید یہ لوگ مجھے تمام عمر نہ بھولیں گے ؎

نایک رام۔ بھیّا۔ بھُول چُوک آدمی ہی سے تو ہوتی ہے۔ اب اُس
کا پچھتاوا نہ کرو ؎

ونے۔ نایک رام۔ یہ بھُول چُوک نہیں۔ ایشور کا قانون ہے۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ ایشور پاک عہد کرنے والوں کا سخت امتحان لیا کرتے ہیں۔
خادمِ قوم کا درجہ اِن امتحانات میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں ملتا۔ مَیں
امتحان میں فیل ہو گیا۔ بُری طرح فیل ہو گیا ؎

نایک رام نے سوچا تھا کہ ذرا جیل کے داروغہ صاحب سے خیر و
عافیت کا حال دریافت کرتے چلیں۔ لیکن موقع نہ دیکھا تو فوراً موٹر
سروس کے دفتر میں گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دربار نے سب موٹروں کو
ایک ہفتہ کے لئے روک لیا ہے ؎

مسٹر کلارک کے کئی دوست باہر سے شکار کھیلنے کو آئے ہوئے تھے
اب کیا ہو؟ نایک رام کو گھوڑے پر سوار ہونا نہ آتا تھا اور ونے کو
یہ مناسب نہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ تو سوار ہو کر چلے اور وہ پیدل ؎

نایک رام۔ بھیّا۔ تم سوار ہو جاؤ۔ میری کون [illegible] پڑ جاتے

تو دس کوس چل سکتا ہوں ؂
ونے - تو میں بھی ایسا کرن لگا جاتا ہوں - اب رات کی تھکاوٹ دور ہو گئی ؂
دونوں آدمیوں نے کچھ ناشتہ کیا اور رادھے پور کو روانہ ہو گئے -
آج ونے نے جتنی باتیں کیں - اتنی شاید اور کبھی نہ کی تھیں اور وہ بھی نایک رام جیسے لٹھ گنوار سے - صوفیا کی کڑی باتیں اسے اُنہیں بالکل ادنیٰ معلوم ہوتی تھیں - بولے ---- پنڈا جی سمجھ لو کہ اگر دربار نے ان سب قیدیوں کو چھوڑ نہ دیا جو میری شہادت سے سزایاب ہوئے ہیں تو میں اپنا منہ کسی کو نہ دکھلاؤں گا - میرے لئے یہی ایک اُمید باقی رہ گئی ہے - تم گھر جا کر ماتا جی سے کہہ دینا کہ وہ اپنی غلطی پر کتنا ملول کتنا نادم تھا ؂
نایک رام - بھیا تم گھر نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤں گا - اب تو جہاں تم ہو وہیں میں بھی ہوں - جو کچھ بیتے گی دونوں ہی پر بیتے گی ؂
ونے - بس تمہاری یہی بات بُری معلوم ہوتی ہے - تمہارا اور میرا کونسا ساتھ ہے ؟ میں پاپی ہوں - مجھے اپنے پاپوں کا پراشچت کرنا ہے - تمہارے ماتھے پر کوئی کلنک نہیں ہے - تم اپنی زندگی کیوں برباد کرو گے ؟ میں نے اب تک صوفیا کو نہیں پہچانا تھا - آج معلوم ہوا کہ وہ کتنی فراخ دل ہے - مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں ہے - ہاں شکایت صرف اس بات کی ہے کہ اُس نے مجھے اپنا نہ سمجھا - وہ اگر سمجھتی کہ یہ میرے ہیں تو میری ایک ایک بات کیوں پکڑتی - ذرا ذرا سی باتوں پر کیوں جاسوسوں کی طرح کڑی نگاہ ڈالتی ؟ وہ یہ جانتی ہے کہ میں ٹھکرا دوں گی تو یہ جان پر کھیل جائیں گے - یہ جانتے ہوئے بھی اُس نے میرے ساتھ اتنی بیدردی

کیوں کی ؟ وہ یہ کیوں بھول گئی کہ انسان سے خطائیں ہوتی ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اپنا سمجھ کر ہی اُس نے مجھے یہ سخت سزا دی ہو۔ دوسروں کی بُرائیوں کی ہمیں پرواہ نہیں ہوتی۔ اپنوں ہی کو بُری راہ چلتے دیکھ کر سزا دی جاتی ہے۔ مگر بیگانوں کو سزا دیتے وقت اس کا تو خیال رکھنا چاہئے کہ یگانگیت کا رشتہ نہ ٹوٹنے پائے۔ یہ سوچ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دل مجھ سے ہمیشہ کے لئے پھر گیا ؟

نایک رام۔ جیسا ئن ہے نا ؟ کسی انگریز کو گانٹھے گی !

وِنے۔ تم بالکل بیہودہ ہو۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ مَیں کہتا ہوں۔ وہ اب عمر بھر کنواری رہے گی۔ تم اُسے کیا جانو ؟ بات سمجھو نہ بوجھو۔ جھٹ کہہ اُٹھے کہ کسی انگریز کو گانٹھے گی۔ مَیں اُسے کچھ کچھ جانتا ہوں میرے لئے اُس نے کیا کیا نہیں کیا۔ کیا کیا نہیں سہا ؟ جب اُس کی محبت یاد آجاتی ہے تو دل و جگر میں ایسا درد ہوتا ہے کہ کہیں پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دینے کا جی چاہتا ہے۔ اب وہ ناقابلِ فتح ہے۔ اُس نے اپنی محبت کا دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اُس جنم میں نہ جانے کون سی تپسیا کی تھی جس کا اچھا پھل اتنے دنوں تک مَیں نے بھوگا۔ اب کوئی دیوتا بن کر بھی اُس کے سامنے آئے تو وہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ جنم سے جیسائن بھلے ہی ہو مگر عادات و اطوار سے وہ آریہ استری ہے۔ میں نے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔ آپ بھی ڈوبا۔ اُسے بھی لے ڈوبا۔ اب تم دیکھنا کہ ریاست کو کیسا وہ ناکوں چنے چبواتی ہے اُس کی زبان میں وہ طاقت ہے کہ آن کی آن میں ریاست کا نام و نشان مٹا سکتی ہے !

نایک رام۔ ہاں ہے تو ایسی ہی آفت کا پرکالہ ۔

ونے۔ پھر وہی حماقت! میں تم سے کتنی ہی بار کہہ چکا کہ میرے سامنے اُس کا نام عزت سے لیا کرو۔ میں اُس کے متعلق کسی کی زبان سے ایک بھی نامناسب لفظ نہیں سُن سکتا۔ وہ اگر مجھے برچھیوں سے چھید دے تو اُس کے لئے میرے دل میں نفرت کا خیال نہ پیدا ہوگا۔ محبت میں انتقام نہیں ہوتا۔ محبت تو بیحد عفو۔ بیحد فیاضی۔ بیحد تحمل سے معمور ہوتی ہے ۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں نے دوپہر تک نصف منزل طے کی۔ دوپہر کو آرام کرنے لگے تو ایسے سوئے کہ شام ہوگئی۔ رات کو وہیں ٹھہرنا پڑا۔ سرائے موجود تھی۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ ہاں نایک رام کو آج زندگی میں پہلی دفعہ بھنگ نہ ملی اور وہ بہت بیچین رہے۔ ایک تولہ بھنگ کے لئے ایک سے دس روپے تک دینے کو تیار تھے مگر آج نصیبوں میں فاقہ ہی لکھا تھا۔ ہر طرح مجبور ہو کر وہ سر پکڑے ہوئے کنوئیں کی جگت پر آ بیٹھے گویا کسی گھر سے آدمی کی کریا کرم کر کے آئے ہوں ۔

ونے نے کہا۔ ایسی عادت کیوں ڈالتے ہو کہ بھنگ کے بغیر ایک روز بھی رہنا مشکل ہو؟ چھوڑ دو اِسے بھلے آدمی۔ مفت جان دیتے ہو۔

نایک رام۔ بھیا۔ اِس جنم میں تو چھوٹتی نہیں آگے کی رام جانے۔ یہاں تو مرتے وقت بھی ایک گولا سرہانے رکھ لیں گے۔ وصیت کر جائیں گے کہ ایک سیر بھنگ ہماری چتا میں ڈال دینا۔ کوئی پانی دینے والا تو ہے نہیں۔ پر جو کبھی بھگوان نے وہ دن دکھایا تو لڑکوں سے کہہ جاؤں گا کہ

پنڈے کے ساتھ بھنگ کا پنٹا ابھی ضرور دینا۔ اس کا مجا وہی جانتا ہے جو اسے پیتا ہے۔

نایک رام کو آج کھانا اچھا نہ معلوم ہوا۔ نیند نہ آئی۔ بدن ٹوٹتا رہا۔ غصہ میں سرائے والے کو خوب گالیاں دیں۔ مارنے دوڑے۔ بنئے کو ڈانٹا کہ صاف شکر کیوں نہیں دی۔ حلوائی سے اُلجھ پڑے کہ مٹھائیاں کیوں خراب دیں؟ دیکھ تو تیری کیا گت بناتا ہوں۔ چل کر سیدھے سردار صاحب سے کہتا ہوں۔ بچا۔ دوکان نہ لٹوا لوں تو کہنا۔ جانتے ہو میرا نام ہے نایک رام! یہاں تیل کی بو سے گھن ہے۔ حلوائی پیروں پڑنے لگا پر اُنہوں نے ایک نہ سُنی۔ یہاں تک کہ دھمکا کر اُس سے پچیس روپے اینٹھ لئے۔ لیکن چلتے وقت ونے نے روپے واپس کرا دئے۔ ہاں حلوائی کو تاکید کر دی کہ ایسی خراب مٹھائیاں نہ بنایا کرے اور تیل کی چیز کے گھی کے دام نہ لیا کرے۔

دوسرے روز دونوں آدمی دس بجتے بجتے اودے پور پہنچ گئے۔ پہلا آدمی جو اُنہیں نظر پڑا وہ خود سردار صاحب تھے۔ وہ ٹمٹم پر بیٹھے ہوئے دربار سے آ رہے تھے۔ ونے کو دیکھتے ہی گھوڑا روک دیا اور پوچھا آپ کہاں؟

ونے نے کہا ــــ یہیں تو آ رہا تھا۔

سردار۔ کوئی موٹر نہ ملا؟ ہاں نہ ملا ہوگا۔ تو ٹیلیفون کیوں نہ کر دیا؟ یہاں سے سواری بھیج دی جاتی۔ فضول ہی اتنی تکلیف اُٹھائی۔

ونے۔ مجھے پا پیادہ چلنے کا محاورہ ہے۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی میں آج آپ سے ملنا چاہتا ہوں اور تنہائی میں۔ آپ کب مل سکیں گے؟

سردار۔ آپ کے لئے وقت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب جی چاہے

چلے آئے گا بلکہ وہیں ٹھہرے گا بھی ۔

ونے ۔ اچھی بات ہے ۔

سردار صاحب نے گھوڑے کو چابک لگائی اور روانہ ہو گئے ۔ یہ نہ ہو سکا کہ ونے کو بھی بٹھا لیتے کیونکہ اُن کے ساتھ نایک رام کو بھی بٹھانا پڑتا ۔ ونے سنگھ نے ایک تانگا لیا اور ذرا دیر میں سردار صاحب کے مکان پر جا پہنچے ۔

سردار صاحب نے دریافت کیا ۔ اِدھر کئی روز سے آپ کی کوئی خبر نہیں ملی ۔ آپ کے ساتھ کے اور لوگ کہاں ہیں ؟ کچھ مسز کلارک کا پتہ چلا ؟

ونے ۔ ساتھ کے آدمی تو پیچھے ہیں ۔ لیکن مسز کلارک کا کہیں پتہ نہ چلا ۔ ساری محنت رائگاں ہوئی ۔ بیرپال سنگھ کا تو میں نے پتہ لگا لیا بلکہ اُس کا گھر بھی دیکھ آیا پر مسز کلارک کا سُراغ نہ ملا ۔

سردار صاحب نے تعجب سے کہا ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ مجھے تو جو اطلاع ملی ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے مسز کلارک کی ملاقات ہوئی اور اب مجھے آپ سے ہوشیار رہنا چاہئے ۔ دیکھئے میں وہ خط آپ کو دکھلاتا ہوں ۔

یہ کہہ کر سردار صاحب میز کے پاس گئے اور ایک موٹے بادامی کاغذ پر لکھا ہوا خط اُٹھا لائے ۔ لا کر ونے کے ہاتھ میں رکھ دیا ۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ونے نے دروغگوئی سے کام لیا تھا اُن کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا ۔ اپنی بات کس طرح بنائیں ۔ یہ سمجھ میں نہ آیا ۔ نایک رام بھی فرش پر بیٹھے تھے سمجھ گئے ۔ کہ یہ پریشان ہیں ۔ وہ

جھوٹ بولنے اور باتیں بنانے میں کافی مشاق تھا۔ بولا — کنور صاحب ذرا مجھے دیجئے کس کا خط ہے؟

ونے۔ اندر دت کا۔

نایک رام۔ اوہو۔ اس پاگل کا خط ہے! وہی لونڈا نا۔ جو سیوا سمتی میں آ کر گایا کرتا تھا؟ اس کے ماں باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ سرکار پگلا ہے۔ ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتا ہے*

سردار۔ نہیں کسی پاگل لونڈے کی تحریر ایسی نہیں ہو سکتی۔ بڑا ہوشیار اس میں کوئی شک نہیں۔ اس کے خطوط ادھر کئی روز سے میرے پاس برابر آ رہے ہیں۔ کبھی مجھے دھمکاتا ہے۔ کبھی اُپدیش دیتا ہے۔ لیکن جو کچھ کہتا ہے مہذب پیرایہ میں۔ ایک لفظ بھی اہانت آمیز نہیں ہوتا۔ اگر یہ وہی اندر دت ہے جسے آپ جانتے ہیں تو اور بھی تعجب ہے۔ ممکن ہے اُس کے نام سے کوئی دوسرا ہی آدمی خط لکھتا ہو۔ یہ کوئی معمولی تعلیمیافتہ شخص نہیں معلوم ہوتا*

ونے سنگھ کو ایسے سِٹ پٹائے جیسے کوئی نوکر اپنے مالک کا صندوق کھولتا ہوا پکڑ لیا جائے۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے کہ میں نے کیوں جھوٹ کہا؟ مجھے چھپانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ لیکن اندر دت کا اس خط سے کیا مقصد ہے؟ کیا مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے؟

نایک رام۔ کوئی دوسرا ہی آدمی ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں کے حاکموں کو کنور صاحب سے بھڑکا دیں۔ کیوں بھیا؟ سمتی میں کوئی اچھا پڑھا لکھا آدمی تھا؟

ونے۔ سبھی پڑھے لکھے تھے اُن میں جاہل ایک بھی نہیں۔ اندر دت

بھی اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ شخص ہے۔ پر مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ اُس کے دل میں میری جانب سے اتنی کدورت ہے ؃

یہ کہہ کر اُنھوں نے سردار صاحب کو منفعل نگاہوں سے دیکھا۔ جھوٹ کی شکل ہر لحہ زیادہ خوفناک اور اُس کی تاریکی اور بھی زیادہ گھنی ہوتی جاتی تھی ؃

ونے نے شرماتے ہوئے کہا۔ سردار صاحب معاف فرمائے گا کہ میں آپ سے جھوٹ کہہ رہا تھا۔ اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ لفظ بلفظ صحیح ہے۔ بلاشک میری ملاقات مسز کلارک سے ہوئی۔ میں اس واقعہ کو آپ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے اُن سے اس بات کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ وہاں بہت آرام سے ہے۔ یہاں تک کہ میرے بیحد اصرار پر بھی وہ میرے ساتھ نہ آئیں ؃

سردار صاحب نے بے پروائی سے کہا — سیاسی معاملات میں وعدہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اب مجھے آپ سے واقعی ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اگر اِس خط سے مجھے ساری باتوں کی خبر نہ مل گئی ہوتی تو آپ نے تو مجھے مغالطہ دینے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آج کل اُس کے متعلق گورنمنٹ سے کتنی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ یوں کہئے کہ مسز کلارک کے بخیریت واپس آجانے پر کلی ہماری جملہ کارگزاریوں کا انحصار ہے۔ خیر یہ کیا بات ہے؟ مسز کلارک آئیں کیوں نہیں؟ کیا بدمعاشوں نے اُنھیں آنے نہ دیا؟

ونے۔ بیر پال سنگھ تو بڑی خوشی سے اُنھیں بھیجنا چاہتا تھا۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی جان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ لیکن وہ خود

آنے پر تیار نہ ہوئیں۔

سردار۔ مسٹر کلارک سے ناراض تو نہیں ہیں؟

ونے۔ ہو سکتا ہے۔ جس روز بغاوت ہوئی تھی۔ مسٹر کلارک لشہ میں بیہوش پڑے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ چڑھ گئی ہو۔ ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اُن سے ملاقات ہو جانے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہم نے جسونت نگر کے باشندوں پر تشدد کرنے میں بہت سی نامنصفانہ باتوں سے کام لیا۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ باغیوں نے مسز کلارک کو یا تو قید کر رکھا ہے یا قتل کر ڈالا ہے۔ اسی خوف کی بنا پر ہم نے جبر و تشدد سے کام لیا سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا۔ مگر دو باتوں میں سے ایک بھی سچ نہ نکلی۔ مسز کلارک زندہ ہیں اور خوش ہیں۔ وہ وہاں سے خود ہی نہیں آنا چاہتیں۔ جسونت نگر کے لوگ بلا وجہ ہمارے عتاب کے مورد ہو گئے۔ میں آپ سے باصرار التجا کرتا ہوں کہ اُن غریبوں پر رحم ہونا چاہئے۔ سینکڑوں بیگناہوں کا خون ہو رہا ہے۔

سردار صاحب دیدہ دانستہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کرنا چاہتے تھے مگر ایسا کر چکنے پر انہیں اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انصاف کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا بے انصافی کی تلافی کرنا۔ صوفیا کے گم ہو جانے سے انہیں صرف گورنمنٹ کی کج نگاہی کا خوف تھا۔ مگر صوفیا کا پتہ مل جانا تو تمام مُلک کے سامنے اپنی نااہلیت اور ناانصافی کا اعلان کرنا تھا۔ مسٹر کلارک کو خوش کر کے گورنمنٹ کو خوش کیا جا سکتا تھا مگر رعایا کا منہ اتنی آسانی سے بند نہ کیا جا سکتا تھا۔

سردار صاحب نے تامل سے کہا ــــ یہ تو میں مان سکتا ہوں کہ مسز

کلارک صحیح وسالم ہیں۔ لیکن آپ تو کیا اگر کوئی فرشتہ بھی آ کر کہے کہ وہ وہاں
خوش ہیں اور لوٹنا نہیں چاہتیں تو بھی میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں
یہ بچوں کی سی بات ہے۔ کسی کو اپنے گھر سے اتنی نفرت نہیں ہوتی کہ وہ
دشمنوں کے ساتھ رہنا پسند کرے۔ باغیوں نے مسز کلارک کو یہ کہنے
کے لئے مجبور کیا ہوگا۔ وہ مسز کلارک کو اُس وقت تک نہ چھوڑیں گے۔
جب تک ہم تمام قیدیوں کو آزاد نہ کر دیں۔ یہ اُن کی چالاکی ہے اور
میں اُسے باور نہیں کر سکتا۔ مسز کلارک کو سخت سے سخت اذیتیں دی
جا رہی ہیں اور اُنہوں نے اذیتوں سے نجات پانے کے لئے آپ سے
یہ سفارش کی ہے۔ بس اور کوئی بات نہیں ہے ۔

ونے۔ میں آپ کے اِس خیال سے متفق نہیں ہو سکتا۔ مسز کلارک کافی
خوش و خرم نظر آتی تھیں۔ دُکھتا ہوا دل کبھی اتنا مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سردار۔ یہ آپ کی آنکھوں کا نقص ہے۔ اگر مسز کلارک خود آ کر مجھ سے
کہیں کہ میں بڑے آرام سے ہوں تو بھی مجھے یقین نہ آئے گا۔ آپ نہیں
جانتے یہ لوگ کن حکمتیوں سے آزادی پر جان دینے والے لوگوں پر بھی
اپنا رعب جما لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے پنجہ سے چھٹکارا پا جانے پر
بھی قیدی اُنہیں کی سی کہتا ہے اور اُنہیں کی سی کرتا ہے۔ میں ایک زمانہ
میں پولیس کا ملازم تھا۔ آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے کتنے ہی سیاسی مقدما
میں بڑے بڑے ریاضت کشوں سے ایسے ایسے جرائم کا اقبال کرا دیا۔
جن کا اُنہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بیرپال سنگھ اس معاملہ میں ہم سے
کہیں زیادہ ہوشیار ہے۔

ونے۔ سردار صاحب اگر ذرا دیر کے لئے مجھے یہ یقین بھی ہو جائے کہ

مسز کلارک نے دباؤ میں پڑ کر مجھ سے یہ باتیں کہی ہیں تو بھی اب ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہمیں اتنی بیدردی سے تشدد نہ کرنا چاہئے تھا۔ اب ان ملزموں کے ساتھ کچھ رعایت ضروری ہونی چاہئے ؟

سردار۔ سیاسی معاملات میں رعایت کرنا اپنی ہار مان لینا ہے۔ اگر میں یہ بھی مان لوں کہ مسز کلارک وہاں آرام سے ہیں اور آزاد ہیں۔ اور ہم نے جسونت نگر کے لوگوں پر واقعی بڑا ظلم کیا ہے۔ پھر بھی میں رعایت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ رعایت کرنا اپنی کمزوری اور غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں رعایت کا انجام کیا ہوگا؟ باغیوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ اُن کے دلوں سے ریاست کا خوف جاتا رہے گا اور جب خوف نہ رہا تو سلطنت بھی نہیں رہ سکتی۔ خوف کو آپ نکال دیجئے اور سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ پھر آرجن کی بہادری اور یدھشٹر کا انصاف بھی اُسے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ سو دو سو بیگناہوں کا جیل میں رہنا سلطنت کے نہ رہنے سے کہیں بہتر ہے۔ مگر میں اُن باغیوں کو بیگناہ کیوں کر تسلیم کر لوں؟ کئی ہزار آدمیوں کا مسلح ہو کر جمع ہونا یہ ثابت کرتا ہے۔ کہ وہاں لوگ بغاوت کرنے ہی کے خیال سے جمع ہوئے تھے ۔

وسنتے۔ لیکن جو لوگ اُس میں شامل نہ تھے وہ تو بے قصور ہیں ؟

سردار۔ ہرگز نہیں ؟ اُن کا فرض تھا کہ حکام کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیتے۔ ایک چور کو کسی کے گھر میں نقب زنی کرتے دیکھ کر آپ گھر والوں کو جگانے کی کوشش نہ کریں تو آپ خود چور کی اعانت کر رہے ہیں۔ اکثر حالتوں میں اغماض جرم سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے ۔

ونے۔ کم از کم اتنا تو کیجیے کہ جو لوگ میری شہادت پر قید کئے گئے ہیں۔ اُنہیں رہا کر دیجیے *

سردار۔ ناممکن ہے *

ونے۔ میں طرزِ حکومت کے تعلق سے نہیں بلکہ رحم اور شرافت کی بنا پر آپ سے یہ التجا کرتا ہوں ؟

سردار۔ کہہ دیا بھائی جان! کہ یہ ناممکن ہے۔ آپ اُس کے انجام پر غور نہیں کر رہے ہیں *

ونے۔ لیکن میری التجا کو منظور نہ کرنے کا انجام بھی اچھا نہ ہوگا۔ آپ مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ بنا رہے ہیں *

سردار۔ میں کھلی ہوئی بغاوت سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتا ہوں صرف قومی خادموں سے۔ رعایا کے ہوا خواہوں سے اور اُن سے یہاں کی رعایا کا جی بھر گیا ہے۔ مدت گذر جائے گی اس کے قبل کی رعایا کو قومی خادموں کا پھر اعتبار ہو *

ونے۔ اگر اسی نیت سے آپ نے میرے ہاتھوں رعایا کو تباہ و برباد کرایا تو آپ نے میرے ساتھ واقعی دغا کیا۔ لیکن میں آپ کو متنبہ کئے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے میرا کہنا نہ مانا تو آپ ریاست میں ایسا انقلاب برپا کر دیں گے جو ریاست کی جڑ ہلا دے گا۔ میں یہاں سے مسٹر کلارک کے پاس جاتا ہوں۔ اُن سے بھی یہی التجا کروں گا اور اگر وہ بھی نہ سُنیں گے تو مہارانا کی خدمت میں یہی تجویز پیش کروں گا۔ اگر اُنہوں نے بھی نہ سُنا تو پھر اس ریاست کا مجھ سے بڑا اور کوئی دشمن نہ ہوگا *

یہ کہہ کر ونے سنگھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور نایک رام کو ہمراہ لئے

مسٹر کلارک کے بنگلہ پر جا پہنچے۔ وہ آج ہی اپنے شکاری احباب کو رخصت کر کے واپس آئے تھے، اور اس وقت آرام کر رہے تھے۔ ونے نے اردلی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ صاحب کچھ کام کر رہے ہیں۔ ونے باغ میں ٹہلنے لگے۔ جب نصف گھنٹہ تک صاحب نے نہ بلایا تو اٹھے اور سیدھے مسٹر کلارک کے کمرہ میں چلے گئے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے اور بولے۔ آیئے آیئے۔ آپ ہی کی یاد کر رہا تھا۔ کہئے کیا خبر ہے؟ صوفیا کا پتہ تو آپ لگا ہی آئے ہوں گے؟

ونے۔ جی ہاں لگا آیا۔

یہ کہہ کر ونے سنگھ نے مسٹر کلارک سے بھی وہی داستان کہی جو انہوں نے سردار صاحب سے کہی تھی اور ان سے بھی وہی اسرار آمیز التجا کی۔

کلارک۔ مس صوفیا آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟

ونے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن وہاں انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔

کلارک۔ تو پھر آپ نے نئی کھوج کیا کی؟ میں نے تو سمجھا تھا کہ شاید آپ کے آنے سے اس معاملہ پر کچھ روشنی پڑے گی۔ یہ دیکھئے صوفیا کا خط ہے۔ آج ہی آیا ہے۔ اسے آپ کو دکھا تو نہیں سکتا مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اس وقت میرے سامنے آ جائے تو اسے پستول کا نشانہ بنانے میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہ کروں گا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ مذہب پرستی مکر اور دغا کا دوسرا نام ہے۔ اس کی مذہبیت نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ شاید ہی کسی نے اتنا بڑا دھوکا نہ کھایا ہوگا۔ میں نے سمجھا تھا کہ مذہبیت سے خلوص پیدا

ہوتا ہے مگر یہ میرا وہم تھا۔ میں اُس کی مذہبیت پر دلدادہ ہوگیا۔ میں انگلینڈ کی رنگیلی عورتوں کی طرف سے مایوس ہوگیا تھا۔ صوفیا کی سادگی اور مذہبیت دیکھ کر میں نے سمجھا کہ مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی۔ اپنی سوسائٹی کی بیقدری کر کے میں اس کے پاس آنے جانے لگا اور بالآخر شادی کے لئے کہا۔ صوفیا نے منظور تو کر لیا مگر کچھ دنوں تک شادی کو ملتوی رکھنا چاہا۔ میں کیا جانتا تھا کہ اُس کے دل میں کیا ہے۔ راضی ہوگیا۔ اُسی حالت میں وہ میرے ساتھ یہاں آئی بلکہ یوں کہئے کہ وہی مجھے یہاں لائی۔ دُنیا سمجھتی ہے وہ میری بیوی تھی۔ اوہ۔ ہرگز نہیں۔ ہماری تو منگنی بھی نہ ہوئی تھی۔ اب جا کر بھید کُھلا کہ وہ تو بالشویکوں کی ایجنٹ ہے۔ اُس کے ایک ایک لفظ سے اُس کے فطرت کا اظہار ہوتا ہے۔ محبت کا سوانگ بھر کر وہ انگریزوں کے باطنی خیالات سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ اُس کا یہ مقصد پورا ہوگیا۔ مجھ سے جو کام نکل سکتا تھا وہ نکال کر اُس نے مجھے دھتا بتا دیا۔ ونے سنگھ تم نہیں اندازہ کر سکتے کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتا تھا؟ اس بیمثال حُسن کی تہ میں یہ زبردست دغا! مجھے دھمکایا ہے کہ اتنے دنوں میں انگریزی معاشرت کا مجھے جو کچھ تجربہ ہوا ہے اُسے میں ہندوستانیوں کے تفنن طبع کے لئے بے کم و کاست شائع کر دوں گی۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے اُسے میں خود ہی کیوں نہ ظاہر کر دوں۔ انگریز قوم ہندوستان کو لامحدود زمانہ تک اپنی وسیع سلطنت کا جُزو بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ کنسرویٹو ہو یا لبرل۔ ریڈیکل ہو یا لیبر نیشنلسٹ ہو یا سوشلسٹ۔ اس ایک بات پر سبھی متفق ہیں۔ صوفیا کے پہلے ہی میں صاف کہہ دینا چاہتی ہوں کہ ریڈیکل اور لیبر کے لیڈروں

کے دھوکے میں نہ آؤ۔ کنسرویٹو جماعت میں خواہ کتنی ہی بُرائیاں ہوں مگر وہ بے خوف ہے۔ وہ کڑوے سچ سے نہیں ڈرتا۔ ریڈیکل اور لیبر اپنے پاک وصاف اصولوں کی تائید کرنے میں ایسی اُمیدافزا باتیں کہہ ڈالتے ہیں۔ جن پر عمل کرنے کی جرأت اُن میں نہیں ہے۔ اختیار ترک کی چیز نہیں ہے۔ دُنیا کی تاریخ صرف اسی ایک لفظ "اختیار پسندی" پر ختم ہوجاتی ہے۔ انسانی فطرت اب بھی وہی ہے جو آغازِ دُنیا کے وقت تھی۔ انگریز قوم ترک کے لئے یا بلند اصولوں پر قربان ہو جانے کے لئے کبھی مشہور نہیں رہی۔ ہم سب کے سب (ریں لیبر ہوں) سلطنت پسند واقع ہوئے ہیں۔ فرق صرف اُس طرزِ عمل میں ہے جسے مختلف جماعتیں اس قوم پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ کوئی سختی سے حکومت کرنا چاہتی ہے۔ کوئی ہمدردی سے۔ کوئی چکنی چپڑی باتوں سے کام نکال کر۔ بس اصل میں کوئی مقررہ طرزِ حکومت نہیں ہے بلکہ صرف مقصد ہے اور وہ یہ کہ کیونکہ ہمارے اختیار و اقتدار میں روزافزوں ترقی ہوتی رہے یہی وہ مخفی راز ہے جسے ظاہر کردینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ اگر یہ خط مجھے نہ ملتا تو میری آنکھوں پر پردہ ہی پڑا رہتا اور میں صوفیا کے لئے کیا کچھ نہ کر ڈالتا۔ مگر اس خط نے میری آنکھیں کھول دیں اور اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا بلکہ آپ سے بھی اصرار کرتا ہوں کہ اس بولشویک تحریک کو نیست و نابود کردینے میں ریاست کی مدد کیجئے۔

صوفیا جیسی ذہین مستعد اور دھن کی پکی عورت کے ہاتھوں میں پڑ کر یہ تحریک کتنی خطرناک ہوسکتی ہے اس کا اندازہ کرلینا مشکل نہیں ہے *

ونے یہاں سے بھی مایوس ہوکر باہر نکلے تو سوچنے لگے کہ اب جہاں جا

صاحب کے پاس جانا بے فائدہ ہے۔ وہ صاف کہہ دیں گے کہ جب دیوان اور ایجنٹ کچھ نہیں کر سکتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن جی نہ مانا تانگہ والے کو شاہی محل کی طرف سے چلنے کا حکم دیا۔
نایک رام۔ کیں گیٹ پٹ کرتا رہا؟ آیا راہ پر؟
ونے۔ یہی راہ پر آجاتا تو مہارانا صاحب کے پاس کیوں چلتے؟
نایک رام۔ ہجار دو ہجار مانگتا ہو تو دے کیوں نہیں دیتے؟ افسر چھوٹے ہوں یا بڑے سبھی لالچی ہوتے ہیں۔
ونے۔ کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ انگریزوں میں اگر یہ برائیاں ہوتیں تو اِس ملک سے یہ لوگ کب کے چلے گئے ہوتے۔ یوں انگریز بھی رشوت لیتے ہیں۔ دیوتا نہیں ہیں۔ پہلے پہلے جو انگریز یہاں آئے تھے وہ تو پورے ڈاکو تھے مگر اپنی سلطنت کا نقصان کر کے یہ لوگ کبھی اپنا فائدہ نہیں سوچتے۔ رشوت لیں گے تو اُسی حالت میں جب سلطنت کو اُس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔
نایک رام خاموش ہو گئے۔ تانگہ شاہی محل کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں کئی سڑکیں۔ کئی مدرسے کئی شفاخانے ملے۔ ان سب کے نام انگریزی تھے۔ یہاں تک کہ ایک پارک ملا۔ وہ بھی کسی انگریز ایجنٹ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہندوستانی شہر نہیں بلکہ انگریزوں کی بستی ہے۔ جب تانگہ محل کے سامنے پہنچا تو ونے سنگھ اُتر پڑے۔ اور مہارانا صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری کے پاس گئے۔ وہ ایک انگریز تھا۔ ونے نے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ مہاراجہ صاحب تو ابھی پوجا پر ہے۔ گیارہ بجے بیٹھا تھا چار بجے اُٹھے گا۔ کیا آپ لوگ

اتنی دیر تک پُوجا کیا کرتا ہے؟

و نے۔ ہمارے یہاں ایسے ایسے پُوجا کرنے والے ہیں جو کئی کئی دنوں تک مراقبہ میں غرق رہتے ہیں۔ پُوجا کا وہ حصّہ جس میں پرماتما سے یا دیگر دیوتاؤں سے اپنی بھلائی کی استدعا کی جاتی ہے۔ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن وہ حصّہ جس میں مراقبہ کے ذریعہ روح کو پاک بنایا جاتا ہے بہت بڑا ہوتا ہے ؛

سکریٹری۔ ہم جس راجہ کے ساتھ پہلے تھا۔ وہ سبیرے سے دو بجے تک پُوجا کرتا تھا۔ تب کھانا کھاتا تھا اور چار بجے سوتا تھا۔ پھر نو بجے پُوجا پر بیٹھ جاتا تھا اور دو بجے رات کو اُٹھتا تھا۔ وہ سورج ڈوبنے کے وقت آدھ گھنٹہ کے لئے باہر نکلتا تھا۔ مگر اتنی لمبی پُوجا تو میرے خیال میں بالکل غیر قدرتی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ کہ یہ نہ تو عبادت ہے اور نہ دل کی صفائی کا کام بلکہ ایک قسم کا بیکاری ہے ؛

و نے اس وقت اتنا پریشان ہو رہے تھے کہ اُنہوں نے اس طنز کا کوئی جواب نہ دیا۔ سوچنے لگے ”اگر راجہ صاحب نے بھی صاف جواب دیا تو میرے لئے کیا کرنا مناسب ہوگا؟ ابھی اتنے بیگنا ہوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ کہیں صوفیا نے خفیہ قتل کا کھیل شروع کر دیا تو وہ خون بھی میری گردن پر ہوگا“ اس خیال سے وہ اتنے بیتاب ہوئے کہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آرام کرسی پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ یوں وہ روزانہ سندھیا کرتے تھے پر آج پہلی بار ایشور سے رحم کی پرارتھنا کی۔ رات بھر کے جاگے۔ دن بھر کے تھکے تھے ہی۔ ایک جھپکی آگئی۔ جب آنکھیں کھلیں تو چار بج چکے تھے۔ سکریٹری سے پوچھا

اب تو ہز ہائنس پوجا پر سے اُٹھ گئے ہوں گے؟
سکریٹری۔ آپ نے تو ایک لمبی نیند لے لیا۔
یہ کہہ کر اُس نے ٹیلی فون کے ذریعہ کہا ــ کنور ونے سنگھ ہز ہائنس سے ملنا چاہتے ہیں۔
ایک لمحہ میں جواب ملا ــ آنے دو۔
ونے سنگھ مہاراج کے دیوانِ خاص میں پہنچے۔ وہاں کوئی آرائش نہ تھی۔ صرف دیواروں پر دیوتاؤں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ قالین کے فرش پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ مہاراجہ صاحب مسند پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے جسم پر صرف ایک ریشمی چادر تھی اور گلے میں ایک تلسی کی مالا۔ چہرہ پر فقر و غنا کا رنگ نمودار تھا۔ ونے کو دیکھتے ہی بولے۔ آؤ جی۔ بہت دن لگا دئے۔ مسٹر کلارک کی میم کا کچھ پتہ چلا؟
ونے جی ہاں۔ بیر پال سنگھ کے گھر میں ہے۔ اور بڑے آرام سے۔ دراصل ابھی مسٹر کلارک سے اُس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ صرف منگنی ہوئی ہے۔ اُن کے پاس آنے پر راضی نہیں ہوتی ہے۔ کہتی ہے۔ میں یہیں بڑے آرام سے ہوں اور مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔
مہاراجہ۔ ہری ہری۔ یہ تو تم نے عجیب بات سُنائی۔ اُن کے پاس آتی ہی نہیں! سمجھ گیا۔ اُن سب نے بس کرن کر دیا ہوگا۔ شیو شیو۔ اُن کے پاس آتی ہی نہیں؟
ونے۔ اب خیال فرمائیے کہ وہ تو زندہ ہے اور آرام سے۔ اور یہاں ہم لوگ نے کتنے ہی بےگناہوں کو جیل میں ڈال دیا۔ کتنے ہی گھروں کو برباد کر دیا اور کتنے ہی کو جسمانی سزائیں دیں۔

مہاراجہ۔ شیو شیو۔ بڑا انرتھ (ظلم) ہوا۔

وِنے۔ غلطی سے ہم لوگوں نے غریبوں پر کیسے کیسے ظلم کئے کہ اُن کی یاد ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مہاراج بہت ٹھیک فرماتے ہیں کہ بڑا انرتھ ہوا۔ جیوں ہی یہ بات لوگوں کو معلوم ہو جائے گی تو رعایا میں بڑا اودیلا مچ جائے گا۔ اس لئے اب یہی مناسب ہے کہ ہم اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور قیدیوں کو رہا کر دیں۔

مہاراجہ۔ ہری ہری۔ یہ کیسے ہوگا بیٹا۔ راجاؤں سے بھی کہیں غلطیاں ہوتی ہیں؟ شیو شیو۔ راجہ تو ایشور کا اوتار ہے۔ ہری ہری۔ وہ ایک بار جو کر دیتا ہے اُسے پھر نہیں مٹا سکتا۔ شیو شیو۔ راجہ کی بات نوشتۂ تقدیر ہے۔ وہ نہیں مٹ سکتا۔ شیو شیو۔

وِنے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں جو نیک نامی و عزت ہے وہ ناانصافی و ظلم کو عرصہ تک قائم رکھنے میں نہیں ہے۔ راجاؤں کے لئے عفو ہی زیبا ہے۔ قیدیوں کو چھوڑ دینے کا حکم دیا جائے۔ جرمانہ کے روپے لوٹا دئے جائیں اور جنہیں جسمانی سزائیں دی گئی ہیں اُنہیں انعام دے کر خوش کیا جائے۔ اِس سے آپ کا بڑا نام ہوگا۔ لوگ آپ کی تعریف کریں گے۔ اور آپ کو دعائیں دیں گے۔

مہاراجہ۔ شیو شیو۔ بیٹا۔ تم راج نیت (سیاست) کی باتیں نہیں جانتے یہاں ایک قیدی بھی چھوڑا گیا اور ریاست پر ایک بلا نازل ہوئی۔ پرجا کہے گی کہ میم کو نہ جانے کس نیت سے چھپائے ہوئے ہے۔ شاید اُس پر فریفتہ ہے۔ جبھی تو پہلے سزا کا سوانگ رچ کر اب باغیوں کو چھوڑے دیتا ہے۔ شیو شیو۔ ریاست خاک میں مل جائے گی۔ پاتال (تحت الثرےٰ

کو جیل جائے گی۔ کوئی نہ پوچھے گا کہ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ۔ کہیں بھی
اس پر خیال نہ ہوگا۔ ہری ہری۔ ہماری حالت معمولی مجرموں سے
بھی گئی گذری ہے۔ اُنہیں تو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔
عدالت میں اُن پر کوئی قانونی دفعہ عاید کی جاتی ہے اور اُسی دفعہ کے
مطابق اُنہیں سزا دی جاتی ہے۔ ہم سے کون صفائی لیتا ہے؟ ہمارے
لئے کون سی عدالت ہے؟ ہری ہری۔ ہمارے لئے نہ کوئی قانون ہے
نہ کوئی دفعہ۔ جو جُرم چاہا لگا دیا۔ جو سزا چاہی دے دی۔ نہ کہیں اپیل
ہے نہ نگرانی۔ راجے عیاش مشہور ہی ہیں۔ اُن پر یہ الزام لگتے کتنی
دیر لگتی ہے۔ کہا جائے گا کہ تم نے کلارک کی نہایت حسین میم کو اپنے
رانواس میں چھپا لیا اور جھوٹ موٹ اُڑا دیا کہ وہ گم ہوگئی۔ ہری ہری
شیو شیو۔ سُنتا ہوں بڑی خوب صورت عورت ہے۔ چاند کا ٹکڑا ہے
پری ہے بیٹا۔ اس حالت میں مجھے کلنک نہ لگاؤ۔ ضعیفی کی عمر بھی ہمیں
ایسے بُرے الزامات سے نہیں بچا سکتی۔ یہ مشہور ہی ہے کہ راجا لوگ
کشتوں وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں اس لئے تمام عمر قوی و مضبوط بنے
رہتے ہیں۔ شیو شیو! یہ سماج نہیں ہے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ نکما
جیا بُرے حوال! شیو شیو! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سو پچاس بےگناہوں
کا جیل میں پڑا رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ وہاں بھی تو کھانا کپڑا
ملتا ہی ہے۔ اب تو جیل خانوں کی حالت بہت اچھی ہے۔ نئے نئے
کُرتے دئے جاتے ہیں۔ خوراک بھی عمدہ دی جاتی ہے۔ ہاں تمہاری
خاطر سے اتنا کر سکتا ہوں کہ جن گھرانوں کا کوئی سرپرست نہ رہ گیا ہو یا
جو جرمانوں کے سبب سے مفلس و نادار ہو گئے ہوں اُنہیں پوشش۔ وظیفے

کچھ مار دی جائے۔ ہری ہری! تم ابھی کلارک کے پاس تو نہیں گئے تھے؟

ونے۔ گیا تھا۔ وہیں سے تو آ رہا ہوں ؛

مہاراجہ (گھبرا کر) اُن سے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میم صاحب بڑے آرام سے ہیں اور اتنے پر راضی نہیں ہیں؟

ونے۔ یہ بھی کہہ دیا۔ چھپانے کی کوئی بات نہ تھی۔ کسی طرح اُنہیں صبر تو ہو ؛

مہاراجہ (زانو پر ہاتھ ٹیک کر) چوپٹ کر دیا۔ ہری ہری! بالکل چوپٹ کر دیا۔ شیو شیو! آگ تو لگا دی۔ اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟ شیو شیو! کلارک کہے گا کہ قید ہی قید میں بھی آرام سے ہے تو اِس میں کچھ راز ضرور ہے۔ ضرور ہی کہے گا۔ ایسا کہنا قدرتی بات بھی ہے میرے بُرے دن آ گئے۔ شیو شیو! میں اِس اعتراض کا کیا جواب دوں گا بھگوان۔ تم نے بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ اسی کو کہتے ہیں راکبن کی عقل۔ وہاں نہ جانے کون سی خوشخبری سُنانے کو دوڑے تھے۔ پہلے رعایا کو جڑکا کر ریاست میں آگ لگا دی۔ اب یہ دوسری چوٹ کی۔ نادان۔ تجھے کلارک سے کہنا چاہئے تھا کہ وہاں میم کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ اوہ۔ شیو شیو!

دفعتاً پرائیویٹ سکرٹری نے ٹیلی فون میں کہا — مسٹر کلارک آ رہے ہیں ؛

مہاراجہ نے کھڑے ہو کر کہا — آ گیا ملک الموت — آ گیا۔ کوئی ہے؟ کوٹ پتلون لاؤ۔ تم جاؤ ونے چلے جاؤ ریاست سے چلے جاؤ پھر مجھے

مُنہ نہ دکھانا۔ جلدی گھوڑی لاؤ۔ یہاں سے اوگالدان ہٹا دو ؂

وسنے کو آج راجہ سے نفرت ہو گئی۔ سوچا اتنی اخلاقی گراوٹ۔ اتنی بُزدلی! یوں راج کرنے سے ڈوب مرنا بہتر ہے۔ وہ باہر نکلے تو نایک رام نے پوچھا ـــــ کیسی چھنی ؟

وسنے۔ اُن کی تو مارے دہشت کے آپ ہی جان نکلی جاتی ہے ایسا ڈرتے ہیں گویا مسٹر کلارک کوئی شیر ہیں اور اُنہیں آتے ہی نگل جائیں گے۔ مجھے تو اس حالت میں ایک دن بھی نہ رہا جاتا ؂

نایک رام۔ بھیّا۔ میری تو اب صلاح ہے کہ گھر لوٹ چلو۔ اس جنجال میں کب تک جان کھپاؤ گے؟

وسنے نے آبدیدہ ہو کر کہا ـــــ پنڈا جی کون مُنہ لے کر گھر جاؤں؟ مَیں اب گھر جانے کے قابل نہیں رہا۔ ماتا جی میرا مُنہ نہ دیکھیں گی۔ آیا تھا قوم کی خدمت کرنے جاتا ہوں سینکڑوں خاندانوں کو تباہ کر کے میرے لئے تو اب ڈوب مرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ مَیں سمجھ گیا نایک رام۔ مجھ سے کچھ نہ ہوگا۔ میرے ہاتھوں کسی کی بھلائی نہ ہوگی۔ مَیں زہر بونے ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ مَیں سانپ ہوں جو کاٹنے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا جس کم بخت کو علاقہ کا علاقہ گالیاں دے رہا ہو جس کی بربادی کے لئے پوجا پاٹ کئے جا رہے ہوں اُسے دنیا پر بوجھ کی طرح رہنے کا کیا حق ہے؟ آج مجھ پر کتنے بیکسوں کا صبر پڑ رہا ہے۔ میری وجہ سے جتنا آنسو بہا ہے۔ اُس میں مَیں ڈوب سکتا ہوں۔ مجھے زندگی سے ڈر لگ رہا ہے۔ جتنا ہی جیئوں گا اتنا ہی اپنے اوپر گناہوں کا بار بڑھاؤں گا۔ اس وقت

اگر یکایک میری موت ہو جاتی تو سمجھوں کہ ایشور نے مجھے بچا لیا ۔

اس طرح رنج و پشیمانی میں ڈوبے ہوئے وسنے اُس مکان میں پہنچے جو ریاست کی جانب سے اُنہیں قیام کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ وسنے کو دیکھتے ہی نوکر چاکر دوڑے۔ کوئی پانی کھینچنے لگا۔ کوئی جھاڑو دینے لگا۔ کوئی برتن دھونے لگا۔ وسنے تانگہ سے اُتر کر سیدھے دیوان خانہ میں گئے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ میز پر ایک بند لفافہ ملا۔ وسنے کا دل دھڑکنے لگا یہ رانی جانھوی کا خط تھا۔ لفافہ کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔ کوئی ماں پردیس میں پڑے ہوئے اپنے بیمار بیٹے کا تار پا کر اتنی غمگین نہ ہوتی ہوگی۔ لفافہ ہاتھ میں لئے ہوئے سوچنے لگے۔ اس میں میری ملامت کے سوا اور کیا ہوگا؟ اندر دت نے جو کچھ زبانی کہا ہے وہی بات زیادہ سخت الفاظ میں یہاں دوہرائی گئی ہوگی۔ لفافہ جیوں کا تیوں رکھ دیا اور سوچنے لگے اب کیا کرنا چاہئے؟ کیوں نہ یہاں بازار میں کھڑے ہو کر عوام کو مطلع کر دوں کہ دربار تمہارے ساتھ بے انصافی کر رہا ہے؟ لیکن اُس وقت غمزدہ عوام کو مدد کی ضرورت ہے۔ روپیہ کہاں سے آئے؟ والد صاحب کو لکھوں کہ آپ اس وقت مجھے جتنے روپے بھیج سکیں بھیج دیجئے؟ روپے آ جائیں تو یہاں یتیموں کو تقسیم کر دوں۔ نہیں۔ سب سے پہلے وائسرائے سے ملوں اور یہاں کی واقعی حالت اُن سے بیان کر دوں۔ ممکن ہے کہ وہ دربار پر دباؤ ڈال کر قیدیوں کو آزاد کرا دیں۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ اب مجھے سب کام چھوڑ کر وائسرائے سے ملنا چاہئے ۔

وہ سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔ لیکن رانی جی کے خط کی یاد سر پر چمکتی برہنہ شمشیر کی طرح انہیں مضطرب کر رہی تھی۔ آخر اُن سے ضبط

نہ ہو سکا۔ خط کھول کر پڑھنے لگے :۔

ونے آج سے کئی ماہ قبل میں تمہاری ماں ہونے پر فخر کرتی تھی۔ مگر آج تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ تم کیا تھے کیا ہو گئے! اور اگر یہی حالت رہی تو ابھی اور نہ جانے کیا ہو جاؤ گے؟ اگر میں جانتی کہ تم اسی طرح مجھے خفیف کرو گے تو آج تم اس دنیا میں نہ ہوتے۔ بیدرد! اس لئے تو نے میری کوکھ میں جنم لیا تھا؟ اس لئے میں تجھے اپنے دل کا خون پلا پلا کر پالا پوسا تھا؟ مصوّر جب کوئی تصویر بناتے بناتے دیکھتا ہے کہ اس سے میرے دلی جذبات کا انکشاف نہیں ہوتا تو وہ فوراً اُسے مٹا دیتا ہے۔ اسی طرح میں تجھے بھی مٹا دینا چاہتی ہوں۔ میں نے ہی تمہیں بنایا ہے۔ میں نے ہی تمہیں یہ جسم دیا ہے روح کہیں سے آئی ہے۔ پر جسم میرا ہی ہے۔ میں اُسے تم سے واپس مانگتی ہوں۔ اگر تم میں اب بھی کچھ خودداری ہے تو میری امانت مجھے واپس کر دو۔ تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے رنج ہوتا ہے۔ جس کانٹے سے دل میں کسک ہو رہی ہے اسے نکال سکوں تو کیوں نہ نکال ڈالوں؟ کیا تم میری یہ آخری خواہش پوری کرو گے؟ یا دیگر خواہشات کی طرح اسے بھی خاک میں ملا دو گے؟ میں تمہیں اب بھی اتنا بے غیرت نہیں سمجھتی ورنہ میں خود آتی اور تمہارے دل سے وہ چیز نکال لیتی جس نے تمہاری طبیعت کو بُرائی کی طرف مائل کر دیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے؟ وہ خودداری ہے اگر تمہارے جیسے میرے سو لڑکے ہوتے تو میں اُن سبوں کو اُس کے تحفظ کے لئے قربان کر دیتی! تم سمجھتے ہو گے میں غصہ سے پاگل ہو گئی ہوں۔

یہ غصہ نہیں ہے۔ اپنی دلی تکلیف کا رونا ہے جس ماں کے قلم سے ایسے بیدردانہ الفاظ نکلیں اُس کے غم مایوسی اور ندامت کا اندازہ تم جیسا کمزور انسان نہیں کر سکتا۔ اب میں اور کچھ نہ لکھوں گی۔ تمہیں سمجھانا بے سود ہے۔ جب عمر بھر کی تعلیم رائگاں گئی تو ایک خط کی تعلیم کا کیا اثر ہوگا۔ اب صرف دو تمنائیں ہیں۔ ایشور سے تو یہ کہ تم جیسی نالایق اولاد ساتویں دشمن کو بھی نہ دے اور تم سے یہ کہ اپنی زندگی کے اس بُرے کھیل کو ختم کردو۔

...نے یہ خط پڑھ کر روئے نہیں۔ ناراض نہیں ہوئے۔ مغموم بھی نہیں ہوئے۔ اُن کی آنکھیں غرور سے چمک اُٹھیں۔ چہرہ پر جوش کی سُرخی نمودار ہوگئی جیسے کسی شاعر کی زبان سے اپنے آبا و اجداد کے بہادرانہ کارنامے سُن کر کسی منچلے راجپوت کا چہرہ تمتما اُٹھے:۔ ماتا! تمہیں دھنیہ ہے! بہشت میں بیٹھی ہوئی بہادر راجپوتنیوں کی روحیں تمہاری معیار پسندی پر فخر کرتی ہوں گی۔ میں اب تک تمہاری لاثانی شجاعت سے واقف نہ تھا۔ تم نے بھارت کی قابل عورتوں کا سر اونچا کر دیا۔ دیوی! میں خود اپنے کو تمہارا بیٹا کہتے ہوئے شرمندہ ہوں۔ ہاں میں تمہارا بیٹا کہلانے کے قابل نہیں ہوں۔ تمہارے فیصلہ کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ اگر میرے قالب میں سو جانیں ہوتیں تو اُن سبوں کو تمہاری خودداری کے تحفظ کے لئے قربان کر دیتا۔ ابھی اتنا بے عزت نہیں ہوا ہوں۔ لیکن یوں نہیں۔ میں تمہیں اتنا اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ تمہارا بیٹا جینا نہیں جانتا پر مرنا جانتا ہے۔ اب دیر کیوں؟ زندگی میں جو کچھ نہ کرنا تھا وہ سب کر چکا۔ اُس کے ختم کر دینے کا اس سے بہتر اور کون موقع ہوگا؟ یہ سر صرف ایک بار تمہارے

قدموں پر تڑپے گا۔ ممکن ہے کہ آخر وقت تمہارا پاک آشرواد پا جاؤں شاید تمہاری زبان سے یہ پاک الفاظ ادا ہو جائیں کہ تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ تو نے جینا نہ جانا۔ پر مرنا جانتا ہے۔ اگر مرتے وقت بھی تمہارے مُنہ سے "پیارے بیٹے" یہ دو الفاظ سُن سکا تو میری روح مطمئن ہو جائے گی اور دوزخ میں بھی سُکھ چین سے رہ سکے گی۔ کاش ایشور نے پَر دئے ہوتے تو اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاتا۔

ونے نے باہر کی طرف دیکھا۔ سُورج کسی غیرت کے مارے انسان کی طرح اپنا اُترا ہوا چہرہ پہاڑوں کی آڑ میں چھپا چکے تھے۔ نایک رام چار زانو بیٹھے ہوئے بھنگ گھونٹ رہے تھے۔ یہ کام وہ خدمتگاروں سے نہیں لیتے تھے۔ کہتے "یہ بھی ایک بِدیا ہے۔ کیا ہلدی دھنیا تھے نہیں کہ جو چاہے پیس دے۔ اس میں بُدھی خرچ کرنا پڑتی ہے تب جاکر بُوٹی بنتی ہے" کل ناغہ بھی ہو گیا تھا۔ محو ہو کر بھنگ پیستے اور راماین کی دو چار چوپائیاں جو یاد تھیں لَے سے گاتے جاتے تھے۔ اتنے میں ونے نے بُلایا۔

نایک رام۔ کیا ہے بھیّا؟ آج مجا ماروں بُوٹی بن رہی ہے۔ تم نے کبھی کاہے کو پی ہوگی۔ آج تھوڑی سی لے لینا۔ ساری تھکاوٹ بھاگ جائے گی۔

ونے۔ اچھا۔ اس وقت بُوٹی رہنے دو۔ ماتا جی کا خط آیا ہے۔ گھر چلنا ہے ایک تانگہ ٹھیک کر لو۔

نایک رام۔ بھیّا۔ تمہارے تو سب کام جلدی کے ہوتے ہیں۔ گھر چلنا ہے تو کل آرام سے چلیں گے۔ بُوٹی چھان کر رسوئی بناتا ہوں۔ تم نے بہت کاشمیری رسوئیوں کا بنا ہوا بھوجن کھایا ہے۔ آج جرا میرے ہاتھ کے بھی بھوجن کا سواد لو۔

ونے ۔ اب گھر پہنچ کر ہی تمہارے ہاتھ کے بھوجن کا سواد لوں گا ۔

نایک رام ۔ ماتا جی نے بلایا ہوگا ؟

ونے ۔ ہاں ۔ بہت جلد ۔

نایک رام ۔ اچھا بُوٹی تو تیار ہو جائے ۔ گاڑی نو نو بجے رات کو جاتی ہے ۔

ونے ۔ نو بجنے میں دیر نہیں ہے ۔ سات تو بج ہی گئے ہوں گے ۔

نایک رام ۔ جب تک اسباب بندھواؤ ۔ میں جلدی سے چھانے لیتا ہوں ۔ تقدیر میں اتنا سُکھ بھی نہیں لکھا ہے کہ بے فکر ہو کر بُوٹی تو چھانتا ۔

ونے ۔ اسباب کچھ نہیں جائے گا ۔ میں گھر سے کوئی اسباب لے کر نہیں آیا تھا ۔ یہاں سے چلتے وقت گھر کی کنجی سردار صاحب کو دے دینی ہوگی ۔

نایک رام ۔ اور یہ سارا اسباب ؟

ونے ۔ کہہ دیا کہ میں کچھ نہ لے جاؤں گا ۔

نایک رام ۔ بھیا تم کچھ نہ لو پر میں تو یہ دوسالا اور یہ صندوق ضرور لوں گا ۔ جدھر سے دوسالا اوڑھ کر نکل جاؤں گا دیکھنے والے لوٹ جائیں گے ۔

ونے ۔ ایسی مہلک چیز لے کر کیا کرو گے جسے دیکھ کر ہی سُنگراؤ پڑ جائے ؟ یہاں کی کوئی چیز نہ چھونا ۔ جاؤ ۔

نایک رام بھاگ کو کوستے ہوئے گھر سے نکلے تو گھنٹہ بھر تک گاڑی کا کرایہ طے کرتے رہے ۔ آخر جب یہ پیچیدہ مسئلہ کسی طرح حل نہ ہوا تو ایک کو جبراً پکڑ لائے ۔ تانگہ والا جھنجھناتا ہوا آیا ۔ "سب حاکم ہی حاکم تو ہیں ۔ گدا جنور کے پیٹ کو بھی تو کچھ ملنا چاہئے ۔ کوئی مائی کا لال یہ نہیں سوچتا کہ دن بھر تو بیگار میں مرے گا ۔ کیا آپ کھائے گا ۔ کیا جنور کو کھلائے گا ۔ کیا بال بچوں کو دے گا ؟ اُس پر نرکھ نامہ لکھ کر گلی گلی لٹکا دیا ۔ بس

تانگہ والے ہی سب کو لوٹے کھاتے ہیں اور تو جتنے عملے ملازم ہیں سب ایک دودھ کے دھوئے ہوئے ہیں۔ بچہ دھولے۔ بھیک مانگ کھائیے پر تانگہ کبھی نہ چلائیے۔

جیوں ہی تانگہ دروازہ پر آیا۔ ونے جاکر بیٹھ گئے لیکن نایک رام اپنی آدھ گھٹی بوٹی کیونکر چھوڑتے؟ جلدی جلدی رگڑی۔ چھان کر پی۔ تمباکو کھائی۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر پگڑی باندھی۔ لوگوں سے رام رام کہی اور دوشالہ کو گرسنہ نگاہوں سے تاکتے ہوئے باہر نکلے۔ تانگہ چلا۔ سردار صاحب کا گھر راستہ ہی میں تھا۔ وہاں جاکر نایک رام نے کنجی اُن کے دربان کے حوالہ کی اور آٹھ بجتے بجتے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ نایک رام نے سوچا کہ راہ میں تو کچھ کھانے کو ملے ہی گا نہیں اور گاڑی پر کھانا کھائیں گے کیسے۔ دوڑ کر پوڑیاں لیں۔ پانی لائے اور کھانے بیٹھ گئے۔ ونے نے کہا ابھی میرا جی نہیں چاہتا۔ وہ کھڑے گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل دیکھ رہے تھے کہ یہ گاڑی اجمیر کب پہنچے گی اور دلی میں کون سی گاڑی ملے گی۔ یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑھیا روتی پیٹتی ہوئی چلی آرہی ہے اور دو تین آدمی اُسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ ونے سنگھ کے سامنے ہی آکر بیٹھ گئی۔ ونے نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کا لڑکا جسونت نگر کی جیل کا داروغہ تھا۔ اُسے دن دہاڑے کسی نے قتل کر ڈالا۔ ابھی خبر ملی ہے اور یہ بیچاری غم زدہ ماں یہاں سے جسونت نگر جارہی ہے۔ موٹر والے کرایہ زیادہ مانگتے تھے اس لئے ریل گاڑی سے جاتی ہے۔ راستہ میں اُتر کر بیل گاڑی کرے گی۔ ایک ہی لڑکا تھا۔ بیچاری کو بیٹے کا مُنہ بھی دیکھنا بدا نہ تھا۔

دنے سنگھ کو بہت رنج ہُوا۔ وہ اور دھد بڑا سیدھا سادہ آدمی تھا۔ قیدیوں پر بڑی مہربانی کرتا تھا۔ اُس سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ اُنھیں معاً شبہ ہوا کہ یہ بھی بیر پال سنگھ کے جماعت کی مجرمانہ کارروائی ہے۔ صوفیا نے خالی دھمکی نہ دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے خفیہ قتل کے ذرائع جمع کر لئے ہیں۔ ایشور میری بداعمالیوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اِن قتل کی وارداتوں کا عذاب بھی میری ہی گردن پر ہے۔ صوفیا کی گردن پر نہیں۔ صوفیا جیسی رحیم عقیل۔ فرض شناس عورت نے میری ہی کمزوریوں سے متاثر ہو کر یہ خونریزی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ایشور کیا ابھی میری تکالیف اپنی انتہائی حد کو نہیں پہنچ گئیں؟ میں پھر صوفیا کے پاس جاؤں گا۔ ضرور جاؤں اور اُس کے قدموں پر سر رکھ کر مؤدبانہ عرض کروں گا۔ دیوی میں اپنے کئے کی سزا پا چکا۔ اب یہ کارروائیاں بند کر دو۔ ورنہ یہیں تمہارے سامنے جان دے دوں گا۔ لیکن صوفیا کو پاؤں کہاں؟ کون مجھے اُس قلعہ کے دشوار گذار راستہ پر لے جائے گا؟

جب گاڑی آئی تو دنے سنے بڑھیا کو اپنے ہی پاس بٹھلایا۔ نایک رام دوسرے خانہ میں بیٹھے کیونکہ دنے کی موجودگی میں اُنہیں مسافروں سے آزادانہ گفتگو کرنے کا موقع نہ ملتا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ آج پولیس کے سپاہی ہر اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دربار نے مسافروں کی حفاظت کے لئے یہ خاص انتظام کیا تھا۔ کسی اسٹیشن پر مسافر سوار ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ باغیوں نے کئی جاگیرداروں کو لوٹ لیا تھا۔

پانچویں اسٹیشن سے تھوڑی ہی دور پر گاڑی اچانک رُک گئی۔ وہاں کوئی اسٹیشن نہ تھا۔ لائن کے نیچے کئی آدمیوں کی بات چیت سُنائی دی

پھر کسی نے ونے کے کرہ کا دروازہ کھولا۔ ونے نے پہلے تو آنے والے کو روکنا چاہا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُن کی جمہوریت خود غرضی کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ یہ بھی شک ہوا کہ ڈاکو نہ ہوں۔ لیکن قریب جاکر دیکھا تو کسی عورت کے ہاتھ تھے۔ الگ ہٹ گئے۔ اور ایک لمحہ میں ایک عورت گاڑی پر چڑھ آئی۔ ونے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ وہ مس صوفیا تھی۔ اُس کے بیٹھتے ہی گاڑی پھر چلنے لگی ؞

صوفیا نے گاڑی میں آتے ہی ونے کو دیکھا تو چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ جی میں آیا۔ گاڑی سے اُتر جاؤں۔ مگر گاڑی چل چکی تھی۔ ایک لمحہ تک وہ ساکت کھڑی رہی۔ ونے کے سامنے اُس کی آنکھیں نہ اُٹھتی تھیں۔ پھر اُسی بڑھیا کے پاس بیٹھ گئی اور کھڑکی کی طرف تاکنے لگی۔ تھوڑی دیر تک دونوں بُت بنے بیٹھے رہے۔ کسی کو بات کرنے کی جُرأت نہ ہوتی تھی ؞

بُڑھیا نے صوفیا سے پوچھا۔ کہاں جاؤ گی بیٹی ؟

صوفیا۔ بڑی دور جانا ہے ؞

بُڑھیا۔ یہاں کہاں سے آرہی ہو ؟

صوفیا۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک گاؤں ہے۔ وہیں سے آتی ہوں ؞

بُڑھیا۔ تم نے گاڑی کھڑی کرا دی تھی کیا ؟

صوفیا۔ اسٹیشنوں پر آج کل ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ اِسی لئے درمیان میں گاڑی رُکوا لی ؞

بُڑھیا۔ تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں ہے کیا ؟ اکیلے کیسے جاؤ گی ؟

صوفیا۔ آدمی نہ ہو تو ایشور تو ہے ؞

بُڑھیا۔ ایشور ہیں کہ نہیں۔ کون جانے؟ مجھے تو ایسا جانا پڑتا ہے کہ سنسار کا کرتا دھرتا کوئی نہیں ہے جبھی تو دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ خون ہوتے ہیں۔ کل میرے بیٹے کو ڈاکوؤں نے مار ڈالا۔ درو کرم گنڈ تھا گنٹو۔ کبھی مجھے جواب نہیں دیا۔ جیل کے قیدی اُس کو دعائیں دیا کرتے تھے۔ کبھی کسی بھلے مانس کو نہیں ستایا۔ اُس پر یہ آفت آئی تو کیسے کہوں کہ کوئی ایشور ہے؟

صوفیا۔ کیا جسونت نگر کے جیلر آپ کے بیٹے تھے؟

بُڑھیا۔ ہاں بیٹی۔ وہی ایک لڑکا تھا سو بھگوان نے ہر لیا۔

یہ کہہ کر بُڑھیا سسکنے لگی۔ صوفیا کا چہرہ کسی مرتے ہوئے مریض کے چہرہ کی طرح بے رونق ہو گیا۔ ذرا دیر تک وہ ضبط کئے ہوئے کھڑی رہی۔ پھر کھڑکی سے باہر سر نکال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کا کینہ انتقام منحوس شکل میں اُس کے سامنے تھا۔

صوفیا آدھ گھنٹہ تک مُنہ چھپائے روتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آ گیا جہاں بُڑھیا اُترنا چاہتی تھی۔ جب وہ اُترنے لگی تو ونے نے اُس کا اسباب اُتارا اور اُسے تسلی دے کر رخصت کیا۔

ابھی ونے گاڑی میں بیٹھے بھی نہ تھے کہ صوفیا نیچے جا کر بُڑھیا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔ ماتا تمہارے بیٹے کا خون کرنے والی میں ہوں۔ جو سزا چاہو دو۔ تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔

بُڑھیا نے حیرت سے کہا۔ کیا تو ہی وہ ڈائن ہے۔ جس نے دربار سے لڑنے کے لئے ڈاکوؤں کو جمع کیا ہے؟ نہیں۔ تو نہیں ہو سکتی! تو تو مجھے رحم و مہربانی کی مورت سی نظر آتی ہے۔

صوفیا۔ ہاں ماتا۔ میں ہی وہ ڈائن ہوں!
بُڑھیا۔ جیسا تونے کیا ویسا تیرے آگے آئے گا۔ میں تجھے اور کیا کہوں؟
میری طرح تیرے دن بھی روتے ہی کٹیں ۔

انجن نے سیٹی دی۔ صوفیا بے حس سی کھڑی تھی۔ وہاں سے ہلی تک نہیں۔ گاڑی چلی۔ صوفیا اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ دفعتاً ونے گاڑی سے کُود پڑے۔ صوفیا کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا اور آپ بھی بڑی مشکل سے گاڑی میں چڑھے۔ ایک لمحہ کی دیر ہوتی تو وہیں رہ جاتے ۔

صوفیا نے مغموم لہجہ میں کہا۔ ونے تم میرے کہنے کا یقین کرو یا نہ کرو۔ مَیں سچ کہتی ہوں کہ مَیں نے بیرپال کو ایک آدمی کے قتل کی بھی صلاح نہیں دی۔ مَیں اُس کی قاتلانہ رغبت کی روکنے کی حتے الامکان کوشش کرتی رہی۔ مگر وہ گروہ اُس وقت بدلہ لینے کی دُھن میں دیوانہ ہو رہا تھا کسی نے میری نہ سُنی۔ یہی سبب ہے کہ مَیں اب یہاں سے جا رہی ہوں۔ میں نے اس رات کو ایک جنون کی سی حالت میں تم سے نہ جانے کیا کیا باتیں کیں۔ لیکن ایشور جانتا ہے کہ اس کا مجھے کتنا رنج و افسوس ہے ۔ ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ ہمیشہ دوسروں کو مارنے اور دوسروں کے ہاتھوں مارے جانے کے لئے ہم سخت مصیبت کے وقت ہی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ حالت ہمیشہ نہیں قائم رہ سکتی۔ انسان فطرتاً امن پسند ہوتا ہے۔ پھر جب سرکاری تشدد نے کمزور رعایا کو انتقام لینے پر آمادہ کر دیا تو کیا طاقتور سرکار اس سے بھی زیادہ تشدد کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے گی؟ لیکن میں تم سے ایسی باتیں کر رہی ہوں گویا تم گھر ہی کے آدمی ہو۔ میں بھول گئی تھی کہ تم سرکار کے ہوا خواہوں میں ہو۔ مگر اتنی مہربانی کرنا

کہ مجھے پولیس کے حوالہ نہ کر دینا۔ پولیس سے بچنے ہی کے لئے میں نے راستہ میں گاڑی ٹھہرا کر سوار ہونے کا بندوبست کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت بھی تم میری ہی تلاش میں ہو۔

ونے سنگھ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ ملامت آمیز لہجہ میں بولے۔ صوفیا تمہیں اختیار ہے کہ مجھے چاہے جتنا کمینہ اور ذلیل سمجھو۔ مگر ایک دن آئے گا جب تمہیں ان باتوں پر پچھتانا پڑے گا اور تم سمجھو گی کہ تم نے مجھ پر کتنی زیادتی کی ہے۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کیا گھر پر یہاں آنے کے قبل میرے گرفتار ہونے کی خبر پا کر تم نے بھی وہی وطیرہ اختیار نہ کیا تھا؟ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے دوسروں کو برباد کیا اور تم اپنے ہی کو برباد کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ میں نے تمہارے طرزِ عمل کو قابلِ عفو سمجھا۔ وہ مصیبت کے وقت کا طرزِ عمل تھا۔ تم نے میرے طرزِ عمل کو معافی کے ناقابل سمجھا۔ اور سخت سے سخت چوٹ جو تم پہنچا سکتی تھیں اُسے پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ مجھے پولیس کی مدد کرتے دیکھ کر تمہیں اتنا تعجب و افسوس نہ ہوا ہوگا جتنا مجھ کو تمہیں مسٹر کلارک کے ساتھ دیکھ کر ہوا۔ اِس وقت بھی تم وہی انتقامی وطیرہ اختیار کر رہی ہو یا کم از کم تم مجھ سے ایسا کہہ چکی ہو۔ اتنے پر بھی تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔ تمہاری جھڑکیاں سُن کر مجھے جتنا روحانی کوفت ہوا اور ہو رہا ہے وہی میرے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ اُس میں تم نے اِس وقت اور اضافہ کر دیا۔ کبھی تم اپنی اِس بیدردی پر خون کے آنسو بہاؤ گی۔ خیر۔

یہ کہتے کہتے ونے کا گلا بھر آیا۔ پھر وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔

صوفیا نے آنکھوں سے اپنی دلی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

آؤ اب ہمارا تمہارا میل ہو جائے۔ میری ان باتوں کو بھول جاؤ۔

ونے نے آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا۔۔ میں کچھ کہتا ہوں؟ اگر طبیعت آسودہ نہ ہوئی ہو تو اور جو چاہے کہہ ڈالو۔ جب بُرے دن آتے ہیں تو کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ تمہارے یہاں سے آ کر میں نے قیدیوں کو آزاد کرانے کے لئے حکام سے مسٹر کلارک سے۔ یہاں تک کہ مہارانا صاحب سے بھی جتنی منت سماجت کی وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مگر کسی نے میری بات تک نہ سُنی۔ ہر طرف سے مایوس ہی ہونا پڑا۔

صوفیا۔ یہ تو میں جانتی تھی۔ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟

ونے۔ جہنم کو!

صوفیا۔ مجھے بھی لیتے چلو۔

ونے۔ تمہارے لئے بہشت ہے۔

ایک لمحہ بعد پھر بولے۔ گھر جا رہا ہوں۔ ماں جی نے بُلایا ہے۔ مجھے دیکھنے کی خواہش مند ہیں۔

صوفیا۔ اندروت تو کہتے تھے تم سے بہت ناراض ہیں۔

ونے نے جیب سے رانی صاحبہ کا خط نکال کر صوفیا کو دے دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ یہ تو مجھے اتنا کھینچ رہی ہے اور میں خواہ مخواہ اُس کی طرف دوڑا جاتا ہوں۔ دفعتاً صوفیا نے خط کو چاک کر کے کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور فرطِ محبت سے بیقرار ہو کر بولی ۔" میں تمہیں نہ جانے دوں گی۔ ایشور جانتا ہے۔ میں تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تمہارے عوض میں خود ہی رانی جی کے پاس جاؤں گی اور اُن سے کہوں گی۔ تمہاری خطاوار میں ہوں . . . " یہ کہتے کہتے اُس کا گلا بھر آیا۔

بول نہ سکی۔ ونے کے کندھے پر سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگی۔ آواز ہلکی ہوئی تو پھر بولی ــــ مجھ سے وعدہ کرو کہ نہ جاؤں گا۔ تم نہیں جا سکتے ـ مذہباً اور انصافاً نہیں جا سکتے۔ بولو وعدہ کرتے ہو؟

اُن اشک آلود آنکھوں میں کتنی نرمی کتنی التجا کتنی عاجزی کتنی ضد تھی!

ونے نے کہا۔ نہیں صوفیا مجھے جانے دو۔ تم ماتا جی کو خوب جانتی ہو۔ مَیں نہ جاؤں گا تو وہ اپنے دل میں مجھے بے عزّت۔ بے حیا۔ بُزدل سمجھیں گی اور اس مجنونانہ حالت میں وہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں +

صوفیا۔ نہیں ونے۔ مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔ للّٰلہ رحم کرو۔ میں رانی جی کے پاس جا کر روؤں گی۔ اُن کے پیروں پڑوں گی اور اُن کے دل میں تمہاری طرف سے جو کدورت ہے اُسے اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالوں گی۔ مجھے دعوٰے ہے کہ میں اُن کی ممتا والے جذبات متحرک کر دوں گی۔ مَیں اُن کے مزاج سے واقف ہوں۔ اُن کا دل دَیا کا بھنڈار ہے۔ جس وقت میں اُن کے قدموں پر سر رکھ کر کہوں گی۔ اماں تمہارا بیٹا میرا مالک ہے میری خاطر اُسے معاف کر دو" اُس وقت وہ مجھے پیروں سے ٹھکرائیں گی نہیں۔ وہاں سے جھلاتی ہوئی اُٹھ کر چلی جائیں گی لیکن ایک لمحہ بعد مجھے بلائیں گی اور محبت سے گلے لگائیں گی۔ میں اُن سے تمہاری جان کی اماں مانگوں گی۔ پھر تمہیں بھی مانگ لوں گی۔ ماں کا دل کبھی اتنا سخت نہیں ہو سکتا۔ وہ اِس خط کو لکھ کر شاید اُس وقت پچھتا رہی ہوں گی۔ منا رہی ہوں گی کہ خط نہ پہنچے۔ بولو۔ وعدہ کرو +

ایسے محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ ونے کے کانوں نے کبھی نہ سُنے

تھے۔ اُنہیں اپنی زندگی بامعنی معلوم ہونے لگی۔ آہ۔ صوفیا اب بھی مجھے چاہتی ہے۔ اُس نے مجھے معاف کر دیا۔ وہ زندگی جو پہلے ریگستان کی طرح بے آب غیر آباد اور سُنسان تھی اب وحش وطیور۔ چشموں اور نہروں بیل بوٹوں اور پودوں سے معمور ہو کر ایک دلکشی کا مرقع بن گئی۔ خوشی کے دروازے کھُل گئے تھے اور اس کے اندر سے میٹھے گیتوں کی تان۔ برقی لیمپوں کی روشنی۔ ہوائے معطر کی خوشبو باہر نکل نکل کر دل کو جبراً اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ ونے سنگھ کو اِس منظرِ دلفریب نے بالکل وارفتہ بنا دیا۔ اصل میں زندگی کا سُکھ زندگی دُکھ ہے۔ ترک تعلق اور دلی کلفت زندگی کے لئے قابل قدر جواہر ہیں۔ ہماری پاک خواہش۔ ہماری بے لوث خدمات۔ ہمارے نیک ارادے۔ سبھی ہماری کشتِ غم کی پیداوار ہیں۔

ونے نے نوش کھاتے ہوئے کہا۔ صوفیا۔ ماتاجی کے پاس ایک بار مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ پھر صاف طور پر نہ کہیں گی کہ......

صوفیا نے ونے کی گردن میں ہاتھوں کو حمائل کرتے ہوئے کہا نہیں نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔ تم تنہا اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ تم میں ہمت ہے خودداری ہے مُروّت ہے سب کچھ ہے پر صبر نہیں۔ پہلے میں اپنے لئے تمہیں ضروری سمجھتی تھی۔ اب تمہارے لئے اپنے کو ضروری سمجھتی ہوں۔ ونے زمین کی طرف کیوں تاکتے ہو؟ میری طرف دیکھو! میں نے تمہیں جو سخت الفاظ کہے اُس پر نادم ہوں۔ خدا گواہ ہے۔ سچے دل سے نادم ہوں۔ اُن باتوں کو بھول جاؤ۔ محبت میں جتنی معیار پسندی ہوتی ہے اُتنا ہی عفو بھی ہوتا ہے۔ بولو۔ وعدہ کرو۔ اگر تم مجھ سے گلا چھڑا کر چلے

جاؤگے تو پھر...... تمہیں صوفیا نہ ملے گی۔
ونے نے محبت کے جوش میں آکر کہا۔ تمہاری مرضی ہے تو نہ جائیں گا۔
صوفیا۔ تو ہم اگلے اسٹیشن پر اُتر پڑیں گے۔
ونے۔ نہیں۔ پہلے بنارس چلیں۔ تم ماتا جی کے پاس جانا۔ اگر وہ مجھے معاف کر دیں گی......
صوفیا۔ ونے ابھی بنارس نہ چلو۔ ذرا دل کو سکون ہونے دو۔ ذرا طبیعت ٹھکانے ہونے دو۔ پھر رانی جی کا تم پر کیا اختیار ہے؟ تم میرے ہو۔ اُن سبھی قاعدوں کے مطابق جنہیں خدا اور انسان نے بنایا ہے۔ تم میرے ہو۔ میں رعایت نہیں اپنا حق چاہتی ہوں۔ ہم اگلے اسٹیشن پر اُتر پڑیں گے۔ اِس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کہاں جانا ہے؟
ونے نے لجاتے ہوئے کہا۔ گزر بسر کیسے ہوگا؟ میرے پاس جو کچھ ہے وہ نایک رام کے پاس ہے۔ وہ کسی دوسرے کمرہ میں ہے۔ اگر اُسے خبر ہوگئی تو وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔
صوفیا۔ اُس کی کیا پرواہ؟ نایک رام کو جانے دو۔ محبت جنگلوں میں بھی سُکھی رہ سکتی ہے۔
اندھیری رات میں گاڑی کوہ و بیابان کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ باہر دوڑتی ہوئی کوہستانی قطاروں کے سوا اور کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ ونے تاروں کی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ صوفیا دیکھ رہی تھی کہ آس پاس کوئی گاؤں ہے یا نہیں۔
اتنے میں اسٹیشن نظر آیا۔ صوفیا نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور دونوں چپکے سے اُتر پڑے جیسے چڑیوں کا جوڑا گھونسلے سے دانہ کی کھوج

میں ہار جائے۔ اُنہیں اُس کی فکر نہیں کہ آگے میا دیکھی ہے۔ شکاری چڑیاں بھی ہیں اور کسان کی غلیل بھی ہے۔ اُس وقت تو دونوں اپنے خیالات میں مگن ہیں۔ دانہ سے لہراتے ہوئے کھیتوں کی بہار دیکھ رہے ہیں۔ مگر وہاں تک پہنچنا بھی اُن کے نصیبوں میں ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا ۔

(۳۶)

مسٹر جان سیوک نے طاہر علی کی محنت اور ایمانداری سے خوش ہو کر کھالوں پر کچھ کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ اس سے اب اُن کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا تھا جس سے مل کے مزدوروں پر اُن کا رعب تھا اور اوورسیر نیز ادنےٰ درجہ کے کلرک بھی اُن کا کافی لحاظ کرتے تھے۔ لیکن آمدنی میں ہونے کے ساتھ ہی اُن کے اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جب یہاں اُن کے مساوی درجہ کے لوگ نہ تھے تو وہ پھٹے پُرانے جوتوں ہی پر بسر کر لیا کرتے خود ہی بازار سے سودا خرید لاتے اور کبھی کبھی خود ہی پانی بھی کھینچ لیتے تھے۔ کوئی ہنسنے والا نہ تھا۔ اب مل کے ملازمین کے سامنے اُنہیں زیادہ شان سے رہنا پڑتا تھا۔ اور کوئی موٹا کام اپنے ہاتھ سے کرتے شرم معلوم ہوتی تھی۔ اِس لئے اُنہوں نے مجبوراً ایک بڑھیا خادمہ رکھ لی تھی۔ پان الائچی وغیرہ کا خرچ پہلے سے کئی گُنا بڑھ گیا تھا۔ اُس پر کبھی دوستوں کی دعوت بھی کرنی پڑتی تھی۔ تنہا رہنے والے سے کوئی دعوتوں کا خواہشمند نہیں ہوتا جانتا ہے کہ اس طرح دعوت پھیکی ہوگی۔ لیکن عیال دار لوگوں کے لئے تو کوئی مفر نہیں۔ کسی نے کہا ـــ خاں صاحب آج زمازردہ پکوائے۔ سوکھی دال کھاتے کھاتے زبان موٹی پڑ گئی۔ اس کے جواب میں طاہر علی کو کہنا ہی پڑتا ـــ ہاں ہاں لیجئے آج ہی پکواتا ہوں۔ گھر میں ایک ہی عورت

ہوتی تو اُس کی بیماری کا حیلہ کرکے ٹالنے کی کوشش کرتے مگر یہاں تو گھر میں ایک کیا بلکہ تین تین عورتیں تھیں۔ پھر اُس کے علاوہ طاہر علی دل کے چھوٹے نہ تھے۔ اُنہیں کھلانے پلانے کا شوق تھا اور دوستوں کی اپاندار میں تو اُن کو خاص لطف آتا۔ خلاصہ یہ کہ شرافت کے نباہ میں اُن کی حُلیہ بگڑی جاتی تھی۔ بازار میں تو اب اُن کا دمڑی کا اعتبار نہ تھا۔ وہ نادہند مشہور ہو گئے تھے۔ پس وہاں تو اُنہیں کوئی چیز بھی اودھار نہ ملتی۔ دوستوں سے دستگردوں سے قرض لے کر کام چلایا کرتے۔ بازار والوں نے نااُمید ہو کر تقاضا کرنا چھوڑ دیا۔ سمجھ گئے کہ اِس کے پاس ہی نہیں ہے دے گا کہاں سے تحریری قرض جان دار اور غیر فانی ہوتا ہے۔ زبانی قرض بے جان اور فانی۔ ایک عربی گھوڑا ہے جو ایڑ نہیں برداشت کر سکتا۔ یا تو سوار کا خاتمہ کر دے گا یا اپنا۔ دوسرا لدو ٹٹو ہے جسے اُس کے پیر نہیں بلکہ کوڑے چلاتے ہیں۔ کوڑا ٹوٹا یا سوار کا ہاتھ رُکا اور ٹٹو بیٹھا۔ پھر نہیں اُٹھ سکتا۔

لیکن اگر صرف دوستوں کی خاطر و مدارات ہی بات ہوتی تو شاید طاہر علی کسی طرح کھینچ تان کر چولی بٹھانے میں کامیاب ہوتے۔ مصیبت یہ تھی کہ اُن کے چھوٹے بھائی ماہر علی ان دنوں مراد آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گئے تھے۔ تنخواہ پاتے ہی اُس کا نصف حصہ آنکھیں بند کر کے مراد آباد بھیج دینا پڑتا تھا۔ طاہر علی خرچ سے ڈرتے تھے مگر اُن کی دونوں ماؤں نے طعنے دے دے کر اُنہیں گھر میں رہنا مشکل کر دیا تھا۔ دونوں ہی کی یہ دلی تمنا تھی کہ ماہر علی پولیس میں ملازم ہو کر داروغہ بنے۔ بیچارے طاہر علی مہینوں تک حُکّام کے بنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ یہاں جا، وہاں جا۔ اُنہیں ڈالی دے۔ اُنہیں نذرانہ پیش کر۔ ان کی سفارش لا۔

اُن کی چٹھی منگا۔ بالآخر مسٹر جان سیوک کی سفارش کام کر گئی۔ یہ سب مرحلے تو طے ہو گئے۔ آخری مرحلہ ڈاکٹری معائنہ تھا۔ یہاں سفارش اور خوشامد کا گزر نہ تھا۔ بتیس روپے سِول سرجن کے لئے سولہ روپے اسسٹنٹ سرجن کے لئے اور آٹھ روپے کلرک اور چپڑاسیوں کے لئے۔ کل چھپن روپیوں کی میزان تھی۔ یہ رقم کہاں سے آئے؟ چاروں طرف سے مایوس ہو کر طاہر علی کلثوم کے پاس آئے اور بولے ـــ تمہارے پاس کوئی زیور ہو تو دے دو۔ میں بہت جلد چھڑا دوں گا۔ اُس نے تنک کر صندوقچہ کو اُن کے سامنے پٹک دیا اور کہا ـــ یہاں زیوروں کی ہوس نہیں ہے۔ سب آس پوری ہو چکی۔ روٹی دال ملتی جائے۔ یہی غنیمت ہے۔ تمہارے گہنے تمہارے آگے ہیں۔ جو جی چاہے کرو ـــ طاہر علی کچھ دیر تک تو شرم سے سر نہ اٹھا سکے پھر صندوقچہ کی طرف دیکھا۔ ایسی ایک بھی چیز نہ تھی جس سے اُس کی چوتھائی رقم بھی مل سکتی۔ ہاں تمام زیورات سے کام چل سکتا تھا۔ شرماتے ہوئے کل چیزیں نکال کر رومال میں باندھیں اور باہر آکر اِس فکر میں بیٹھے ہی تھے کہ انہیں کیونکر لے جاؤں کہ اتنے میں خادمہ آئی۔ طاہر علی کو سوجھی کہ کیوں نہ اِس کے معرفت روپے منگواؤں۔ مامائیں اِن کاموں میں مشّاق ہوتی ہیں۔ چپکے سے بلا کر اُس سے یہ بات کہی بڑھیا نے کہا ـــ میاں یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چیز تو رکھنی ہے۔ کون کسی سے خیرات مانگتے ہیں۔ میں روپے لا دوں گی۔ آپ مطمئن رہیں۔ خادمہ گہنوں کی پوٹلی لے کر چلی تو زینب نے دیکھا بلا کر بولیں۔ تو کہاں لئے چلی ہے؟ کہا ـــ میں ماہر علی کے روپے منگوائے دیتی ہوں۔ اُن کا ایک دوست مہاجنی کا کام کرتا ہے۔ ماما نے پوٹلی اُسے دے دی۔ دو گھنٹہ بعد

اپنے پاس سے چھتیس روپے نکال کر دئیے۔ اس طرح یہ مشکل مسئلہ حل ہوا۔
ماہر علی مراد آباد گئے اور جب سے وہیں تعلیم پا رہے تھے۔ تنخواہ کا نصف حصّہ وہاں چلے جانے کے بعد بقیہ نصف حصّہ میں گھر کا خرچ بڑی مشکل سے پورا پڑتا۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی۔ اُدھر ماہر علی نصف ہی پر قناعت نہ کرتے۔ کبھی لکھتے کہ کپڑوں کے لئے روپے بھیجئے کبھی ٹینس کھیلنے کے لئے سوٹ کی فرمائش کرتے طاہر علی کو کمیشن کے روپوں سے بھی کچھ نہ کچھ وہاں بھیج دینا پڑتا تھا۔

ایک روز تمام رات فاقہ کرنے کے بعد علی الصباح زینب نے آکر کہا۔ آج روپوں کی کچھ فکر کی یا آج بھی روزہ رہے گا؟

طاہر علی نے چڑھ کر کہا۔ مَیں اب کہاں سے لاؤں؟ تمہارے سامنے ہی کمیشن کے روپے مُرادآباد نہیں بھیج دئیے تھے؟ بار بار لکھتا ہوں کہ کفایت سے خرچ کرو۔ مَیں بہت تنگ ہوں۔ لیکن وہ حضرت فرماتے ہیں کہ یہاں ہر ایک لڑکا گھر سے سینکڑوں روپے منگواتا ہے اور بیدریغ خرچ کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کفایت کرنا میرے امکان میں نہیں جب اُدھر کا یہ حال ہے اور اِدھر کا یہ حال تو روپے کہاں سے لاؤں؟ دوستوں میں بھی تو کوئی ایسا نہیں بچا جس سے کچھ مانگ سکوں۔

زینب۔ سُنتی ہو رقیہ اُن کی باتیں؟ لڑکے کو خرچ کیا دے رہے ہیں۔ گویا میرے اوپر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ مجھے کیا تم اُسے خرچ بھیجو یا بُلاؤ۔ اُس کے وہاں پڑھنے سے یہاں پیٹ تھوڑا ہی بھر جائے گا۔ تمہارا بھائی ہے پڑھاؤ یا نہ پڑھاؤ۔ مجھ پر کیا احسان؟

طاہر علی۔ تو تمہیں بتاؤ۔ روپے کہاں سے لاؤں؟

زینب۔ مردوں کے ہزار ہاتھ ہوتے ہیں تمہارے ابا جان دس ہی روپے پاتے تھے کہ زیادہ؟ بیس تو مرنے کے کچھ دن پہلے ہوگئے تھے۔ آخر کنبہ کی پرورش کرتے تھے کہ نہیں؟ کبھی فاقوں کی نوبت نہیں آئی۔ مرغا ہین دن میں دو بار ضرور میسر ہو جاتا تھا۔ تمہاری تعلیم ہوئی۔ شادی ہوئی۔ کپڑے وغیرہ بھی آتے تھے۔ اللہ کے فضل سے بساط کے مطابق گہنے بھی بنتے تھے۔ وہ تو مجھ سے کبھی نہ پوچھتے تھے۔ کہاں سے روپے لاؤں؟ آخر کہیں سے لاتے ہی تو تھے۔

طاہر علی۔ پولیس کے محکمہ میں ہر طرح کی گنجایش ہوتی ہے۔ یہاں کیا ہے؟ گنی بوٹیاں۔ نپا شوربا۔

زینب۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو دکھا دیتی کہ اسی نوکری میں کیسے سونا برستا ہے۔ سینکڑوں چمار ہیں۔ کیا کہو تو ایک ایک گٹھا لکڑی نہ لائیں؟ سبوں کے یہاں چھان چھپر پر ترکاریاں لگی ہوں گی۔ کیوں نہیں توڑوا منگاتے؟ کھالوں کی قیمت میں بھی کمی بیشی کرنے کا تمہیں اختیار ہے۔ کوئی یہاں بیٹھا دیکھ نہیں رہا ہے۔ دس کے پونے دس لکھ دو تو کیا ہرج ہو؟ روپوں کی رسیدوں پر انگوٹھے کا نشان ہی نہ بنواتے ہو۔ نشان پکارنے جاتا ہے کہ میں دس ہوں یا پونے دس؟ پھر اب تمہارا اعتبار جم گیا۔ صاحب کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آخر اس اعتبار سے کچھ اپنا فائدہ بھی تو ہو کہ ساری عمر دوسروں ہی کا پیٹ بھرتے رہو گے؟ اس وقت بھی تمہاری تحویل میں سینکڑوں روپے ہوں گے۔ جتنی ضرورت سمجھو اسی وقت نکال لو۔ جب ہاتھ میں روپے آئیں تو رکھ دینا۔ روزانہ آمد فی خرچ کا میزان ہی ملنا چاہئے نا؟ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آج کھال کا دام

دیا۔ گل دیا۔ اِس میں کیا تردد ہے؟ چمار کہیں فریاد کرنے نہ جائے گا۔ سبھی ایسا کرتے ہیں اور اسی طرح دنیا کا کام چلتا ہے۔ ایمان درست رکھنا ہو تو انسان کو چاہئے کہ فقیر ہو جائے ٭

رقیہ۔ بہن ایمان ہے کہاں؟ دنیا کا کام تو اسی طرح چلتا ہے ٭

طاہر علی۔ بھئی جو لوگ کرتے ہوں وہ جانیں۔ میری تو ان ہتھکنڈوں سے روح فنا ہوتی ہے۔ امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ آخر خدا کو بھی تو مُنہ دکھانا ہے۔ جیسی بھی اُس کی مرضی ہو۔ زندہ رکھے یا مار ڈالے ٭

زینب۔ واہ رے مَردُوئے۔ قربان جاؤں تیرے ایمان پر۔ تیرا ایمان سلامت رہے چاہے گھر والے بھوکوں مر جائیں۔ تمہاری منشاء یہی ہے کہ یہ سب مُنہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جائیں۔ بس اور کچھ نہیں۔ فکر تو آدمی کو اپنے بیوی بچوں کی ہوتی ہے۔ اُن کے لئے بازار موجود ہی ہے۔ فاقہ تو ہمارے لئے ہے۔ اُن کا فاقہ تو محض نمایش ہے ٭

طاہر علی نے اس الزام بیجا پر مغموم ہو کر کہا ــــ کیوں جلاتی ہو امّی جان؟ خدا گواہ ہے جو بچّہ کے لئے دھیلے کی بھی کوئی چیز لی ہو۔ میری نیّت تو کبھی ایسی نہ تھی نہ ہے اور نہ ہو گی۔ یوں تمہاری طبیعت ہے جو چاہے سمجھو ٭

رقیہ۔ دونوں بچے رات بھر تڑپتے رہے "امّاں روٹی۔ امّاں روٹی!" پوچھو اماں کیا آپ روٹی بن جاؤں۔ تمہارے بچے اور نہیں تو اور سیر کے گھر چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے کچھ نہ کچھ کھا پی آتے ہیں۔ یہاں تو میری ہی جان کھاتے ہیں ٭

زینب۔ اپنے بال بچوں کو کھلانے نہ کھلانے کا تمہیں اختیار ہے۔ کوئی

تمہارا حساب لینے والا تو ہے نہیں۔ خواہ زردہ کھلاؤ خواہ بھوکا رکھو۔ ہمارے بچّوں کو تو گھر کی روکھی سوکھی روٹیوں کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ یہاں کوئی دلی نہیں ہے جو فاقوں سے زندہ رہے۔ جاکر کچھ انتظام کرو +

طاہر علی باہر آکر بڑی دیر تک متفکر کھڑے رہے۔ آج پہلی مرتبہ اُنہوں نے امانت کے روپیوں کو ہاتھ لگانے کی جُرأت کی۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی کھڑا تو نہیں ہے۔ پھر بہت آہستگی کے ساتھ آہنی صندوق کو کھولا۔ یوں دن میں سینکڑوں بار وہی صندوق کھولتے اور بند کرتے تھے مگر اِس وقت اُن کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آخر اُنہوں نے روپے نکال لئے۔ پھر صندوق کو بند کر دیا۔ روپے لاکر زینب کے سامنے پھینک دئیے اور بغیر کچھ کہے باہر چلے گئے۔ اپنے دل کو یوں سمجھایا "اگر خدا کو منظور ہوتا کہ میرا ایمان سلامت رہے تو کیوں اتنے آدمیوں کا بوجھ میرے سر پر ڈالتا۔ یہ بوجھ سر پر رکھا تھا تو اُس کے اُٹھانے کی طاقت بھی تو دینی چاہئے تھی۔ میں خود فاقے کر سکتا ہوں پر دوسروں کو تو مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر اس مجبوری کی حالت میں خدا مجھے سزا کے قابل سمجھے تو وہ منصف ہی نہیں ہے" اس دلیل سے اُنہیں کچھ تسکین ہوئی۔ لیکن مسٹر جان سیوک تو اس دلیل سے مان جانے والے آدمی نہ تھے۔ طاہر علی سوچنے لگے۔ کون چمار سب سے موٹا ہے جسے آج روپے نہ دوں تو چیں چپڑ نہ کرے۔ نہیں موٹے آدمی کے روپے روکنا مناسب نہیں کیونکہ وہ نڈھ ہوتے ہیں۔ جو سب سے غریب سب سے سیدھا ہو اُسی کے روپے روکنا چاہئے۔ اس میں کوئی خوف نہیں ہے۔ چپکے سے بلا کر انگوٹھے کا نشان بنوا لوں گا۔ اُس کی ہمت ہی نہ پڑے گی کہ کسی سے کہے۔ اُس دن سے اُنہیں

جب ضرورت پڑتی تحویل سے روپے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔ رفتہ رفتہ روپوں کو پورا کر دینے کا خیال کم ہونے لگا۔ تحویل کے روپوں میں کمی واقع ہونے لگی۔ دل مضبوط ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ چھٹا مہینہ گزرتے گزرتے وہ تحویل کے پورے ڈیڑھ سو روپے صرف کر چکے تھے۔

اب طاہر علی کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ چماروں سے خوشامد آمیز باتیں کرتے۔ کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتے تھے کہ تحویل میں ان روپوں کا پتہ نہ چلے۔ لیکن بہی کھاتہ میں ردّوبدل کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ گھر میں بھی کسی سے یہ بات نہ کہتے۔ بس خدا سے یہی دعا کرتے کہ ماہر علی آجائیں۔ انہیں سو روپے ماہوار ملیں گے۔ دو ماہ میں ادا کر دوں گا۔ اتنے دن صاحب حساب کی جانچ نہ کریں تو پھر بیڑا پار ہے۔

انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب کچھ ہی ہو مگر اور روپے نہ نکالوں گا۔ لیکن ساتویں مہینہ پھر پچیس روپے نکالنے پڑے۔ اب ماہر علی کا سال بھی پورا ہونے کو تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کی اور کسر تھی۔ سوچا آخر مجھے اسی کی بدولت تو یہ زیر باری ہو رہی ہے۔ جیوں ہی آیا۔ میں نے گھر اُسے سونپا۔ کہہ دوں گا "بھائی! اتنے دنوں تک میں نے سنبھالا۔ جو کچھ بن پڑا تمہاری تعلیم میں صرف کیا۔ تمہیں برسر روزگار کر دیا۔ اب کچھ دنوں کے لئے مجھے اِس فکر سے نجات دو۔" اُس کے آنے تک یہ پردہ ڈھکا رہ جائے تو پھر دُم جھاڑ کر نکل بھاگوں گا۔

پہلے وہ ایسی ہی کوئی ضرورت پڑنے پر صاحب کے یہاں جاتے تھے۔ اب دن میں ایک بار اُن سے ضرور ہی ملتے۔ ملاقاتوں سے اُن کے

شک کو دَبا ہُوا رکھنا چاہتے تھے۔ جس چیز سے ٹکر لگنے کا خوف ہوتا ہے اُس سے ہم اور بھی زیادہ چمٹ جاتے ہیں۔ کلثوم اُن سے بار بار پوچھتی کہ آج کل تم اتنے روپے کہاں پا جاتے ہو؟ سمجھاتی "دیکھو نیت خراب نہ کرنا۔ تکلیف اور تنگی سے بسر کرنا اتنا بُرا نہیں ہے جتنا خدا کے سامنے گنہگار بننا۔" لیکن طاہر علی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے بہلا دیا کرتے تھے۔

ایک روز صبح کو طاہر علی نماز سے فارغ ہو کر دفتر میں آئے تو دیکھا کہ ایک چمار کھڑا رو رہا ہے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ بولا "کیا بتاؤں کھاں صاحب۔ رات گھر والی گُجر گئی۔ اب اُس کا کریا کرم کرنا ہے۔ میرا جو کچھ حساب ہو دے دیجئے۔ دوڑا ہوا آیا ہوں۔ کپھن کے لئے بھی روپیہ پاس نہیں ہے۔" طاہر علی کی تحویل میں روپے کم تھے۔ کل اسٹیشن سے مال روانہ کیا تھا۔ محصول ادا کرنے میں روپے خرچ ہو گئے تھے۔ آج صاحب کے سامنے حساب پیش کر کے روپیہ لانے والے تھے۔ اُنہیں اِس چمار کو کئی کھالوں کی قیمت دینی تھی۔ کوئی بہانہ نہ کر سکے کچھ روپے لا کر اُسے دئے۔

چمار نے کہا۔ "ہجور۔ اتنے میں تو کپھن بھی پورا نہ ہوگا۔ مرنے والی اب پھر سے تو آئے گی نہیں۔ اُس کا کریا کرم تو دل کھول کر کر دوں۔ میرے جتنے روپے آتے ہیں۔ سب دے دیجئے۔ یہاں تو جب تک دس بوتل دارو نہ ہوگی۔ لہاس (لاش) دُوار پر سے نہ اُٹھے گی۔"

طاہر علی نے کہا۔ "اس وقت روپے نہیں ہیں پھر لے جانا۔"

چمار۔ "واہ کھاں صاحب واہ۔ انگوٹھے کا نسان کرائے تو مہینوں ہو گئے اب کہتے ہو پھر لے جانا۔ اِس بھگت نہ دوگے تو کیا میرے مرنے پر دوگے؟

چاہئے تو یہ تھا کہ اپنی طرف سے کچھ مدد کرتے۔ اُلٹے میرے ہی روپے باقی رکھتے ہو۔

طاہر علی کچھ روپے اور لائے۔ چمار نے سب روپے زمین پر پٹک دئے اور بولا ـــ آپ تھوک سے چوہیا جلاتے ہیں! میں آپ سے اودھار نہیں مانگتا۔ کھیرات نہیں مانگتا اپنے روپے مانگتا ہوں اور آپ یہ کنجوسی کر رہے ہیں مانو گھر سے دے رہے ہوں۔

طاہر علی نے کہا۔ اس وقت اِس سے زیادہ ممکن نہیں۔

چمار تھا تو سیدھا مگر اُسے کچھ شبہ ہوگیا۔ وہ گرم ہو پڑا۔ اتفاقاً اُسی وقت مسٹر جان سیوک بھی آپہنچے۔ وہ آج بہت جھلّائے ہوئے تھے۔ پربھو سیوک کی کجروی نے اُنہیں بے قابو سا کر دیا تھا۔ اُنھوں نے یہ جھگڑا دیکھا تو تیز لہجہ میں بولے۔ اُس کے روپے کیوں نہیں دے دیتے؟ میں نے آپ سے تاکید کر دی تھی کہ سب آدمیوں کا حساب روزمرّہ صاف کرا دیا کیجئے۔ آپ کیوں باقی رکھتے ہیں؟ کیا آپ کی تحویل میں روپے نہیں ہیں؟

طاہر علی روپے لانے چلے تو کچھ ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ صاحب کو فوراً شک ہوگیا۔ اُنھوں نے رجسٹر اُٹھالیا اور حساب دیکھنے لگے حساب صاف تھا۔ اِس چمار کے روپے ادا ہو چکے تھے۔ اُس کے انگوٹھے کا نشان موجود تھا۔ پھر یہ بقایا کیسا؟ اتنے میں اور کئی چمار آگئے۔ اس چمار کو روپے لئے جاتے دیکھا تو سمجھے آج حساب صاف کیا جا رہا ہے۔ بولے ـــ سرکار ہمارا ابھی مل جائے۔ صاحب نے رجسٹر کو زمین پر پٹک دیا اور جھڑک کر بولے ـــ یہ کیا معاملہ ہے؟ جب اِن سے رسید لی گئی تو اُن کے روپے کیوں نہیں دئے گئے؟

طاہر علی سے اور کچھ تو نہ بن پڑا۔ صاحب کے قدموں پر گر پڑے اور رونے لگے۔ نقب میں بیٹھ کر آنکھیں دکھانے کے لئے بڑے مشاق آدمی کی ضرورت ہے۔

چماروں نے موقع کو تاڑ کر کہا ۔۔۔ سرکار ہمارا پچھلا کچھ نہیں ہے ہم تو آج کے روپوں کے لئے کہتے ہیں۔ جرادیر ہوئی مال رکھ گئے تھے کہاں صاحب اُس بھکت (وقت) نماج پڑھتے تھے۔

صاحب نے پھر رجسٹر اُٹھا کر تو اُنہیں کسی کسی نام کے سامنے ایک ہلکا سا × کا نشان دکھائی دیا۔ سمجھ گئے حضرت نے یہی روپے اُڑائے ہیں۔ ایک چمار سے جو بازار سے سگریٹ پیتا ہوا آرہا تھا۔ پوچھا ۔۔۔ تیرا نام کیا ہے؟

چمار۔ چنکو۔

صاحب۔ تیرے کتنے روپے باقی ہیں؟

کئی چماروں نے اُسے ہاتھ کے اشارہ سے سمجھایا کہ کہہ دے کچھ نہیں۔ چُنکو نہ سمجھا اور بولا ۔۔۔ سترہ پہلے کے تھے تو آج کے۔

صاحب نے اپنی نوٹ بک پر اُس کا نام درج کر لیا۔ طاہر علی کو کچھ بھی نہ کہا۔ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ جہاں قانون کی رُو سے سزا مل سکتی تھی وہاں سخت سُست کہنے کی کیا ضرورت؟ سب رجسٹروں کو اُٹھوا کر گاڑی میں رکھا۔ دفتر میں قفل بند کیا۔ آہنی سیف میں ڈبل لاک لگائے۔ کنجیاں جیب میں رکھیں اور فٹن پر سوار ہو گئے۔

طاہر علی کو اتنی جُرأت بھی نہ ہوئی کہ کچھ منت سماجت کریں۔ زبان ہی بند ہو گئی۔ ساکت کھڑے رہ گئے۔ چماروں کے چودھری نے تشفی

دی۔ آپ کیوں ڈرتے ہو کہاں صاحب۔ آپ کا بال تو بانکا ہونے نہ پائے گا۔ ہم کہہ دیں گے اپنے روپے بھر پائے ہیں۔ کیوں بے جھنکو۔ نرا گنوار ہی ہے۔ اِسارہ بھی نہیں سمجھتا؟

جھنکو نے نادم ہوکر کہا ــــ چودھری۔ بھگوان جانیں جو مَیں جرا بھی اِسارہ پاجاتا تو روپے کا نام ہی نہ لیتا ۔

چودھری۔ اپنا بیان بدل دینا۔ کہہ دینا۔ مجھے جبانی حساب یاد نہیں تھا۔

جھنکو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بیان بدلنا سانپ کے منہ میں اُنگلی دینا تھا۔ طاہر علی کی ان باتوں سے ذرا بھی تسکین نہیں ہوئی۔ وہ پچھتا رہے تھے۔ اِس لئے نہیں کہ مَیں نے روپے کیوں خرچ کئے بلکہ اس لئے کہ ناموں کے سامنے × کے نشانات کیوں قائم کئے۔ اگر کسی کاغذ پر نوٹ کر لیتا تو آج کیوں یہ نوبت آتی۔ اب خدا ہی خیر کرے۔ صاحب معاف کرنے والے آدمی نہیں ہیں۔ کچھ سُوجھ ہی نہ پڑتا تھا کہ کیا کریں۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔

چودھری بولا۔ کہاں صاحب۔ اب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا۔ یہ صاحب بڑا جلاد آدمی ہے۔ جلدی روپے جُٹا یئے۔ آپ کو یاد ہے کُل کتنے روپے نکلتے ہوں گے؟

طاہر علی۔ روپوں کی فکر نہیں ہے جی۔ یہاں تو داغ لگ جانے کا افسوس ہے۔ کیا جانتا تھا کہ آج یہ آفت آنے والی ہے ورنہ پہلے ہی سے تیار نہ ہو جاتا۔ جانتے ہو کہ یہاں کارخانہ کا ایک نہ ایک آدمی قرض مانگنے کو سر پر سوار رہتا ہے۔ کس کس سے حیلہ کروں؟ اور پھر مروّت میں حیلہ کرنے سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ روپے نکال کر دے دیتا ہوں۔ یہ اُسی شرافت

کی سزا ہے - ڈیڑھ سو سے کم نہ نکلیں گے بلکہ چاہے دو سو ہو گئے ہوں ❊

چودھری - بھلا سرکاری رقم اِس طرح کھرچ کی جاتی ہے - آپ نے کھرچ کی یا کسی کو اُدھار دے دی - بات ایک ہی ہے - وہ لوگ روپے دے دیں گے ؟

طاہر علی - ایسا کھرا تو ایک بھی نہیں - کوئی کہے گا - تنخواہ ملنے پر دوں گا کوئی کچھ بہانہ کرے گا - سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ❊

چودھری - گھر میں تو روپے ہوں گے ؟

طاہر علی - ہونے کو کیا دو چار سو روپے نہ ہوں گے مگر جانتے ہو کہ عورتوں کا روپیہ جان کے ساتھ رہتا ہے - خدا کو جو منظور ہے وہ ہوگا ❊

یہ کہہ کر طاہر علی اپنے دو چار دوستوں کی طرف چلے کہ شاید یہ حال سُن کر لوگ میری کچھ مدد کریں - مگر کہیں نہ جا کر ایک درخت کے نیچے نماز پڑھنے لگے - کسی سے مدد کی امید نہ تھی ❊

اِدھر چودھری نے چماروں سے کہا --- بھائیو ہمارے مُنشی جی اِس وقت تنگ ہیں - سب لوگ تھوڑی تھوڑی مدد کر دو تو اُن کی جان بچ جائے - صاحب اپنے روپے ہی تو لیں گے کہ کسی کی جان لیں گے - بس سمجھ لو کہ ایک دن نشہ نہ کیا ❊

چودھری تو چماروں سے روپے وصول کر کے جمع کرنے لگا - طاہر علی کے دوستوں نے یہ حال سُنا تو چپکے ہی دُبک رہے کہ کہیں طاہر علی کچھ مانگ نہ بیٹھیں - ہاں جب تیسرے پہر کو دارو غہ نے آ کر تحقیقات کرنی شروع کی اور طاہر علی کو حراست میں لے لیا تو یار لوگ بھی تماشا دیکھنے آ پہنچے - گھر میں کہرام مچ گیا - کلثوم نے جا کر زینب سے کہا --- لیجئے

اب تو آپ کا ارمان نکلا ٭

زینب نے کہا۔ تم مجھ سے کیا بگڑتی ہو بیگم۔ ارمان نکلے ہوں گے تو تمہارے نہ نکلے ہوں گے تو تمہارے۔ میں نے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ جا کر کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالو۔ گلچھرے تم نے اُڑائے ہوں گے۔ یہاں تو روٹی دال کے سوا اور کسی کا کچھ نہیں جانتے ٭

کلثوم کے پاس تو کفن کو کوڑی بھی نہ تھی۔ زینب کے پاس روپے تھے مگر اُس نے دل جلانا ہی کافی سمجھا۔ کلثوم کو اس وقت طاہر علی سے ہمدردی نہ تھی۔ اُسے اُن پر غصّہ آرہا تھا جس طرح کسی کو اپنے بچّہ کو چاقو سے اُنگلی کاٹتے ہوئے دیکھ کر غصّہ آئے ٭

شام ہو رہی تھی طاہر علی کے لئے دارو غہ نے ایک یکّہ منگوایا۔ اُس پہ چار کانسٹبل اُنہیں لے کر سوار ہوئے۔ دارو غہ جانتا تھا کہ یہ ماہر علی کے بھائی ہیں۔ کچھ لحاظ کرتا تھا۔ چلتے وقت بولا کہ اگر آپ کو گھر میں کسی سے کچھ کہنا ہو تو آپ جا سکتے ہیں۔ عورتیں گھبرا رہی ہوں گی۔ اُنہیں ذرا تسکین دیتے آئیے۔ مگر طاہر علی نے کہا مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ وہ کلثوم کو اپنی صورت نہ دکھانا چاہتے تھے۔ جسے اُنہوں نے دیدہ و دانستہ تباہ کر دیا تھا۔ اور اب بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے تھے۔ کلثوم دروازہ پر کھڑی تھی۔ اُس کا غصّہ بہ طور رنج کی شکل میں تبدیل ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب یکّہ چلا تو وہ غش کھا کر گر پڑی۔ بچے آبا آبا کہتے یکّہ کے پیچھے دوڑے دارو غہ نے اُنہیں ایک ایک چوّنی مٹھائی کھانے کو دے کر بہلا دیا۔ طاہر علی تو اُدھر حراست میں گئے اِدھر گھڑی رات جاتے جاتے چاروں کا چودھری روپے لے کر مسٹر سیوک کے پاس پہنچا۔ صاحب بولے۔ یہ روپے تم اُن کے

گھر والوں کو دے دو تو اُن کا گزر ہو جائے۔ معاملہ اب پولیس کے ہاتھ میں ہے
میں کچھ نہیں کر سکتا ۔

چودھری۔ حضور۔ آدمی سے کوتا ہی ہو ہی جاتی ہے۔ اتنے دنوں تک آپ
کی چاکری کی۔ سرکار کو اس پر کچھ دیا کرنی چاہئے۔ بڑا بھاری کُرم (کنبہ)
ہے مالک۔ بال بچے بھوکوں مر جائیں گے ۔

جان سیلوک۔ میں یہ سب جانتا ہوں۔ بیشک اُن کا خرچ بہت تھا اِسی
لئے میں نے مال پر کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اُنہوں نے جو کچھ
کیا ہے مجبور ہو کر کیا ہے۔ لیکن زہر کسی نیت سے کھایا جائے وہ زہر ہی
کا کام کرے گا۔ کبھی امرت نہیں ہو سکتا۔ دغا بازی زہر سے کم مہلک
نہیں ہوتی۔ تم یہ روپے لے جا کر اُن کے گھر والوں کو دے دو۔ مجھے خانصاحب
سے کوئی کینہ نہیں ہے۔ مگر اپنے اصول کو نہیں توڑ سکتا۔ گناہ کو معاف کرنا
گناہ ہے ۔

چودھری یہاں سے مایوس ہو کر چلا گیا۔ دوسرے دن مقدمہ پیش
ہوا۔ طاہر علی مجرم ثابت ہوئے۔ وہ اپنی صفائی نہ دے سکے۔ اُنہیں چھ
ماہ کی سزا ہو گئی ۔

جب طاہر علی کانسٹبلوں کے ساتھ جیل کی طرف جا رہے تھے تو
اُنہیں ماہر علی تانگہ پر سوار آتا ہوا نظر پڑا۔ اُن کا دل بے اختیار اُمڈ آیا۔
آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سمجھے کہ ماہر مجھ سے ملنے کو دوڑتا ہوا چلا آ
رہا ہے۔ شاید آج ہی آیا ہے۔ اور آتے ہی آتے یہ خبر سُن کر بیقرار ہو گیا
ہے۔ جب تانگہ قریب آیا تو چیخ کر رو پڑے۔ ماہر علی نے ایکبار اُنہیں دیکھا
لیکن نہ سلام کیا نہ تانگہ روکا۔ نہ پھر اُس طرف دیکھا۔ اپنا منہ پھیر لیا گویا

دیکھا ہی نہیں۔ تانگہ ماہر علی کی بغل سے نکل گیا۔ طاہر علی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ ایک بار پھر چیخ کر رو ئے۔ وہ خوشی کا نعرہ تھا اور یہ غم کی فریاد۔ وہ آنسو کے قطرے تھے اور یہ خون کے!

لیکن ایک ہی لمحہ میں اُن کے دل کو تسکین ہوگیا:۔ ماہر نے مجھے دیکھا ہی نہ ہوگا۔ اُس کی نگاہ میری طرف اُٹھی ضرور تھی مگر شاید وہ کسی خیال میں مستغرق تھا۔ ایسا ہوتا بھی تو ہے کہ جب ہم کسی خیال میں محو ہوتے ہیں تو نہ سامنے کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور نہ قریب کی باتیں سُنائی دیتی ہیں۔ یہی سبب ہے۔ اچھا ہی ہُوا کہ اُس نے مجھے نہ دیکھا ورنہ اِدھر مجھے ندامت ہوتی اُدھر اُسے رنج ہوتا۔

اُدھر ماہر علی مکان پر پہنچے تو چھوٹے بھائی آکر لپٹ گئے۔ طاہر علی کے دونوں بچے بھی دوڑے اور "ماہر چچا آئے" کہہ کر اُچھلنے کودنے لگے۔ کلثوم بھی روتی ہوئی نکل آئی۔ سلام بندگی کے بعد ماہر اپنی ماں کے پاس گئے۔ اُس نے اُنہیں سینہ سے لگا لیا۔

ماہر۔ تمہارا خط نہ گیا ہوتا تو ابھی مَیں تھوڑا ہی آتا۔ امتحان کے بعد ہی تو وہاں لطف آتا ہے۔ کبھی میچ۔ کبھی دعوت۔ کبھی سیر۔ کبھی مشاعرہ۔ بھائی صاحب کو یہ کیا حماقت سُوجھی؟

زینب۔ بیگم صاحب کی فرمائشیں کیسے پوری ہوتیں۔ زیور چاہئے۔ زردوز چاہئے۔ نذری چاہئے کہاں سے آتا؟ اُس پہ کہتی ہیں کہ تمہیں لوگوں نے اُنہیں غارت کر دیا۔ پوچھو۔ روٹی دال میں ایسا کون چھتیس ٹکے کا خرچ تھا۔ مہینوں سر میں تیل ڈالنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ اپنے پاس سے پیسے نکالو تو پان کھاؤ۔ اُس پہ اتنے طعنے!

ماہر - میں نے تو اسٹیشن سے آتے ہوئے اُنہیں جیل جاتے دیکھا۔ میں تو شرم کے مارے اُن سے کچھ نہ بولا۔ سلام تک نہ کیا۔ آخر لوگ یہی تو کہتے کہ اُن کا بھائی قید خانہ جا رہا ہے۔ منہ پھیر کر چلا آیا۔ بھیّا رو پڑے۔ میرا دل بھی مسوس اُٹھا۔ جی چاہتا تھا۔ اُن کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ لیکن شرم دامنگیر ہوئی۔ تھانہ دار کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ اُس کا شمار حُکام میں ہوتا ہے۔ اِس بات کا خیال نہ کرتا تو بدنام ہو جاؤں گا ۔

زینب - چھ ماہ کی سزا ہوئی ہے۔

ماہر - جرم تو سنگین تھا مگر شاید حاکم نے رحم کیا ۔

زینب - تمہارے ابّا کا لحاظ کیا ہوگا۔ ورنہ تین سال سے کم کے بیٹے نہ جاتے۔

ماہر - خاندان میں داغ لگا دیا - بزرگوں کی آبرو خاک میں ملا دی ۔

زینب۔ خدا نہ کرے کہ کوئی مرد عورت کا کلمہ پڑھے ۔

اتنے میں ماما ناشتہ کے لئے مٹھائیاں لائی۔ ماہر علی نے ایک مٹھائی طاہر کو دی اور ایک جابر کو۔ اِن دونوں نے جا کر صابر اور نسیمہ کو دکھائی۔ وہ دونوں بھی دوڑے۔ زینب نے کہا ”جاؤ کھیلتے کیوں نہیں؟ کیا سر پر ڈٹ گئے۔ نہ جانے کہاں کے مربھوکے چھوکرے ہیں۔ ان سبوں کے مارے کوئی چیز منہ میں ڈالنی مشکل ہے۔ بلا کی طرح سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ سات دن کھاتے ہی رہتے ہیں پھر بھی اِن کا جی نہیں بھرتا ۔

رقیہ - چچھوری ماں کے بچّے اور ہوں گے کیسے ؟

ماہر نے ایک ایک مٹھائی اُن دونوں کو بھی دی۔ پھر بولے ـــــ اب گزر بسر کی کیا صورت ہوگی ؟ بھابھی کے پاس تو روپے ہوں گے نا؟

زینب - ہوں گے کیوں نہیں۔ اِنہیں روپوں کے لئے تو شوہر کو جیل بھیجا

دیکھتی ہوں۔ کیا انتظام کرتی ہیں۔ یہاں کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ پوچھنے جائے ؛

ماہر۔ مجھے ابھی نہ جانے کتنے دنوں میں جگہ ملے۔ مہینہ بھر لگ جائے۔ دو مہینے لگ جائیں۔ جب تک مجھے تنگ مت کرنا ؛

زینب۔ تم اس کا غم نہ کرو بیٹا۔ وہ اپنا سنبھالے۔ ہمارا ابھی خدا حافظ ہے۔ وہ زردہ کھا کر سوئیں گی تو ہمیں بھی روکھی روٹیاں میسر ہو جائیں گی۔

جب شام ہو گئی تو زینب نے ماما سے کہا — جا کر بیگم صاحبہ سے پوچھو کچھ سودا سلف آئے گا یا آج ماتم منایا جائے گا؟ ماما نے واپس ہو کر کہا — وہ تو بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ جسے بھوک ہو وہ کھائے مجھے نہیں کھانا ہے ؛

زینب۔ دیکھا یہ تو میں پہلے ہی کہتی تھی کہ صاف جواب ملے گا۔ جانتی ہے کہ لڑکا پردیس سے آیا ہے مگر پیسے نہ نکلیں گے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے بازار سے کھانا منگوا لے گی۔ دوسرے کھائیں یا مریں اُس کی بلا سے۔ خیر اُنہیں اُن کے میٹھے نوالے مبارک ہوں۔ ہمارا بھی اللہ مالک ہے۔

کلثوم نے جب سے سُنا تھا کہ طاہر علی کو چھ ماہ کی سزا ہو گئی جبھی سے اُس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ ماما پیغام لائی تو وہ سُن کر جل اُٹھی۔ بولی:۔ اُن سے کہہ دو کہ پکائیں کھائیں۔ یہاں بھوک نہیں ہے بچوں پر ترس آئے تو دو دو لقمے اُنہیں بھی دے دیں ؛

ماما نے اِنہیں فقرات کا خلاصہ کہا تھا جس سے یہ گڑبڑ ہوئی ؛

رات کو نو بج گئے۔ کلثوم دیکھ رہی تھی کہ چولھا گرم ہے۔ مصالحہ جات کی خوشبو آ رہی تھی۔ بگھار کی آواز بھی سُنائی دیتی تھی۔ لیکن جب بڑی

دیر تک کوئی اُس کے بچّوں کو بلانے نہ آیا تو ڈاڑھیں مار کر رونے لگی۔ اُسے
معلوم ہو گیا کہ گھر والوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب میں بیکس ہوں۔ دُنیا
میں کوئی میرا نہیں ہے۔ دونوں بچّے روتے روتے سو گئے تھے۔ اُنہیں کے
پائنتیے وہ بھی پڑ رہی۔ یا اللہ! یہ دو دو بچے اور پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں
گھر کے اکوسیوں کا یہ حال۔ یہ ناؤ کیسے پار لگے گی ؟

ماہر علی دستر خوان پر بیٹھے تو ماما سے پُوچھا۔ بھابی نے بھی کچھ بازار سے
منگوایا ہے یا نہیں ؟

زینب۔ ماما سے منگوائیں گی تو پردہ ہی فاش ہو جائے گا۔ خدا کے
فضل سے صابر سیانا ہوا ہے۔ گُپ چُپ کے سودے وہی لاتا ہے اور
ایسا گھا گھ ہے کہ لاکھ پھُسلانے پر بھی مُنہ نہیں کھولتا۔

ماہر علی۔ پوچھ لینا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم لوگ کھا پی کر سوئیں اور وہ بیچاری
روزہ سے رہ جائیں۔

زینب۔ ایسی اَنیلی نہیں ہیں۔ وہ ہم جیسیوں کو چرا لائیں۔ ہاں پوچھنا
میرا فرض ہے پوچھ لوں گی۔

رقیہ۔ سالن اور روٹی کیس بَلتے کھائیں گی۔ اُنہیں تو زردہ اور شیرمال
چاہیئے۔

دوسرے روز دونوں بچے سویرے ہی باورچی خانہ میں گئے تو زینب
نے ایسی کڑی نگاہوں سے دیکھا کہ بس روتے ہوئے لوٹ آئے۔ اب
کلثوم سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ جھلا کر اُٹھی اور باورچی خانہ میں جا کر ماما سے
بولی۔ تو نے بچوں کو کھانا کیوں نہیں دیا رے؟ کیا اتنی جلد کایا پلٹ ہو گئی؟
اسی گھر کے پیچھے ہم مٹی میں مل گئے اور آج میرے بچے بھوکوں کے مارے

تڑپیں۔ کسی کو ترس نہ آئے!

ماما نے کہا۔ تو آپ مجھ سے کیا بگڑتی ہیں؟ میں کون ہوتی ہوں؟ جیسا حکم پاتی ہوں ویسا کرتی ہوں ۔

زینب۔ اپنے کمرہ سے بولی ــــ تم مٹی میں مل گئیں تو یہاں کس نے گھر بھر لیا؟ کل تک کچھ ناتا نبھا جاتا وہ بھی تم نے توڑ دیا۔ بیٹے کے یہاں سے اور چار جنس آئی۔ جب کہیں منہ میں دانہ گیا۔ سوکیس سے لڑکا آیا۔ تم نے بات تک نہ پوچھی۔ تمہاری نیکی کوئی کہاں تک بیان کرے ۔

آج سے کلثوم کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ ماہر علی کبھی دونوں بھائیوں کو لے کر نانبائی کی دوکان سے کھانا کھا آتے۔ کبھی کسی دوست آشنا کے مہمان ہو جاتے۔ زینب اور رقیہ کے لئے ماما چپکے چپکے اپنے گھر سے کھانا بنا لاتی۔ گھر میں چولھا نہ جلتا۔ نسیمہ اور صابر علی الصباح گھر سے نکل جاتے اور کوئی کچھ دے دیتا تو کھا لیتے۔ زینب اور رقیہ کی صورت سے ایسا ڈرتے تھے جیسے چوہا بلّی سے۔ ماہر کے پاس بھی نہ جاتے۔ بچّے دوست اور دشمن کو خوب پہچانتے ہیں۔ اب وہ پیار کے بھوکے نہیں۔ رحم کے بھوکے تھے۔ رہی کلثوم سو اس کے لئے تو غم ہی کافی تھا۔ وہ سینا پرونا جانتی تھی۔ چاہتی تو سلائی کر کے اپنا گزارہ کر لیتی پر جلن کے مارے کچھ نہ کرتی تھی۔ وہ ماہر کے منہ میں کالک لگانا چاہتی تھی کہ دُنیا میری حالت دیکھے اور ان پر تھوکے۔ اُسے اب طاہر علی پر بھی غصّہ آتا تھا: ــ تم اسی قابل تھے کہ جیل میں پڑے پڑے چکی پیسو۔ اب آنکھیں کھلیں گی۔ تم کو دُنیا کے ہنسنے کی فکر تھی۔ اب دُنیا کسی پر نہیں ہنستی۔ لوگ مزے سے میٹھے لقمے اڑاتے اور میٹھی نیند سوتے ہیں۔ کسی کو بھی تو نہیں دیکھتی کہ بھولوں ہی ذرا

اِن خود غرضوں کی فضیحت کرے۔ کسی کو غرض ہی کیا پڑی ہے کہ کسی پہ نتھنے
لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ایسے کوتاہ اندیش حیاداروں کی یہی سزا ہے ؎

اِس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز سُبھاگی کلثوم کے یہاں ساگ بھاجی لے کر آئی۔ وہ اب سبزی فروشی کا کام کرتی تھی۔ کلثوم کی صورت دیکھی تو بولی ــــ بہوجی۔ تم تو پہچانی ہی نہیں جاتیں۔ کیا کُڑھ کُڑھ کر جان دے دو گی؟ بپت تو پڑ گئی ہے۔ کُڑھنے سے کیا ہوگا؟ مَسَل ہے آنا ھی آئے بیٹھے گنوائے۔ تم نہ رہو گی تو بچوں کو کون پالے گا؟ دُنیا کتنی جلد اندھی ہو جاتی ہے۔ بیچارے کہاں صاحب اِنہیں لوگوں کے لئے مرتے تھے۔ اب کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ گھر گھر یہی چرچا ہو رہی ہے کہ اِن لوگوں کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ بھگوان کو کیا مُنہ دکھائیں گے ؎

کلثوم۔ اب تو بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا ہو گیا ؎

سُبھاگی۔ بہو کوئی مُنہ پر بھلے نہ کہے پر سب تھُڑی تھُڑی کرتے ہیں۔ بیچارے ننھے ننھے لڑکے مارے مارے پھرتے ہیں۔ دیکھ کر کلیجہ پھٹتا ہے۔ کل تو چودھری نے ماہر میاں کو کھُوب آڑے ہاتھوں لیا تھا ؎

کلثوم کو اِن باتوں سے بڑی تسکین ہوئی۔ دُنیا اِن لوگوں کو تھوکتی تو ہے۔ اُن کی بُرائی تو کرتی ہے۔ اِن بےحیاؤں کو لاج ہی نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ بولی ــــ کس بات پر؟

سُبھاگی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ باہر سے چودھری نے پکارا۔ سُبھاگی نے جا کر پوچھا۔ کیا کہتے ہو؟

چودھری۔ بہوجی سے کچھ کہنا ہے۔ جرا پردے کی اوٹ میں کھڑی ہو جائیں ؎

دوپہر کا وقت تھا۔ گھر میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ زینب اور رقیہ کسی ولی کے مزار پر شیرینی چڑھانے گئی ہوئی تھیں۔ کلثوم پردہ کی آڑ میں آکر کھڑی ہو گئی ؛

چودھری۔ بہوجی۔ کئی دن سے آنا چاہتا تھا۔ گر موکا ہی نہ ملتا تھا۔ جب آتا تو ماہر میاں کو بیٹھے دیکھ کر لوٹ جاتا تھا۔ کل ماہر میاں مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے بھیا کی مدد کے لئے جو روپے جمع کئے تھے وہ مجھے دے دو۔ بھابھی نے مانگے ہیں۔ میں نے کہا کہ جب تک بہوجی سے خود نہ پوچھ لوں گا آپ کو نہ دوں گا۔ اِس پر بہت بگڑے۔ کچی پکی مُنہ سے نکلنے لگے "سمجھ لوں گا۔ بُرے گھر بھجوا دوں گا۔" میں نے کہا "جائیے سمجھ لیجئے گا"۔ تو اب آپ کا کیا حکم ہے؟ وے سب روپے ابھی تک میرے پاس رکھے ہوئے ہیں آپ کو دے دوں نا؟ مجھے تو آج معلوم ہوا کہ وہ سب آپ کے ساتھ دگا کر گئے ؛

کلثوم نے کہا۔ خدا تمہیں اِس نیکی کا ثواب دے گا۔ مگر یہ روپے جس کے ہوں اُنہیں واپس کر دو۔ مجھے اِن کی ضرورت نہیں ہے ؛

چودھری۔ کوئی نہ لوٹائے گا ؛

کلثوم۔ تو تمہیں اپنے پاس رکھو ؛

چودھری۔ آپ لیتی کیوں نہیں؟ ہم کوئی اوسان تھوڑے جتاتے ہیں۔ کھاں صاحب کی بدولت بہت کچھ کمایا کھایا ہے۔ دوسرا اُنسی ہوتا تو ہجاروں روپے ہجر لے لیتا۔ یہ اُنہیں کی نجر سمجھی جائیے ؛

چودھری نے بہت اصرار کیا مگر کلثوم نے روپے نہ لئے۔ وہ ماہر علی کو دکھانا چاہتی تھی کہ جن روپوں پر تم کُتوں کی طرح لپکے تھے اُنہیں دیو

کو مَیں نے پیر سے ٹھکرا دیا۔ میں لاکھ گئی گزری ہوں پھر بھی مجھ میں کچھ غیرت باقی ہے۔ تم مرد ہو کر بیحیائی پر کمرے باندھے ہوئے ہو۔

چودھری یہاں سے چلا تو سُبھاگی سے بولا ـــــ یہی بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں۔ چاہے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جائیں۔ مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پساریں گی۔ ایسا نہ ہوتا تو چھوٹے بڑے میں پھرک ہی کیا رہتا۔ دھن سے بڑائی نہیں ہوتی۔ دھرم سے ہوتی ہے۔

اِن روپیوں کو لوٹا کر کلثوم کا سر غرور سے اونچا ہو گیا۔ آج اُسے پہلی مرتبہ طاہر علی پر ناز ہوا۔ یہ عزت ہے کہ بیٹھے پیچھے دُنیا بڑائی کرتی ہے۔ اُس بے عزتی سے تو مر جانا ہی اچھا کہ چھوٹے چھوٹے آدمی مُنہ پر فضیحت کریں۔ کوئی لاکھ اُن کے احسان کو مٹائے پر دُنیا تو انصاف کرتی ہے۔ روز ہی تو عملے سزا پاتے رہتے ہیں۔ کوئی تو اُن کے بال بچوں کی بات نہیں پوچھتا بلکہ اُلٹے اور لوگ طعنے دیتے ہیں۔ آج اُن کی نیک نامی نے میرا سر اُونچا کر دیا۔

سُبھاگی نے کہا ـــــ بہو جی۔ بہت عورتیں دیکھیں پر تم جیسی دھیرج والی برلی ہی کوئی ہو گی۔ بھگوان تمہارا اسنکٹ ہریں۔

جانے لگی تو اُس نے کئی امرود بچوں کے لئے رکھ دئے۔ کلثوم نے کہا ـــــ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

سُبھاگی مسکرا کر چلی گئی۔

(۳۷)

پربھو سیوک نہایت مستعد آدمی تھے۔ اُن کی حوصلہ مندیوں کی بدولت سیوا سمتی میں جان سی پڑ گئی۔ ممبروں کی تعداد میں روز بروز ترقی

ہوتی گئی۔ جو لوگ کاہل اور بے پرواہ سے ہو رہے تھے وہ پھر نئے جوش سے کام کرنے لگے۔ پربھوسیوک کی شرافت اور نیک دلی سب کو فریفتہ کر لیتی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی اب اُن میں وہ مستعدی نظر آتی تھی جس کی اُنہیں خود اُمید نہ تھی۔ سیوا سمتی کے عموماً سبھی لوگ قابل اور تعلیم یافتہ تھے۔ وہ سمتی کو ترقی دینے کے لئے کسی نئی تجویز سے کام لینا چاہتے تھے۔ وہ جاہل سپاہیوں کی فوج نہ تھی جو افسر کے حکم کو حکم خدا مانتی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ فوج تھی۔ جو افسر کے حکم پر غور کرتی ہے۔ اُسے ہر پہلو سے جانچتی ہے۔ اور جب تک اُس کے جواز کی قایل نہ ہو جائے اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ پربھوسیوک کی بڑی ہوشیاری سے اس مشکل کام کو آگے بڑھانا شروع کیا۔

اب تک اس جماعت کا کام صرف سوشل تھا۔ میلوں تماشاؤں میں جانے والوں کی مدد کرنا۔ باڑھ کے مارے ہوؤں کو بچانا۔ مصیبت زدہ عوام کی تکلیف رفع کرنا یہی اُن کے خاص کام تھے۔ پربھوسیوک نے سمتی کے دائرۂ عمل کو وسیع کر دیا۔ اُسے سیاسی شکل دے دی۔ اگرچہ اُنہوں نے کوئی نئی تجویز نہیں پیش کی۔ کسی تبدیلی کا تذکرہ تک نہ کیا۔ مگر رفتہ رفتہ اُن کی شخصیت کے اثر سے نئی باتوں کا آغاز ہونے لگا۔

پربھوسیوک نہایت خلیق آدمی تھے مگر کسی کو غریبوں پر ظلم کرتے دیکھ کر اُن کا اخلاق تشدد آمیز ہو جاتا تھا۔ کسی سپاہی کو گھسیاروں کی گھاس چھینتے دیکھ کر وہ فوراً گھسیاروں کی طرف سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ آفاتِ ارضی و سماوی سے عوام کی حفاظت کرنا اُنہیں بے سود سا معلوم ہوتا تھا۔ زبردستوں کے ظلم ہی پر اُن کی خاص نگاہ رہتی تھی۔

رشوت خور اہلکاروں پر۔ ظالم زمینداروں پر۔ خود غرض حکام پر۔ وہ ہمیشہ تاک لگائے رہتے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں اس جماعت کی دھاک بیٹھ گئی۔ اُس کا دفتر کمزوروں اور مصیبت زدوں کی جائے پناہ بن گیا۔ پربھوسیوک کمزوروں کو مقابلہ کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ جب تک عوام خود ہی اپنی حفاظت کرنا نہ سیکھیں گے۔ ایشور بھی اُنھیں ظلم سے نجات نہیں دے سکتا۔

ہمیں سب سے پہلے اپنی خودداری کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ ہم بزدل اور ڈرپوک ہوگئے ہیں۔ ذلت اور نقصان چپکے سے برداشت کرلیتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کو تو بہشت میں بھی آرام نہیں مل سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم بیخوف اور جری بنیں۔ مصائب کا مقابلہ کریں۔ مرنا سیکھیں۔ جب تک ہمیں مرنا نہ آئے گا۔ جینا بھی نہ آئے گا۔ پربھوسیوک کے لئے مظلوموں کی حفاظت کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بن جانا اِس سے کہیں زیادہ آسان تھا کہ وہ کسی مریض کے سرہانے بیٹھا پنکھا جھلے یا قحط زدوں کو غلہ اور روپیہ تقسیم کرتا پھرے۔ اُس کے رفیقوں کو بھی اِس قسم کی مردانہ خدمت کرنے کا زیادہ شوق تھا۔ کچھ لوگ تو اِس سے بھی زیادہ کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عوام میں بدامنی پیدا کرنا بھی والنیٹروں کا خاص فرض ہے اندرونی اِس غول کا سرغنہ تھا اور اُسے نرم رکھنے کے لئے پربھوسیوک کو نہایت ہوشیاری سے کام کرنا پڑتا تھا۔

لیکن جیوں جیوں یہ جماعت مشہور اور ہردلعزیز ہوتی گئی۔ اُس پر حکام کا شبہ بھی زیادہ ہوتا گیا۔ اب کنور صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں سرکار اِس جماعت کا تشدد سے خاتمہ نہ کردے۔ کچھ دنوں میں یہ افواہ

بھی گرم ہوئی کہ حکام ہیں کنور صاحب کی ریاست کو ضبط کرنے کی چرچا ہو رہا ہے۔ کنور صاحب بیخوف آدمی تھے مگر یہ افواہ سُن کر اُن کی طبیعت بھی ڈانواڈول ہوگئی۔ وہ ثروت سے عظ نہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ مگر ثروت کی خواہش کو ترک نہ کر سکتے تھے۔ اُن کو دوسروں کی بھلائی کرنے میں اُس سے کہیں زیادہ خوشی ملتی تھی جتنی کہ نفس پرستی میں۔ بھلائی کرنے میں عزت تھی۔ وہ عزت ہی نہ رہی تو جینے میں مزہ کیا رہا۔ وہ پربھوسیوک کو بار بار سمجھاتے ــــ بھئی ذرا سوچ سمجھ کر کام کرو۔ حکام سے بچ کر چلو۔ ایسے کام ہی کیوں کرو جن سے حکام کو تم پر شبہ ہو؟ تمہارے لئے رفاہ عام کا میدان کیا کم ہے کہ سیاسی جھگڑوں میں پڑو؟ ــــ لیکن پربھوسیوک اُن کے مشورہ کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ دھمکاتے تھے کہ استعفا دے دوں گا۔ ہمیں حکام کی کیا پرواہ؟ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ہم سے کچھ نہیں پوچھتے پھر ہمیں کیوں اُن کا رُخ دیکھ کر کام کریں؟ ہم اپنے مجوزہ راستہ سے منحرف نہ ہوں گے۔ حکام کا جو جی چاہے کریں۔ خودداری کے احساس کو مٹا کر ہستی کو زندہ بھی رکھا تو کیا۔ اُن کا رُخ دیکھ کر کام کرنے کا مطلب تو یہی ہے کہ ہم کھائیں پئیں۔ مقدمہ بازی کریں۔ ایک دوسرے کا بُرا چیتیں اور پڑے پڑے سوئیں۔ ہمارے اور اُن کے اغراض میں اختلاف ہے۔ جس سے ہمارا فائدہ ہے۔ اُس سے اُن کا نقصان ہے اور ایسی حالت میں اُن کا بدگمان ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ اگر ہم لوگ اس طرح ڈرتے رہیں گے تو پھر ہمارا عدم و وجود برابر ہے۔

ایک روز دونوں آدمیوں میں بحث کی نوبت آگئی۔ بندوبست کے حکام نے کسی صوبہ میں آراضی کا محصول اپنے حسب دلخواہ بڑھا دیا تھا۔

کاؤنسلوں۔ اخباروں اور سیاسی جلسوں میں اس اضافہ کی مخالفت کی جا رہی تھی مگر حکام متعلقہ پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ پربھو سیوک کی رائے تھی کہ ہمیں جا کر اسامیوں سے کہنا چاہئے کہ سال بھر تک زمین کو پرتی پڑی رہنے دیں۔ کنور صاحب کہتے تھے کہ یہ تو کھلم کھلا حاکموں سے بَیر مول لینا ہے۔

پربھو سیوک۔ اگر آپ اتنا ڈر رہے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ اس جماعت کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ دو کشتیوں پر بیٹھ کر دریا کو عبور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ مجھے رئیسوں پر پہلے بھی اعتبار نہ تھا اور اب تو بالکل ہی مایوس ہو گیا ہوں۔

کنور۔ تم میرا شمار رئیسوں میں کیوں کرتے ہو۔ جب تمہیں خوب معلوم ہے کہ مجھے ریاست کی پرواہ نہیں ہے؟ لیکن کوئی کام روپیہ کے بغیر تو نہیں چل سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ دیگر قومی انجمنوں کی طرح اس انجمن کو بھی روپیہ کی کمی کے سبب ہم ٹوٹتا ہوا دیکھیں۔

پربھو سیوک۔ میں بڑی سے بڑی جائداد کو بھی اصول پہ قربان کر دینے سے دریغ نہ کروں گا۔

کنور۔ میں بھی نہ کرتا اگر جائداد میری ہوتی۔ لیکن جائداد میرے ورثاء کی ہے اور مجھے کوئی مجاز نہیں ہے کہ میں بلا ان کی مرضی جائداد کو تلف کر دوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اعمال کا خمیازہ میرے ورثاء کو اٹھانا پڑے۔

پربھو سیوک۔ یہ روساء کی پرانی دلیل ہے۔ وہ اپنی ثروت پسندی کو اسی پردہ کی آڑ میں چھپایا کرتے ہیں۔ اگر آپ کو خوف ہے کہ ہمارے کاموں سے آپ کی جائداد کو نقصان پہنچے گا تو بہتر ہے کہ آپ اس انجمن سے

قطع تعلق کریں۔

کنور صاحب نے متفکرانہ لہجہ میں کہا — پربھو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کہ اس تحریک کی بُنیاد ابھی کتنی کمزور ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ حُکام کی تیز نگاہی کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا اور تمہارا مقصد ایک ہی ہے۔ میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو۔ لیکن میں سن رسیدہ ہوں۔ آہستہ چلنا چاہتا ہوں اور تم جوان ہو۔ دوڑنا چاہتے ہو۔ میں بھی حکام کی مہربانیوں کا متمنی نہیں ہوں۔ میں بہت پہلے تجویز کر چکا ہوں۔ کہ ہماری قسمت ہمارے ہاتھ ہے۔ اپنے بہبود کے لئے جو کچھ کریں گے ہمیں کریں گے۔ دوسروں سے ہمدردی یا مدد کی اُمید رکھنا فضول ہے۔ لیکن کم از کم ہماری قومی تحریکات کو زندہ تو رہنا ہی چاہئے۔ میں اس تحریک کو حکام کی بدگمانیوں کا شکار بنا کر اُس کا فاتحہ پڑھنا نہیں چاہتا۔

پربھو سیوک نے کچھ جواب نہ دیا۔ بات بڑھ جانے کا خوف تھا البتہ دل میں طے کر لیا کہ اگر کنور صاحب نے زیادہ مداخلت کی تو اُن کو اس جماعت سے علیحدہ کر دوں گا۔ روپیہ کا سوال اتنا مشکل نہیں ہے کہ اُس کے لئے تحریک کی بیخکنی کر دی جائے۔ اندر دت نے بھی یہی صلاح دی۔ کنور صاحب کو الگ کر دینا چاہئے۔ ہم دوائیں تقسیم کرنے اور قحط زدہ علاقوں میں مویشیوں کا چارہ ڈھونڈنے کے نہیں ہیں۔ ہے وہ بھی ہمارا کام۔ اس سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن میں اُسے اتنا وزن دار نہیں سمجھتا۔ یہ انہدام کا زمانہ ہے۔ تعمیر کا زمانہ بعد کو آئے گا۔ طاعون قحط اور سیلاب سے دُنیا کبھی ویران نہیں ہوئی اور نہ ہو گی۔

شُدہ شُدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اب کتنے ہی اہم معاملات میں یہ

دونوں آدمی کنور صاحب سے رائے تک نہ لیتے۔ بیٹھ کر آپس ہی میں طے کر لیتے۔ ہر طرف سے مظالم کی خبریں ہر وقت دفتر سے آتی رہتی تھیں۔ کہیں کہیں تو لوگ اس جماعت کی مدد حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دینے کو تیار ہو جاتے۔ اِس سے اس امر کا یقین ہوتا جاتا تھا کہ سمتی اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ اُسے کسی مستقل سرمایہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کام کرنے والوں میں کافی حوصلہ اور جوش ہو تو کبھی روپیوں کا کال نہیں پڑ سکتا۔ جیوں جیوں یہ بات ظاہر ہوتی جاتی تھی۔ کنور صاحب کی ماتحتی ممبروں کو کھلتی تھی۔

پربھو سیوک کا کلام ان دنوں انقلابی جذبات سے مملو ہوتا تھا۔ قومیت۔ جدوجہد۔ کشمکش کا جذبہ ہر شعر سے مترشح ہوتا تھا۔ اُس نے کشتی کے عنوان سے ایک ایسی نظم لکھی جسے بحر شاعری کا ایک گوہر نایاب کہنا بیجا نہ ہوگا۔ لوگ پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ پہلے ہی بند میں مسافر نے پوچھا تھا — کیوں مانجھی۔ کشتی ڈوبے گی یا پار لگے گی؟ مانجھی نے جواب دیا — مسافر۔ کشتی ڈوبے گی۔ کیونکہ تمہارے دل کو یہ اندیشہ اسی سبب سے ہوا ہے۔ کوئی ایسا جلسہ یا مجمع نہ تھا جہاں یہ نظم نہ پڑھی گئی ہو۔ ادبی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔

خدمتی جماعت پر پربھو سیوک کا اقتدار دن بدن بڑھتا جاتا تھا عموماً سبھی ممبروں کو اب اُن سے عقیدت ہو گئی تھی۔ سبھی دل و جان سے اُن کے اشاروں پر چلنے کو تیار رہتے۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ قومیت کے نشہ میں چور۔ نہ دولت کی پرواہ۔ نہ گھر بار کی فکر۔ روکھا سوکھا کھانے والے۔ موٹا جھوٹا پہننے والے۔ زمین پر سو کر

رات کاٹ دیتے تھے۔ گھر کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی کسی درخت کے نیچے پڑے رہتے۔ کبھی کسی جھونپڑے میں۔ ہاں اُن کے دل میں اعلیٰ اور پاک حب الوطنی کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔

تمام ملک میں اِس انجمن کے حُسنِ انتظام کی دھوم تھی۔ پربھو سیوک ملک کے معزز اور ہر دلعزیز لیڈروں میں سے تھے۔ اتنی کم عمری میں یہ ناموری لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ جگہ جگہ سے قومی مجلسوں نے اُنہیں بُلانا شروع کیا۔ جہاں جاتے لوگ اُن کی تقریر سُن کر ازخود رفتہ ہو جاتے تھے۔ پُونا میں قومی سبھا کا جلسہ تھا۔ پربھو سیوک کو نوید ملا۔ اُنہوں نے فوراً اندرونت کو اپنا کام سپرد کیا اور جنوبی علاقہ جات میں سفر کرنے کا ارادہ کرکے روانہ ہو گئے۔ پونا میں اُن کے استقبال کی خوب خوب تیاریاں کی گئی تھیں۔ یہ شہر قومی کارکنوں کا ایک مرکزی مقام بھی تھا۔ اُن کا افسر بڑے جیوٹ کا آدمی تھا جس نے برلن میں انجینری کی ڈگری حاصل کی تھی اور تین سال کے لئے اس جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کا تمام شہر میں بڑا رسوخ تھا۔ وہ اپنی جماعت کے ممبروں کو لئے ہوئے اسٹیشن پر کھڑا ہوا تھا۔ پربھو سیوک کا دل اس دھوم دھام کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اُن کے دل نے کہا — یہ میری سرگرمی کا اثر ہے۔ یہ لگن - یہ بے خوفی۔ یہ بیداری ان میں کہاں تھی؟ میں نے ہی انہیں پیدا کیا۔ ب اُمید ہوتی ہے کہ زندہ رہا تو کچھ نہ کچھ کر دکھاؤں گا — آہ غرور!

شام کے وقت بڑے پنڈال میں جب وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تو کئی ہزار سامعین کو اپنی طرف عقیدتمندانہ نگاہوں سے تاکتے ہوئے دیکھ کر اُن کا دل بھر آیا۔ گیلری میں یوروپین لیڈیاں بھی موجود تھیں۔

صوبہ کے گورنر بھی تشریف لائے تھے۔ جس کی تحریریں یہ معجزہ ہے۔ اُس کی تقریریں کیا کچھ جادو ہوگا۔ سب یہی دیکھنا چاہتے تھے۔
پربھوسیوک کا لکچر شروع ہوا۔ کسی سے اُن کا تعارف کرانے کی ضرورت نہ تھی۔ قانونِ سیاست کی فلسفیانہ تشریح کرنے لگے۔ وہ قانون کیا ہے اُس کی ضرورت کیوں ہے۔ اُس کی پابندی کا کیا طریقہ ہے۔ کن حالتوں میں اُس کی خلاف ورزی کرنا رعایا کا فرض ہو جاتا ہے۔ اُس میں کیا بھلائی بُرائی ہے؟ اُنھوں نے نہایت قابلیت اور بے خوفی سے اِن سوالوں کی توضیح کی۔ ایسے پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کو اگر کوئی شخص سلیس اور دل کش بنا سکتا تھا تو وہ پربھوسیوک تھے۔ گو سیاست بھی دُنیا کی اُن مخصوص چیزوں میں ہے جو توضیح و تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اُس کی تشریح اُسی کے حق میں سمِ قاتل ہے۔ اِس پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہے۔ پربھوسیوک نے پردہ اُٹھا دیا۔ فوجوں کے پرے نظروں سے غائب ہو گئے۔ عدالتوں کے شاندار محل زمین دوز ہو گئے۔ ثروت و اقتدار کے نشانات مٹنے لگے۔ سامنے روشن اور جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "قانون کا نہ ہونا ہی بہترین قانون ہے"۔ لیکن جوں ہی اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے "یہ ہمارا ملک بلا قانون کا ہے۔ مجبوری اور پابندی میں لذت ہے"۔ اُسی وقت سامنے سے پستول دغنے کی آواز آئی اور گولی پربھوسیوک کے کان کے پاس سے نکل کر پیچھے دیوار میں جا لگی۔ رات کا وقت تھا۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کس نے یہ وار کیا۔ شک ہوا کہ کسی یوروپین کی شرارت ہے۔ لوگ گیدریوں کی طرف دوڑے۔ معاً پربھوسیوک نے بلند آواز میں کہا —— میں اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے مجھ پہ وار کیا ہے اُس

کا جی چاہے تو وہ پھر مجھے نشانہ بنا سکتا ہے۔ میری جانب سے کسی کو بدلہ لینے کا اختیار نہیں ہے۔ میں اپنے خیالات کی اشاعت کرنے کے لئے آیا ہوں۔ زیادتیوں کے انتقام کے لئے نہیں ۔

ایک سمت سے آواز آئی ـــ یہ قانون کی ضرورت کا روشن ثبوت ہے۔

جلسہ برخاست ہو گیا۔ یوروپین اصحاب عقب کے دروازہ سے نکل گئے۔ باہر مسلح پولیس آ پہنچی تھی ۔

دوسرے روز شام کو پربھو سیوک کے نام تار آیا کہ خدمتی انجمن کی انتظامیہ کمیٹی آپ کے لکچر کو ناپسند کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ آپ اُسے واپس لیں ورنہ یہ کمیٹی آپ کے لکچروں کی ذمہ دار نہ ہوگی ۔

پربھو سیوک نے تار کے کاغذ کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اُسے پیروں سے کچلتے ہوئے آپ آپ بولے ـــ مکّار۔ بُزدل۔ رنگا سیار۔ قومیت کا دم بھرتا ہے۔ قوم کی خدمت کرے گا! ایک تقریر سے کایا پلٹ کر دی۔ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتا ہے؟ قومی خدمت کو بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ سانپ سے کھیلنا ہے۔ شیر سے پنجہ لینا ہے۔ اگر اپنی جان اور دولت اتنی پیاری ہے تو یہ سوانگ کیوں بھرتے ہو؟ جاؤ تم جیسے قوم پرستوں کے بغیر ملک کا کوئی نقصان نہیں ہے ۔

اُنہوں نے اُسی وقت تار کا جواب دیا ـــ میں انتظامیہ کمیٹی کے ماتحت ہونا اپنے لئے ذلت آمیز سمجھتا ہوں۔ میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔

آدھ گھنٹے کے بعد دوسرا خط آیا۔ اس پر سرکاری مہر تھی۔ لکھا تھا:۔

مائی ڈیر سیوک۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کل آپ کی تقریر سُن کر مجھے کتنا حظ اور نفع حاصل ہوا۔ اسے مبالغہ نہ سمجھئے کہ سیاست کی ایسی عالمانہ اور باریک تشریح میں نے آج تک کہیں نہ سُنی تھی۔ قواعد نے میری زبان بند کر رکھی ہے مگر میں آپ کے جذبات و خیالات کی عزّت کرتا ہوں اور خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ دن جلد آئے جب ہم سیاست کا راز سمجھیں اور اُس کے اعلیٰ ترین اصولوں پر کاربند ہو سکیں۔ صرف ایک ہی ایسا شخص ہے جسے آپ کی صاف گوئی شاق ہے اور مجھے افسوس و شرم کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ شخص یورپین ہے۔ میں یوروپین جماعت کی طرف سے اِس وحشیانہ اور بُزدلانہ حملہ پر اپنے رنج و نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کُل یوروپین جماعت کو آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اگر میں اس شیطان کا پتہ نہ لگانے میں کامیاب ہُوا (اُس کا کل سے پتہ نہیں ہے) تو آپ کو اس کی اطلاع دینے میں مجھ سے زیادہ خوش اور کوئی نہ ہوگا۔ آپ کا ایف ولسن ؂

پربھو سیوک نے اِس خط کو دوبارہ پڑھا۔ اُس کے دل میں گُدگُدی سی ہونے لگی۔ بڑی احتیاط سے اُسے اپنے صندوق میں رکھ دیا۔ کوئی اور وہاں ہوتا تو ضرور ہی اُسے پڑھ کر سُناتے۔ وہ گھمنڈ میں آکر کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ یہ ہے زندہ قوموں کی فیاضی۔ فراخدلی اور قدردانی! اُنہوں نے آزادی کا لطف اُٹھایا ہے۔ آزادی کے لئے قربانیاں دی ہیں اور آزادی کی اہمیت سے واقف ہیں۔ جس کی ساری زندگی دوسروں کی خوشامد کرنے اور دوسروں کا مُنہ تاکنے میں گزری ہو وہ آزادی کی اہمیت کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ مرنے کے دن سر پر آجاتے ہیں تو ہم کتنے خدا پرست بن جاتے

ہیں۔ بھرت سنگھ بھی اُسی طرف گئے ہوتے۔ اب تک رام نام کی مالا پھیرتے ہوتے۔ وہ تو ونے سنگھ نے اِس طرف گھما دیا۔ یہ اُنہیں کا اثر تھا۔ ونے اُس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ بڑی ضرورت ہے! تم کہاں ہو؟ آ کر دیکھو تمہاری اِس کشت کا کیا حال ہے۔ اُس کے محافظ ہی اُسے اُجاڑ رہے ہیں!

(۳۸)

صوفیا اور ونے ساری رات تو اسٹیشن پر پڑے رہے۔ سویرے قریب کے گاؤں میں گئے جو بھیلوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ صوفیا کو یہ مقام بہت پسند آیا۔ گاؤں کے سر پر پہاڑ کا سایہ تھا اور پیڑوں کے نیچے ایک پہاڑی چشمہ میٹھا راگ گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ بھیلوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے جن پر بیل پھیلی ہوئی تھی۔ پریوں کے کھلونوں کی طرح خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ کیا کرنا ہے۔ کہاں جانا ہے کہاں رہنا ہے اُس وقت تک اُنہوں نے اُسی گاؤں میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک جھونپڑے میں جگہ بھی آسانی سے مِل گئی۔ بھیلوں کی مہمان نوازی مشہور ہے اور یہ دونوں بھوک پیاس گرمی۔ سردی برداشت کرنے کے عادی تھے۔ جو کچھ موٹا جھوٹا میسّر ہوا کھا لیا۔ چاء اور مکھن مُربّے اور میوؤں کا چسکا نہ تھا۔ صاف اور سادہ غذا اُن کی خوراک تھی۔ وہاں اُن کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس جھونپڑے میں صرف ایک بھیلنی رہتی تھی۔ اُس کا لڑکا کہیں فوج میں ملازم تھا۔ بڑھیا اِن لوگوں کی خدمت خوشی سے کرتی۔ یہاں اُنہوں نے مشہور کیا کہ ہم دلّی کے رہنے والے ہیں۔ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے آئے ہیں۔ گاؤں کے باشندے اُن کا بڑا ادب اور

لحاظ کرتے تھے ؎

مگر اتنی خلوت اور آزادی کے باوجود بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت کم ملتے۔ دونوں ہی نہ جانے کیوں خائف رہتے تھے۔ ان میں ناچاقی نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ دونوں مضطرب تھے۔ دونوں بیقرار۔ دونوں بیتاب۔ مگر اخلاقی پابندیوں کا خیال اُنہیں باہم ملنے نہ دیتا تھا۔ عمیق مذہبی مطالعہ نے صوفیا کو فرقہ بندیوں کی تنگی سے آزاد کر دیا تھا۔ اُس کے دل میں اب کسی سے نفرت یا مخالفت نہ تھی۔ جس بے اطمینانی نے مہینوں تک اُس کے مذہبی اصولوں کو دبا رکھا تھا۔ وہ مفقود ہو گئی تھی۔ اب کل جاندار اُس کے لئے اپنے ہی تھے۔ اگرچہ ونے کے خیالات اتنے وسیع نہ تھے۔ دنیا کی محبت اُن کی نگاہ میں ایک فلسفیانہ بحث سے زیادہ قیمتی تھی مگر صوفیا کی وسیع الخیالی کے سامنے اُس کے موروثی احساسات مُنہ چھپاتے پھرتے تھے۔ واقعی دونوں کا روحانی ارتباط ہو چکا تھا اور مادی ارتباط میں بھی کوئی ٹھوس رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ دونوں جُدا رہتے تھے۔ تنہائی میں ساتھ ساتھ کبھی نہ بیٹھتے تھے اُنہیں اب اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا۔ تقریر کا دور ختم ہو چکا تھا۔ تحریر کا دور آ گیا تھا تقریر سے زبان نہیں کٹتی۔ تحریر سے ہاتھ کٹ جاتے ہیں ؎

لیکن تحریر سے ہاتھ چاہے کٹ جائیں پھر بھی اُس کے بغیر کوئی بات پختہ نہیں ہوتی۔ ذرا سا اختلاف۔ ذرا سی بے احتیاطی سے سمجھوتہ مسترد ہو سکتا ہے۔ اِس لئے دونوں ہی اِس غیر یقینی حالت کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے۔ کیسے کریں یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کون اِس تذکرہ کو چھیڑے ؟ شاید باتوں میں کوئی اعتراض پیدا ہو جائے۔ صوفیا کے لئے تو ونے کی قربت کافی

تھی۔ وہ اُنہیں ہر وقت آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ اُن کے رنج اور خوشی میں شریک ہوتی تھی۔ اُنہیں اپنا سمجھتی تھی۔ اِس سے زیادہ وہ کچھ نہ چاہتی تھی۔ ونسے ہر روز آس پاس کے دیہاتوں میں گھومنے چلے جاتے تھے۔ کوئی عورت اُن سے اپنے پردیسی لڑکے یا شوہر کے نام خط لکھاتی۔ کہیں وہ مریضوں کو دوا دیتے۔ کہیں اُنہیں آپس کے جھگڑوں میں پنچ بننا پڑتا۔ صبح کے گئے پھر رات گئے گھر لوٹتے۔ یہ اُن کا روزمرہ کا دستور تھا۔ صوفیا چراغ جلائے اُن کی راہ دیکھا کرتی۔ جب وہ آجاتے تو اُن کے ہاتھ پیر دُھلوا کر کھانا کھلاتی۔ دن بھر کی باتیں اشتیاق سے سُنتی اور پھر دونوں اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں سونے چلے جاتے۔ وہاں ونسے کو اپنا گھاس کا بچھونا بچھا ہوا ملتا۔ سرہانے پانی کی ہانڈی رکھی ہوتی۔ صوفیا اتنے ہی سے مطمئن تھی۔ اگر اُسے یقین ہو جاتا کہ میری ساری زندگی اِسی طرح کٹ جائے گی تو اِسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتی۔ یہی اُس کی زندگی کا خوابِ شیریں تھا لیکن ونسے اتنے صابر اور بے نیاز نہ تھے۔ اُن کو محض روحانی ارتباط سے تسکین نہ ملتی تھی۔ صوفیا کا بے مثال حُسن۔ اُس کی شیریں کلامی اُس کے جسم کا سڈول پن اُن کے عشقیہ تخیل کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ اُنہوں نے نامناسب حالات میں پڑ کر ایک بار اُسے کھو دیا تھا۔ وہ اب دوبارہ اُس امتحان میں نہ پڑنا چاہتے تھے۔ جب اُس کا امکان تھا اُن کے دل کو کبھی سکون نہ مل سکتا تھا۔

یہ لوگ ریلوے اسٹیشن کے پتہ پر اپنے نام کے خطوط۔ اخبارات۔ رسالے اور کتابیں وغیرہ منگا لیا کرتے تھے۔ اُن سے دنیا کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ بھیلوں سے اُنہیں کچھ محبت سی بھی ہو گئی تھی۔ یہاں سے

کسی اَور جگہ چلے جانے کی اُنہیں خواہش نہ ہوتی تھی۔ دونوں کو خوف تھا کہ اس محفوظ مقام سے نکل کر ہمارا نہ جانے کیا حال ہو۔ نہ جانے ہم کس بھنور میں جا پھنسیں۔ اِس گوشۂ عافیت کو دونوں ہی غنیمت سمجھتے تھے۔ صوفیا کو ونے پر یقین تھا وہ اپنی کشش کی طاقت سے واقف تھی۔ ونے کو صوفیا پر یقین نہ تھا وہ اپنی مقناطیسی قوت سے بے خبر تھے۔

اِس طرح ایک سال گزر گیا۔ صوفیا ونے کو ناشتہ کرا کے انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ہوئی ایک کتاب دیکھ رہی تھی۔ کبھی اہم مقامات پر پنسل سے × کا نشان لگاتی۔ کبھی سوالیہ نشان لگاتی اور کہیں کہیں خط بھی کھینچ دیتی۔ ونے کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ محویت سرد مہری کی علامت تو نہیں ہے۔ مطالعہ میں ایسی محو ہے کہ دوسری طرف دیکھتی بھی نہیں۔ اُنہوں نے کپڑے پہنے۔ وہ باہر جانا چاہتے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ سرائی یا رچے موجود نہ تھے۔ کمبل کافی نہ تھا۔ آلس میں ہو کر انگیٹھی کے پاس آئے اور مانچی بیٹھ گئے۔ صوفیا کی نگاہیں کتاب کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ونے کی للچائی ہوئی نظر موقع پا کر آزادی سے اُس کے حُسنِ خداداد کا جلوہ دیکھنے لگی۔ دفعتاً صوفیا نے سر اُٹھایا تو ونے کو اپنی طرف مخمور نگاہوں سے تاکتے دیکھا۔ اُس نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا "آج تو بڑی سردی ہے۔ کہاں جاؤ گے؟ بیٹھو۔ تمہیں اس کتاب کے چند ابواب سناؤں۔ نہایت عمدہ کتاب ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے صحن کی طرف دیکھا۔ بھیلنی غائب تھی۔ شاید لکڑیاں چننے چلی گئی تھی۔ اب دس بجے کے پہلے نہ آئے گی۔ صوفیا کچھ پریشان سی ہو گئی۔

ونے نے اشتیاق آمیز لہجہ میں کہا "نہیں صوفی آج کہیں نہ

جاؤں گا۔ تم سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب بند کرکے رکھ دو۔ تمہارے ساتھ رہ کر بھی تم سے باتیں کرنے کو ترستا رہتا ہوں"۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے صوفیا کے ہاتھوں سے کتاب چھین لینے کی کوشش کی۔ صوفیا کتاب کو مضبوط پکڑ کر بولی "ٹھہرو ٹھہرو۔ کیا کرتے ہو؟ اب یہی شرارت مجھے بھلی نہیں لگتی۔ بیٹھو۔ اس فرانسیسی فلاسفر کے خیالات سُناؤں۔ دیکھو اُس نے مذہبی تفسیر میں کتنی وسیع النظری سے کام لیا ہے"۔

ونے۔ نہیں آج دس منٹ کے لئے تم اس فلاسفر سے چھٹی مانگ لو اور میری وہ باتیں سُن لو جو کسی پنجرے میں پڑی ہوئی چڑیا کی طرح باہر نکلنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ آخر میرے اس بن باس کی کوئی مدت ہے یا ہمیشہ مسرت کے خواب ہی دیکھتا رہوں گا؟

صوفیا۔ اس فلاسفر کے خیالات اُس جواب سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ جو میں تمہیں دے سکتی ہوں۔ مجھے ان پر کئی شکوک ہیں۔ ممکن ہے تبادلۂ خیالات سے وہ رفع ہو جائیں۔

ونے۔ نہیں یہ کتاب بند کرکے رکھ دو۔ آج میں تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن کر حاضر ہوا ہوں۔ آج تم سے وعدہ لئے بغیر تمہارا دامن نہ چھوڑوں گا۔ کیا اب بھی میرا امتحان لے رہی ہو؟

صوفیا نے کتاب بند کرکے رکھ دی اور متانت سے کہا "میں نے تو اپنے کو تمہارے قدموں پر ڈال دیا۔ اب اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

ونے۔ اگر میں دیوتا ہوتا تو تمہاری محبت آمیز پرستش سے قانع ہو جاتا۔ لیکن میں بھی تو خواہشات کا تابع کمزور انسان ہوں۔ میں نے جو کچھ پایا ہے اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں اور چاہتا ہوں سب چاہتا ہوں۔

کیا اب بھی تم میرا مطلب نہیں سمجھتیں؟ میں چڑیا کو اپنی منڈیر پر بیٹھی ہوئی دیکھ کر آسودہ نہیں۔ میں اُسے اپنے پنجرے میں جاتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا اور بھی زیادہ صاف الفاظ میں کہوں؟ میں پھول کا رس چاہتا ہوں۔ صرف پھول کی خوشبو سے میرا جی نہیں بھرتا۔

صوفیا۔ ونے مجھے ابھی مجبور نہ کرو۔ میں بالکل تمہاری ہی ہوں۔ میں اس وقت یہ بات جتنی صداقت اور خلوص سے کہہ رہی ہوں۔ اُس سے زیادہ کسی مندر یا کلیسا میں یا کسی ہَوَن کُنڈ کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔ جس وقت میں نے تمہاری توہین کی تھی اُس وقت بھی میں تمہاری تھی۔ لیکن معاف کرنا میں کبھی کوئی ایسا کام نہ کروں گی جس سے تمہاری سُبکی۔ تمہاری ذلت یا تمہاری بُرائی ہو۔ میری یہ احتیاط اپنے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے ہے۔ روحانی اتصال کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ مگر جسمانی اتصال کے لئے عزیز و اقارب کی منظوری اور سوسائٹی کے قواعد کی پابندی لازمی ہے ورنہ یہ اتصال شرمناک ہو جاتا ہے۔ میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہ کرے گا اگر میرے باعث تم پر تمہارے ماں باپ بالخصوص تمہاری ماں کی ناخوشی ہو اور میرے ساتھ تمہیں بھی ننگ خاندان سمجھنے لگیں۔ مَیں قیاس بھی نہیں کر سکتی کہ اس کجروی کے لئے رانی جی تمہیں اور خصوصاً مجھے کیا سزا دیں گی۔ وہ ستی ہیں دیوی ہیں۔ اُن کا غُصّہ نہ جانے کیا غضب ڈھائے۔ میں اُن کی نگاہ میں کتنی ذلیل ہوں۔ اُس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے اور تمہیں بھی اُنہوں نے انتہائی سزا دے دی جو اُن کے امکان میں تھی۔ ایسی حالت میں جب اُنہیں معلوم ہوگا کہ میرے اور تمہارے درمیان صرف محبت کا رشتہ نہیں۔ عقد کا رشتہ قائم ہو گیا ہے تو عجب نہیں

کہ وہ غصّہ سے مغلوب ہو کر خودکشی کرلیں۔ ممکن ہے کہ اُس وقت تم اِن ساری پریشانیوں کے لئے تیار ہو جاؤ مگر میں مادی تعلق اتنا اہم نہیں سمجھتی۔

ونے نے اُداس ہو کر کہا۔ ”اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ میری ساری عمر خوشی کا خواب دیکھتے ہی تمام ہو جائے“۔

صوفیا۔ نہیں ونے۔ میں اتنی نااُمید نہیں ہوں۔ مجھے اب بھی امید ہے کہ کبھی نہ کبھی رانی جی سے تمہارا اور اپنا قصور معاف کرالوں گی اور پھر اُن کی دعاؤں کے ساتھ ہم دونوں کی متحد زندگی کا آغاز ہوگا۔ رانی جی کی خوشی اور ناخوشی دونوں انتہا پذیر ہوتی ہیں۔ ایک انتہا کا اندازہ ہم کر چکے۔ خدا نے چاہا تو دوسری انتہا کا بھی جلد ہی اندازہ ہو جائے گا۔ میں تم سے منت کرتی ہوں کہ اب اس معاملہ کا ذکر پھر نہ کرنا ورنہ مجھے کوئی دوسرا مامن تلاش کرنا پڑے گا۔

ونے نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ دن جبھی آئے گا جب یا تو اماں جی نہ ہونگی یا میں نہ رہوں گا“۔

پھر اُنہوں نے کمبل اوڑھا۔ ہاتھ میں لکڑی لی اور باہر چلے گئے جیسے کوئی کسان مہاجن کی ڈانٹ سُن کر اُس کے گھر سے باہر نکلے۔

پھر بدستور سابق دن گزرنے لگے۔ ونے بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے۔ حتے الامکان گھر سے باہر ہی گھوما کرتے۔ آتے بھی تو کھانا کھا کر چلے جاتے۔ کہیں جانا نہ ہوتا تو ندی کے کنارہ پر جا بیٹھتے اور گھنٹوں نظارۂ آب سے دل بہلاتے رہتے۔ کبھی کاغذ کی ناویں بنا کر اُس میں چھوڑتے اور اُن کے پیچھے پیچھے وہاں تک جاتے جہاں کہ وہ غرقاب ہو جاتیں۔ اُنہیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ صوفیا کو اب بھی مجھ پر یقین نہیں ہے۔ وہ مجھ سے

محبت کرتی ہے مگر میری اخلاقی طاقت پر اُسے شک ہے۔

ایک روز وہ ندی کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ بڑھیا بھیلنی پانی بھرنے کو آئی۔ اُنہیں وہاں بیٹھا دیکھ کر اُس نے گھڑا رکھ دیا اور بولی۔ کیوں مالک تم یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟ گھر میں مالکن گھبراتی نہ ہوں گی؟ میں اُنہیں بہت روتے دیکھا کرتی ہوں۔ کیا تم نے اُنہیں کچھ کہا ہے کیا؟ کیا بات ہے کہ کبھی تم دونوں کو بیٹھ کر ہنستے بولتے ہوئے نہیں دیکھتی؟

ونے نے کہا۔ کیا کروں ماتا۔ اُنہیں یہی تو بیماری ہے کہ مجھ سے روٹھی رہتی ہیں۔ یہ بیماری اُنہیں برسوں سے ہو گئی ہے۔

بھیلنی۔ تو بیٹا اِس کا اوپائے میں کر دوں گی۔ ایسی جڑی دے دوں کہ تمہارے بنا اُنہیں چھن بھر بھی چین نہ آئے۔

ونے نے کہا۔ کیا ایسی جڑی بھی ہوتی ہے؟

بڑھیا نے واقفیت کے لہجہ میں کہا۔ "بیٹا جڑیاں تو ایسی ایسی ہوتی ہیں کہ چاہے آگ باندھ لو۔ پانی باندھ لو۔ مُردے کو جلا دو۔ مدعی کو گھر بیٹھے مار ڈالو۔ ہاں جاننا چاہئے۔ تمہارا بھیل بڑا گنی تھا۔ راجوں کے دربار میں آیا جایا کرتا تھا۔ اُسی نے مجھے دو چار بوٹیاں بتا دی تھیں۔ بیٹا۔ ایک ایک بوٹی ایک ایک لاکھ کو سستی ہے"؟

ونے نے تو میرے پاس اتنے روپے کہاں ہیں؟

بھیلنی۔ نہیں بیٹا۔ تم سے میں کیا لوں گی۔ تم تو بسانتھ پوری کے نواسی ہو۔ تمہارے درسن پا گئی۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔ وہاں جا کر میرے لئے تھوڑا سا گنگا جل بھیج دینا۔ بڑھیا تر جائے گی۔ تم نے مجھ سے پہلے نہ کہا نہیں تو میں نے وہی جڑی تمہیں دے دی ہوتی۔ تم دونوں کی اَن بن دیکھ کر

مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے۔

شام کے وقت جب صوفیا بیٹھی کھانا پکا رہی تھی بھیلنی نے ایک جڑی لا کر ونے سنگھ کو دی اور بولی "بیٹا - بڑے جتن سے رکھنا۔ لاکھ روپے دو گے تب بھی نہ ملے گی۔ اب تو یہ بدّیا ہی اُٹھ گئی۔ اُس کو اپنے لہو میں پندرہ دن روز بھگو کر سکھاؤ۔ تب اِس میں سے ایک ایک رتی کاٹ کر مالکن کو دُھونی دو۔ پندرہ دن کے پیچھے جو بچ رہے وہ اُن کے جوڑے میں باندھ دو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ بھگوان چاہیں گے تو تم آپ اُن سے ادبنے لگو گے۔ وہ پرچھائیں کی طرح تمہارے پیچھے لگی رہیں گی۔" یہ کہہ کر اُس نے ونے کے کان میں ایک منتر بتایا جو کئی مہمل الفاظ کا مجموعہ تھا اور کہا کہ جڑی کو لہو میں ڈوباتے وقت یہ منتر پانچ بار پڑھ کر جڑی پر پھونک دینا۔

ونے سنگھ توہم پرست نہ تھے۔ منتر جنتر پر اُن کا ذرا بھی اعتقاد نہ تھا۔ لیکن سُنی سُنائی باتوں سے اُنہیں یہ معلوم تھا کہ نیچی ذاتوں میں اِس قسم کے جادو ٹونکے کا بڑا رواج ہے اور کبھی کبھی اُس سے حیرت انگیز نتائج بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ خود عمل میں کوئی طاقت نہیں۔ اگر کچھ نتیجہ ہوتا ہے تو وہ جہلاء کی دماغی کمزوری کے سبب۔ تعلیم یافتہ لوگوں پر جو عموماً شکّی ہوتے ہیں۔ جو ایشور کی ہستی کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ان باتوں کا بھلا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ تو بھی اُنہوں نے عمل کا تہیہ کر لیا۔ اُنہیں کسی نتیجہ کی اُمید نہ تھی۔ وہ صرف امتحاناً ایسا کرنا چاہتے تھے۔

لیکن اگر کہیں واقعی اِس جڑی میں کوئی معجزہ ہو تو پھر کیا پوچھنا۔ اُس کے خیال ہی سے اُن کا دل بے حد مسرور ہو گیا۔ صوفیا میری ہو جائے گی۔ اُس وقت اُس کی محبت میں کچھ اَور ہی بات ہو گی۔

جوں ہی منگل کا دن آیا۔ وہ ندی پر گئے۔ اور چاقو سے اپنی ایک انگلی میں زخم کر کے جڑی کو خون سے تر کیا۔ پھر اُسے ایک بلند چٹان پر پتھر ول سے ڈھک کر رکھ آئے پندرہ روز تک متواتر یہی عمل کرتے رہے۔ سردی ایسی تھی کہ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جاتے تھے۔ برتنوں میں پانی جم جاتا تھا۔ لیکن ونے روزمرّہ نہاتے جاتے۔ صوفیا نے اُن میں اتنی پابندی کبھی نہیں نہ دیکھی تھی۔ کہتی کہ اتنے سویرے نہ نہاؤ۔ کہیں سردی نہ لگ جائے۔ جنگلی لوگ بھی دن بھر آگ جلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ باہر منہ نہیں نکالا جاتا۔ ذرا دھوپ پھیلنے پر غسل کیا کرو۔ اِس پر ونے مسکرا کر کہہ دیتے کہ بیمار پڑوں گا تو کم از کم میرے پاس بیٹھو گی تو۔ اُن کی کئی اُنگلیاں زخمی ہو گئی تھیں۔ مگر وہ زخموں کو چھپائے رہتے تھے ❊

ان دنوں ونے کی نگاہ صوفیا کی ایک ایک بات ایک ایک چال پر لگی رہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میرے عمل کا کچھ اثر ہو رہا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی ظاہر نتیجہ نہ دکھائی دیتا تھا۔ آخر پندرھویں روز اُنہیں صوفیا کے برتاؤ میں کچھ خفیف سا فرق نظر آیا۔ شاید کسی اَور وقت اُن کا خیال بھی اُس طرف نہ جاتا مگر آج کل تو اُن کی نگاہ بہت باریک بین ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر سے باہر جانے لگے تو صوفیا نادانستہ طریقہ پر نکل آئی اور کئی فرلانگ تک اُن سے باتیں کرتی ہوئی چلی گئی۔ جب ونے نے بہت اصرار کیا تو لوٹی۔ ونے نے سمجھا کہ یہ اُسی عمل کا اثر ہے ❊

آج سے دُھونی دینے کا کام شروع ہوتا تھا۔ ونے بہت متفکر تھے ــــ یہ عمل کیونکر پورا ہو گا۔ تنہا صوفیا کے کمرہ میں جانا تہذیب۔ شرافت اور انسانیت کے خلاف ہے۔ کہیں صوفیا جاگ پڑے اور مجھے دیکھ

لے تو وہ مجھ کو کتنا کمینہ سمجھے گی۔ شاید ہمیشہ کے لئے مجھ سے متنفر ہو جائے۔ وہ نہ بھی جاگے تو بھی یہ کون سا اخلاق ہے کہ کوئی مرد کسی نوجوان عورت کے کمرہ میں جائے۔ نہ جانے وہ کس حالت میں لیٹی ہوگی۔ ممکن ہے کہ بال کھلے ہوں۔ کپڑا ہٹ گیا ہو۔ اُس وقت میرے دل میں کیا کیا بُرے خیالات پیدا ہوں گے۔ میں اخلاقی نقطۂ خیال سے کس درجہ گر جاؤں گا ❊

تمام دن وہ انہیں پریشان کُن خیالات میں محو رہے لیکن شام ہوتے ہی وہ کمہار کے یہاں سے ایک کچا پیالہ لائے اور اُسے حفاظت سے رکھ دیا۔ انسانی فطرت میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکثر ہم ایسے کام کر ڈالتے ہیں۔ جن کے کرنے کی ہمیں خواہش نہیں ہوتی۔ کوئی پوشیدہ ترغیب ہم کو اپنی مرضی کے خلاف چلنے پر مجبور کرتی ہے ❊

آدھی رات ہوئی تو ونے پیالے میں آگ اور ہاتھ میں وہی خون بھگو کر سکھائی ہوئی جڑی لے کر صوفیا کی کوٹھڑی کے دروازہ پر پہنچے۔ کمبل کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جھونپڑے میں کواڑ کہاں ❊ کمبل کے پاس کھڑے ہو کر اُنھوں نے کان لگا کر سُنا۔ صوفیا میٹھی نیند سو رہی تھی۔ وہ تھر تھر کانپتے پسینہ سے تر اندر داخل ہوئے۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں صوفیا خواب میں مدہوش لیٹی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے دماغ میں نازک خیالی بس رہی ہو۔ ونے کے دل پر رعب سا چھا گیا۔ کئی منٹ تک مسحور سے کھڑے رہے مگر اپنے کو سنبھالے ہوئے۔ گویا کسی دیوی کے مندر میں ہوں! ذی حِس دلوں میں حُسن خداداد کا نظارہ پرستش کے جذبات کو متحرک کر دیتا ہے اور خواہشات نفسانی کو مسکن۔ ونے کچھ دیر تک صوفیا کو عقیدتمندانہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ آہستہ سے بیٹھ گئے پیالہ

میں جڑی کا ایک چھوٹا ٹکڑا توڑ کر رکھ دیا اور اُسے صوفیا کے سرہانے کی طرف کھسکا دیا۔ ایک لمحہ میں جڑی کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک گیا۔ عود اور عنبر میں یہ خوشبو کہاں؟ دھوئیں میں کچھ ایسا جوش افزا اثر تھا کہ ونے کا دل بیقرار ہوگیا۔ جوں ہی دھواں بند ہوا۔ ونے نے پیالے سے جڑی کی راکھ نکال لی۔ بھیلنی کی ہدایت کے مطابق اُسے صوفیا پر چھڑک دیا اور باہر نکل گئے۔ لیکن اپنی کوٹھڑی میں جاکر وہ گھنٹوں بیٹھے پچھتاتے رہے۔ اُنھوں نے بار بار اپنے اخلاقی حسیات کو بیدار کرنے کی کوشش کی اپنے اس فعل کو دغا بازی اور عصمت دری کہہ کر دل میں نفرت پیدا کرنی چاہئے۔ سوتے وقت قصد کرلیا کہ بس آج ہی سے اس عمل کا خاتمہ ہے۔ دوسرے روز وہ دن بھر غمگین اُداس اور پریشان رہے۔ جوں جوں رات نزدیک آتی تھی اُنھیں اندیشہ ہوتا جاتا تھا کہ کہیں میں پھر اُسی عمل کو نہ کر دوں۔ وہ دو تین بھیلوں کو بُلا لائے اور اُنھیں اپنے پاس سُلایا۔ اُنھوں نے کھانا بھی دیر سے کھایا کہ بستر پر جاتے ہی نیند آجائے۔ جب کھانا کھاکر اُٹھے تو صوفیا آکر اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ وہ رات کو اُن کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بہت دیر تک اُن کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ آج کے اخبارات میں پربھو سیوک کی پونا والی تقریر شائع ہوئی تھی۔ صوفیا نے اُسے بلند لہجہ میں پڑھا۔ اُس کا سر غرور سے اونچا ہوگیا۔ بولی — دیکھو کتنا عشرت پسند شخص تھا جسے ہمیشہ عمدہ کپڑوں اور عمدہ سامانوں کی دُھن لگی رہتی تھی۔ اُس کی کتنی کایا پلٹ ہوئی ہے۔ مَیں سمجھتی تھی کہ اس سے کبھی کچھ نہ ہوگا۔ تن پروری ہی میں اُس کی زندگی بسر ہوگی۔ انسانی دل کے بھید سمجھ میں نہیں آتے۔

اُس کے اِس پریم اور تیاگ پر تعجب ہوتا ہے۔

ونے۔ جب پربھوسیوک اس جماعت کے مہتم ہو گئے تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر گنگادلی تو اُسے ذرا تقسیم کرنے والوں کی جماعت بنا کر چھوڑتے پتاجی پر میرا یقین نہیں ہے اور اندر دت تو بالکل اُجڈ ہے۔ پربھوسیوک سے زیادہ قابل شخص نہ مل سکتا تھا۔ وہ یہاں ہوتے تو بلائیں لیتا۔ یہ خدائی مدد ہے اور اب مجھے امید ہوتی ہے کہ ہماری کوشش بیکار نہ جائے گی۔

بھیلوں کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ صوفیا چلنے کو اُٹھی تو اُس نے ونے کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں محبت کے سوا اور بھی کچھ تھا۔ ایک تو خواہش جھلک رہی تھی۔ ایک کشش تھی جس نے ونے کو سر سے پیر تک ہلا دیا۔ جب وہ چلی گئی تو اُنہوں نے ایک کتاب اُٹھا لی اور پڑھنے لگے۔ لیکن جوں جوں عمل کا وقت قریب آتا تھا اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جبراً اُنہیں دھکیل رہا ہے۔ جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ صوفیا سو گئی ہوگی تو وہ آہستہ سے اُٹھے۔ پیالہ میں آگ لی اور چلے۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ خائف تھے۔ ایک بار جی میں آیا کہ پیالہ کو پٹک دیں لیکن ایک لمحہ کے بعد ہی اُنہوں نے صوفیا کی کوٹھڑی میں قدم رکھا۔ آج اُنہوں نے اپنی نگاہیں اوپر نہیں اُٹھائیں۔ سر نیچا کئے ہوئے دُھونی سُلگائی اور راکھ چھڑک کر چلے آئے۔ چلتی بار اُنہوں نے صوفیا کی چاند سی صورت دیکھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ مُسکرا رہی ہے۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایشور اب لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اِس نے دیکھ نہ لیا ہو۔ بڑی تیزی سے اپنی کوٹھڑی میں آئے۔ چراغ بجھا دیا اور چارپائی پر گر پڑے۔ گھنٹوں دل دھڑکتا رہا

اس طرح پانچ روز تک ونے نے بڑی دقت سے اس کام کو کیا اور اتنے ہی دنوں میں اُنہیں صوفیا پر اس کا اثر صاف نظر آنے لگا۔ حتیٰ کہ پانچویں دن وہ دوپہر تک اُن کے ساتھ بھیلوں کے جھونپڑوں کی سیر کرتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں متانت کی جگہ اب اشتیاق انگیز شوخی نمودار تھی اور لبوں پر شیریں تبسّم تھا۔ آج رات کو کھانے کے بعد وہ اُن کے پاس بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اُس نے اپنا سر ونے کی گود میں رکھ دیا اور اُن کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی ــــ "سچ بتاؤ ونے ایک بات تم سے پوچھوں بتاؤ گے نا؟ سچ بتانا۔ تم یہ تو نہیں چاہتے کہ یہ بلا سر سے ٹل جائے؟ میں کہے دیتی ہوں کہ جیتے جی نہ ٹلوں گی۔ نہ تمہیں چھوڑ دوں گی۔ تم بھی مجھ سے بھاگ کر نہیں جاسکتے۔ کسی طرح نہ جانے دوں گی۔ جہاں جاؤ گے۔ میں بھی چلوں گی۔ تمہارے گلے کا ہار بنی رہوں گی۔ یہ کہتے کہتے اُس نے ونے کے ہاتھ چھوڑ دئے اور اُن کے گلے میں باہیں ڈال دیں"۔

ونے کو ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیر اُکھڑ گئے ہیں اور میں لہروں میں بہا جا رہا ہوں۔ ایک عجیب خوف سے اُن کا دل کانپ اُٹھا گویا اُنہوں نے کھیل میں شیرنی کو جگا دیا ہو۔ اُنہوں نے نامعلوم طریقہ پر خود کو صوفیا کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا اور بولے ــــ صوفیا!

صوفیا چونک پڑی گویا خواب میں تھی۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی ــــ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اگلے جنم سے اُس کے قبل سے ابتدا ہی سے تمہاری ہوں۔ کچھ خواب سا یاد آتا ہے کہ ہم اور تم کسی ندی کے کنارے ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ سچ!

ونے نے خائف ہو کر کہا۔ تمہارا جی کیسا ہے؟
صوفیا۔ مجھے کچھ ہوا تھوڑا ہی ہے۔ میں تو اپنے اگلے جنم کی بات یاد کر رہی ہوں۔ مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ تم مجھے جھونپڑے میں تنہا چھوڑ کر اپنی کشتی پر کہیں پردیس چلے گئے تھے اور میں روز ندی کے کنارے بیٹھ کر تمہاری راہ دیکھتی رہتی تھی پر تم آتے نہ تھے۔
ونے۔ صوفیا مجھے خوف ہو رہا ہے کہ تمہارا جی اچھا نہیں ہے۔ رات بہت گئی ہے اب سو جاؤ۔
صوفیا۔ میرا تو آج یہاں سے جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ کیا تمہیں نیند آ رہی ہے۔ تو سوؤ۔ میں بیٹھی ہوں۔ جب تم سو جاؤ گے میں چلی جاؤں گی" ایک لمحہ بعد پھر بولی —— "مجھے نہ جانے کیوں خوف ہو رہا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ سچ بتاؤ کیا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے"؟
ونے۔ صوفی۔ اب ہم روز ابد تک جدا نہ ہوں گے۔
صوفیا۔ تم لتنے بے درد نہیں ہو۔ میں جانتی ہوں۔ میں ماں جی میں خود دوں گی۔ صاف صاف کہہ دوں گی کہ ونے میرے ہیں۔
ونے کی حالت اُس بھوکے ہوئے آدمی کی سی تھی جس کے آگے پروسی ہوئی تھالی رکھی ہو۔ بھوک سے طبیعت بے چین ہو۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہوں۔ بھوک سے آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہو مگر تھالی میں ہاتھ نہ ڈال سکتا ہو۔ اس لئے پہلے کسی دیوتا کا بھوگ لگانا ہے۔ انہیں اب اِس میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ صوفیا کی بیقراری اُن کے عمل کا نتیجہ ہے۔ اُنہیں تعجب ہوتا تھا کہ اُس جڑی میں ایسی کون سی تاثیر ہے۔ وہ اپنے فعل پہ نادم تھے۔ دُکھی تھے اور سب سے زیادہ خوفزدہ

تھے۔ آتما سے نہیں۔ پرماتما سے نہیں۔ صوفی سے! جب صوفیا کو معلوم ہو جائے گا۔ کبھی نہ کبھی تو یہ نشہ اُترے ہی گا۔ اُس وقت وہ مجھ سے اُس کا سبب پوچھے گی اور میں چھپا نہ سکوں گا۔ اُس وقت وہ مجھے کیا کہے گی ؟

آخر جب انگیٹھی کی آگ ٹھنڈی ہو گئی اور صوفیا کو سردی معلوم ہونے لگی تو وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ عمل کا وقت بھی آ پہنچا۔ لیکن آج ونے کو عمل کرنے کی جُرات نہ ہوئی۔ اُنہیں جڑی کا امتحان ہی لینا تھا وہ ہو گیا۔ اور اُنہیں ایسے عمل پر ہمیشہ کے لئے اعتقاد ہو گیا ؟

صوفیا کو چارپائی پر لیٹتے ہی ایسا وہم ہوا کہ رانی صاحبہ سامنے کھڑی ہوئی تاک رہی ہیں اُس نے کمبل سے سر کو باہر کر کے دیکھا اور اپنی دماغی کمزوریوں پر جھنجھلا کر وہ سوچنے لگی ـــ آج کل مجھے کیا ہو گیا ہے ؟ مجھے کیوں طرح طرح کے اندیشے ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں روز ناگوار واقعات کا خوف دل پر طاری رہتا ہے ؟ جیسے مجھ میں تمیز ہی نہیں باقی رہی۔ ونے آج کل مجھے کیوں کھنچے ہوئے ہیں ؟ شاید وہ ڈر رہے ہیں کہ رانی جی کہیں اُنہیں بددعا نہ دے دیں یا خودکشی نہ کر لیں۔ اُن کی باتوں میں نہ پہلا سا جوش ہے اور نہ پہلی سی محبت۔ رانی میری زندگی کو تباہ و برباد کئے دیتی ہیں ؟

اُنہیں خیالاتِ پریشان کے ہوتے ہوئے وہ سو گئی۔ تو دیکھتی کیا ہے کہ واقعی رانی جی میرے سامنے کھڑی قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ اور کہہ رہی ہیں ـــ ونے میرا ہے وہ میرا بچہ ہے۔ اُسے میں نے پیدا کیا ہے۔ پالا پوسا ہے۔ تو کیوں اُسے میرے ہاتھوں سے چھینے لیتی ہے ؟ اگر تو نے اُس کو مجھ سے چھینا میرے خاندان کو داغ لگایا تو ہم

دونوں کو اسی تلوار سے قتل کر دوں گی ؞

صوفیا تلوار کی چمک سے گھبرا گئی۔ چلا اٹھی۔ نیند ٹوٹ گئی۔ اُس کا سارا بدن تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ دل مضبوط کر کے اٹھی اور ونے کی کوٹھڑی میں جا کر اُن کے سینہ سے لپٹ گئی۔ ونے کی آنکھیں لگ ہی رہی تھیں۔ اُنہوں نے چونک کر سر اُٹھایا ؞

صوفیا۔ ونے ونے جاگو۔ میں ڈر رہی ہوں ؞

ونے۔ فوراً چارپائی پر سے اُتر کر کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے پوچھا ــ کیا ہے صوفیا ؟

صوفیا۔ رانی جی کو ابھی ابھی میں نے اپنے کمرہ میں دیکھا۔ ابھی وہیں کھڑی ہیں ؞

ونے ۔صوفیا۔ اطمینان رکھو۔ تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ؞

صوفیا۔ خواب نہیں تھا ونے! میں نے رانی جی کو مجسّم دیکھا ؞

ونے۔ وہ یہاں کیسے آ جائیں گی ؟ ہوا تو نہیں ہیں ؞

صوفیا۔ تم اِن باتوں کو نہیں جانتے۔ ونے! ہر شخص کے دو قالب ہوتے ہیں ایک کثیف دوسرا لطیف۔ دونوں مشابہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ دوسرا پہلے سے کہیں زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ وہ معمولی حالتوں میں نظر نہیں آتا مگر مراقبہ یا خواب کی حالت میں کثیف جسم کا عوض بن جاتا ہے۔ رانی جی کا لطیف جسم ضرور یہاں ہے ؞

دونوں نے بیٹھ کر ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ صوفیا کو اب ونے کے بغیر ایک لمحہ بھی چین نہ آتا۔ اُسے صرف دماغی بے چینی نہ تھی۔ نفسانی

خواہشات کو پورا کرنے کے لئے بھی بے چین رہتی۔ جن باتوں کے محض خیال سے
اُسے نفرت ہوتی تھی۔ جن باتوں کی فقط یاد سے اُس کے چہرہ پر شرم کی سُرخی
دوڑ جاتی تھی۔ وہیں باتیں اب ہر وقت اُس کے دل میں موجود رہتیں۔ اُسے
اپنی اِس دلی کثافت پر تعجب ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ عیش و عشرت کے
تصوّر میں محو ہو کر اُس دائرہ میں قدم رکھتی جو تا ہل ہی کے لئے مخصوص ہے
تو رانی جی کی وہی غضبناک صُورت اُس کے روبرو آکر کھڑی ہو جاتی
اور وہ چونک کر کمرہ سے نکل بھاگتی۔ اِس طرح اُس نے دس بارہ یوم
گزارے۔ شمشیرِ برہنہ کے نیچے کھڑے ہوئے مجرم کی حالت بھی اتنی بُری
نہ ہوتی ہوگی ؏

ایک روز وہ گھبرائی ہوئی ونے کے پاس آئی اور بولی۔ ونے میں
بنارس جاؤں گی۔ میں بڑی پریشانی میں ہوں۔ رانی جی یہاں مجھے چین
نہ لینے دیں گی۔ اگر یہاں رہی تو شاید مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔
مجھ پر ضرور کوئی نہ کوئی عمل کیا گیا ہے۔ میں اتنی پریشان حال کبھی نہ تھی
مجھے خود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں وہ نہیں رہی۔ کوئی اور ہی ہو گئی
ہوں۔ میں جا کر رانی جی کے پیروں پڑوں گی۔ اُن سے اپنی خطا معاف کراؤں
گی اور اُنھیں کی اجازت سے تمہیں حاصل کروں گی۔ اُن کی مرضی کے بغیر
میں تمہیں نہیں پا سکتی اور جبراً لے لوں تو خیریت سے نہ گزرے گی۔ ونے
مجھے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ مَیں تمہارے لئے اتنی اُکتانے والی چیز
ہو جاؤں گی۔ میرا دل اتنا کمزور۔ اتنا گرویدہ کبھی نہ تھا ؏

ونے نے متردّد ہو کر کہا ۔۔۔ صوفیا۔ مجھے امید ہے کہ چند روز میں تمہارے
دل کو قرار ہو جائے گا ؏

صوفیا۔ نہیں ونے ہرگز نہیں۔ رانی جی نے تمہیں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ موتو فرشتے سے مستفیض ہونا سعادت رساں ہوا کرتا ہے۔ میں اُن سے بھیک مانگوں گی ــــ

ونے۔ تو مَیں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا ؂

صوفیا۔ نہیں نہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ مَیں تمہیں رانی جی کے سامنے نہ لے جاؤں گی۔ مجھے تنہا جانے دو ؂

ونے۔ اِس حالت میں مَیں تمہیں تنہا کبھی نہ جانے دوں گا۔ اگر ایسا ہی ہے تو مَیں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آجاؤں گا ؂

صوفیا۔ وعدہ کرو کہ بلا میری اجازت رانی جی کے پاس نہ جاؤ گے ؂

ونے۔ ہاں صوفیا یہ منظور ہے۔ وعدہ کرتا ہوں ؂

صوفیا۔ پھر بھی دِل نہیں مانتا۔ ڈر لگتا ہے کہ وہاں تم جوش میں آکر کہیں رانی جی کے پاس نہ چلے جاؤ۔ تم یہیں کیوں نہیں رہتے؟ میں تمہیں روزمرّہ خط لکھا کروں گی۔ اور جلد سے جلد واپس آجاؤں گی ؂

ونے نے اُسے تسکین دینے کے لئے تنہا جانے کی اجازت دے دی مگر اُن کا محبّت میں ڈوبا ہوا دل یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ صوفیا اِس اضطراب کی حالت میں اتنا طویل سفر تنہا کرے۔ سوچا اُس کی نگاہ بچا کر گاڑی کے کسی دوسرے کمرہ میں بیٹھ جاؤں گا۔ اُنہیں واپسی کی بہت کم اُمید تھی۔ بھیلوں نے سُنا تو انواع و اقسام کے تحفے لے کر اُنہیں رخصت کرنے کو آموجود ہوئے۔ ہرنوں کی کھالیں۔ شیروں کے ناخون اور نہ جانے کن کن جڑی بوٹیوں کا انبار لگ گیا۔ ایک بھیل نے اپنی بھاری کمان نذر کی۔ صوفیا اور ونے دونوں ہی کو اس مقام سے رغبت ہو گئی تھی۔ وہاں

کے باشندوں کی سیدھی سادی اور سچی زندگی اُن میں ایسی پسند آگئی تھی کہ
چھوڑ کر جاتے ہوئے دلی رنج ہوتا تھا بھیل لوگ کھڑے رو رہے تھے اور کہہ
رہے تھے کہ جلد آنا۔ ہمیں بھول نہ جانا۔ بڑھیا بھیلنی تو انہیں کسی طرح چھوڑتی
ہی نہ تھی۔ سب کے سب اسٹیشن تک اُنہیں پہنچانے آئے۔ لیکن جب
گاڑی کے آجانے پر ونے سے جُدا ہونے کا وقت آیا تو صوفیا اُن کے
گلے سے بلا اختیار لپٹ کر رونے لگی۔ ونے چاہتے تھے کہ نکل جائیں اور
کسی دوسری گاڑی میں بیٹھیں مگر اُن کو چھوڑتی ہی نہ تھی گویا کہ وہ آخری
ملاقات تھی۔ جب انجن نے سیٹی دی تو وہ دلی صدمہ سے بیقرار ہو کر
بولی ــــ ونے مجھ سے اتنے دنوں تک کیسے رہا جائے گا؟ رو رو
کر مر جاؤں گی۔ ایشور میں کیا کروں؟

ونے۔ صوفیا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔

صوفیا۔ نہیں نہیں۔ خدا کے لئے۔ میں اکیلی ہی جاؤں گی۔

ونے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے اور گاڑی چل دی۔ ذرا دیر بعد صوفیا
نے کہا ــــ تم نہ آتے تو میں شاید گھر تک نہ پہنچتی۔ مجھے ایسا معلوم ہو
رہا تھا کہ جان نکلی جا رہی ہے۔ سچ بتانا! تم نے مجھ پر جادو تو نہیں کر دیا
میں اتنی بے صبر کیوں ہوں۔

ونے نے شرمندہ ہو کر کہا۔ کیا جانے صوفی۔ میں نے ایک عمل تو کیا ہے
میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ جادو تھا یا کچھ اور۔

صوفیا۔ سچ؟

ونے۔ ہاں بالکل سچ؟ میں تمہاری سرد مہری سے خایف ہو گیا تھا کہ مبادا
تم پھر میرا امتحان لو۔

صوفیا نے ونے کی گردن میں ہاتھ ڈال دئے اور بولی — تم بڑے چھلیا ہو۔ اپنا جادو اُتارلو۔ مجھے کیوں تڑپا رہے ہو ؟

ونے۔ کیا کہوں اُتارنا نہیں سیکھا۔ یہی تو غلطی ہوئی ؛

صوفیا۔ تو مجھے بھی وہی منتر کیوں نہیں سکھا دیتے ؟ نہ مَیں اُتار سکوں گی۔ نہ تم اُتار سکو گے —— (ایک لمحہ کے بعد) لیکن نہیں میں تمہیں دیوانہ نہ بناؤں گی۔ دو میں سے ایک کو تو ہوش رہنا ہی چاہئیے۔ دونوں بیہوش ہو جائیں گے تو بُرا ہوگا۔ اچھّا بتاؤ۔ کون سا عمل کیا ہے ؟

ونے نے اپنی جیب سے اس جڑی کو نکال کر دکھاتے ہوئے کہا —— بس اِسی کی دُھونی دیتا تھا ؛

صوفیا۔ جب میں سو جاتی تھی ؟

ونے (زیادہ شرمندہ ہوکر) ہاں۔ صوفیا۔ جبھی ؛

صوفیا۔ تم بڑے گستاخ ہو۔ اچھّا۔ اب وہ جڑی مجھے دے دو۔ تمہاری محبّت کم ہوتے دیکھوں گی تو مَیں بھی وہی عمل کروں گی ؛

یہ کہتے ہوئے اُس نے جڑی لے کر رکھ لی۔ ذرا دیر بعد اُس نے پوچھا۔ یہ تو بتاؤ کہ وہاں تم رہو گے کہاں ؟ مَیں تمہیں رانی کے پاس نہ جانے دوں گی ؛

ونے۔ اب میرا کوئی دوست نہیں رہا۔ سبھی مجھ سے بدظن ہو رہے ہوں گے۔ نایک رام کے گھر چلا جاؤں گا۔ تم وہیں آکر مجھ سے مل لیا کرنا۔ وہ تو اپنے گھر پہنچ ہی گیا ہوگا ؛

صوفیا۔ کہیں جاکر کہہ نہ دے ؛

ونے۔ نہیں۔ وہ احمق ہو مگر دغاباز نہیں ہے ؛

صوفیا - اچھی بات ہے۔ دیکھیں رانی صاحبہ سے مراد ملتی ہے یا موت!

(۳۹)

تیسرے روز سفر ختم ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ صوفیا اور ونے دونوں ڈرتے ہوئے گاڑی سے اُترے کہ کہیں کسی شناس سے ملاقات نہ ہو جائے۔ صوفیا نے سیدوا بھون (ونے کا گھر) جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اُس کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ رانی صاحبہ نہ جانے کس طرح پیش آئیں۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ ناحق یہاں آئی۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ اب اُسے اپنی دیہاتی زندگی کی یاد آنے لگی۔ کتنا سکون تھا کتنی سادی زندگی تھی۔ نہ کوئی خلل تھا نہ کوئی رکاوٹ تھی۔ نہ کسی سے حسد تھا نہ کینہ۔ ونے سنگھ اُسے تسکین دیتے ہوئے بولے —— دل مضبوط رکھنا۔ ذرا بھی نہ ڈرنا سچی باتیں کہہ دینا بالکل سچی۔ ذرا بھی مبالغہ نہ ہو۔ ذرا بھی خوشامد نہ ہو۔ التجا اور سوال کا ایک کلمہ بھی زبان سے نہ نکالنا۔ میں باتوں کو گھٹا بڑھا کر اپنی جان کی حفاظت نہیں کرنا چاہتا۔ میں انصاف اور خالص التجا چاہتا ہوں۔ اگر وہ تم سے ناجائز یا نہ سلوک کریں۔ سخت الفاظ کا استعمال کریں تو پھر تم ذرا بھی نہ ٹھہرنا۔ علی الصباح آ کر مجھ سے ایک ایک بات کہہ دینا۔ یا کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔

صوفیا اُنہیں ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ ونے تو پانڈے پور کی طرف چلے اور وہ سیدوا بھون کی طرف چلی۔ تانگہ والے نے کہا —— مس صاحب۔ آپ کہیں چلی گئی تھیں کیا؟ بہت دنوں بعد دکھلائی دیں۔

صوفیا کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا بولی۔ تم نے مجھے کب دیکھا ہے

تو اِس شہر میں پہلی ہی بار آئی ہوں ؛

تانگہ والے نے کہا۔ آپ ہی جیسی ایک مس صاحب یہاں سیوک صاحب کی بیٹی بھی تھیں۔ مَیں نے سمجھا۔ آپ ہی ہوں گی ؛

صوفیا۔ میں عیسائی نہیں ہوں ؛

جب وہ سیوا بھون کے سامنے پہنچی تو تانگہ سے اُتر پڑی۔ وہ رانی صاحبہ سے ملنے کے پہلے اپنے آنے کی کانوں کان بھی خبر نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ ہاتھ میں اپنا بیگ لئے ہوئے ڈیوڑھی پر گئی اور دربان سے بولی ـــ جاکر رانی جی سے کہو کہ مس صوفیا آپ سے ملنا چاہتی ہیں ؛

دربان اُسے پہچانتا ہی تھا۔ اُس نے اُٹھ کر سلام کیا اور بولا ـــ ہجور اندر چلیں۔ اطلاع کیا کرنی ہے۔ بہت دنوں کے بعد آپ کے درشن ہوئے ؛

صوفیا۔ مَیں بہت اچھّی طرح کھڑی ہوں۔ تم جاکر اطلاع تو کردو ؛

دربان۔ سرکار۔ اُن کا مجاج آپ جانتی ہی ہیں۔ بگڑ اُٹھیں گی کہ ساتھ کیوں نہ لایا۔ اطلاع کیوں دینے آیا؟

صوفیا۔ میری خاطر سے دو چار باتیں سُن لینا ؛

دربان اندر گیا تو صوفیا کا دل اِس طرح دھڑک رہا تھا جیسے کوئی پتّا ہل رہا ہو۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں رانی صاحبہ غصّہ میں بھری وہیں سے بگڑتی ہوئی نہ آئیں۔ یا کہلا دیں کہ چلی جا۔ میں نہیں ملنا چاہتی۔ ایک مرتبہ اُن سے ملنے بغیر تو میں جانے کی نہیں چاہے وہ ہزار بار دُھتکاریں ؛

ایک منٹ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ رانی جی شال اوڑھے ہوئے

دروازہ پر آگئیں اور اُس سے لپٹ کر گلے ملیں جیسے کوئی ماں سُسرال سے آئی ہوئی بیٹی کو گلے لگالے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ روندھے ہوئے گلے سے بولیں ــــ تم یہیں کیوں کھڑی رہ گئیں بیٹی اندر کیوں نہ چلی آئیں؟ میں تو روز ہی تمہاری راہ دیکھتی رہتی تھی۔ تم سے ملنے کو جی تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ مجھے اُمید ہو رہی تھی کہ تم آ رہی ہو پر تم آتی نہ تھیں۔ کئی بار یونہی اسٹیشن تک گئی کہ شاید تمہیں دیکھ سکوں ایشور سے روز دعائیں کرتی تھی کہ ایک بار تم سے ملاقات ہو۔ چلو اندر چلو۔ میں نے تمہارے ساتھ جو سخت کلامی کی تھی اُسے بھول جاؤ۔ (دربان سے) یہ بیگ اُٹھا لے۔ مہری سے کہہ دے کہ میں صوفیا کا پُرانا کمرہ صاف کر دے۔ بیٹی تمہارے کمرہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ دل بھر بھر آتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے وہ صوفیا کا ہاتھ پکڑے اپنے کمرہ میں آئیں اور اُسے اپنی بغل میں مسند پر بیٹھا کر بولیں۔ آج میری مُراد پوری ہو گئی۔ تم سے ملنے کو دل بہت بے چین تھا۔

صوفیا کا متفکر دل اِس بے لوث محبّت کے اظہار سے بیقرار ہو گیا وہ صرف اتنا کہہ سکی ــــ مجھے بھی آپ کے درشن کی بڑی خواہش تھی۔ آپ سے اپنی خطائیں معاف کرانے آئی ہوں۔

رانی۔ بیٹی۔ تم دیوی ہو۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ میں نے تمہیں پہچانا نہ تھا۔ مجھے سب معلوم ہے بیٹی۔ سب سُن چکی ہوں۔ تمہارا دل اتنا پاک وصاف ہے۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ آہ اگر میں پہلے سے جانتی! یہ کہتے کہتے رانی صاحبہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگیں جب طبیعت ٹھہری

تو پھر لولیں — اگر پہلے سے جان گئی ہوتی تو آج اِس گھر کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا
ہوتا۔ آہ مَیں نے دسنے کے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ تمہیں نہ معلوم ہوگا
بیٹی۔ جب تم نے . . . . . . (سوچ کر) بیر پال سنگھ ہی نام تھا نا ؟ ہاں
جب تم نے اُس کے گھر پر رات کے وقت دسنے کو ملامت کی تو وہ نادم
ہوکر ریاست کے حُکّام کے پاس قیدیوں پر رحم کرنے کے لئے دوڑتا رہا
وہ دن دن بھر بھوکا پیاسا پڑا رہتا۔ رات رات بھر رویا کرتا۔ کبھی دیوان کے
پاس جاتا۔ کبھی ایجنٹ کے پاس۔ کبھی پولیس کے افسرِ اعلیٰ کے پاس کبھی
خود مہاراجہ صاحب کے پاس۔ سب سے التجائیں کرکے ہار گیا۔ کسی نے نہ سُنی۔
قیدیوں کی حالت پر کسی کو ترس نہ آیا۔ بیچارہ دسنے مایوس ہوکر اپنے
ڈیرے پر آیا۔ وہاں وہ نہ جانے کس سوچ میں بیٹھا تھا کہ میرا خط اُسے مل
گیا۔ دردکرم صوفی وہ خط نہیں تھا۔ زہر کا پیالہ تھا جسے مَیں نے اپنے
ہاتھوں اُسے پلایا۔ تیز خنجر تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں اُس کی گردن پر
پھیرا۔ مَیں نے لکھا تھا تم اِس قابل نہیں ہو کہ مَیں تمہیں اپنا بیٹا سمجھوں
تم مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ اور بھی نہ جانے کتنی ہی سخت باتیں لکھی تھیں
یاد کرتی ہوں تو چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ یہ خط پاتے ہی وہ بِلا کسی سے کچھ
کہے ہوئے نایک رام کے ساتھ یہاں آنے کو تیار ہوگیا۔ کئی اسٹیشنوں تک
نایک رام اُس کے ساتھ آئے۔ پھر پنڈا جی کو نیند آگئی اور جب اُن کی
آنکھیں کھلیں تو دسنے کا کہیں گاڑی میں پتہ نہ تھا۔ اُنھوں نے ساری
گاڑی میں ڈھونڈھ مارا۔ پھر لوٹے پور تک گئے۔ راستہ میں ایک ایک
اسٹیشن پر اُتر کر دریافت کیا مگر سب بے سود۔ بیٹی۔ یہ اِس دکھیا کی رام کہانی
ہے۔ میں ہتیارنی ہوں۔ مجھ سے زیادہ ابھاگنی دنیا میں اور کون ہوگی ؟ نہ جانے

دنے کا کیا حال ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔ وہ بڑا غیرت مند ہے بیٹی۔ بات کا بڑا دھنی۔ میری باتیں اُس کے دل میں لگ گئیں۔ میرے پیارے لعل نے کبھی آرام نہ پایا۔ اُس کی ساری زندگی تپسیا ہی میں گذری۔

یہ کہہ کر رانی پھر رونے لگیں۔ صوفیا بھی رو رہی تھی۔ مگر دونوں کے خیالات میں کتنا فرق تھا۔ رانی کے آنسو فکر و غم کے تھے اور صوفیا کے آنسو مسرت و جوش کے۔

ایک لمحہ بعد رانی جی نے پوچھا — کیوں بیٹی تم نے اُسے جیل میں دیکھا تھا تو بہت دُبلا ہو گیا تھا؟

صوفیا۔ جی ہاں۔ پہچانے نہ جاتے تھے۔

رانی۔ اُس نے سمجھا کہ باغیوں نے نہ جانے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا ہو۔ بس اسی بات پر اُسے ضد ہو گئی۔ آرام سے بیٹھو بیٹی۔ اب یہی تمہارا گھر ہے۔ اب میرے لئے تمہیں دنے کی جگہ پر ہو۔ اب یہ بتاؤ تم اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟ اندردت تو کہتا تھا کہ تم دنے کو لعنت ملامت کرنے کے تین ہی چار روز بعد وہاں سے چلی آئی تھیں۔ اتنے دن کہاں رہیں؟ سال بھر سے زیادہ تو ہو گیا ہوگا۔

صوفیا کا دل فرطِ مسرت سے اُچھل رہا تھا۔ جی میں تو آیا کہ اُسی وقت سارا ماجرا بیان کر دوں اور ماں کی آتشِ غم کو بُجھا دوں۔ مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں اِن کا مذہبی جذبہ پھر نہ متحرک ہو جائے۔ دنے کی طرف سے تو اب وہ بیفکر ہو گئی تھی۔ اب اُسے صرف اپنی ہی فکر تھی۔ دیوتا کو نہ پا کر ہم پتھر پُوجتے ہیں۔ دیوتا مل جائے تو پتھر کون پُوجے؟ بولی — کہاں تھی؟ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی تھی۔ مایوس ہو کر یہاں چلی آئی ہوں۔

رانی۔ تم ناحق اتنے دنوں تک تکلیف اٹھاتی رہیں۔ تمہارا کیا یہ گھر نہ تھا؟ برا نہ ماننا بیٹی۔ تم نے ونے کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ اتنی ہی جتنی میں نے۔ تمہاری بات اسے اور بھی زیادہ لگی۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا تھا ہمارے ہی فائدہ کے لئے کیا تھا۔ میں تو اپنے جیتے کے ساتھ اتنی بیرحمی کبھی نہ کر سکتی۔ اب تم خود اپنی بھول پر پچھتا رہی ہو گی۔ ہم دونوں ہی ابھاگنی ہیں۔ آہ بیچارے ونے کو کہیں سکھ نہ ملا۔ تمہارا دل بہت سخت ہے۔ سوچو۔ اگر تمہیں خبر ملتی کہ ونے کو ڈاکوؤں نے پکڑ کر قتل کر ڈالا ہے۔ تو تمہاری کیا حالت ہو جاتی۔ شاید تم بھی اتنی ہی بیرحم ہو جاتیں ۔ یہ انسانی خاصہ ہے۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے؟ میں آپ ہی ہر وقت پچھتایا کرتی ہوں۔ اب تو اس کام کو سنبھالنا ہے جو اسے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ تم نے اس کے لئے بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ ذلت بدنامی۔ سختی۔ سبھی اٹھائیں۔ اب اس کا کام سنبھالو۔ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھو۔ تمہیں کیا خبر ہو گی۔ کچھ دنوں تک پربھو سیوک اس سیوا سمتی کے نایک رہے۔ کام کرنے والا ہو تو ایسا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُن سے سارا ملک چھان ڈالا اور پورے پانچ سو والنٹیر جمع کر لئے۔ بڑے بڑے شہروں میں شاخیں قائم کر دیں۔ بہت سا روپیہ بھی جمع کر لیا۔ مجھ اس سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ ونے نے جس تحریک پر اپنی زندگی قربان کر دی وہ پھل پھول رہی ہے۔ مگر ایشور کو نہ جانے کیا منظور تھا۔ پربھو سیوک اور کنور صاحب میں اَن بَن ہو گئی۔ پربھو سیوک اُسے ٹھیک اُسی راستہ پر لے جا رہا تھا جس پر ونے لے جانا چاہتا تھا۔ کنور صاحب اور اُن کے خاص دوست ڈاکٹر گنگولی اُسے دوسرے ہی راستہ پر

لے جانا چاہتے تھے۔ آخر پربھو سیوک نے استعفا دے دیا۔ جبھی سے سمتی ڈانوا ڈول ہو رہی ہے۔ نہ جانے بچتی ہے یا جاتی ہے۔ کنور صاحب میں ایک عجیب تبدیلی ہو گئی ہے۔ وہ اب حکام سے خائف رہنے لگے ہیں۔ افواہ تھی کہ سرکار اُن کی کُل جائداد ضبط کرنے والی ہے۔ حکام کی بدگمانیاں رفع کرنے کے لئے اُنہوں نے پربھو کے مجوزہ پروگرام سے اپنا اختلاف شائع کرا دیا۔ یہی باہمی ناچاقی کا خاص سبب تھا۔ ابھی دو ماہ بھی نہیں گزرے لیکن شیرازہ بکھر گیا۔ سینکڑوں رضا کار مایوس ہو کر اپنے کام دھندوں میں لگ گئے۔ مشکل سے دو سو والنیٹر اور رہوں گے۔ چلو بیٹی۔ تمہارا کمرہ اب صاف ہو گیا ہوگا۔ تمہارے کھانے کا بندوبست کر کے پھر اطمینان سے باتیں کروں۔ (مہراجن سے) اِنہیں پہچانتی ہے نہ؟ پہلے یہ میری مہمان تھیں اب یہ میری بہو ہیں۔ جا اِن کے لئے دو چار نئی چیزیں تیار کر لا۔ آہ۔ آج ونے ہوتا تو میں اپنے ہاتھوں سے اِسے اُس کے گلے لگا دیتی۔ بیاہ رچاتی۔ شاستروں میں اس کی اجازت ہے ؂

صوفیا کی زبردست خواہش ہوئی کہ راز کو افشا کر دوں۔ بات لبوں تک آئی اور رُک گئی۔ اُسی وقت دفعتاً شور اُٹھا کہ لال صاحب آ گئے۔ لال صاحب آ گئے۔ بھیا ونے سنگھ آ گئے۔ نوکر چاکر ہر طرف سے دوڑ پڑے لونڈیاں باندیاں کام چھوڑ چھوڑ کر بھاگیں۔ ایک لمحہ میں ونے نے کمرہ میں قدم رکھا۔ رانی نے اُنہیں سر سے پیر تک دیکھا گویا یقین کر رہی تھیں کہ میرا ہی ونے ہے یا کوئی اور۔ پھر رانی صاحبہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں۔ بہت دنوں میں آئے بیٹا۔ آؤ چھاتی سے لگا لوں۔ لیکن ونے نے فوراً اُن کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ رانی صاحبہ کو آنسوؤں کی کثرت سے د

کچھ سُوجھتا تھا اور نہ محبّت کے بے انتہا جوش کے سبب کوئی بات منہ سے نکلتی تھی۔ وہ جُھکی ہوئیں ونے کا سر پکڑ کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بھگتی اور ماتا کا کیسا قابلِ دید نظارہ تھا!

لیکن ونے کو رانی کی باتیں مجُھ دلی نہ تھیں۔ ماں کو دیکھ کر اُس کے دل میں جوش پیدا ہوا کہ اُن کے قدموں پر جان دے دوں۔ ایک مجنونانہ خیال تھا۔ جان دے دینے کے لئے نہیں ماں کے قدموں پر زندگی کا خاتمہ کر دینے کے لئے یہ دکھلا دینے کے لئے کہ اگرچہ میں نے قصور کیا ہے مگر بالکل بے غیرت نہیں ہوں۔ جینا نہیں جانتا لیکن مرنا جانتا ہوں۔ اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سامنے ہی دیوار سے تلوار لٹک رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر تلوار کو اُتار لایا اور اُسے یک دم کھینچ کر بولا —— ماں اِس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ کا بیٹا کہلاؤں لیکن آپ کے آخری حکم کی تعمیل میں اپنی ساری غلطیوں کا پراسچت (کفارہ) کئے دیتا ہوں۔ مجھے آشیرواد دیجئے۔

صوفیا چیخ مار کر ونے سے لپٹ گئی۔ رانی نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی —— ونے ایشور گواہ ہے کہ مَیں تمہیں کب کا معاف کر چکی۔ تلوار چھوڑ دو۔ صوفیا۔ تو اِن کے ہاتھوں سے تلوار چھین لے۔ میری مدد کر!

ونے کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ گردن پر تلوار پھیر لینا کتنا آسان ہے۔ صوفیا نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی کلائی پکڑ لی اور آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔ ونے مجھ پر رحم کرو۔

اُس کی نگاہ میں اتنا درد اتنا انکسار تھا کہ ونے کا دل پسیج گیا۔ اُن کی مُٹھی ڈھیلی پڑ گئی۔ صوفیا نے تلوار لے کر کھونٹی پر لٹکا دی۔

اتنے میں کنور بھرت سنگھ آ کر کھڑے ہو گئے اور ونے کو سینہ سے لگاتے ہوئے بولے۔ تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے۔ مونچھیں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ اتنے دُبلے کیوں ہو؟ بیمار تھے کیا؟

ونے۔ جی نہیں۔ بیمار تو نہیں تھا۔ ایسا دُبلا بھی نہیں ہوں۔ اب ماں کے ہاتھوں کا پکوان کھا کر موٹا ہو جاؤں گا۔

کنور۔ تم دور کیوں کھڑی ہو صوفیا۔ آؤ تمہیں بھی پیار کر لوں۔ روز ہی تمہاری یاد آتی تھی۔ ونے بڑا خوش نصیب ہے کہ اُس نے تم جیسی استری پائی۔ دُنیا میں تو ملتی نہیں۔ بہشت کی میں نہیں جانتا۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ تم دونوں ایک ہی روز آئے۔ بیٹی مَیں تم سے ونے کی سفارش کرتا ہوں۔ تم نے اُنہیں جو ملامت کی تھی اُسے سُن کر بیچارہ نایک رام عورتوں سے اتنا ڈر گیا ہے کہ ٹھے کی کرائی شادی سے انکار کر گیا۔ عمر بھر عورت کے لئے ترستا رہا پر اب تو نام بھی نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ یہ ذات بیوفا ہوتی ہے۔ بھئی ونے سنگھ نے جس کے لئے بدنامی سہی جان پر کھیلے وہی اُن سے آنکھیں پھیر لے! کان پکڑے۔ اب تو مر جاؤں گا پر بیاہ نہ کروں گا۔ اپنا ہاتھ بڑھا ونے۔ صوفیا یہ ہاتھ لو تو مجھے اطمینان ہو جائے کہ تمہارے دل صاف ہو گئے۔ جاہنوی چلو۔ ہم لوگ باہر چلیں۔ انہیں ایک دوسرے کو منانے اور انہیں کتنی ہی شکایتیں کرنی ہوں گی۔ دونوں باتیں کرنے کے لئے بیقرار ہو رہے ہوں گے۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔

جب تخلیہ ہو گیا تو صوفیا نے پوچھا — تم اتنی جلد کیسے آ گئے؟

ونے نے شرماتے ہوئے کہا — صوفیا مجھے وہاں منہ چھپا کر بیٹھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ جان کے خوف سے چھپ رہنا بزدلوں کا کام ہے۔ ماتا

کی جو مرضی ہو وہی سہی۔ نایک رام کہتا رہا کہ پہلے میں صاحب کو آجانے دو پر مجھ سے نہ رہا گیا ٭

صوفیا۔ خیر اچھا ہی ہوا۔ خوب آ گئے۔ ماتا جی تمہاری چرچا کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھیں۔ اُن کا دل تمہاری طرف سے صاف ہو گیا ہے٭

ونے۔ تمہیں تو کچھ نہیں کہا؟

صوفیا۔ مجھ سے تو ایسا لپٹ کر گلے ملیں کہ میں متحیّر ہو گئی۔ یہ اُنہیں سخت الفاظ کا اثر ہے جو میں نے تم سے کہے تھے۔ وہاں خود چاہے بیٹے کو جتنا ڈانٹے مگر اُسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا شخص اُسے کڑی نگاہوں سے بھی دیکھے۔ میری بے انصافی نے اُن کے منصفانہ جذبہ کو بیدار کر دیا٭

ونے۔ ہم لوگ بڑی اچھی ساعت چلے تھے ٭

صوفیا۔ ہاں ونے۔ ابھی تک تو خیریت سے گزری۔ آگے کی ایشور جانے ٭

ونے۔ ہم اپنا دُکھ کا حصّہ بھُگت چکے ٭

صوفیا نے شک کے لہجہ میں کہا۔ ایشور کرے ایسا ہی ہو ٭

لیکن صوفیا کو اپنے دل کے آئینہ میں کسی آنے والی ناگہانی مصیبت کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ اُسے ظاہر نہ کر سکتی تھی مگر وہ ملول تھی۔ ممکن ہے کہ آبائی مذہب کو ترک کر دینے کا غم اِس کا سبب ہو یا وہ اِسے ایسی بارش خیال کر رہی ہو جو اپنی کثرت سے آیندہ ہونے والی بارش کی قلت کی خبر دیتی ہے معلوم نہیں جو بات ہو مگر صوفیا رات کو کھانا کھا کر سوئی تو اُس کا دل کسی بوجھ سے دبا ہوا تھا ٭

(۴۰)

مِل کے تیار ہونے میں اب بہت تھوڑی کسر رہ گئی تھی۔ باہر سے

تمباکو کی گاڑیاں لدی چلی آتی تھیں۔ کسانوں کو تمباکو کی کاشت کے لئے تقاوی تقسیم کی جا رہی تھی۔ گورنر سے مِل کے افتتاحی رسم ادا کرنے کی استدعاء کی گئی تھی اور اُنہوں نے منظور بھی کر لیا تھا۔ تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اس لئے تعمیری کام کو اُس دن تک ختم کر دینے کے لئے بڑی مستعدی سے کام کیا جا رہا تھا۔ اُس وقت کوئی کام باقی نہ رہنا چاہیئے۔ مزہ تو جب آئے کہ دعوت میں اِسی مِل کا بنا ہُوا سگار بھی رکھا جا دے۔ مسٹر جان سیوک صبح سے شام تک اِنہیں تیاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی دونی اُجرت دے کر کام کرایا جا رہا تھا۔ مِل کے قریب پختہ مکانات تیار ہو چکے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اور پاس کے کھیتوں میں مزدوروں نے جھونپڑیاں ڈال لی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف ایک میل تک جھونپڑیوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ دوکان داروں نے بھی اپنے اپنے چھپر ڈال لئے تھے۔ پان مٹھائی اناج۔ گڑ۔ گھی۔ ساگ ترکاری اور منشی اشیاء کی دوکانیں کھل گئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بازار ہے۔ مِل کے پردیسی مزدور جنہیں نہ برادری کا خوف تھا نہ رشتہ داروں کا لحاظ۔ دن بھر تو مِل میں کام کرتے تھے اور رات کو تاڑی شراب وغیرہ پیتے تھے۔ جُوا روز ہوتا تھا۔ ایسے مقامات پر بدچلن عورتیں بھی آ ہی پہنچتی ہیں۔ یہاں بھی ایک چھوٹا موٹا چکلہ آباد ہو گیا تھا۔ پانڈے پور کا پُرانا بازار سرد ہوتا جاتا تھا۔ مٹھوا۔ گھیسو۔ وِدّیادھر۔ تینوں اکثر اس طرف سَیر کو آتے اور جُوا کھیلتے۔ گھیسو تو دودھ بیچنے کے بہانے آتا۔ وِدّیادھر نوکری تلاش کرنے کے بہانے آتا اور مٹھوا صرف ان دونوں کا ساتھ دینے کے لئے آتا۔ کوئی چاٹ کھا رہا ہے۔ کوئی تمبولی کی دوکان

کے سامنے کھڑا ہے۔ کوئی پیشہ در عورتوں سے مذاق کر رہا ہے۔ فحش مذاق حیا سوز نظر بازیاں شہوانی طور و طریق۔ ان سب کا ایک نہ رکنے والا بہاؤ سا جاری رہتا تھا۔ پانڈے پور میں یہ دلچسپیاں کہاں؟ لڑکوں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تاڑی کی دوکان کے سامنے کھڑے ہوں۔ کہیں گھر کا کوئی آدمی نہ دیکھ لے۔ نوجوانوں کی مجال نہ تھی کہ کسی عورت کو چھیڑیں۔ کہیں میرے گھر جا کر کہہ نہ دے۔ سبھی ایک دوسرے سے رشتہ رکھتے تھے۔ یہاں وہ رکاوٹیں کہاں؟ ہر شخص آزاد تھا۔ اُسے نہ کسی کا خوف تھا نہ لحاظ۔ کوئی کسی پر ہنسنے والا نہ تھا۔ تینوں کو منع کیا جاتا تھا کہ وہاں نہ جایا کرو اور جاؤ بھی تو اپنا کام کر کے چلے آیا کرو۔ مگر جوانی دیوانی ہوتی ہے کون کسی کی سنتا تھا؟ سب سے بُری حالت بجرنگی کی تھی۔ گھیسو روز ہی روپیہ بارہ آنے اُڑا لیا کرتا اور پوچھنے پر بگڑ کر کہتا۔ کیا میں چور ہوں؟

ایک روز بجرنگی نے سُورداس سے کہا — سُورداس لڑکے برباد ہوتے جاتے ہیں۔ جب دیکھو چکلے ہی میں ڈٹے رہتے ہیں گھیسو میں چوری کی بان کبھی نہ تھی۔ اب ایسا ہتھ لپکا ہو گیا ہے کہ سو جتن سے پیسے رکھ دو۔ کھوج کر نکال لیتا ہے۔

جگدھر سُورداس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہ باتیں سُن کر بولا — میری بھی وہی دشا ہے بھائی۔ ودیادھر کو کتنا پڑھایا لکھایا۔ مڈل تک کھینچ کھانچ کر لے گیا۔ آپ بھوکا رہتا تھا۔ گھر کے لوگ کپڑوں کو ترستے تھے۔ پر اُس کے لئے تو کسی بات کی کمی نہ تھی۔ آس تھی کہ چار پیسے کمائے گا۔ میرا بُڑھاپا کٹ جائے گا۔ گھر بار سنبھالے گا۔ برادری میں مرجاد بڑھائے گا سو وہ اب روج وہاں جا کر جُوا کھیلتا ہے۔ مجھ سے بہانہ کرتا ہے کہ وہاں

ایک بابو کے پاس کام سیکھنے جاتا ہوں۔ سُنتا ہوں کسی عورت سے اُس کی آسنائی ہوگئی ہے ابھی پتلی گھر کے کئی مجور اُسے کھوجتے ہوئے میرے پاس آئے تھے۔ اُسے پا جائیں تو مار پیٹ کریں۔ وہ بھی اُسی عورت کے آسنا ہیں۔ مَیں نے ہاتھ پیر جوڑ کر ان کو بدا کیا۔ یہ کارکھانا کیا کھُلا ہماری تباہی آگئی۔ پھانڈا جُرور ہے۔ چار پیسے کی آمدنی ہے۔ پہلے ایک ہی کھونچہ نہ بکتا تھا۔ اب تین تین بک جاتے ہیں۔ لیکن ایسا سونا کِس کام کا جس سے کان پھٹیں؟

بجرنگی۔ جی جواہی کھیلتا تب تک گنیمت تھی۔ ہمارا گھیسو تو آوارہ ہوگیا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو صورت کیسی بگڑ گئی ہے۔ کیسی دیہہ نکل آئی تھی! مجھے پوری آسا تھی کہ اب کی دنگل مارے گا۔ اکھاڑے کا کوئی پٹھا اُس کے جوڑ کا نہیں ہے مگر جب سے چلکے کی چاٹ پڑ گئی ہے دن دن گھُلا جاتا ہے۔ دادا کو تم نے دیکھا تھا نا؟ دس پانچ کوس کے گِرد میں کوئی کوئی اُن سے ہاتھ نہ مِلا سکتا تھا۔ چُٹکی سے سُپاری توڑ دیتے تھے۔ مَیں نے بھی جوانی میں کتنے ہی دنگل مارے۔ تم نے تو دیکھا ہی تھا۔ اُس پنجابی کو کیسا مارا کہ پانچ سو روپے اِنام پائے اور اکھباروں میں دور دور تک نام ہو گیا۔ کبھی کسی مائی کے لال نے میری پیٹھ میں دُھول نہیں لگائی۔ تو بات کیا تھی؟ لنگوٹ کے سچے تھے۔ مونچھیں نکل آئی تھیں تب تک کسی اِستری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ بیاہ بھی ہو گیا تب بھی محنت کسرت کی دھن میں اِستری کا دھیان ہی نہ کرتے تھے۔ اُسی کے بَل پر اب بھی دعویٰ ہے کہ دس پانچ کا سامنا ہو جائے تو چھکے چھڑا دیں۔ پر اِس لونڈے نے ڈونگا ڈبا دیا۔ گھورے اُستاد کہتے تھے کہ اِس میں تو دم ہی نہیں ہے

جہاں دو پکڑ ہوئیں کہ بس بھینسے کی طرح ہانپنے لگتا ہے ؛

سُورداس۔ میں اندھا آدمی۔ لونڈوں کے یہ چرتر کیا جانوں۔ پر سُبھاگی کہتی تھی کہ مٹھوا کے ڈھنگ بھی اچھے نہیں ہیں۔ جب سے ٹیشن پر قلی ہوگیا ہے۔ روپیہ آٹھ آنے روج کما تا ہے مُدا کسم لے لو جو گھر میں ایک پیسہ بھی دیتا ہو۔ بھوجن میرے ماتھے ہے۔ جو کچھ پاتا ہے نسہ پانی میں اُڑا دیتا ہے ؛

جگدھر۔ تم بھی تو جھوٹ موٹ لاج ڈھو رہے ہو۔ نکال کیوں نہیں دیتے گھر سے؟ اپنے سر پڑے گی تو آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اپنا لڑکا ہو تو ایک بات ہے۔ بھائی بھتیجے کس کے ہوتے ہیں؟

سُورداس۔ پالا تو لڑکے ہی کی طرح ہے۔ دل نہیں مانتا ؛

جگدھر۔ اپنا بنانے سے تھوڑے ہی اپنا ہو جائے گا ؛

ٹھاکردین بھی آگیا تھا۔ جگدھر کی بات سُن کر بولا۔ بھگوان نے کیا تمہارے کرم میں کانٹے ہی بونا لکھا ہے؟ کسی کا بھی بھلا نہیں دیکھ سکتے۔

سُورداس۔ اُس کے مَن میں جو آئے کرے پر میرے کیئے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کھا کر سوؤں اور اُس کی بات نہ پوچھوں ؛

ٹھاکردین۔ کوئی بات کہنے کے پہلے سوچ لینا چاہیئے کہ سُننے والے کو اچھی لگے گی یا بُری۔ جس لڑکے کو بچپنے سے پالا اور اس طرح کہ کوئی اپنے بیٹے کو بھی نہ پالتا اُسے اب کیسے چھوڑ دے؟

جمنی۔ اُنکے کل جُگی لڑکے جو کچھ نہ کریں تھوڑا ہے۔ ابھی دودھ کے دانت نہیں اُکھڑے۔ سُبھاگی نے گھیسو کو گود میں کھلایا ہے۔ سو آج وہ اُسی سے دل لگی کرتا ہے چھوٹے بڑے کا لحاج اُٹھ گیا۔ یہ تو کہو سُبھاگی کی کاٹھی

اچھی ہے نہیں بال بچے ہوتے ہوتے تو گھیسو سے بیٹے ہوتے ۔

اِدھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں اُدھر تینوں لونڈے نایک رام کے دالان میں بیٹھے ہوئے منصوبے باندھ رہے تھے۔ گھیسو نے کہا سُبھاگی مارے ڈالتی ہو۔ دیکھ کر یہی جی چاہتا ہے کہ گلے لگا دوں۔ سر پر ساگ کی ٹوکری رکھ کر بَل کھاتی ہوئی چلتی ہے۔ سو جان لے لیتی ہے۔ بڑی کا پھر ہے ۔

ودّیا دھر۔ تم تو ہو گھامڑ۔ پڑھے لکھے تو ہو نہیں بات کیا سمجھو بمعسوک۔ کبھی اپنے منہ سے تھوڑا ہی کہتا ہے کہ میں راجی ہوں۔ اُس کی آنکھوں سے تاڑ جانا چاہئے۔ جتنی ہی بگڑے اُتنی ہی دل سے راجی سمجھو۔ کچھ پڑھے ہوتے تو جانتے۔ عورتیں کیسے نکھرے کرتی ہیں ۔

مٹھوا۔ پہلے سُبھاگی مجھ سے بھی اِسی طرح بگڑتی تھی۔ کسی طرح ہتھے ہی نہ چڑھے۔ بات ہی نہ سُنے۔ پر میں نے ایک دن ہمت کر کے کلائی پکڑ لی اور کہا —— اب نہ چھوڑوں گا چاہے مار ہی ڈالو۔ مرنا تو ایک دن ہے ہی تیرے ہی ہاتھوں مروں گا تو سیدھے سرگ جاؤں گا ۔ وہ تو بگڑ کر گالیاں دینے لگی۔ پھر کہنے لگی —— چھوڑ دو۔ کہیں کوئی دیکھ لے تو گجب ہو جائے۔ میں تیری بوا لگتی ہوں۔ پر میں نے ایک نہ سُنی۔ بس پھر کیا تھا۔ اُسی دن سے آ گئی جنگل میں ۔

مٹھوا اپنی عشقیہ فتوحات کی فرضی داستانیں گھڑنے میں بڑا ہوشیار تھا۔ جاہل ہونے پر بھی غپ مارنے میں اُن سے ودّیا دھر کو مات کر دیا تھا۔ اپنی گڑھنتوں میں کچھ ایسا رنگ بھرتا تھا کہ دوستوں کو اُن گپوڑوں پر یقین آ جاتا تھا ۔

گھیسو بولا۔ کیا کہوں۔ میری تو ہمت ہی نہیں پڑتی۔ ڈرتا ہوں کہیں

شور نہ مچادے تو آفت آجائے۔ تمہاری ہمت کیسے پڑگئی تھی؟

ودّیا دھر۔ تمہارا سر۔ جاہل جپٹ تو ہو۔ معسوک اپنے عاسک کو آجماتا ہے کہ اس میں کچھ جیوٹ بھی ہے یا یونہی چھیلا بنا پھرتا ہے۔ عورت اُسی کو پیار کرتی ہے جو دلاور ہو نڈر ہو۔ آگ میں کود پڑے۔

گھیسو۔ تم تیار ہو؟

ودّیا دھر۔ ہاں آج ہی۔

مٹھوا۔ مگر دیکھی لینا دادا دوار پر نیم کے نیچے سوتے ہیں۔

گھیسو۔ اِس کا کیا ڈر؟ ایک دھکّا دوں گا۔ دور جا کر گرے گا۔

تینوں مشورہ کرتے اس سازش کے داؤں پیچ سوچتے۔ تُلی بازار کی طرف چلے گئے۔ وہاں تینوں نے شراب پی۔ دس گیارہ بجے رات تک بیٹھے گانا بجانا سُنتے رہے۔ شراب خانوں میں نغمہ سے نا آشنا کانوں کے لئے گانے کی کمی کبھی نہیں رہتی۔ تینوں بدمست ہو کر لوٹے تو گھیسو بولا صلاح پکّی ہے نا؟ آج وارا نیارا ہو جائے۔ چت پڑے یا پٹ۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ چوکیدار پہرہ دے کر جا چکا تھا۔ گھیسو اور ودّیا دھر سوردا س کے دروازہ پر گئے۔

گھیسو۔ تم آگے چلو۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔

ودّیا دھر۔ نہیں تم جاؤ۔ تم گنوار آدمی ہو۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا تو بات بھی نہ بنا سکو گے۔

نشہ نے گھیسو کو آپے سے باہر کر رکھا تھا۔ کچھ یہ دکھانا بھی منظور تھا کہ تم لوگ مجھے جتنا احمق سمجھتے ہو اُتنا نہیں ہوں۔ وہ جھونپڑی میں گھس ہی پڑا اور جا کر سُبھاگی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سُبھاگی چونک کر اُٹھ بیٹھی اور زور سے بولی۔ کون ہے؟ چل ہٹ!

گھیسو۔ چُپ چُپ میں ہوں ÷

سُبھاگی۔ چور چور! چور چور!

سورداس جاگا۔ وہ اُٹھ کر جھونپڑی میں جانا چاہتا تھا کہ کسی نے اُسے پکڑ لیا۔ اُس نے ڈانٹ کر پوچھا۔ کون ہے؟ جب کچھ جواب نہ ملا۔ تو اُس نے بھی اُس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور چلایا "چور چور!" محلہ والے یہ آوازیں سُنتے ہی لاٹھیاں لے کر نکل پڑے۔ بجرنگی نے پوچھا۔ کہاں گیا کہاں؟ سبھاگی بولی ہیں پکڑے ہوئے ہوں۔ لوگوں نے جاکر پوچھا تو اندر سُبھاگی گھیسو کو پکڑے ہوئے ہے اور باہر سُورداس وِدّیا دھر کو۔ متھوا نایک رام کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ یہ شور غل سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک لحہ میں سارا محلہ ٹوٹ پڑا۔ چور کے پکڑنے کو شاید ہی کوئی نکلے مگر پکڑے ہوئے چور پر زور آزمائی کے لئے سبھی پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں آکر دیکھتے ہیں تو نہ چور نہ چور کا بھائی۔ بلکہ اپنے ہی محلّے کے لونڈے ہیں ÷

ایک عورت بولی۔ یہ جمانے کی کھوبی ہے کہ گاؤں گھر کا بچار بھی اُٹھ گیا کسی کی آبرو بچے گی؟

ٹھاکر دین۔ ایسے لونڈوں کا سر کاٹ لینا چاہئے ÷

نایک رام۔ چپ رہو ٹھاکر دین۔ یہ گُسّا کرنے کی بات نہیں۔ رونے کی بات ہے! ÷

جگدھر۔ بجرنگی۔ جمنی۔ سر جُھکائے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ بجرنگی کو تو ایسا غصہ آرہا تھا کہ گھیسو کا گلا دبا دے۔ یہ بھیڑ اِدھر ہل چل دیکھ کر کئی کانسٹبل بھی آپہنچے۔ اچھا شکار پھنسا۔ مٹھیاں گرم

ہوں گی۔ فوراً دونوں نوجوانوں کی کلائیاں پکڑ لیں۔ جمنی نے رو کر کہا۔ یہ لونڈے مُنہ میں کالک لگانے والے ہیں۔ اچھّا ہوگا۔ چھ چھ مہینے کی سجا کاٹ آئیں گے تب اُن کی آنکھیں کھُلیں گی۔ سمجھاتے سمجھاتے ہار گئی کہ بیٹا۔ بدراہ مت چلو پر کون سُنتا ہے۔ اب جاکر چکی پیسو۔ اِس سے تو اچھا تھا کہ بانجھ ہی رہتی ⁘

نایک رام۔ اچھّا۔ اب اپنے اپنے گھر جاتے جاؤ۔ جمعدار لونڈے ہیں چھوڑ دو۔ آؤ چلیں ⁘

جمعدار۔ ایسا نہ کہو پنڈا جی۔ کوتوال صاحب کو معلوم ہوجائے گا تو سمجھیں گے کہ ان سبھوں نے کچھ لے دے کر چھوڑ دیا ہوگا ⁘

نایک رام۔ کیا کہتے ہو سورداس۔ اب یہ لوگ جائیں نا ؟

ٹھاکر دین۔ ہاں اور کیا۔ لڑکوں سے بھول چُوک ہو ہی جاتی ہے۔ کام تو بُرا کیا پر اب جانے دو۔ جو ہُوا سو ہُوا ⁘

سُورداس۔ مَیں کون ہوتا ہوں کہ جانے دوں ؟ جانے دیں کوتوال ڈپٹی حاکم لوگ ⁘

بجرنگی۔ سورداس۔ بھگوان جانتا ہے جان کا ڈر نہ ہوتا تو اِس دُشٹ کو کچّا ہی چبا جاتا ⁘

سُورداس۔ اب تو حاکم لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ چھوڑیں چاہے ڈنڈ دیں ⁘

بجرنگی۔ تم کچھ نہ کرو گے تو کچھ نہ ہوگا۔ جمعدار جی کو ہم منالیں گے ⁘

سُورداس۔ تو بھیّا۔ صاف صاف بات یہ ہے کہ مَیں بنا سرکار میں رپٹ کئے نہ مانوں گا چاہے سارا محلّہ میرا دُشمن ہوجائے ⁘

بجرنگی۔ کیا یہی ہوگا۔ سُورداس ؟ گاؤں گھر ٹولے محلّے کا کچھ لحاظ نہ کرو گے ؟

لڑکوں سے بھول تو ہی گئی اب اُن کی جندگانی کھراب کر کے کیا ملے گا ؟
جگدھر۔ سُبھاگی ہی کہاں کی دیبی ہے۔ جب سے بھیرو نے چھوڑ دیا۔ سارا محلّہ اُس کا رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہے۔ بنا پہلے کسی سانٹھ گانٹھ کے کوئی کسی کے گھر میں نہیں گھُستا ۔
سُورداس۔ تو یہ سب مجھ سے کیا کہتے ہو بھائی ؟ سبھاگی دیبی ہو چاہے ہرجائی۔ وہ جانے اس کا کام جانے۔ میں نے اپنے گھر میں چوروں کو پکڑا ہے۔ اُس کی تھانے میں جرور رپٹ کروں گا۔ تھانہ والے نہ سنیں گے تو حاکم سے کہوں گا۔ لڑکے لڑکوں کی راہ رہیں تو لڑکے ہیں۔ شہدوں کی راہ چلیں تو شہدے ہیں۔ بدماسوں کے اور کیا سینگ پونچھ ہوتی ہے بجرنگی۔ سور کہے دیتا ہوں۔ کھون ہو جائے گا ۔
سُورداس۔ تو کیا ہو جائے گا ؟ کون میرے نام کو کوئی رونے والا بیٹھا ہوا ہے ؟
نایک رام نے وہاں ٹھہرنا بیفائدہ سمجھا کیوں نیند خراب کریں ؟ چلنے لگے تو جگدھر نے کہا۔ پنڈا جی تم بھی جاتے ہو۔ یہاں کیا ہو گا ؟
نایک رام نے جواب دیا۔ بھائی سُورداس مانے گا نہیں چاہے لاکھ کہو۔ میں بھی تو کہہ چکا۔ کہو اور ہاتھ پیر پڑوں پر ہونا ہوا نا کچھ نہیں۔ گھیسو اور ودّیا کی تو بات ہی کیا۔ متھوا بھی ہوتا تو سورداس اُس کو کبھی نہ چھوڑتا ہٹیلی آدمی ہے ۔
جگدھر۔ ایسا کہاں کا دھنّا سیٹھ ہے کہ اپنے من ہی کی کرے گا۔ تم چلو۔ جبرا ڈانٹ کر کہو تو ۔
نایک رام لَوٹ کر سورداس سے بولے۔ سُور۔ کبھی کبھی گاؤں گھر

ساتھ مُلا ہجا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لڑکوں کی جِندگانی برباد کر کے کیا پاؤگے؟
سُور داس۔ پنڈا جی۔ تم بھی اوروں کی سی کہنے لگے۔ دنیا میں کہیں نیاؤ ہے کہ نہیں؟ کیا عورت کی آبرو کچھ ہوتی ہی نہیں؟ سُبھاگی گریب ہے۔ اَبلا ہے مجوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہے۔ اِس لئے جو کوئی چاہے اُس کی آبرو بگاڑ دے؟ جو چاہے اُسے ہرجائی سمجھ لے؟

سارا محلّہ ایک ہو گیا۔ یہاں تک کہ دونوں کانسٹبل بھی محلّہ والوں کی سی کہنے لگے۔ ایک بولا۔ عورت کھلّہ (خود) ہرجائی ہے۔

دوسرا۔ محلّہ کے آدمی چاہیں تو کھُون پچا لیں۔ یہ کون سا بڑا جُرم ہے۔
پہلا۔ سَہادت ہی نہ ملے گی تو جُرم کیا ثابت ہوگا۔
سُور داس۔ سَہادت تو جب نہ ملے گی جب مَیں مر جاؤں گا۔ کیا کہا۔ وہ ہرجائی ہے؟
کانسٹبل۔ ہرجائی تو ہے ہی۔ ایک بار نہیں سَو بار اُسے بجار میں ترکاری بیچتے اور ہنستے دیکھا ہے۔
سُور داس۔ تو بجار میں ترکاری بیچنا اور ہنسنا ہرجائیوں کا کام ہے؟
کانسٹبل۔ ارے تو جاؤ گے تو تھانہ ہی تک نا؟ وہاں بھی تو ہمیں سے رپٹ کرو گے۔
نایک رام۔ اچھی بات ہے۔ اِسے رپٹ کرنے دو مَیں دیکھ لوں گا۔ درگا جی کوئی گیر آدمی نہیں ہیں۔
سُور داس۔ ہاں۔ درگا جی کے جو مَن میں آئے کریں۔ دوس پاپ اُن کے ساتھ ہے۔
نایک رام۔ کہتا ہوں۔ محلّہ میں نہ رہنے پاؤ گے۔

سُورداس۔ جب تک جیتا ہوں تب تک تور ہوں گا۔ مرنے کے بعد دیکھی جائے گی ؀

کوئی سورداس کو سمجھاتا تھا کوئی دھمکاتا تھا۔ وہاں وہی لوگ رہ گئے تھے جو اِس معاملہ کو دَبا دینا چاہتے تھے۔ جو لوگ اِسے بڑھانا چاہتے تھے وہ بجرنگی اور نایک رام کے خوف سے کچھ کہہ نہ سکنے کے سبب اپنے اپنے گھر کو چلے گئے تھے۔ اِن دونوں آدمیوں سے بَیر مول لینے کی کسی میں ہمّت نہ تھی۔ پر شُورداس اپنی بات پر ایسا اَڑا تھا کہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ آخر یہی طے ہوا کہ اِسے تھانہ جاکر رپٹ لکھوا آنے دو۔ ہم لوگ تھانہ دار ہی کو راضی کر لیں گے۔ دس بیس روپے سے غم کھائیں گے ؀

نایک رام۔ ارے وہی لالہ تھانہ دار ہیں نا؟ اُنہیں تو مَیں چُٹکی بجاتے بجاتے گانٹھ لوں گا۔ میری پُرانی جان پہچان ہے ؀

جگدھر۔ پنڈا جی میرے پاس تو روپے بھی نہیں ہیں۔ میری جان کیسے بچے گی؟

نایک رام۔ مَیں بھی تو پردیس سے لوٹا ہوں۔ ہاتھ کھالی ہے۔ جاکر کہیں روپے کی پھکر کرو ؀

جگدھر۔ میں شُورداس کو اپنا ہِتو سمجھتا تھا۔ جب کبھی کام پڑا ہے اُس کی مدد کی ہے۔ اِسی کے پیچھے بھیرو سے میری دُشمنی ہو گئی۔ اور تب بھی یہ میرا نہ ہوا ؀

نایک رام۔ یہ کسی کا نہیں ہے اور سب کا ہے۔ جاکر دیکھو۔ جہاں سے ہو سکے پچیس روپے تو لے ہی آؤ ؀

جگدھر۔ بھیّا۔ روپے کس سے مانگنے جاؤں؟ کون پتیائے گا؟

نایک رام ۔ ارے وِدّیا کی آماں سے کوئی گہنا ہی مانگ لو۔ اِس بکھت تو پران بچیں۔ پھر چھُڑا دینا ٭

جگدھر بہانے کرنے لگا۔ وہ چھلّا تک نہ دے گی۔ مَیں مر بھی جاؤں تو کپھن کے لئے روپے نہ نکالے گی۔ یہ کہتے کہتے وہ رونے لگا۔

نایک رام کو اُس پر ترس آگیا۔ روپے دینے کا وعدہ کر لیا ٭

سُورداس بڑے سویرے تھانہ کی طرف چلا تو بجرنگی نے کہا سُورداس تمہارے سر پر موت کھیل رہی ہے۔ جاؤ ٭

جمنی سُورداس کے پیروں سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی بولی۔ سُورداس تم ہمارے بَیری ہو جاؤ گے یہ کبھی آسا نہ تھی ٭

بجرنگی نے کہا۔ بیچ ہے اور کیا۔ ہم اِس کو پالتے ہی چلے آتے ہیں۔ بھوکوں کبھی نہیں سونے دیا۔ بیماری آرامی میں کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب کبھی دودھ مانگنے آیا کھالی ہاتھ نہیں جانے دیا۔ اِس نیکی کا یہ بدلہ! سچ کہا ہے کہ اندھوں میں سِیل (مُرّوت) نہیں ہوتی۔ ایک پاہن کے پیچھے!

نایک رام پہلے ہی لپک کر تھانہ جا پہنچے اور تھانہ دار کو سارا ماجرا سُنا کر کہا۔ پچاس کا ڈول ہے۔ کم نہ جیاوہ۔ رپٹ ہی نہ لکھئے ٭

داروغہ نے کہا۔ پنڈا جی۔ جب تم درمیان میں ہو تو سو پچاس کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اندھے کو معلوم ہو جائے گا کہ رپٹ نہیں لکھی گئی تو سیدھا ڈپٹی صاحب کے پاس جا پہنچے گا۔ پھر میری جان آفت میں پڑ جائے گی۔ نہایت رو کھا افسر ہے۔ پولیس کا تو جانی دشمن ہی سمجھو۔ اندھا یوں ماننے والا اسامی نہیں ہے۔ جب اِس نے چتاری کے راجہ صاحب کو ناکوں چنے چبوا دئے تو دو مردوں کی کون گنتی ہے ؟ بس یہی ہو سکتا ہے

کہ جب میں تحقیقات کے لئے آؤں تو آپ لوگ کسی کو شہادت نہ دینے دیں۔ عدم ثبوت میں معاملہ خارج ہو جائے گا۔ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ شہادت کے لئے کسی کو مجبور نہ کروں گا اور گواہوں کے بیانات میں بھی کچھ کاٹ چھانٹ کر دوں گا۔

دوسرے روز شام کے وقت داروغہ جی تحقیقات کرنے گئے۔ محلّے کے سب لوگ جمع ہوئے مگر جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے رات کو کسی کی چور چور کی آواز نہیں سُنی۔ مَیں نے کسی کو سُورداس کے دروازہ پر نہیں دیکھا۔ میں تو گھر میں دروازہ بند کئے پڑا سوتا تھا۔ یہاں تک کہ ٹھاکردین نے بھی صاف کہا۔ صاحب مَیں کچھ نہیں جانتا۔

داروغہ نے سُورداس پر بگڑ کر کہا۔ جھوٹی رپٹ کرتا ہے۔ بدمعاش!

سُورداس۔ رپٹ جھوٹی نہیں ہے سچّی ہے۔

داروغہ۔ تیرے کہنے سے سچّی مان لوں۔ کوئی گواہ بھی ہے؟

سُورداس نے محلّہ والوں کو مخاطب کر کے کہا۔ یارو سچّی بات کہنے سے مت ڈرو۔ میل مروّت اِسے نہیں کہتے کہ کسی عورت کی آبرو بگاڑ دی جائے اور لوگ اُس پر پردہ ڈال دیں کسی کے گھر میں چوری ہو جائے اور لوگ چھپا لیں۔ اگر یہی حال رہا تو سمجھ لو کہ کسی کی آبرو نہ بچے گی۔ بھگوان نے سبھی کو بہو بیٹیاں دی ہیں۔ کچھ اُن کا بھی کھیال کرو عورت کی آبرو کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے پیچھے سر کٹ جاتے ہیں لہو کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ مَیں اور کسی سے نہیں پُوچھتا۔ ٹھاکردین تمہیں بھگوان کا ڈر ہے پہلے تمہیں آئے تھے۔ تم نے یہاں کیا دیکھا؟ کیا میں

اور سُبھاگی دونوں گھیسو اور بدّیا دھر کا ہاتھ نہیں پکڑے ہوئے تھے؟ دیکھو مُنہ دیکھی نہیں۔ ساتھ کوئی نہ جائے گا۔ جو کچھ دیکھا ہے سچ سچ کہہ دو۔

ٹھاکر دین دھرم سے ڈرتا تھا۔ یہ باتیں سُن کر خوفزدہ ہوگیا۔ بولا۔ چوری ڈاکے کی بات تو میں کچھ نہیں جانتا۔ یہی پہلے بھی کہہ چکا۔ بات بدلنی نہیں آتی۔ ہاں جب میں آیا تو تم اور سُبھاگی دونوں لڑکوں کو پکڑے چلا رہے تھے۔

سُورداس۔ میں ان دونوں کو اُن کے گھر سے تو نہیں پکڑ لایا تھا؟

ٹھاکر دین۔ یہ بھگوان جانیں۔ ہاں چور چور کی آواج میرے کان میں پڑی تھی۔

سُورداس۔ اچھا اب میں تم سے پوچھتا ہوں جمعدار۔ تم آئے تھے نا؟ بولو یہاں جماؤ تھا کہ نہیں؟

کانسٹبل نے ٹھاکر دین کو بدلتے دیکھا تو ڈرا کہ اندھا دو چار آدمیوں کو اور لائے گا تو ہم جھوٹے بنیں گے۔ بولا۔ ہاں جماؤ کیوں نہیں تھا۔

سُورداس۔ گھیسو کو سُبھاگی پکڑے ہوئے تھی کہ نہیں؟ بدّیا دھر کو میں پکڑے ہوئے تھا کہ نہیں؟

کانسٹبل۔ چوری ہوتے ہم نے نہیں دیکھی۔

سُورداس۔ ہم ان دونوں لڑکوں کو پکڑے ہوئے تھے کہ نہیں؟

کانسٹبل۔ ہاں پکڑے ہوئے تھے پر چوری ہوتے نہیں دیکھی۔

سُورداس۔ دارو گاجی۔ ابھی گواہی ملی کہ اور دوں؟ یہاں ننگے لُچے نہیں بستے۔ بھلے مانسوں ہی کی بستی ہے۔ کہئے۔ بجرنگی سے کہلا دوں۔ کہئے کھُد گھیسو سے کہلا دوں۔ کوئی جھوٹی بات نہ کہے گا۔ مروّت مروّت

کی جگہ ہے۔ مروت محبت کی جگہ ہے۔ مروت اور محبت کے پیچھے کوئی اپنا پرلوک نہ بگاڑے گا۔

بجرنگی نے دیکھا۔ اب لڑکے کی جان نہیں بچتی تو اپنا ایمان کیوں بگاڑیں۔ داروغہ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور بولا — داروغاجی۔ سورداس جو بات کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ جس نے جیسی کرنی کی ہے ویسی بھوگے۔ ہم کیوں اپنا پرلوک بگاڑیں؟ لڑکا ایسا نالایق نہ ہوتا تو آج کیوں منہ میں کالکھ لگتی؟ جب اس کا چلن ہی بگڑ گیا تو میں کہاں تک بچاؤں گا؟ ڈنڈ بھوگے گا تو آپ آنکھیں کھلیں گی۔

ہوا بدل گئی۔ ایک لمحہ میں شہادتوں کا تانتا بندھ گیا۔ دونوں ملزم حراست میں لے لئے گئے۔ مقدمہ چلا اور تین تین مہینے کی سزا ہو گئی۔ بجرنگی اور جگدھر دونوں سورداس کے معتقد تھے۔ نایک رام کا یہ کام تھا کہ سب سے سورداس کے گن کا بکھان کیا کرے۔ اب یہ تینوں اس کے دشمن ہو گئے۔ دو بار پہلے بھی وہ اپنے محلے سے بیر لے چکا تھا مگر ان دونوں موقعوں پر کسی کو اس کی ذات سے اتنا صدمہ نہ پہنچا تھا۔ اب کے تو اس نے بڑا زبردست قصور کیا تھا۔ جمنی جب سورداس کو دیکھتی تو سو کام چھوڑ کر اسے کوستی۔ سبھاگی کو گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک ہوا کہ مٹھوا نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ رات کو بھی اسٹیشن ہی پر رہ جاتا۔ اپنے ساتھیوں کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ نایک رام تو اتنے برہم تھے کہ سورداس کے دروازہ کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ چکر کھا کر آتے جاتے۔ بس اس کے ساتھیوں میں لے دے کے ایک بھیرو رہ گیا۔ ہاں کبھی کبھی دوسروں کی نظر بچا کر ٹھاکر دین بھی خیریت کا حال

پوچھ جاتا۔ اور تو اور دیا گر بھی اُس سے کنارہ کرنے لگے کہ کہیں لوگ اُس کا دوست سمجھ کر مجھے دان دچھنا دینا بند نہ کردیں۔ سچّائی کے دوست کم ہوتے ہیں۔ دشمنوں کی تعداد سے کہیں کم ؛

(۱۴)

پربھو سیوک نے تین سال تک امریکہ میں رہ کر اور ہزاروں روپے خرچ کرکے جو تجربہ اور ہنر حاصل کیا تھا وہ مسٹر جان سیوک نے اُن کی صحبت سے اُتنے ہی مہینوں میں حاصل کرلیا تھا۔ اتنا ہی نہیں۔ پربھو سیوک کی طرح وہ صرف بتلائے ہوئے راستہ پر آنکھیں بند کرکے چلنے پر قانع نہ تھے۔ اُن کی نگاہ آگے پیچھے دائیں بائیں بھی رہتی تھی۔ ماہرین میں ایک تنگ دلی ہوتی ہے جو اُن کی نگاہوں کو محدود رکھتی ہے۔ وہ کسی مسئلہ پر آزاد ہوکر وسیع نگاہ نہیں ڈال سکتے۔ ضابطہ اصول اور پدوا یا اُن کی نگاہوں کو پھیلنے نہیں دیتیں۔ طبیب ہر مرض کی دوا کتابوں میں تلاش کرتا ہے۔ وہ صرف تشخیص کا بندہ ہے اور علامات کا غلام۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کتنے ہی مرضیوں کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ عقل سلیم اگر تفصیلات پر قادر نہیں تو تعصّبات سے بھی آزاد ہوتی ہے۔ وہ کسی مسئلہ پر مجموعی حیثیت سے غور کرسکتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی۔ یہی باعث ہے کہ دفتر وزارت میں بیٹھا ہوا فوجی وزیر سپہ سالار پر حکومت کرتا ہے پربھو سیوک کی علیحدگی سے مسٹر جان سیوک ذرا بھی برداشتہ خاطر نہیں ہوئے وہ دوگنے حوصلے سے کام کرنے لگے۔ کاروباری شخص تھے۔ جتنی آسانی سے دفتر میں بیٹھ کر بہی کھاتہ لکھ سکتے تھے۔ اُتنی ہی آسانی سے موقع پڑنے پر وہ انجن کے پہیوں کو بھی چلا سکتے تھے۔ پہلے کبھی کبھی سرسری نگاہ ہی

سے مِل کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ اب باقاعدگی کے ساتھ اوقاتِ معینہ پر جاتے اکثر دن کا کھانا وہیں کھاتے اور شام کو گھر جاتے۔ کبھی کبھی رات کے نو دس بج جاتے۔ وہ پربھوسیوک کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ مَیں نے تمہارے ہی بھروسہ پر یہ کام نہیں شروع کیا۔ کوّے کے ڈھولنے پر بھی سویرا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ اُن کی زر پرستی اولاد کی محبت پر مبنی نہ تھی۔ وہ اُن کی زندگی کا خاص جُزو اور اُن کے چشمۂ حیات کا اصلی منبع تھی۔ دنیا کی اور سبھی باتیں ضمنی تھیں ✤

مزدوروں اور کاریگروں کے لئے مکانات تعمیر کرانے کا مسئلہ ابھی حل نہ ہوا تھا۔ اگرچہ مجسٹریٹ ضلع سے اُنہوں نے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا مگر چتاری کے راجہ صاحب کی طرف سے اُنہیں بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ صاحب ایکبار عوام کی مرضی کے خلاف چل کر اس قدر بدنام ہو چکے تھے کہ اُس سے کہیں زیادہ اہم فتح کی اُمید بھی اب اُنہیں ایسی فضیحت کے لئے تیار نہ کر سکتی تھی۔ مِل بڑے زوروں پر چل رہی تھی مگر مزدوروں کے مکانات کا نہ ہونا اُس کی ترقی میں رُکاوٹ ڈال رہا تھا۔ جان سیوک اِسی اُدھیڑ بن میں پڑے رہتے تھے ✤

اتفاقاً وقتی حالات میں کچھ ایسا تغیر ہوا کہ یہ مشکل مسئلہ بھی کسی خاص کوشش کے بغیر ہی حل ہو گیا۔ پربھوسیوک کی علیحدگی نے وہ کام کر دکھایا جو شاید اُن کی رفاقت سے نہ ہو سکتا ✤

جب سے صوفیا اور ونے آگئے تھے۔ سمتی خوب ترقی کر رہی تھی۔ اُس کی سیاسی رفتار روز بروز تیز ہوتی جاتی تھی۔ کنور صاحب نے جتنی آسانی سے پہلی مرتبہ حُکّام کے شکوک رفع کر دئے تھے اُتنی آسانی سے ابکے

نہ کر سکے۔ اب مسئلہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا۔ پربھو سیوک کو استعفا دینے کے لئے مجبور کرنا مشکل نہ تھا مگر ونے کو گھر سے بدر کر کے اُسے حکام کے رحم پر چھوڑ دینا کہیں زیادہ مشکل تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کنور صاحب بے خوف آدمی تھے۔ حب الوطنی کے رنگ میں رنگے ہوئے آزاد۔ بے لوث اور دور اندیش۔ اُن کی زندگی اتنی سادہ اور صاف تھی کہ لوگ اُنہیں تارک الدنیا کہا کرتے تھے۔ اُنہیں عیش و عشرت کے لئے کسی بڑی جائداد کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔ مگر ظاہرا طریقہ پر وہ حکام کے مورد عتاب بننے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ قومی کام کے لئے اپنا سب کچھ دے سکتے تھے۔ مگر اس طرح کہ امانت کی باگ ڈور اُن کے ہاتھوں میں رہے۔ اُن میں اُس قربانی کی ہمت نہ تھی جو بالکل بے غرضی اور بے لوثی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اُنہیں یقین تھا کہ ہم آڑ میں رہ کر اُس سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں جتنا کہ سامنے آ کر۔ ونے کی اور ہی رائے تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ہم جائداد کے لئے اپنے ضمیر کی آزادی کا خون کیوں کریں۔ ہم جائداد کے مالک بن کر رہیں گے۔ اُس کے غلام بن کر نہیں۔ اگر پست پرستی سے نجات نہ پا سکے تو اس ریاضت کا نتیجہ کیا ہوا۔ یہ تو گناہ بے لذت ہے بے نیازی کے لئے ہی تو یہ ریاضت اختیار کی گئی ہے۔ کنور صاحب اس کا یہ جواب دیتے کہ ہم جائداد کے مالک نہیں بلکہ محافظ ہیں۔ یہ جائداد آیندہ نسلوں کی امانت ہے۔ ہمیں کیا اختیار ہے کہ ہم اُن نسلوں سے وہ آرام چھین لیں جو اُنہیں وراثتاً ملنا چاہئے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اتنے معیار پسند نہ ہوں یا اُنہیں وقتی حالات کے تبدیل ہو جانے سے نفس کشی کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اُن میں وہ فطرتی اوصاف

نہ ہوں جن کے سامنے جائداد کوئی چیز نہیں۔ ایسے ہی دلائل سے وہ دل کی تشفی کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اپنی زندگی بھر دولت و ثروت سے آرام و عزت حاصل کرنے کے بعد وہ ترک اور استغناء کا واقعی مطلب ہی نہ سمجھ سکتے تھے۔ وہ اولاد کے لئے جائداد نہ چاہتے تھے۔ جائداد کے لئے اولاد چاہتے تھے۔ جائداد کے مقابلہ میں اولاد کی حیثیت ثانوی تھی۔ اُنہیں حکام کی خوشامد سے نفرت تھی۔ وہ حکام کے ہاں میں ہاں ملانا معیوب سمجھتے تھے۔ مگر حکام کی نظروں میں مشتبہ ہو جانا اس حد تک کہ وہ دشمنی پر آمادہ ہو جائیں۔ اُنہیں محض حماقت معلوم ہوتی تھی۔ کنور صاحب کے ہاتھوں میں ونے کو راہ راست پر لانے کی ایک ہی تدبیر تھی۔ وہ یہ کہ صوفیا سے اُس کی شادی ہو جائے۔ اس طرح زنجیروں میں جکڑ کر وہ اُس کے اُٹھتے ہوئے جوش کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اب جو کچھ تاخیر تھی وہ صوفیا کی طرف سے۔ صوفیا کو اب بھی اندیشہ تھا کہ اگرچہ رانی صاحبہ اُس وقت مجھ پر خصوصاً مہربان ہیں مگر اُنہیں دل سے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔ اُس کا یہ اندیشہ بالکل بے بنیاد بھی نہ تھا۔ رانی بھی صوفیا سے محبت کر سکتی تھیں اور کرتی تھیں۔ وہ اُس کی عزت کر سکتی تھیں۔ اور کرتی تھیں۔ مگر وہ اپنی بہو میں ترک تعلق و استغنا غرور و خوض کی بہ نسبت حیا۔ سادگی اور خاندانی شرافت کا ہونا زیادہ ضروری خیال کرتی تھیں۔ وہ چھوڑنے والی بہو نہیں بلکہ لپٹنے والی بہو چاہتی تھیں۔ مگر وہ اپنے دلی خیالات کو بھول کر بھی زبان پر نہ لاتی تھیں نہیں۔ بلکہ وہ ایسے خیالات کو اپنے دل میں آنے ہی نہ دینا چاہتی تھیں۔ وہ اِسے احسان فراموشی سمجھتی تھیں ×

کنور صاحب کئی روز تک اسی فکر میں مبتلا رہے مسٹر جان سیوک سے گفتگو کئے بغیر شادی کس طرح طے ہوتی؟ آخر ایک دن اپنی مرضی کے خلاف ہونے پر بھی وہ مجبوراً اُن کے پاس گئے۔ شام ہو گئی تھی۔ مسٹر سیوک ابھی ابھی مل سے واپس آئے تھے۔ اور مزدوروں کے مکانات کی تجویز کو سامنے رکھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ کنور صاحب کو دیکھتے ہی اُٹھے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔

کنور صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے بولے۔ آپ نے اور صوفیا کی شادی کے متعلق کیا تجویز کرتے ہیں؟ آپ میرے دوست اور صوفیا کے والد ہیں اور دونوں ہی رشتوں کے سبب مجھے آپ سے یہ کہنے کا حق ہے کہ اب اس کام میں دیر نہ کیجئے۔

جان سیوک۔ دوستی کے تعلق سے آپ مجھ سے چاہے جو خدمت لے سکتے ہیں لیکن (متانت سے) صوفیا کا والد ہونے کے تعلق سے مجھے کچھ تجویز کرنے کا حق نہیں ہے۔ اُس نے مجھے اِس حق سے محروم کر دیا ہے۔ ورنہ اُسے یہاں آئے اتنے دن ہو گئے کیا ایک مرتبہ بھی یہاں تک نہ آتی؟ اُس نے ہم سے یہ حق چھین لیا ہے۔ اتنے ہی میں مسز سیوک بھی آ گئیں اور شوہر کی باتیں سُن کر بولیں۔ مَیں تو مَر جاؤں گی پر اُس کی صورت نہ دیکھوں گی۔ ہمارا اُس سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔

کنور۔ آپ لوگ صوفیا کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ جب سے وہ یہاں آئی ہے ایک روز بھی گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اس کا سبب فقط شرم ہے اور کچھ نہیں۔ شاید ڈرتی ہے کہ باہر نکلوں اور کسی شناسا سے ملاقات ہو جائے تو اُس سے کیا باتیں کروں گی۔ ذرا دیر کے لئے فرض

کہہ لیجئے کہ ہم میں سے کوئی بھی اُس کی جگہ ہوتا تو اُس وقت دل میں کیسے خیالات ہوتے۔ اِس بارہ میں وہ قابل معافی ہے۔ مَیں تو اِسے اپنی بدقسمتی سمجھوں گا۔ اگر آپ لوگ اُس سے اس طرح بے تعلق ہو جائیں گے۔ اب شادی میں تاخیر نہ ہونی چاہیئے ٭

مسز سیوک۔ خدا وہ دن نہ لائے۔ میرے لئے تو وہ مر گئی۔ میں اُس کا فاتحہ پڑھ چکی اور اُس کے نام کو جتنا رونا تھا رو چکی ٭

کنور۔ یہ زیادتی آپ لوگ میری ریاست کے ساتھ کر رہے ہیں شادی ہی ایک ایسی تدبیر ہے جو ونے کی خود سری کو زائل کر دے گی ٭

جان سیوک۔ میری تو رائے ہے کہ آپ ریاست کو کورٹ آف وارڈ کے سپرد کر دیجئے۔ گورنمنٹ عالیہ آپ کی تجویز کو بخوشی منظور کر لے گی اور آپ کے متعلق اُس کا سارا شبہ دور ہو جائے گا۔ اُس وقت کنور ونے سنگھ کی سیاسی بدعنوانیوں کا ریاست پر ذرا بھی اثر نہ پڑے گا اور اگرچہ اُس وقت اُن کو آپ کی یہ تجویز بُری معلوم ہو گی مگر کچھ روز بعد جب اُن کے خیالات میں پختگی آ جائے گی تو وہ آپ کے ممنون ہوں گے اور آپ کو اپنا سچا بہی خواہ خیال کریں گے۔ ہاں اتنی عرض اَور ہے کہ اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے آپ اپنے کو خوب مضبوط بنا لیں۔ اُس وقت اگر آپ کی طرف سے ذرا بھی پس و پیش ہوا تو آپ کی ساری کوشش بیکار جائے گی۔ آپ گورنمنٹ کی بدگمانیوں کو رفع کرنے کی بجائے اور بھی بڑھا دیں گے ٭

کنور۔ میں جائداد کی حفاظت کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میری خواہش صرف اتنی ہے کہ ونے کو کسی قسم کی مالی تکلیف نہ ہونے پا دے بس اپنے لئے میں اَور کچھ نہیں چاہتا ٭

جان سیوک۔ آپ ظاہرا تو کنور ونے سنگھ کے لئے کوئی انتظام نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے وثیقہ میں سے جو مناسب سمجھیں اُنہیں بھی دے دیا کریں ؛

کنور۔ اچھا مان لیجئے کہ ونے اِسی راستہ پر بڑھتے ہی گئے تو ؟

جان سیوک۔ تو اُنہیں ریاست پر کوئی اختیار نہ ہوگا ؛

کنور۔ لیکن اُن کی اولاد کو تو یہ اختیار رہے گا ؛

جان سیوک۔ ضرور ؛

کنور۔ گورنمنٹ صاف لفظوں میں اس شرط کو منظور کرلے گی ؟

جان سیوک۔ نہ منظور کرنے کا تو کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا ؛

کنور۔ ایسا تو نہ ہوگا کہ ونے کے اعمال کا نتیجہ اُن کی اولاد کو بھگتنا پڑے؟ سرکار ریاست کو ہمیشہ کے لئے ضبط کرلے ؟ دو ایک مقامات پر ایسا ہوا ہے۔ برار ہی کو لیجئے ؛

جان سیوک۔ کوئی خاص بات پیدا ہو جائے تو نہیں کہہ سکتا لیکن سرکار کا یہ وطیرہ کبھی نہیں رہا۔ برار کی بات جانے دیجئے۔ وہ اتنا بڑا صوبہ ہے کہ کسی ریاست میں اُس کا شامل ہو جانا مُلکی انتظامات میں مشکلات پیدا کرسکتا ہے ؛

کنور۔ تو میں کل ڈاکٹر گنگولی کو شملہ سے تار بھیج کر بُلائے لیتا ہوں ؛

جان سیوک۔ آپ چاہیں تو بُلا لیں۔ میری رائے تو یہیں سے مسودہ بنا کر اُن کے پاس بھیج دیا جاوے۔ یا کہئے تو میں خود چلا جاؤں اور ساری باتیں آپ کی مرضی کے موافق طے کرا آؤں ؛

کنور صاحب نے شکریہ ادا کیا اور گھر چلے آئے۔ تمام رات وہ

اِسی حیص بیص میں پڑے رہے کہ ونے اور جانھوی سے اِس تجویز کا تذکرہ کروں یا نہیں۔ اُن کا جواب اُنہیں معلوم تھا۔ اُن سے ناپسندیدگی اظہار کے سوا ہمدردی کی ذرا بھی اُمید نہیں۔ کہنے سے فائدہ کیا؟ ابھی تو ونے کو کچھ خوف بھی ہے۔ یہ حال سُنے گا تو اور بھی دلیر ہو جائے گا۔ آخرکار اُنہوں نے یہی طے کیا کہ ابھی راز فاش کر دینے سے کوئی نفع نہیں بلکہ خلل پڑ جائے گا۔ کام پورا ہو جائے پر کہنے سُننے کے لئے کافی وقت ملے گا۔

مسٹر جان سیوک پیروں تلے گھاس نہ اُگنے دینا چاہتے تھے۔ دوسرے ہی روز اُنھوں نے ایک بیرسٹر سے درخواست کا مسودہ تیار کرایا اور اُسے کنور صاحب کو بھی دکھلایا۔ اُسی روز وہ کاغذ ڈاکٹر گنگولی کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر گنگولی نے اِس تجویز کو بہت پسند کیا اور خود شملہ سے آئے۔ یہاں کنور صاحب سے مشورہ کیا اور دونوں اصحاب صوبہ کے گورنر کے پاس جا پہنچے۔ گورنر کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا خصوصاً ایسی حالت میں کہ ریاست پر ایک کوڑی کا بھی قرض نہ تھا۔ سرکاری عمّال نے ریاست کے حساب وغیرہ کی جانچ شروع کی اور ایک ماہ کے اندر ریاست پر سرکار کا قبضہ ہو گیا۔ کنور صاحب ندامت و پشیمانی کے سبب ان دنوں ونے سے بہت کم بولتے۔ گھر میں بہت کم جاتے۔ آنکھیں چُراتے رہتے تھے کہ کہیں یہ گفتگو نہ چھڑ جائے۔ جس روز تمام شرائط طے ہو گئیں۔ کنور صاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔ ونے سنگھ سے بولے۔ ریاست پر سرکاری قبضہ ہو گیا۔

ونے نے چونک کر دریافت کیا۔ کیا ضبط ہو گئی؟

کنور۔ نہیں۔ مَیں نے کورٹ آف وارڈس کے سپرد کر دیا۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے شرائط کا ذکر کیا اور انکسار کے ساتھ کہا۔ معاف کرنا۔ میں نے تم سے اِس بارہ میں صلاح نہیں کی ۔

ونے ۔ مجھے اِس کا ذرا بھی غم نہیں ہے ۔ لیکن آپ نے فضول ہی اپنے کو گورنمنٹ کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔ اب آپ کی حیثیت محض ایک وثیقہ دار کی ہے جس کا وثیقہ کسی وقت بھی بند کیا جا سکتا ہے ۔

کنور ۔ اُس کا الزام تمہارے سر ہے ۔

ونے ۔ آپ نے یہ تجویز کرنے کے بیشتر ہی مجھ سے پوچھا ہوتا تو یہ نوبت نہ آنے پاتی ۔ میں تمام عمر ریاست سے دست بردار رہنے کا اقرار نامہ تحریر کر دیتا اور آپ اُسے شائع کر کے حکّام کو خوش رکھ سکتے تھے ۔

کنور (سوچ کر) اُس حالت میں بھی یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ میں پوشیدہ طور پر تمہاری مدد کر رہا ہوں۔ اِس شبہ کو مٹانے کا میرے پاس اور کون ذریعہ تھا ؟

ونے ۔ تو میں اِس گھر سے نکل جاتا اور آپ سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیتا اب بھی اگر آپ اِس انتظام کو منسوخ کرا سکیں تو بہتر۔ میں اپنے خیال سے نہیں۔ آپ ہی کے خیال سے کہہ رہا ہوں ۔ میں اپنے گزر بسر کی کوئی صورت پیدا کر لوں گا ۔

کنور صاحب آبدیدہ ہو کر بولے۔ "ونے ۔ مجھ سے ایسی سخت باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری ملامت کا نہیں۔ تمہاری ہمدردی اور رحم کا مستحق ہوں میں جانتا ہوں کہ صرف سوشل خدمات سے ہماری نجات نہیں ہو سکتی ۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم آزادی سے اُن خدمات کو بھی انجام نہیں دے سکتے کوئی

تحریک جس سے ملک میں اپنی حالت کے احساس کی قابلیت پیدا ہو۔ جو اخوت اور قومیت کے جذبات کو بیدار کرے۔ اشتباہ سے بچ نہیں سکتی یہ سب جانتے ہوئے میں نے اس خدمتی دائرہ میں قدم رکھا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا۔ کہ یہ تحریک جلد ہی موجودہ صورت اختیار کر لے گی اور اُس کا یہ انجام ہوگا ــــ میں نے سوچا تھا کہ میں ظاہر نہ ہوکر بھی اس کا انتظام کرتا رہوں گا۔ یہ نہ جانتا تھا کہ اُس کے لئے مجھے اپنا سب کچھ اپنا ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کا بھی سب کچھ سُواہا کر دینا پڑے گا میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں اس قدر ایثار کی ہمت نہیں ہے ؎

ونے نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اُنہیں اپنی یا صوفیا کی کوئی فکر نہ تھی۔ ہاں اُسے فکر تھی تحریک کو جاری رکھنے کی۔ اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟ اُنہیں کبھی دان مانگنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ عوام سے روپے کس طرح ملتے ہیں۔ کم از کم پانچ ہزار ماہوار کا صرفہ تھا۔ اتنا روپیہ فراہم کرنے کے لئے ایک علیحدہ جماعت کی ضرورت تھی۔ اب اُنہیں معلوم ہوا کہ دولت اتنی حقیر شے نہیں ہے۔ پانچ ہزار روپئے ہوا یا ساٹھ ہزار روپیہ سالانہ کے لئے بارہ لاکھ کے مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے۔ کچھ عقل کام نہ کر سکتی تھی۔ جانہوی کے پاس کچھ اُن کی بچ کی پونجی تھی جسے وہ دینا نہ چاہتی تھیں۔ اب تو اُسے محفوظ رکھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ وہ ونے کو مفلس نہیں بنانا چاہتی تھیں ؎

سہ پہر کا وقت تھا۔ ونے اور اندردت دونوں روپے کے لئے متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتاً صوفیا نے آکر کہا۔ میں ایک تدبیر بتلاؤں ؎

اندردت۔ چندہ مانگنے چلیں؟

صوفیا۔ کیوں نہ ایک ڈراما کھیلا جائے۔ ایکٹر موجود ہی ہیں۔ کچھ پردے تیار کرائے جائیں۔ مَیں بھی تیاری میں مدد دوں گی ٭

ونے۔ رائے تو صائب ہے۔ مگر ڈراما کی ہیروئن تمہیں کو بننا پڑے گا ٭

صوفیا۔ ہیروئن کا پارٹ آندورانی لیں گی اور میں ان کی سکھی کا ٭

اندردت۔ اچھا کون سا ناٹک کھیلا جائے؟ بھٹ جی کا دُرگا وتی ناٹک؟

ونے۔ مجھے تو پرساد کا "اجات شترُ" بہت پسند ہے ٭

صوفیا۔ مجھے کربلا بہت پسند آیا۔ اس میں رزم کا بھی شائبہ ہے اور سوگ کا بھی۔ دونوں کی نفیس آمیزش ہے ٭

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک چٹھی رساں اندر آیا اور ایک مُہر بند رجسٹرڈ لفافہ ونے کے ہاتھ میں دے کر چلا گیا۔ لفافہ لندن سے آیا تھا اور اُس پر پربھو سیوک کے نام کی مُہر تھی ٭

ونے۔ اچھا بتاؤ اس میں کیا ہوگا؟

صوفیا۔ روپے تو ہوں گے نہیں اور چاہے جو ہو۔ وہ غریب روپے کہاں پائے گا؟ وہاں ہوٹل کا خرچ ہی بمشکل ادا کرتا ہوگا ٭

ونے۔ اور مَیں کہتا ہوں کہ اِس میں روپیوں کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا ٭

اندردت۔ کبھی نہیں۔ کوئی نئی تصنیف ہوگی ٭

ونے۔ تو رجسٹری کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

اندردت۔ روپے ہوتے تو بیمہ نہ کرایا ہوتا ٭

ونے۔ میں کہتا ہوں روپے ہیں۔ چاہے شرط بدلو ٭

اندردت۔ میرے پاس کُل پانچ روپے ہیں۔ پانچ پانچ کی بازی ہے ٭

وسنے۔ یہ نہیں۔ اگر اِس میں روپے ہوں تو میں تمہاری گردن پر سوار ہوکر کمرہ کے اُس سرے تک جاؤں گا۔ نہ ہوئے تو تم میری گردن پر سوار ہونا۔ بولو۔

اندر دت۔ اچھّا منظور ہے۔ کھولو لفافہ۔

لفافہ کھولا گیا تو ایک چک نکلا۔ پورے دس ہزار کا۔ لندن بینک کے نام۔ وسنے خوشی سے اُچھل پڑے۔ بولے — میں کہتا نہ تھا۔ یہاں علمِ غیب پڑھے ہوئے ہیں۔ آئیے لائیے گردن۔

اندر دت۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ گردن توڑ کر رکھ دوگے کیا؟ ذرا خط تو پڑھو۔ کیا لکھا ہے؟ کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ لگے سواری گانٹھنے۔

وسنے۔ جی نہیں۔ یہ نہیں ہونے کا۔ آپ کو سواری دینی ہوگی۔ گردن ٹوٹے یا رہے۔ اِس کا میں ذمہ دار نہیں۔ کچھ دُبلے پتلے تو ہو نہیں۔ خاصے دیو بنے ہوئے ہو۔

اندر دت۔ بھئی۔ آج منگل کے دن نظر نہ لگاؤ۔ کل دو من ۳۵ سیر تُل گیا ہوں۔ راجپوتانہ جانے کے قبل تین من سے زیادہ تھا۔

وسنے۔ خیر دیر نہ کیجئے۔ آئیے گردن جھکا کر کھڑے ہو جائیے۔

اندر دت۔ سوفیا میری حفاظت کرو۔ تمہیں نے پہلا کہا تھا کہ اِس میں روپے نہ ہوں گے۔ وہی سُن کر میں نے بھی کہہ دیا تھا۔

صوفیا۔ میں تمہارے جھگڑوں میں نہیں پڑتی۔ تم جانو وہ جانیں۔ یہ کہہ کر اُس نے خط پڑھنا شروع کیا:-

پیارے بھائی۔ میں نہیں جانتا کہ یہ خط کس کو لکھ رہا ہوں۔ کچھ خبر نہیں کہ آج کل مینیجر کون ہے۔ مگر سیوا سمتی سے مجھے اب بھی وہی محبّت

ہے جو پہلے تھی۔ اُس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ میری خیریت کا حال جاننے کے لئے مشتاق ہوں گے۔ میں پونا ہی میں تھا کہ وہاں کے گورنر نے مجھے ملنے کے لئے بُلایا۔ اُن سے دیر تک علم ادب کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ وہ ایک ہی ماہرِ فن ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ کم نکلیں گے۔ دنے (اُس کا کچھ حال نہیں معلوم ہُوا) کے سوا مَیں نے اور کسی کو بھی اتنا سخن فہم نہیں پایا۔ کتنا جاندار اخلاق تھا۔ گورنر صاحب کے اصرار سے میں یہاں آیا اور جب سے آیا ہوں میری تواضع تکریم برابر ہو رہی ہے۔ واقعی زندہ اقوام ہی ماہرین فن کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ بڑے خلیق، فراخ دل اور ملنسار آدمی ہیں۔ مجھے اس قوم سے اب عقیدت ہوگئی ہے اور مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اس قوم کے ہاتھوں ہمارا نقصان کبھی نہیں ہوسکتا۔ کل یونیورسٹی کی جانب سے مجھے ایک سپاس نامہ دیا گیا تھا۔ خادمان ادب کا ایسا ہجوم مَیں نے کاہیکو کبھی دیکھا تھا۔ عورتوں کا اخلاق اور احترام آمیز سلوک دیکھ کر میں دنگ ہوگیا۔ دو دن پہلے اِنڈیا ہوس نے دعوت دی تھی۔ آج ادبی انجمن نے مدعو کیا ہے۔ کل لبرل ایسوسی ایشن دعوت دے گا۔ پرسوں پارسی سماج کا نمبر ہے۔ اُسی روز یونین کلب کی جانب سے پارٹی دی جاوے گی۔ مجھے خواب میں بھی اُمید نہ تھی کہ میں اتنی جلد بڑا آدمی ہو جاؤں گا۔ میں شہرت اور عزت کی بُرائی کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ اِس کے سوا اہلِ کمال کو اور کیا صلہ مل سکتا ہے؟ مجھے اب معلوم ہوا کہ میں کیا کرنے کے لئے دُنیا میں آیا ہوں۔ میری زندگی کا مقصد کیا ہے اب تک وہم میں پڑا ہوا تھا۔ اب میری زندگی کا مشن ہوگا۔ مغرب و مشرق میں رشتۂ اتحاد قائم کرنا اور اُسے پائدار بنانا باہمی اختلافات کو مٹانا اور

دونوں میں یکسانیت کے جذبات کو پیدا کرنا۔ میں اسی بات کا عہد کروں گا
کسی زمانہ میں مشرق نے مغرب کو مذہب و ایمان کا راستہ دکھلا دیا تھا۔ اب
وہ اُسے اتحاد کا نغمہ سُنائے گا۔ اتحاد کا رستہ دکھلائے گا۔ میرے کلام کے
پہلے حصّہ کو میکملن کمپنی جلد ہی شائع کرے گی۔ خود گورنر صاحب اُس کا
دیباچہ لکھیں گے۔ اِس مجموعۂ کلام کے لئے کمپنی نے مجھے چالیس ہزار
روپے دئے ہیں۔ تمنّا تو یہی تھی کہ یہ ساری رقم اپنی پیاری ستی کے
نذر کرتا مگر ارادہ ہے کہ امریکہ کی سیر بھی کر دوں۔ اِس لئے اِس وقت
جو کچھ بھیجتا ہوں اُسے قبول کیجئے۔ مَیں نے محض اپنا فرض ادا کیا ہے۔
اس لئے شکریہ کی امید نہیں رکھتا۔ البتہ اتنا عرض کر دینا ضروری
خیال کرتا ہوں کہ آپ کو خدمت کے معیارانہ اصولوں پر عمل کرنا چاہئے۔
اور سیاسی معاملات سے الگ ہو کر انسانی اخوت کی اشاعت کو اپنا
معیار بنانا چاہئے۔ میری تقریروں کی رپورٹ آپ کو یہاں کے اخبارات
میں ملے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ میرے سیاسی خیالات میں کتنا فرق
آگیا ہے۔ میں اب ایک مُلک کا نہیں بلکہ سب ملکوں کا ہوں۔ اب
ساری دُنیا میرا مُلک ہے۔ کُل انسان میرے بھائی ہیں اور جغرافیائی
نیز قومی حدود کو مٹا دینا میری زندگی کا خاص مقصد ہے۔ خدا سے دعا
کیجئے کہ امریکہ سے بخیریت واپس آئیں ؏

آپ کا سچا بھائی، پربھو سیوک

صوفیا نے خط میز پر رکھ دیا۔ متانت سے بولی ـــــ اس کے
دونوں ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ روحانی کمال یا زوال۔ مَیں تو زوال ہی
سمجھتی ہوں ؏

ونے۔ کیوں کمال کیوں نہیں ؟
صوفیا۔ اِس لئے کہ پربھوسیلوک آرایش و زیبایش کا دلدادہ ہے۔ وہ ایک بات پر کبھی قائم نہیں رہتا۔ جو شخص اپنی عزّت ہونے پر اتنا پُرامید ہوسکتا ہے وہ اپنی ذلّت سے اُتنا ہی نااُمید بھی ہو جائے گا۔
ونے۔ یہ کوئی بات نہیں۔ شاید اِسی طرح میں بھی مسرور ہو جاتا۔ یہ تو بالکل قدرتی بات ہے۔ یہاں اُن کی کیا قدر ہوئی ؟ مرتے دَم تک گمنام بنے رہتے۔
اندر دت۔ جب ہمارے کام کے نہیں رہے تو مشہور ہُوا کریں۔ ایسے دنیا سے محبّت کرنے والوں کے ہاتھوں نہ کسی کی بھلائی ہوئی ہے اور نہ ہوگی جس میں اپنا پن نہیں اُس میں پرایا پن کیا ہوگا ؟
صوفیا۔ یہی محبّت ہمارے کئی شعراء کو لے ڈوبی اور وہ اِنہیں بھی لے ڈوبے گی۔ اِنکا عدم وجود ہمارے لئے یکساں ہے۔ بلکہ مجھے تو اب اِن سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ میں ابھی جاکر اِس خط کا جواب لکھتی ہوں۔
یہ کہتے ہوئے صوفیا اُس خط کو ہاتھ میں لئے اپنے کمرہ میں چلی گئی۔
ونے نے کہا۔ کیا کردں ؟ روپیے واپس کردوں ؟
اندر دت۔ روپے کیوں واپس کروگے۔ اُنہوں نے کوئی شرط تو نہیں لکھی ہے محض دوستانہ صلاح دی ہے اور بہت عمدہ صلاح دی ہے۔ ہمارا بھی تو وہی مقصد ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مساوات کے بغیر ہی اخویت کی اشاعت کرنی چاہتے ہیں اور ہم اخویت کے لئے مساوات کا ہونا لازمی خیال کرتے ہیں۔
ونے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اخویت کا مساوات ہی پر دار و مدار ہے۔

اندر دت۔ شریمتی صوفیا اُن کی خوب خبر لیں گی ۔
ونے ۔ اچھا۔ ابھی روپے رکھے لیتا ہوں۔ پھر دیکھا جائے گا ۔
اندر دت۔ دو چار ایسے ہی دوست اور مل جائیں تو ہمارا کام چل نکلے ۔
ونے۔ صوفیا کے ڈراما کھیلنے والی صلاح کیسی ہے ؟
اندر دت۔ کیا پوچھنا۔ اُن کا پارٹ دیکھ کر لوگ دنگ رہ جائیں گے ۔
ونے۔ تم میری جگہ ہوتے تو اُسے اسٹیج پر لانا پسند کرتے ؟
اندر دت۔ پیشہ سمجھ کر تو نہیں لیکن رفاہ عام کے لئے اسٹیج پر لانے میں شاید مجھے اعتراض نہ ہوتا ۔
ونے۔ تو تم مجھ سے کہیں زیادہ فراخ دل ہو۔ میں تو یہ بات کسی حالت میں بھی پسند نہ کروں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہیں صوفیا آج کل کچھ اُداس سی معلوم ہوتی ہے ؟ کل اُس نے مجھ سے جو باتیں کہیں وہ بہت مایوس کُن تھیں۔ اُس کو اندیشہ ہے کہ اُسی کے سبب ریاست کا یہ حشر ہوا ہے۔ ماتا جی تو اُس پر جان دیتی ہیں مگر وہ اُن سے دور بھاگتی ہے۔ پھر وہی روحانی باتیں کرتی ہے۔ جس کا مطلب آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ "میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بننا چاہتی۔ میرے لئے صرف تمہاری محبت کی نظر کافی ہے"۔ اور خدا جانے کیا کیا بک جاتی ہے۔ اِدھر میرا یہ حال ہے کہ گھنٹہ بھر بھی اُسے نہ دیکھوں تو دل بیقرار ہو جاتا ہے ۔
اتنے ہی میں موٹر کی آواز سُنائی دی اور ایک لمحہ بعد اندو وہاں آ پہنچی ۔
اندر دت۔ آیئے۔ اندو رانی آیئے۔ آپ ہی کا انتظار تھا ۔
اندو۔ جھوٹے ہو۔ میری اس وقت ذرا بھی چرچا نہ تھی۔ روپے گنے تردد

میں مبتلا ہو ۔

اندر دت۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ لائی ہیں۔ لائیے۔ واقعی ہم لوگ بہت متردّد ہیں ۔

اندو۔ مجھ سے مانگتے ہو؟ میرا حال جان کر بھی! ایک بار چندہ دے کر ہمیشہ کے لئے سیکھ گئی۔ (ونے سے) صوفیا کہاں ہے؟ ماتا جی تو اب راضی ہیں نا؟

ونے۔ کسی کے دل کی بات کوئی کیا جانے؟

اندو۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ماتا جی بھی راضی ہو جائیں تو بھی تم صوفیا کو نہ پا سکو گے۔ تمہیں ان باتوں سے رنج تو ضرور ہو گا مگر کسی صدمہ کے لئے پیشتر سے تیار رہنا اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ اُسے ناگہانی طریقہ پر برداشت کرنا پڑے ۔

ونے نے آنسو پی کر کہا ——— مجھے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ۔

اندو۔ صوفیا کل مجھ سے ملنے گئی تھی۔ اُس کی باتوں نے اُسے بھی رولایا اور مجھے بھی۔ وہ بڑی کشمکش میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ تمہیں مایوس کرنا چاہتی ہے اور نہ ماتا جی کو ناخوش کرنا چاہتی ہے۔ نہ جانے کیوں اُسے اب بھی شک ہے کہ ماتا جی اُسے اپنی بہو نہیں بنانا چاہتیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ صرف اُس کا خیال ہے۔ وہ خود اپنے دلی راز کو نہیں سمجھتی۔ وہ عورت نہیں ہے ایک خیالی وجود ہے۔ جذبات اور حسّیات سے معمور۔ تم اُس سے لطف اندوز ہو سکتے ہو مگر اُسے عملاً محسوس نہیں کر سکتے۔ اُسے مجسم نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر اپنے عمیق ترین جذبات کو ادا نہیں کر سکتا۔ زبان میں اتنی سکت ہی نہیں ہے۔ صوفیا بھی وہی عمیق ترین جذبہ ہے ۔

اندر دت۔ اور آپ کی یہ ساری باتیں بھی شاعرانہ ہیں۔ صوفیا نہ شاعرانہ خیال ہے نہ کوئی مخفی راز۔ وہ نہ دیوی ہے نہ دیوتا۔ نہ حُور ہے نہ پری جیسی اور عورتیں ہوتی ہیں ویسی ہی ایک عورت وہ بھی ہے۔ وہی اُس کے جذبات ہیں اور وہی اُس کے خیالات۔ آپ لوگوں نے کبھی شادی کی کوئی تیاری کی۔ کوئی بھی ایسی بات کی جس سے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ یہ شادی کر دینا چاہتے ہیں ؟ تو جب آپ لوگ خود ہی بے غرض بنے ہوئے ہیں تو اُسے کیا غرض ہے کہ خوا مخواہ شادی کا تذکرہ کرتی پھرے میں تو اکھڑ آدمی ہوں۔ اُسے دنے سے لاکھ محبت ہو مگر وہ اپنے مُنہ سے تو شادی کی بات نہ کہے گی۔ آپ لوگ وہی چاہتے ہیں جو کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُس نے بھی حیا داری کی راہ سے یہ تدبیر نکالی ہے۔ آپ لوگ تیاریاں کیجئے۔ پھر اُس کی طرف سے اعتراض ہو تو البتہ اُس سے شکایت ہو سکتی ہے جب دیکھتی ہے کہ آپ لوگ خود ہی پس و پیش کر رہے ہیں تو وہ بھی اُن دلیلوں سے اپنی عزّت قائم رکھنا چاہتی ہے ؛

اندو۔ ایسا کہیں بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ وہ اس مکان میں بھی نہ رہے گی

اتنے میں صوفیا اُس خط کو لئے ہوئے آتی نظر پڑی جو اُس نے پر بھو سیلوک کو لکھا تھا۔ اندو نے بات پلٹ دی اور کہا۔ تم لوگوں کو تو ابھی خبر نہ ہوگی اور مسٹر سیوک کو پانڈے پور مل گیا ؛

صوفیا نے اندو سے گلے ملتے ہوئے پُوچھا — پاپا اُس گاؤں کو لے کر کیا کریں گے ؟

اندو۔ ابھی تمہیں معلوم ہی نہیں ؟ وہ محلّہ کھدوا کر پھینک دیا جائے گا۔

اور وہاں مل کے مزدوروں کے لئے مکانات بنائے جائیں گے ؛

اندر دت۔ راجہ صاحب نے منظور کر لیا؟ اتنی جلد بھول گئے۔ ایسے شہر میں رہنا مشکل ہو جائے گا ؛

اندو۔ سرکار کا حکم تھا کیسے نہ منظور کرتے؟

اندر دت۔ صاحب نے بڑی دوڑ لگائی۔ سرکار پر بھی منتر چلا دیا ؛

اندو۔ کیوں اتنی بڑی ریاست پر سرکار کا قبضہ نہیں کرا دیا؟ ایک باغی راجہ کو معزول نہیں بنا دیا؟ ایک انقلابی تحریک کی بیخکنی نہیں کر دی؟ سرکار پر اتنے احسانات کر کے اُسے یونہی جانے دیتے۔ کاروباری شخص نہ ہوتے کوئی راجہ نواب ہوتے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے۔ کہ کمپنی نے پچیس فی صدی نفع دے کر بورڈ کثیر التعداد ممبروں کو اپنی مٹھی میں کر لیا ؛

ونے۔ تو راجہ صاحب کو استعفا دے دینا چاہئے تھا۔ اتنی بڑی ذمہ داری سر پر لینے سے تو یہی بہتر ہوتا ؛

اندو۔ کچھ سوچ سمجھ کر تو منظور کیا ہو گا۔ سُنا کہ پانڈے پور کے لوگ اپنے مکانات چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے ؛

اندر دت۔ نہ ہونا چاہئے ؛

صوفیا۔ ذرا چل کر دیکھنا چاہئے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن کہیں مجھے پاپا نظر آ گئے تو؟ نہیں میں نہ جاؤں گی۔ تمہیں لوگ جاؤ ؛

تینوں آدمی پانڈے پور کو روانہ ہوئے ؛

(۴۲)

عدالت نے اگر دونوں لڑکوں کو سخت سزا دی تو عوام نے بھی سُورداس

کو اُس سے کم سخت سزا نہیں دی۔ اُس پر ہر طرف سے تھڑی تھڑی ہونے لگی۔ محلّہ والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ آس پاس کے گاؤں والے بھی دو چار کھری کھوٹی سُنا جاتے تھے۔ مانگتا تو ہے بھیک پر اپنے کو کتنا لگاتا ہے۔ ذرا چار بھلے مانسوں نے مُنہ لگا لیا تو گھمنڈ کے مارے دھرتی پر پاؤں ہی نہیں دھرتا۔ سورداس کو شرم کے مارے گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ اُس کا ایک اچھّا نتیجہ یہ ہوا کہ بجرنگی اور جگدھر کا غصّہ فرو ہو گیا۔ بجرنگی نے سوچا کہ اب کیا ماروں پیٹوں اُس کے مُنہ میں تو یوں ہی کالکھ لگ گئی۔ جگدھر کی تنہا اتنی ہمّت کہاں۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ سبھاگی بھیرو کے گھر جانے پر رضا مند ہو گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ بلا کسی آڑ کے میں اِن جھونکوں سے بچ نہیں سکتی۔ سورداس کی آڑ صرف ٹٹی کی آڑ تھی ۔

ایک روز سورداس بیٹھا ہوا دُنیا کی ہٹ دھرمی اور بے انصافی کا دُکھڑا رو رہا تھا کہ سُبھاگی بولی ــــ بھیّا تمہارے اوپر میرے کارن چاروں طرف سے بوچھار پڑ رہی ہے۔ بجرنگی اور جگدھر دونوں مارنے پر اُتارو ہیں۔ نہ ہو تو مجھے بھی اب میرے گھر پہنچا دو۔ یہی نہ ہوگا۔ مار پیٹے گا۔ کیا کروں گی۔ سہ لوں گی۔ اِس بے آبروئی سے تو بچوں گی۔

بھیرو تو پہلے ہی سے منہ پھیلائے ہوئے تھا۔ بہت خوش ہوا۔ آ کر سُبھاگی کو بڑے آدر سے لے گیا۔ سُبھاگی جا کر بُڑھیا کے پیروں پر گر پڑی اور خوب روئی۔ بڑھیا نے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بیچاری اب آنکھوں سے بھی معذور ہو گئی تھی۔ بھیرو جب کہیں چلا جاتا تو دکان پہ کوئی بیٹھنے والا نہ رہتا۔ لوگ اندھیرے میں لکڑیاں اُٹھا لے جاتے تھے۔

کھانا تو خیر کسی طرح پکا لیتی تھی مگر اس لوٹ گھسوٹ کا نقصان نہ سہا جاتا تھا۔ سبھاگی گھر کی دیکھ بھال تو کرے گی۔ رہا بھیرو سو اُس کے دل میں اب دغا فریب کا نام بھی نہ تھا۔ اُسے سورداس سے اتنی عقیدت ہو گئی تھی کہ شاید کسی دیوتا سے بھی نہ ہو گی۔ اب وہ اپنی پچھلی باتوں پر پچھتاتا اور کھلے دل سے سورداس کی سراہنا کرتا تھا۔

اتنے دنوں تک سورداس کو گھر بار کی فکر سے نجات تھی۔ پکی پکائی روٹیاں مل جاتی تھیں۔ برتن دُھل جاتے تھے۔ گھر میں جھاڑو لگ جاتی تھی۔ اب پھر وہی پُرانی مصیبت سر پر سوار ہوئی۔ مٹھوا اب اسٹیشن ہی پر رہتا تھا۔ گھیسو اور ودیا دھر کی سزا سے اُس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اُس نے کان پکڑے کہ اب کبھی جُوا اور چرس کے قریب نہ جاؤں گا۔ بازار سے چڑ بن لے کر چباتا اور اسٹیشن کے برآمدے میں پڑا رہتا تھا۔ کون روز تین چار میل چلے؟ ذرا بھی فکر نہ تھی کہ سورداس کی کیسی کٹتی ہے۔ اب میرے ہاتھ پیر ہو گئے کچھ میرا فرض بھی اُس کے متعلق ہے یا نہیں۔ آخر کس دن کے لئے اُس نے مجھے اپنے لڑکے کی طرح پالا پوسا تھا؟ سورداس کئی مرتبہ خود اسٹیشن پر گیا اور اُس سے کہا کہ شام کو گھر چلا آیا کر۔ کیا اب بھی بھیک مانگوں؟ مگر اُس کی بلا سُنے۔ ایک مرتبہ اُس نے صاف کہہ دیا کہ یہاں میرا گذر تو ہوتا ہی نہیں۔ تمہارے لئے کہاں سے لاؤں؟ میرے لئے تم نے کون سی بڑی تپسیا کی تھی؟ ایک ٹکڑا روٹی دے دیتے تھے۔ کُتّے کو نہ دیا مجھی کو دیا۔ تم سے میں کہنے گیا تھا کہ مجھے کھلاؤ پلاؤ؟ چھوڑ کیوں نہ دیا؟ کیا جن لڑکوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ سب مر ہی جاتے ہیں؟ جیسے تم ایک ٹکڑا دے دیتے تھے

ویسے بہت ٹکڑے مل جاتے۔ اِن باتوں سے سُورداس اس قدر دل شکستہ ہوگیا کہ پھر اُس سے گھر آنے کو نہ کہا ؛

اِدھر صوفیا کئی بار سُورداس سے مل چکی تھی۔ وہ اور تو کہیں نہ جاتی مگر وقت نکال کر سُورداس سے ملنے ضرور جاتی۔ ایسے موقع سے پہنچتی کہ سیوک صاحب سے دوچار ہونے کی نوبت نہ آنے پائے۔ وہ جب آتی تو سُورداس کے لئے کوئی نہ کوئی سوغات ضرور لاتی۔ اُس نے اندروت سے اس کا سارا حال سُنا تھا۔ اُس کا عدالت میں عوام سے اپیل کرنا چندہ کے روپے خود نہ لے کر دوسرے کو دے دینا۔ زمین کا معاوضہ جو سرکار سے ملا تھا اُسے خیرات کر دینا ــــــ اُس وقت سے اُس کو سورداس سے اور بھی زیادہ عقیدت ہوگئی تھی۔ جہلاء کا مذہبی شوق اینٹ پتھر کی پرستش سے پورا ہو جاتا ہے اور شرفاء کا اولیائے کرام کی خدمت سے۔ اُنہیں ہر مجذوب اگلے جنم کا کوئی رشی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اُس کی گالیاں سُنتے ہیں۔ اُس کے جھوٹے برتن دھوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے گرد آلود پیروں کو دھو کر پی جاتے ہیں۔ اُنہیں اُس کے قالب میں کوئی مقدس ترین روح بیٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صوفیا کو سُورداس سے کچھ ایسی ہی عقیدت ہوگئی تھی۔ ایکبار وہ اُس کے لئے سنترے اور سیب لے گئی۔ سُورداس گھر لایا۔ مگر اُس نے خود نہ کھایا۔ مٹھوا کی یاد آئی۔ وہ اُس کی بدکلامی کو بھول گیا۔ سویرے پھلوں کو لے کر اسٹیشن گیا اور اُسے دے آیا۔ ایکبار صوفیا کے ساتھ اندو بھی آئی تھی۔ سردی کے دن تھے۔ سورداس کھڑا کانپ رہا تھا۔ اندو نے وہ کمبل جسے وہ اپنے پیروں پر ڈالے ہوئے تھی سُورداس کو دے دیا۔ سُورداس کو وہ کمبل ایسا اچھا معلوم ہوا کہ اُسے خود نہ اوڑھ

سکا۔ مَیں بوڑھا بھکاری۔ یہ کمبل اوڑھ کر کہاں جاؤں گا؟ کون بھیک دے گا؟ رات کو زمین پر پڑوں۔ دن بھر سڑک کے کنارے کھڑا رہوں۔ مجھے یہ کمبل لے کر کیا کرنا ہے۔ جا کر مٹھوا کو دے آیا۔ اِدھر تو اب بھی اتنی محبت تھی اُدھر مٹھوا اتنا خود غرض تھا کہ کھانے کو بھی نہ پوچھتا۔ سُورداس سمجھتا کہ لڑکا ہے۔ یہی اس کے کھانے پہننے کے دن ہیں۔ میری خبر نہیں لیتا نہ سہی۔ خود تو آرام سے کھاتا پہنتا ہے۔ اپنا ہے تو کب نہ کام آئیگا

پھاگن کا مہینہ تھا اور شام کا وقت۔ ایک عورت گھاس بیچ کر جا رہی تھی۔ مزدوروں نے ابھی ابھی کام سے فراغت پائی تھی۔ دن بھر چپ چاپ چرخیوں کے سامنے کھڑے کھڑے اُکتا گئے تھے۔ تفریح کے بیقرار تھے۔ گھسیاری کو دیکھتے ہی اُس پر گندی کبیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ سورداس کو یہ بات بُری لگی۔ بولا — یارو کیوں اپنی جبان کھراب کرتے ہو؟ وہ بچاری تو اپنی راہ چلی جاتی ہے۔ اور تم لوگ اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ بھی تو کسی کی بہو بیٹی ہوگی ؞

ایک مزدور نے کہا۔ بھیک مانگو بھیک۔ جو تمہارے کرم میں بدا ہے۔ ہم گاتے ہیں تو تمہاری نانی کیوں مرتی ہے؟

سُورداس۔ گانے کو تھوڑے ہی کوئی منع کرتا ہے ؞

مزدور۔ تو ہم کیا لاٹھی چلاتے ہیں؟

سُورداس۔ اُس عورت کو چھیڑتے کیوں ہو؟

مزدور۔ تو تمہیں کیوں بُرا لگتا ہے؟ تمہاری بہن ہے کہ بیٹی؟

سُورداس۔ بیٹی بھی ہے۔ بہن بھی ہے۔ ہماری ہوئی تو کسی دوسرے بھائی کی ہوئی تو ؞

اُس کے مُنہ سے جملہ کا آخری لفظ نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک مزدور نے چپکے سے جا کر اُس کی ایک ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ بیچارہ بے خبر کھڑا تھا۔ اتنی زور سے مُنہ کے بل گرا کر آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ مُنہ میں بڑی چوٹ آئی۔ ہونٹ کٹ گئے۔ غشی سی آ گئی۔ پندرہ بیس منٹ تک وہیں بیہوش پڑا رہا۔ کوئی مزدور پاس بھی نہ آیا۔ سب اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ اتفاقاً نایک رام اُسی وقت شہر سے آ رہے تھے۔ سورداس کو سڑک پر پڑا دیکھا تو چکرا گئے کہ ماجرا کیا ہے۔ کسی نے مارا پیٹا تو نہیں؟ بجرنگی کے سوا اور کس میں اتنا دم ہے۔ بُرا کیا۔ کتنا ہی ہو اپنے ایمان کا سچا ہے۔ اُنہیں رحم آ گیا۔ قریب جا کر ہلایا تو سورداس کو ہوش آیا۔ اُس نے اُٹھ کر نایک رام کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے لاٹھی ٹیکتا ہُوا چلا ؞

نایک رام نے پوچھا۔ کسی نے مارا ہے کیا۔ سُور؟ مُنہ سے لہو بہہ رہا ہے ؞

سُورداس۔ نہیں بھیّا۔ ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا ؞

نایک رام۔ چھپاؤ مت۔ اگر بجرنگی یا جگدھر نے مارا ہو تو بتا دو۔ دونوں کو سال سال بھر کے لئے بھجوا نہ دوں تو براہمن نہیں ؞

سُورداس۔ نہیں بھیّا۔ کسی نے نہیں مارا۔ جھوٹ کیسے لگا دوں؟

نایک رام۔ مِل والوں میں سے تو کسی نے نہیں مارا؟ یہ سب بہت راہ چلتے آدمیوں کو چھیڑا کرتے ہیں۔ کہتا ہوں۔ لٹوا دوں گا۔ ان جھونپڑوں میں آگ نہ لگا دوں تو کہنا۔ بتاؤ کس نے یہ کام کیا۔ تم تو آج تک کبھی ٹھوکر کھا کر نہیں گرے۔ ساری دیہہ لہو میں لت پت ہو گئی ہے ؞

سورداس نے کسی کا نام نہ بتلایا۔ جانتا تھا کہ نایک رام غصّہ میں آجائے گا تو مرنے مارنے کو نہ ڈرے گا۔ گھر پہنچا تو سارا محلّہ دوڑ پڑا۔ ہائے ہائے کس مُدّعی نے بیچارے اندھے کو مارا۔ دیکھو تو مُنہ کتنا سوج گیا ہے۔ لوگوں نے سورداس کو بستر پر لٹا دیا۔ بھیرو دوڑا۔ بجرنگی نے آگ جلائی۔ افیون اور تیل کی مالش ہونے لگی۔ سبھی کے دل اُس کی طرف سے نرم پڑ گئے۔ تنہا جگدھر خوش تھا۔ جمنی سے بولا۔ بھگوان نے ہمارا بدلا لیا ہے۔ ہم صبر کر گئے۔ پر بھگوان تو نیائے کرنے والے ہیں ٭

جمنی چڑھ کر بولی۔ چُپ بھی رہو۔ آئے ہو بڑے نیائی کی پونچھ بن کے۔ بپت میں بیری پر بھی نہ ہنسنا چاہئے۔ وہ ہمارا بیری نہیں ہے۔ سچی بات کے پیچھے جان دے دے گا۔ چاہے کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ آج ہم میں سے کوئی بیمار پڑ جائے تو دیکھو کہ رات کی رات بیٹھا رہتا ہے کہ نہیں۔ ایسے آدمی سے کیا بیر ٭

جگدھر شرمندہ ہو گیا ٭

پندرہ روز تک سورداس گھر سے نکلنے کے قابل نہ ہوا۔ کئی دن تک مُنہ سے خون آتا رہا۔ سُبھاگی دن بھر اُس کے پاس بیٹھی رہتی اور بھیرو رات کو اس کے پاس سوتا۔ جمنی بڑے سویرے گرم دودھ لے کر آتی اور اسے اپنے ہاتھوں سے پلا جاتی۔ بجرنگی بازار سے دوائیں لاتا ہاں اگر کوئی اُسے دیکھنے نہ آیا تو وہ مٹھوا تھا۔ اُس کے پاس تین مرتبہ آدمی گیا مگر اُس کی اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ تیمارداری کے لئے نہیں تو کم از کم اُس کی خیر و عافیت کا حال ہی دریافت کرنے کے لئے آتا۔ ڈرتا تھا کہ جاؤں گا تو لوگوں کے کہنے سُننے سے کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑے گا

اسے اب روپے کا چسکا لگ گیا تھا۔ سور داس کے منہ سے بھی اتنا نکل ہی گیا۔ دنیا اپنے مطلب کی ہے۔ باپ ننھا سا چھوڑ کر مر گیا۔ تو اپنے لڑکے کی طرح پرورش کی۔ آپ لنگوری کی طرح بن گیا۔ اُس کی نیند سوتا تھا۔ اُس کی نیند جاگتا تھا۔ آج چار پیسے کمانے لگا تو بات بھی نہیں پوچھتا۔ پھر۔ ہمارے بھی بھگوان ہیں۔ جہاں رہے سکھی رہے۔ اُس کی نیت اُس کے ساتھ۔ میری نیت میرے ساتھ۔ اُسے میری کلک نہ ہو۔ مجھے تو اُس کی کلک ہے۔ میں کیسے بھول جاؤں؟ میں نے لڑکے کی طرح اُسے پالا ہے۔

اِدھر تو سور داس بستر علالت پر پڑا ہوا تھا اُدھر پانڈے پور کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ ایک روز علے الصباح راجہ مہیندر کمار مسٹر جان سیوک۔ افسر تخمینہ۔ پولیس کے چند سپاہی اور ایک داروغہ پانڈے پور آ پہنچے۔ راجہ صاحب نے محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے کہا۔ سرکار کو ایک خاص سرکاری کام کے لئے اس محلہ کی ضرورت ہے۔ اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو معقول معاوضہ دے کر یہ زمین حاصل کر لی جائے۔ لاٹ صاحب کا حکم آ گیا ہے۔ افسر تخمینہ صاحب اسی کام کے لئے تعینات کئے گئے ہیں کل سے اُن کا اجلاس یہیں ہوا کرے گا۔ وہی سب مکانوں کی قیمت کا تخمینہ کریں گے اور اُسی کے مطابق تم لوگوں کو معاوضہ مل جائے گا۔ تمہیں جو کچھ عرض معروض کرنا ہو۔ انہیں سے کرنا۔ آج سے تین ماہ کے اندر تمہیں اپنے اپنے مکان خالی کر دینے پڑیں گے۔ معاوضہ بعد کو ملتا رہے گا۔ جو شخص اتنے دنوں کے اندر مکان نہ خالی کرے گا اُس کے معاوضہ کے روپے ضبط کر لئے جاویں گے اور وہ جبراً گھر سے نکال دیا جاوے گا۔ اگر کوئی عذر

ٹوک کرے گا تو پولیس اُس کا چالان کرے گی۔ اُسے سزا ہوگی۔ سرکار تم لوگوں کو بلا وجہ تکلیف نہیں دے رہی ہے۔ اُس کو اِس زمین کی سخت ضرورت ہے۔ میں صرف سرکاری حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔

گاؤں کے والوں کو پہلے ہی سے اُس کی کچھ خبر مل چکی تھی۔ لیکن اس خیال سے دل کو تسکین دے رہے تھے کہ کون جانے خبر ٹھیک ہے یا نہیں۔ جیوں جیوں دیر ہوتی تھی ان کی کاہل الوجود طبیعتیں بیفکر ہوتی جاتی تھیں۔ کسی کو اُمید تھی کہ حکام سے کہہ سُن کر اپنا گھر بچالوں گا۔ کوئی کچھ دے دلا کر اپنے بچاؤ کی فکر کر رہا تھا۔ کوئی ضد داری کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے تھا۔ کوئی یہ سوچ کر خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ پہلے سے کیوں اپنی جان ہلکان کریں۔ جب سر پر پڑے گی۔ دیکھی جائے گی۔ اس پر بھی آج جب لوگوں نے یکایک یہ حکم سُنا تو گویا اُن پر بجلی سی گر پڑی۔ سب کے سب دست بستہ راجہ صاحب کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ـــــ سرکار۔ یہاں رہتے ہماری پیڑھیاں بیت گئیں۔ اب سرکار ہم کو نکال دے گی تو کہاں جائیں گے؟ دو چار آدمی ہوں تو کہیں گھس پڑیں۔ محلہ کا محلہ اُجڑ کر کہاں جائے گا؟ سرکار جیسے ہمیں نکالتی ہے ویسے کہیں کوئی ٹھکانا بھی بتا دے۔

راجہ صاحب بولے۔ مجھے خود اِس بات کا سخت افسوس ہے اور میں نے تمہاری طرف سے سرکار کی خدمت میں عُذر بھی کیا تھا۔ مگر سرکار کہتی ہے کہ اِس زمین کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ مجھے تمہارے ساتھ سچی ہمدردی ہے مگر مجبور ہوں۔ کچھ کر نہیں سکتا۔ سرکار کا حکم ہے۔ ماننا ہی پڑے گا۔

اس کا جواب دینے کی کسی کو جرات نہ ہوتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو کوہنیوں سے دھکے دیتے تھے کہ آگے بڑھ کر پوچھو۔ معاوضہ کس حساب سے ملے گا مگر کسی کے قدم آگے نہ بڑھتے تھے۔ نایک رام یوں تو بہت ہی چلتے ہوئے آدمی تھے مگر اس موقع پر وہ بھی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ راجہ صاحب سے کچھ کہنا سننا فضول سمجھ کر افسر تخمینہ سے تخمینہ کی شرح میں کچھ بیشی کرا لینے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔ کچھ دے دلا کر اُن سے کام نکالنا زیادہ آسان معلوم ہوتا تھا۔ اس مصیبت میں سبھوں کو سورداس کی یاد آتی تھی وہ ہوتا تو ضرور ہی ہماری طرف سے کچھ کہتا سنتا اتنا گروہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ کئی آدمی دوڑے ہوئے سورداس کے پاس گئے۔ اور اُس سے یہ سارا حال کہا۔

سورداس نے کہا۔ اور سب لوگ تو موجود ہی ہیں۔ میں چل کر کیا کر لوں گا۔ نایک رام کیوں سامنے نہیں آتے؟ یوں تو بہت گرجتے ہیں۔ اب کیوں منہ نہیں کھلتا؟ محلہ ہی میں رعب دکھانے کو ہیں؟ ٹھا کر دین۔ سب کی دیکھ لی گئی۔ سب کے منہ میں دہی جما ہوا ہے۔ حاکموں سے بولنے کو ہمت چاہیئے۔ اکل چاہیئے۔

شیلو سیوک بنیا نے کہا ــــ میرے تو اُن کے سامنے کھڑے ہوتے پیر تھر تھر کانپتے ہیں۔ نہ جانے کوئی کیسے حاکموں سے باتیں کرتا ہے؟ مجھے تو جرا ڈانٹ دیں تو دم ہی نکل جائے۔

جھینگر تیلی بولا۔ حاکموں کا بڑا رعب ہوتا ہے۔ اُن کے سامنے تو اکل ہی خفت ہو جاتی ہے۔

سورداس۔ مجھ سے تو اُٹھا ہی نہیں جاتا۔ چلنا بھی چاہوں تو کیسے چلوں؟

سورداس یوں لاٹھی کے سہارے گھر سے باہر آنے جانے لگا تھا۔ پر اس وقت یکایک اُسے کچھ مان کرنے کی خواہش ہوئی۔ کہنے سے دھوبی گدھے پر نہیں چڑھتا۔

ٹھاکردین۔ یہ کون کٹھن کام ہے۔ ہم لوگ تمہیں اٹھائے چلیں گے۔

سورداس۔ بھائی سب لوگ کروگے اپنے اپنے من ہی کی۔ مجھے کیوں نکّو بناتے ہو؟ جو سب کی گت ہوگی وہی میری بھی ہوگی۔ بھگوان کی جو مرجی ہے وہ ہوگی۔

ٹھاکردین نے بہت منّت کی پر سورداس جانے کو راضی نہ ہوا۔ ٹھاکردین کو بھی غصّہ آگیا۔ بے لاگ بات کہتے تھے۔ بولے۔ اچھّی بات ہے۔ مت جاؤ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جہاں مُرگا نہ ہوگا وہاں سبیرا ہی نہ ہوگا؟ چار آدمی سراہنے لگے تو تو اب مجاج ہی نہیں ملتے۔ سچ کہا ہے۔ کوّا دھونے سے بگلا نہیں ہوتا۔

آٹھ بجتے بجتے حاکم لوگ رخصت ہوگئے۔ اب لوگ نایک رام کے گھر آکر پنچایت کرنے لگے کہ کیا کیا جائے۔

جمنی۔ تم لوگ یونہی بکواس کرتے رہوگے اور کسی کا کیا کچھ نہ ہوگا سورداس کے پاس جاکر کیوں نہیں صلاح کرتے؟ دیکھو کیا کہتا ہے؟

بجرنگی۔ تو جاتی کیوں نہیں؟ مجھی کو ایسی کیا گرج پڑی ہوئی ہے؟

جمنی۔ تو پھر چل کر اپنے گھر بیٹھو۔ بکواس سے کیا ہونا ہے؟

بھیرو۔ بجرنگی۔ یہ ہیکڑی دکھانے کا اوسر نہیں ہے۔ سورداس کے پاس سب لوگ مل کر چلو۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ جرور نکالے گا۔

ٹھاکردین۔ میں تو اب کبھی اُس کے دوار پہ نہ جاؤں گا۔ اتنا کہ سُن کر ہا

گیا پر نہ اُٹھانہ اُٹھا۔ اپنے کو کچھ لگانے لگا ہے ۔

جگدھر۔ سورداس کیا کوئی دیوتا ہے ؟ حاکم کا حکم پلٹ دے گا ؟

ٹھاکردین۔ میں تو گود میں اُٹھا لانے کو تیار تھا ۔

بجرنگی۔ سیکھی ہے سیکھی اور کوئی کیوں نہیں آئے۔ گیا کیوں نہیں حاکموں کے سامنے ؟ ایسا مرتھوڑے ہی رہا ہے ۔

جمنی۔ کیسے جاتا ؟ وہ تو حاکموں سے بُرا بنے۔ یہاں تم لوگ اپنے اپنے من کی کرنے لگو تو اُس کی بھد ہو ۔

بھیرو۔ ٹھیک تو کہتی ہو۔ مدعی سست تو گواہ کیسے چست ہوگا ؟ پہلے چل کر پوچھو۔ اُس کی صلاح کیا ہے ؟ اگر ماننے لائیک ہو تو مانو۔ نہ ماننے لائیک ہو تو نہ مانو۔ ہاں ایک بات جو طے ہو جائے اس پر ٹکنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ کہا تو کچھ اور۔ اور پیچھے سے نکل بھاگے۔ سردار تو بھرم میں پڑا رہے کہ آدمی پیچھے ہیں اور آدمی اپنے اپنے گھر کی راہ لیں ۔

بجرنگی۔ چلو پنڈا جی۔ پوچھ ہی دیکھیں ۔

نایک رام۔ وہ کہے گا کہ بڑے صاحب کے پاس چلو۔ وہاں سُنائی نہ ہو تو پراگ راج۔ لاٹ صاحب کے پاس چلو۔ ہے اتنا بوتہ ؟

جگدھر۔ بھیّا کی بات مہاراج۔ یہاں تو کسی کا مُنہ نہیں کھُلا۔ لاٹ صاحب کے پاس کون جاتا ہے ؟

جمنی۔ ایکبار چلے کیوں نہیں جاتے ؟ دیکھو تو کیا صلاح دیتا ہے ۔

نایک رام۔ میں تیار ہوں۔ چلو ۔

ٹھاکردین۔ میں نہ جاؤں گا اور جسے جانا ہو وہ جائے ۔

جگدھر۔ تو کیا ہمیں کو بڑی گرج پڑی ہے ؟

بجرنگی۔ جو سب کی گت ہوگی وہی ہماری بھی ہوگی ؂

گھنٹہ بھر تک پنچایت ہوئی پر سورداس کے پاس تک کوئی نہ گیا۔ ساجھے کی سوئی ٹھیلے پر لدتی ہے۔ تو چل۔ میں آتا ہوں۔ بس یہی ہوتا رہا۔ لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ شام کے وقت بھیرو سورداس کے پاس گیا۔ سورداس نے پوچھا۔ آج کیا ہوا؟

بھیرو۔ ہوا کیا۔ گھنٹہ بھر تک بکواس ہوئی پھر سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے ؂

سورداس۔ کچھ طے نہ ہوا کہ کیا کیا جائے؟

بھیرو۔ نکالے جائیں گے۔ اس کے سوا اور کیا ہوگا۔ کیوں سورداس کوئی نہ سُنے گا؟

سورداس۔ سُننے والا بھی تو وہی ہے جو نکالنے والا ہے۔ تیسرا ہوتا تب نہ سُنتا ؂

بھیرو۔ میری مرن ہے۔ ہزاروں من لکڑی ہے۔ کہاں ڈھو کر لے جاؤں گا؟ کہاں اتنی دھرتی ملے گی کہ پھر ٹال لگاؤں؟

سورداس۔ سبھی کی مرن ہے۔ بجرنگی ہی کو اتنی دھرتی کہاں مل جاتی ہے کہ پندرہ بیس جانور رہیں اور آپ بھی رہے؟ ملے گی بھی تو اتنا کرا دینا پڑے گا کہ دیوالہ نکل جائے گا۔ دیکھو مٹھوا آج بھی نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ بیمار ہے تو چھن بھر بھی نہ رکوں۔ کتے کی طرح دوڑا چلا جاؤں، چاہے وہ میری بات بھی نہ پوچھے۔ جن کے لئے اپنی جندگانی کھراب کر دو وہ بھی گاڑھے سمے پر منہ پھیر لیتے ہیں ؂

بھیرو۔ اچھا تم تو بتاؤ کہ تم کیا کرو گے؟ تم نے بھی کچھ سوچا ہے؟

سُورداس۔ میری کیا پوچھتے ہو؟ جمین تھی وہ نکل گئی۔ جھونپڑی کے بہت ملیں گے تو دو چار روپے مل جائیں گے۔ ملے تو کیا اور نہ ملے تو کیا۔ جب تک کوئی نہ بولے گا پڑا رہوں گا۔ کوئی ہاتھ پکڑ کر نکال دیگا تو باہر جا بیٹھوں گا۔ وہاں سے اُٹھا دے گا پھر آ بیٹھوں گا۔ جہاں جنم لیا ہے وہیں مروں گا۔ اپنا جھونپڑا جیتے جی نہ چھوڑا جائے گا۔ مرنے پر جو چاہے سو لے۔ باپ دادوں کی جمین کھو دی۔ اب اتنی نسانی رہ گئی ہے۔ اسے نہ چھوڑوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی مر جاؤں گا۔

بھیرو۔ سُور اتنا دَم تو یہاں کسی میں نہیں ہے۔

سُورداس۔ اسی سے تو میں نے کسی سے کچھ کہا ہی نہیں۔ بھلا سوچو کتنا اندھیر ہے کہ ہم جو ستر پستوں سے یہاں آباد ہیں وہ تو نکال دئے جائیں اور دوسرے یہاں آ کر بس جائیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ کسی کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے۔ جبر جستی سے جو چاہے نکال دے۔ نیائے سے نہیں نکال سکتا۔ تمہارے ہاتھ میں بل ہے۔ تم ہمیں مار سکتے ہو۔ ہمارے ہاتھ میں بل ہوتا تو ہم بھی تمہیں مارتے۔ سرکار کے ہاتھ میں مارنے کا بل ہے۔ ہمارے ہاتھ میں اور کوئی بل نہیں ہے تو مر جانے کا تو بل ہے۔

بھیرو نے جا کر اور لوگوں سے یہ باتیں کہیں۔ جگدھر نے کہا۔ دیکھو یہ صلاح ہے۔ گھر تو جائے ہی گا۔ جان بھی جائے گی۔

ٹھاکردین بولے۔ یہ سور ہی کا کیا ہوگا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ مر ہی جائے گا تو کیا۔ یہاں مر جائیں تو بال بچوں کو کس کے سر چھوڑیں؟

بجرنگی۔ مرنے کے لئے کلیجا چاہئے۔ جب ہم ہی مر گئے تو گھر لے کر کیا ہوگا۔

نایک رام۔ ایسے بہت مرنے والے دیکھے ہیں۔ گھر میں سے تو نکلا نہیں گیا۔ مرنے چلے ہیں ؀

بھیرو۔ اُس کی نہ چلاؤ پنڈا جی۔ مَن میں آنے کی بات ہے ؀

دوسرے دِن افسر تخمینہ نے مِل کے ایک کمرہ میں اجلاس کرنا شروع کیا۔ ایک منشی محلہ کے لوگوں کے نام مکانات کی حیثیت۔ پختہ ہیں یا خام۔ پُرانے ہیں یا نئے۔ لمبائی چوڑائی وغیرہ کی ایک فہرست تیار کرنے لگا۔ پٹواری اور منشی گھر گھر گھومنے لگے۔ اُن کا ایک ساتھ رہنا ضروری تھا۔ اس وقت سبھی لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ اسی تثلیث کے ہاتھوں میں تھا۔ نایک رام کی بَن آئی۔ دلالی کرنے لگے۔ لوگوں سے کہتے کہ نکلنا تو پڑے ہی گا۔ اگر کچھ غم کھانے سے معاوضہ بڑھ جائے تو ہرج ہی کیا۔ بیٹھے بٹھائے مٹھی گرم ہوتی تھی۔ تو کیوں چھوڑتے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ مکانوں کی حیثیت کا انحصار اُس چڑھاوے پر تھا جو اس تثلیث پر چڑھایا جاتا تھا۔ نایک رام ٹٹی کی آڑ سے شکار کھیلتے تھے۔ نام بھی کماتے تھے اور دولت بھی۔ بھیرو کا بڑا مکان اور سامنے کا بڑا میدان۔ دونوں سمٹ گئے۔ اُن کا رقبہ گھٹ گیا۔ تثلیث کی وہاں کچھ پوجا نہ ہوئی۔ جگدھر کا چھوٹا مکان بڑا ہو گیا۔ تثلیث نے اُس کی پوجا سے خوش ہو کر لمبائی ڈھیلی کر دیں۔ رقبہ بڑھ گیا۔ ٹھاکردین نے اِن دیوتاؤں کو خوش کرنے کی بہ نسبت شیوجی کو خوش کرنا زیادہ آسان سمجھا۔ وہاں ایک موٹا پانی کے سوا کوئی اور خرچ نہ تھا۔ دونوں وقت پانی دینے لگے۔ مگر اس وقت تثلیث کا دور دورہ تھا۔ شیوجی کی ایک نہ چلی۔ تثلیث نے اُن کے مختصر مگر پختہ مکان کو خام قرار دے دیا۔ بجرنگی دیوتاؤں کو خوش کرنا

کیا جانے۔ اُنہیں ناراض ہی کر چکا تھا۔ مگر جمنی نے اپنی دانشمندی سے
بگڑتا ہوا کام بنا لیا۔ منشی جی اُس کی ایک بچھیا پر ریجھ گئے۔ اُس پر
دانت لگا گئے۔ بجرنگی اپنے مویشیوں کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا
تنک گیا۔ نایک رام نے کہا بجرنگی پچھتاؤ گے۔ بجرنگی نے کہا کہ چاہے
ایک کوڑی بھی معاوضہ نہ ملے پر بچھیا نہ دوں گا۔ آخر جمنی نے جو سودا
کرنے میں بڑی ہوشیار تھی۔ اُسے تنہائی میں لے جا کر سمجھایا کہ اتنے
جانوروں کے رہنے کا کہیں ٹھکانا بھی ہے؟ کہاں لئے لئے پھرو گے؟
ایک بچھیا کے دینے سے سو روپے کا کام نکلتا ہے تو کیوں نہیں نکالتے؟
ایسی نہ جانے کتنی بچھیاں پیدا ہوں گی۔ دے کر سر سے بلا ٹالو۔ اُس
کے سمجھانے سے آخر بجرنگی بھی راضی ہو گیا ؞

پندرہ روز تک تثلیث کی حکومت رہی۔ افسر تخمینہ صاحب بارہ
بجے گھر سے تشریف لاتے۔ اپنے کمرہ میں دو چار سگار پھونکتے۔ اخبارات
ملاحظہ فرماتے اور ایک دو بجے تک مکان واپس جاتے۔ جب نقشہ
مرتب ہو گیا تو افسر صاحب اُس کی جانچ کرنے لگے۔ باشندگان دیہہ کو
پھر طلب کیا گیا۔ افسر نے سب کے تخمینے پڑھ پڑھ کر سنائے۔ ایک سرے
سے دھاندلی تھی۔ بھیرو نے کہا۔ حضور چل کر ہمارا گھر دیکھ لیں۔ وہ بڑا
ہے کہ جگدھر کا۔ اِن کو تو ملیں چار سو اور مجھے ملیں تین سو۔ اِس حساب
سے مجھے چھ سو ملنا چاہئے ؞

ٹھاکردین بگڑے دل تھا ہی۔ اُن سے صاف صاف کہہ دیا۔ صاحب
تخمینہ کسی حساب سے تھوڑے ہی بنایا گیا ہے۔ جس نے منہ میٹھا کر دیا
اُس کی چاندی ہو گئی۔ جو بھگوان کے بھروسے بیٹھا رہا اُس کی بدھیا بیٹھ

گئی۔ اب بھی آپ موکے پر چل کر جانچ نہیں کرتے کہ ٹھیک ٹھیک تخمینہ ہو جائے۔ گریبوں کے گلے ریت رہے ہیں ٭

افسر نے بگڑ کر کہا۔ تمہارے گاؤں کا مکھیا تو تمہاری طرف سے رکھ لیا گیا تھا۔ اُس کی صلاح سے تخمینہ کیا گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ٭

ٹھاکر دین۔ اپنے کہلانے والے ہی تو اور لوٹتے ہیں ٭

افسر۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ٭

سورداس کی جھونپڑی کا معاوضہ ایک روپیہ رکھا گیا تھا اور نایک رام کے گھر کے پورے تین ہزار! لوگوں نے کہا۔ یہ ہے گاؤں گھر والوں کا حال! یہ ہمارے سگے ہیں۔ بھائی کا گلا کاٹتے ہیں۔ اُس پر گھمنڈ یہ کہ ہمیں دَھن کا لالچ نہیں۔ آخر ہے تو جات کا پنڈا ہی نا۔ جاتریوں کو ٹھگنے والا۔ جبھی تو یہ حال ہے۔ جرا سا اکھتیار پاکے آنکھیں پھر گئیں۔ کہیں تھانیدار ہوتے تو کسی کو گھر میں ہی نہ رہنے دیتے۔ اسی سے کہا گیا ہے کہ پرمیشر گنجے کو ناکھون نہ دے ٭

مسٹر کلارک کے بعد مسٹر سیناپتی حاکم ضلع ہوئے تھے۔ سرکاری روپیہ خرچ کرتے کانپتے تھے۔ پیسے کی جگہ دھیلے سے کام نکالتے تھے۔ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں بدنام نہ ہو جاؤں۔ اُن میں وہ خود اعتباری نہ تھی جو انگریز افسروں میں ہوا کرتی ہے۔ انگریزوں پر جانبداری کا شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بے خوف اور آزاد ہوتے ہیں۔ مسٹر سیناپتی کو شک ہوا معاوضے بڑی نرمی سے لکھے گئے ہیں۔ اُنہوں نے اُن کا نصف ہی دینا کافی خیال کیا۔ اب یہ مسل صوبہ کی سرکار کے پاس منظوری کے لئے بھیج گئی۔ وہاں پھر اُس کی جانچ پڑتال ہونے لگی۔ اس طرح تین مہینے کی مدت

گزر گئی تو مسٹر جان سیوک۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور داروغہ ماہر علی اور مزدوروں کو ساتھ لے کر محلہ کو خالی کرانے کے لئے آ دھمکے۔ لوگوں نے کہا کہ ابھی تو ہم کو روپیہ ہی نہیں ملے۔ جان سیوک نے جواب دیا۔ ہمیں تمہارے روپیوں سے کوئی مطلب نہیں۔ روپے جس سے ملیں اُس سے لو ہمیں تو سرکار نے یکم مئی کو محلہ گرا پانے کی منظوری دے دی ہے اور اگر کوئی کہہ دے کہ آج مئی کی پہلی تاریخ نہیں ہے تو ہم لوٹ جائیں گے۔ اب لوگوں میں بڑی ہل چل مچی۔ سرکار کی کیا نیت ہے؟ کیا معاوضہ ملے بغیر ہی ہمیں نکال دیا جائے گا؟ گھر کا گھر جائے اور معاوضہ بھی نہ ملے۔ یہ تو بے موت مرے۔ روپے مل جاتے تو کہیں زمین لے کر مکان بنواتے۔ خالی ہاتھ کہاں جائیں؟ کیا گھر میں خزانہ رکھا ہوا ہے؟ آیا تو روپیہ کے چار آنے ملنے کا حکم ہوا اُس کا بھی یہ حال۔ نہ جانے سرکار کی نیت بدل گئی کہ درمیانی لوگ ہضم کئے جاتے ہیں؟

ماہر علی نے کہا۔ تم لوگوں کو جو کچھ کہنا سُننا ہو وہ حاکم ضلع سے جا کر کہو سُنو۔ مکان آج خالی کرا لئے جائیں گے۔

بجرنگی۔ مکان کیسے کھالی ہوں گے۔ کوئی راہجنی ہے؟ جس حاکم کا یہ حکم ہوا ہے اُسی حاکم کا تو وہ حکم بھی ہے۔

ماہر علی۔ کہتا ہوں۔ سیدھے سے اپنے بورئے بقچے لادو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ناحق ہمیں غصہ کیوں دلاتے ہو؟ کہیں مسٹر ہنٹر کو جوش آ گیا تو پھر تمہاری خیریت نہیں۔

نایک رام۔ داروغہ جی دو چار دن کی مہلت دے دیجئے۔ روپے تو ملیں گے ہی۔ یہ بیچارے کیا بُرا کہتے ہیں کہ بنا روپے سے کہاں بھٹکتے

پھریں ۔

مسٹر جان سیوک تو سپرنٹنڈنٹ کو ساتھ لے کر مل کی سیر کرنے چلے گئے تھے۔ وہاں چاء پانی کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں ماہر علی کی حکومت تھی۔ بولے۔ پنڈا جی ایسے چرکے دوسروں کو دینا۔ یہاں تمہیں بہت دنوں سے دیکھ رہے ہیں اور تمہاری رگ رگ پہچانتے ہیں۔ مکان آج اور آج خالی ہوں گے ۔

دفعتاً ایک طرف سے دو بچے کھیلتے ہوئے آ گئے۔ دونوں ننگے پاؤں تھے۔ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے مگر بشاش۔ ماہر علی کو دیکھتے ہی چچا چچا کہتے ہوئے اُن کی طرف دوڑے۔ یہ دونوں صابر اور نسیمہ تھے۔ کلثوم نے اسی محلہ میں ایک چھوٹا سا مکان ایک روپیہ ماہوار کرایہ پہلے لیا تھا۔ گودام کا مکان جان سیوک نے خالی کرا لیا تھا۔ بیچاری اسی چھوٹے سے گھر میں پڑی ہوئی اپنی مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی۔ ماہر نے دونوں بچوں کو دیکھا تو کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں کیا کرنے آئے؟ دل میں بہت شرمائے کہ اب لوگ کہتے ہوں گے کہ یہ اُن کے بھتیجے ہیں اور اتنے پھٹے حالوں۔ یہ اُن کی خبر بھی نہیں لیتے ۔

نایک رام نے دونوں بچوں کو دو دو پیسے دے کر کہا۔ جاؤ مٹھائی کھانا یہ تمہارے چچا نہیں ہیں ۔

نسیمہ۔ ہوں۔ چچا تو ہیں۔ کیا میں پہچانتی نہیں ؟

نایک رام۔ چچا ہوتے تو تجھے گود میں نہ اُٹھا لیتے۔ مٹھائیاں نہ منگا دیتے تو بھول رہی ہے ۔

ماہر علی نے بگڑ کر کہا۔ پنڈا جی۔ تمہیں ان فضول باتوں سے کیا مطلب؟

میرے بھتیجے ہوں یا نہ ہوں۔ تم سے واسطہ؟ تم کسی کی خانگی باتوں میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟ بھاگو صابر۔ نسیمہ بھاگ جا نہیں تو سپاہی پکڑ لے گا۔

دونوں لڑکوں نے مشکوک نگاہوں سے ماہر علی کو دیکھا اور بھاگ گئے۔ راستہ میں نسیمہ نے کہا — چچا ہی جیسے تو ہیں۔ کیوں صابر۔ چچا ہی ہیں نہ؟

صابر۔ نہیں تو اور کون ہیں؟

نسیمہ۔ تو پھر ہمیں بھگا کیوں دیا؟

صابر۔ جب ابا تھے تب ہم لوگوں کو پیار کرتے تھے۔ اب تو ابا نہیں ہیں نا۔ تب تو ابا ہی سب کو کھلاتے تھے۔

نسیمہ۔ اماں کو بھی تو اب ابا نہیں کھلاتے۔ وہ تو ہم لوگوں کو اب پہلے سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ پہلے کبھی پیسے نہ دیتی تھیں۔ اب تو پیسے بھی دیتی ہیں۔

صابر۔ وہ تو ہماری اماں ہیں نا۔

لڑکے تو چلے گئے۔ ادھر پدارتھ جی نے سپاہیوں کو حکم دیا پھینک دو اسباب اور مکان فوراً خالی کرا لو۔ یہ لوگ لات کے آدمی ہیں۔ بات سے نہ مانیں گے۔

دو کانسٹیبل حکم پاتے ہی بجرنگی کے گھر میں گھس گئے اور برتن نکال نکال کر پھینکنے لگے۔ بجرنگی باہر سرخ آنکھیں لئے کھڑا ہونٹ چبا رہا تھا۔ جمنی گھر میں ادھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی ہانڈیاں اٹھا کر باہر لاتی۔ کبھی پھینکے ہوئے برتنوں کو سمیٹتی۔ منہ ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہ

ہوتا تھا۔ مونڈی کاٹے کار کھانہ ہلانے چلے ہیں۔ دُنیا کو اجاڑ کر اپنا گھر بھر رہے ہیں۔ بھگوان بھی ایسے پاپیوں کا ناس نہیں کرتے۔ نہ جانے کہاں جا کر سو گئے ہیں۔ ہائے ہائے گھسوا کی جوڑی پٹک کر توڑ ڈالی ۔

بجرنگی نے ٹوٹی ہوئی جوڑی اُٹھا لی اور ایک سپاہی کے پاس لے جا کر کہا۔ جمعدار۔ یہ جوڑی توڑ ڈالنے سے تمہیں کیا ملا؟ ثابت اُٹھا لے جاتے تو بھلا کسی کام تو آتی۔ غنیمت ہے کہ لال پگیا باندھے ہوئے ہو نہیں تو آج ......

اُس کے مُنہ سے پوری بات بھی نہ نکلی تھی کہ دو سپاہیوں نے اُس پر ڈنڈے چلانے شروع کئے۔ بجرنگی سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ لپک کر ایک سپاہی کی گردن ایک ہاتھ سے اور دوسرے سپاہی کی گردن دوسرے ہاتھ سے پکڑ لی اور اتنے زور سے دبائی کہ دونوں کی آنکھیں نکل آئیں۔ جمنی نے دیکھا کہ اب غضب ہوا چاہتا ہے تو روتی ہوئی بجرنگی کے پاس گئی۔ اور بولی۔ تمہیں بھگوان کی کسم ہے جو کسی سے لڑائی کرو چھوڑ دو چھوڑ دو۔ کیوں اپنی جان سے بیر کر رہے ہو؟

بجرنگی۔ تو جا بیٹھ۔ پھانسی پا جاؤں تو میکے چلی جانا۔ میں تو ان دونوں کی جان ہی لے کر چھوڑوں گا ۔

جمنی۔ تمہیں گھیسو کی کسم۔ تم میرا ہی مانس کھاؤ جو ان دونوں کو چھوڑ کر یہاں سے چلے نہ جاؤ ۔

بجرنگی نے دونوں سپاہیوں کو چھوڑ دیا مگر اُس کے ہاتھ سے چھوٹنا تھا کہ وہ دوڑے ہوئے ماہر علی کے پاس پہنچے اور کئی اور سپاہیوں کو لئے ہوئے پھر آئے۔ مگر بجرنگی کو جمنی پہلے ہی سے ٹال لے گئی تھی۔

سپاہیوں کو شیر نہ ملا تو شیر کی ماں کو پیٹنے لگے۔ گھر کی ساری چیزیں توڑ پھوڑ ڈالیں۔ جو اپنے کام کی چیز نظر آئی اُس پر ہاتھ بھی صاف کیا۔ یہی حال دوسرے گھروں کا بھی ہو رہا تھا۔ چاروں طرف لوٹ مچی ہوئی تھی۔ کسی نے اندر سے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ کوئی اپنے بال بچوں کو لے کر پچھواڑے سے نکل بھاگا۔ سپاہیوں کو مکان خالی کرانے کا حکم کیا ملا۔ لوٹ مچانے کا حکم مل گیا۔ کسی کو اپنے برتن وغیرہ سمیٹنے کی مہلت بھی نہ دیتے تھے۔ نایک رام کے گھر پر بھی دھاوا ہوا۔ ماہر علی خود پانچ سپاہیوں کو لے کر گھسے۔ دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گھر میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ ایک ٹوٹی ہانڈی بھی نہ ملی۔ سپاہیوں کے حوصلے دل ہی میں رہ گئے۔ سوچے ہوئے تھے کہ اِس مکان میں خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ ماریں گے مگر مایوس اور شرمندہ ہو کر نکلنا پڑا۔ بات یہ تھی کہ نایک رام نے پہلے ہی اپنے گھر کی چیزیں نکال کر باہر کر دی تھیں۔

اُدھر سپاہیوں نے مکانوں کے قفل توڑنے شروع کر دئے۔ کہیں کسی پر مار پڑتی تھی۔ کہیں کوئی اپنی چیزیں لئے بھاگا جاتا تھا۔ کہرام مچا ہوا تھا۔ عجیب منظر تھا۔ گویا دن دھاڑے ڈاکہ پڑ رہا ہو۔ سب لوگ گھروں سے نکل کر یا نکالے جا کر سڑک پر جمع ہوتے جاتے۔ ایسے موقعوں پر عموماً بدمعاشوں کا مجمع ہو ہی جاتا ہے۔ لوٹنے کی ترغیب تھی ہی۔ کسی کو باشندوں سے ہمدردی تھی اور کسی کو پولیس سے اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں بدامنی نہ پھیل جائے۔ کہیں کوئی ہنگامہ نہ برپا ہو جائے۔ ماہر علی نے عوام کے تیور دیکھے تو فوراً ایک کانسٹبل کو پولیس کی چھاؤنی کی طرف دوڑایا اور چار بجتے بجتے مسلح پولیس کی ایک جماعت آ دھ

وہاں آ پہنچی۔ کمک کے آتے ہی ماہر علی اور بھی دلیر ہو گئے۔ حکم دیا کہ مار مار کر سبوں کو بھگا دو۔ لوگ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ بھگا دو۔ جن کسی کو یہاں کھڑے دیکھو مار دو۔ اب تک لوگ اپنے مال اسباب سمیٹنے میں لگے ہوتے تھے۔ مار بھی پڑتی تھی تو چپکے سے سہ لیتے تھے۔ گھر میں تنہا کئی سپاہیوں سے کیسے بھڑتے؟ اب سب کے سب ایک مقام پر جمع ہو گئے۔ انہیں کچھ تو اپنی مجموعی طاقت کا احساس ہو رہا تھا اس پر نایک رام انہیں اکساتے جاتے تھے۔ یہاں آئیں تو مارے بغیر نہ چھوڑنا۔ جب تک دو چار کے ہاتھ پاؤں نہ ٹوٹیں گے یہ سب نہ مانیں گے۔ بارود بھڑکنے والی ہی تھی کہ اتنے میں وہاں اندو کا موٹر آ پہنچا اور اس میں سے ونے۔ اندو اور رانی اندو اتر پڑے۔ دیکھا تو کئی ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ کچھ محلے کے باشندے تھے اور کچھ راہ گیر لوگ۔ کچھ قریب گاؤں کے رہنے والے اور کچھ مل کے مزدور۔ کوئی صرف تماشا دیکھنے آیا تھا۔ کوئی ہمسایوں سے ہمدردی کا اظہار کرنے اور کوئی اس فساد سے حاسدانہ مسرت حاصل کرنے۔ ماہر علی اور ان کے کانسٹبلان اس جوش کے ساتھ جو کمینہ آدمیوں کے دلوں میں ظلم کرتے وقت پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو سڑک پر سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ہجوم پیچھے ہٹنے کے عوض اور آگے ہی بڑھتا آتا تھا۔

ونے نے ماہر علی کے پاس جا کر کہا۔ داروغہ جی۔ کیا ان آدمیوں کو ایک دن کی بھی مہلت نہیں مل سکتی؟

ماہر علی۔ مہلت تو تین مہینے کی تھی اگر تین سال کی بھی ہو جاتی تو بھی مکان خالی کرتے وقت یہی حالت ہوتی۔ یہ لوگ سیدھے سے کبھی نہ

جائیں گے ۔

ونے ۔ کیا آپ اتنی عنایت کر سکتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے سپاہیوں کو روک دیں ۔ جب تک کہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہاں کی حالت سے مطلع کردوں ؟

ماہر علی ۔ صاحب تو یہیں ہیں ۔ مسٹر جان سیوک انہیں مل دکھانے لے گئے تھے ۔ معلوم نہیں کہ وہاں سے کہاں چلے گئے ۔ اب تک نہیں لوٹے ۔

دراصل صاحب بہادر کہیں گئے نہ تھے ۔ جان سیوک کے ساتھ دفتر میں بیٹھے ہوئے مزہ سے شراب نوش کر رہے تھے ۔ دونوں ہی آدمیوں نے واقعی حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی کی تھی ۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم کو دیکھ کر ہی لوگ رعب میں آگئے ہوں گے ۔ خوف کے مارے خود بخود بھاگ جائیں گے ۔

صاحب کو خبر دینے کے لئے ونے سنگھ مل کی طرف تیز قدمی سے چلے تو راجہ صاحب کو موٹر پر آتے ہوئے دیکھا ۔ ٹھٹھک گئے ۔ سوچا کہ جب یہ آگئے ہیں تو صاحب کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے ؟ انہیں سے چل کر کہوں ۔ لیکن اُن کے سامنے جاتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کہیں عوام نے ان کی تحقیر کی تو میں کیا کروں گا ۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں نے ہی ان لوگوں کو ترغیب دی ہے ۔ وہ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ راجہ صاحب کی نگاہ اندوسے موٹر پر پڑی ۔ جل اُٹھے ۔ اندر دت اور ونے کو دیکھا ۔ بخار سا چڑھ آیا —— یہ لوگ یہاں رونق افروز ہیں ۔ پھر کیوں نہ فساد ہو ؟ جہاں یہ بھلے مانس ہوں گے

وہاں جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ یوں انہیں غصّہ بہت کم آتا تھا مگر اُس وقت ضبط نہ ہو سکا۔ دنے سے بولے ـــــ یہ سب آپ ہی کی کرامات معلوم ہوتی ہے ÷

دنے نے نرم لہجہ میں آکر کہا ـــــ میں تو ابھی آیا ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا ہی رہا تھا کہ آپ آتے ہوئے دکھائی دئیے ÷

راجہ۔ خیر۔ اب تو آپ اُن کے رہنما ہیں۔ انہیں اپنے کسی جادو منتر سے ہٹائیے گا کہ مجھے کوئی دوسری تدبیر کرنی پڑے گی؟

دنے۔ ان لوگوں کو صرف اتنی شکایت ہے کہ ابھی ہمیں معاوضہ نہیں ملا۔ ہم کہاں جائیں کیسے نئی زمین خریدیں۔ کیسے نئے مکان کا سامان لیں؟ اگر آپ تکلیف فرما کر ان لوگوں کو تسلّی دے دیں تو سب خود بخود ہٹ جائیں گے ÷

راجہ۔ یہ ان لوگوں کا بہانہ ہے۔ در اصل یہ لوگ فساد کرنا چاہتے ہیں ÷

دنے۔ اگر انہیں معاوضہ دے دیا جائے تو شاید دوسری تدبیر نہ کرنی پڑے ÷

راجہ۔ آپ چھ جیتنے والا راستہ بتلاتے ہیں اور میں ایک ماہ ڈالا چاہتا ہوں ÷

دنے۔ اُس راہ میں کانٹے ہیں ÷

راجہ۔ اُس کی کچھ پرواہ نہیں۔ ہمیں کانٹے ڈالی ہی راہ پسند ہے ÷

دنے۔ اِس وقت اِس مجمع کی حالت خشک پیال کی سی ہے ÷

راجہ۔ اگر پیال ہمارا راستہ روکتا ہے تو ہم اُسے جلا دیں گے ÷

سبھی لوگ خوفزدہ ہو رہے تھے کہ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے پھر

بھی انسانوں کا مجمع کسی غائبانہ طاقت سے متاثر ہوکر راجہ صاحب کی طرف بڑھتا ہوا چلا آتا تھا۔ پولیس کے لوگ بھی اِدھر اُدھر سے آکر موٹر کے پاس کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اُن کے چاروں طرف انسانوں کی ایک بھاری اور اتھاہ ندی لہریں مارنے لگی گویا ایک ہی رو میں اِن گنے گِنائے آدمیوں کو نگل جائے گی۔ اِس چھوٹے اور کمزور کنارہ کو بہالے جائے گی ۔

راجہ مہیندر کمار یہاں آگ کو مشتعل کرنے نہیں بلکہ فرو کرنے آئے تھے۔ اُن کے پاس لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرکے بہت متردد ہو رہے تھے۔ اخلاقی نقطۂ خیال سے تو اُن پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ جب صوبہ کی سرکار نے دباؤ ڈالا تو وہ کرہی کیا سکتے تھے؟ اگر مستعفی ہو جاتے تو دوسرا شخص آکر سرکاری حکم کی تعمیل کرتا۔ پانڈے پور والوں کے سر سے کسی حالت میں بھی یہ مصیبت نہ ٹل سکتی تھی۔ لیکن وہ شروع سے آخیر تک اس امر کی کوشش کر رہے تھے کہ مکانات کے تخلیہ کے پیشتر لوگوں کو معاوضہ دے دیا جائے۔ بار بار یاددہانی کرتے تھے۔ جیوں جیوں آخری تاریخ قریب آتی جاتی تھی اُن کے شکوک میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ تو یہاں تک چاہتے تھے کہ باشندوں کو کچھ روپے پیشگی دے دئے جائیں کہ وہ پہلے ہی سے اپنا ٹھکانا کرلیں۔ مگر کسی نامعلوم سبب سے روپیوں کی منظوری میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ مسٹر سیناپتی سے بار بار کہتے کہ آپ منظوری کی امید پر اپنے حکم سے روپے دِلا دیں مگر حاکم ضلع کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے کہ نہ جانے سرکار کا کیا ارادہ ہے۔ میں بلا اُس کے حکم کے کچھ نہیں کرسکتا۔ جب آج بھی منظوری نہ آئی تو راجہ صاحب نے

تار دے کر دریافت کیا اور دو پہر تک جواب کا انتظار کرتے رہے۔ آخر جب اِس مجمع کی اطلاع ملی تو گھبرا اُٹھے۔ اُسی وقت دوڑے ہوئے حاکم ضلع کے پاس گئے کہ اُن سے کچھ صلاح کریں۔ اُنہیں اُمید تھی کہ وہ خود ہی موقع واردات پر جانے کو تیار ہوں گے مگر وہاں جاکر دیکھا تو صاحب بہادر بیمار پڑے تھے۔ بیماری کیا تھی۔ بیماری کا بہانہ تھا۔ بدنامی سے بچنے کی یہی تدبیر تھی۔ راجہ صاحب سے بولے —— مجھے افسوس ہے کہ میں نہیں جاسکتا۔ آپ جاکر فساد کے دفعیہ کے لئے جو مناسب سمجھیں کریں ؛

مہیندر کمار اب بہت پریشان ہوئے۔ اُنہیں اپنی جان کسی طرح بچتی نہ نظر آتی تھی۔ اگر کہیں خونریزی کی نوبت آگئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ ساری مصیبت میرے ہی سر پر آئے گی۔ پہلے ہی سے لوگ بدنام کر رہے ہیں۔ آج میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہے۔ بیقصور مارا جارہا ہوں میری تقدیر کی کچھ ایسی گردش ہے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اُس کے برعکس ہی کرتا ہوں گویا میرا اپنے اوپر کچھ قابو ہی نہیں رہا۔ اِس زمین کے جھمیلے میں پڑنا ہی میرے لئے زہر ہوگیا۔ جبھی سے کچھ ایسے اتفاقات پیش آتے جاتے ہیں جو میری تمناؤں کو برباد کئے دیتے ہیں۔ نیک نامی۔ شہرت۔ نام عزت کو کون روئے۔ مُنہ دکھانے ہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں ؛

یہاں سے مایوس ہو کر وہ پھر گھر گئے کہ چل کر اندو سے رائے لوں۔ دیکھوں کہ کیا کہتی ہے۔ مگر یہاں اندو نہ تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کہیں گھومنے گئی ہیں ؛

اُس وقت راجہ صاحب کی حالت اُس خسیس آدمی کی سی تھی جو اپنی

آنکھوں سے اپنی دولت لٹتے ہوئے دیکھتا ہو۔ اور اِس خوف سے کہ لوگ
پر میرے دولت مند ہونے کا بھید کھل جائے گا۔ کچھ بول نہ سکتا ہو۔ دفعۃً
اُنہیں ایک بات سوجھی۔ کیوں نہ معاوضہ کے روپے اپنے ہی پاس سے
دوں؟ روپے کہیں جاتے تو ہیں نہیں۔ جب منظوری آجائے گی واپس
لوں گا۔ دو چار روز کا معاملہ ہے۔ میری بات رہ جائے گی، ور عوام کے دل
پر اِس کا کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ کُل ستّر ہزار ہی تو ہیں۔ اور اِس کی کیا ضرورت
ہے کہ کُل روپے آج ہی دے دیئے جائیں؟ کچھ آج دے دوں۔ کچھ کل دے
دوں۔ جب تک منظوری آ ہی جائے گی۔ جب لوگوں کو روپے ملنے لگیں گے
تو تسکین ہو جائے گی۔ یہ اندیشہ نہ رہے گا کہ کہیں سرکار روپیوں کو ضبط
نہ کر لے۔ افسوس کہ مجھے پہلے یہ بات نہ سوجھی ورنہ معاملہ اتنا طول ہی
کیوں کھینچتا۔ اُنہوں نے اُسی وقت امپیریل بینک کے نام بیس ہزار روپے
کا چیک لکھا۔ دیر بہت ہو گئی تھی اِس لئے بینک کے مینیجر کے نام ایک خط
بھی لکھ دیا کہ روپے دینے میں تاخیر نہ کیجئے گا ورنہ بدامنی واقع ہو جانے کا
اِمکان ہے۔ بینک سے آدمی روپے لے کر واپس آیا تو پانچ بج چکے تھے۔
راجہ صاحب فوراً موٹر پر سوار ہو کر پانڈے پور آپہنچے۔ آئے تو تھے ایسے
نیک ارادے سے مگر وہاں دنے اور اناد کو دیکھ کر طیش آگیا۔ جی میں آیا
لوگوں سے کہہ دوں کہ جن کے بوتے پر اُچھل رہے ہو اُنہیں سے روپے لو۔ اور
اِدھر سرکار کو لکھ دوں کہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ پس اُن کے روپے
ضبط کر لئے جائیں۔ اسی غصّہ کی حالت میں اُنہوں دنے دنے سے مذکورہ بالا
باتیں کہیں۔ مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ مجمع بڑھا ہوا چلا آرہا ہے۔ لوگوں
کے چہرے غصّہ سے بگڑے ہوئے ہیں۔ مسلح پولیس سنگین چڑھائے ہوئے

ہے اور اِدھر اُدھر سے دو چار پتھر بھی پھینکے جا رہے ہیں تو اُن کی وہی ...
ہوئی جو خوف میں نشہ کی ہوتی ہے۔ وہ فوراً اپنے موٹر پر کھڑے ہو گئے
اور مجمع کو مخاطب کر کے بلند لہجہ میں بولے ــــ دوستو۔ ذرا صبر کرو۔ ...
فساد کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میں روپے لایا ہوں۔ ابھی تم کو معاوضہ مل جائے
گا۔ سرکار نے ابھی منظوری نہیں بھیجی ہے مگر تمہاری خواہش ہو تو تم مجھ
سے اپنے روپے لے سکتے ہو۔ اتنی سی بات کے لئے تمہاری یہ ہٹ بالکل بیجا
اور نامناسب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اِس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم کسی
کے ورغلانے ہی سے شرارت پر کمر بستہ ہوئے ہو۔ لیکن میں تمہیں اُس لغاوت
کی آگ میں نہ کودنے دوں گا جو تمہارے خیرخواہوں نے جلا رکھی ہے۔
یہ لو۔ اپنے روپے۔ سب لوگ باری باری سے آ کر اپنے نام لکھاؤ۔ انگوٹھے
کا نشان بناؤ۔ روپے لو اور چپکے سے گھر چلے جاؤ۔
ایک آدمی نے کہا۔ گھر تو آپ نے چھین لیا۔

راجہ۔ روپیوں سے گھر ملنے میں دیر نہ لگے گی۔ ہم سے تمہاری جو کچھ مدد
ہو سکے گی اُسے اُٹھا نہ رکھیں گے۔ اِس مجمع کو فوراً منتشر ہو جانا چاہئے
ورنہ روپے ملنے میں دیر ہوگی۔

جو مجمع اُمڈے ہوئے بادلوں کی طرح گھنا اور خوف ناک ہو رہا تھا۔
وہ اِس اعلان کو سنتے ہی روئی کے گالوں کی طرح پھٹ گیا۔ نہ جانے
لوگ کہاں سما گئے۔ صرف وہی لوگ رہ گئے جنہیں روپے پانے تھے۔ بیتی
وانش مندی سر پر آئی ہوئی مصیبت کو کتنی آسانی سے رفع کر سکتی ہے۔
اس کا یہ بین ثبوت تھا۔ ایک نامناسب لفظ۔ ایک سخت فقرہ۔ حالت
کو نازک اور ناقابل اصلاح بنا دیتا۔

پٹواری نے ناموں کی فہرست پڑھنی شروع کی۔ راجہ صاحب اپنے ہاتھوں سے روپے تقسیم کرنے لگے۔ اسامی روپے لیتا تھا۔ انگوٹھے کا نشان بناتا تھا اور پھر دو سپاہی اُس کے ساتھ کر دیئے جاتے تھے کہ جاکر مکان خالی کرالیں ۔

روپے پاکر لوٹتے ہوئے لوگ اس طرح باتیں کرتے جاتے تھے:۔

ایک مسلمان ۔ یہ راجہ بڑا موذی ہے۔ سرکار نے روپے بھیج دئے تھے پر دبائے بیٹھا تھا۔ ہم لوگ گرم نہ پڑتے تو صاف ہضم کر جاتا ۔

دوسرا۔ سوچا ہوگا کہ مکان خالی کرالوں اور روپے سرکار کو واپس کر کے سُرخرو بن جاؤں ۔

ایک برہمن نے اُس کی مخالفت کی۔ کیا بکتے ہو بیچارے نے روپے اپنے پاس سے دئے ہیں ۔

تیسرا۔ تم گدھے ہو۔ یہ چالیں کیا جانو۔ جاکر پوتھی پڑھو اور پیسے ٹھگو ۔

چوتھا۔ سبوں نے پہلے ہی صلاح کر لی ہوگی۔ آپس میں روپے بانٹ لیتے اور ہم لوگ ٹھاٹے ہی پر رہ جاتے ۔

ایک منشی جی بولے۔ اتنا بھی نہ کریں تو سرکار کیسے خوش ہو؟ اُنہیں چاہئے تھا کہ رعایا کی طرف سے سرکار سے لڑتے مگر آپ خود ہی خوشامدی ٹٹو بنے ہوئے ہیں۔ سرکار کا دباؤ تو محض حیلہ ہے ۔

پانچواں۔ تو یہ سمجھ لو کہ اگر ہم لوگ نہ آجاتے تو بیچاروں کو کوڑی بھی نہ ملتی۔ گھر سے نکل جانے پر کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے؟ بیچارے مانگنے جاتے تو چپڑاسیوں سے مار کر نکلوا دیتے ۔

عوام کی نظروں میں ایک مرتبہ اعتبار کھو کر پھر اُس کا قائم کرنا مشکل ہے۔ راجہ صاحب کو عوام کے دربار سے یہ صلہ مل رہا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ چار پانچ ہی اسامیوں کو روپے ملنے پائے تھے کہ اندھیرا ہو گیا۔ راجہ صاحب نے لیمپ کی روشنی میں نو بجے رات تک روپے تقسیم کئے۔ اُس وقت نایک رام نے کہا۔ سرکار اب تو بہت دیر ہوئی نہ ہو کل پر اُٹھا رکھئے۔ راجہ صاحب بھی تھک گئے تھے۔ عوام کو بھی اب روپے ملنے میں کوئی رکاوٹ نہ نظر آتی تھی۔ بس کام دوسرے روز پر ملتوی کر دیا گیا۔ مگر مسلح پولیس نے وہیں ڈیرا جمایا کہ کہیں پھر نہ لوگ جمع ہو جائیں۔

دوسرے روز دس بجے پھر راجہ صاحب تشریف لائے۔ مسٹر کلارک اور اندر دت بھی کئی والنٹیروں کے ساتھ آپہنچے۔ فہرست کھولی گئی۔ سب سے پہلے سُورداس کی طلبی ہوئی۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا آکر راجہ صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

راجہ صاحب نے اُس کو سر سے پیر تک دیکھا اور کہا — تمہارے مکان کا معاوضہ صرف ایک روپیہ ہے۔ یہ لو اور مکان خالی کر دو۔

سُورداس۔ کیسا روپیہ؟

راجہ۔ ابھی تمہیں معلوم ہی نہیں۔ تمہارا مکان سرکار نے لے لیا ہے۔ یہ اُس کا معاوضہ ہے۔

سُورداس۔ مَیں نے تو اپنا مکان بیچنے کو کسی سے نہیں کہا۔

راجہ۔ اور لوگ بھی تو خالی کر رہے ہیں۔

سُورداس۔ جو لوگ چھوڑنے پر راضی ہوں اُنہیں دیجئے۔ میری جھونپڑی

رہنے دیجئے۔ پڑا رہوں گا اور سرکار کا کلیان مناتا رہوں گا۔
راجہ۔ یہ تمہاری مرضی کی بات نہیں ہے۔ سرکاری حکم ہے۔ سرکار کو اس زمین کی ضرورت ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اور مکانات تو گرا دئے جائیں اور تمہارا جھونپڑا بنا رہے؟
سُورداس۔ سرکار کے پاس جمین کی کیا کمی ہے۔ سارا مُلک پڑا ہُوا ہے ایک گریب آدمی کی جھونپڑی چھوڑ دینے سے اُس کا کام تھوڑے ہی رُک جائے گا۔
راجہ۔ فضول حجت کرتے ہو۔ یہ روپیہ لو۔ انگوٹھے کا نشان بناؤ اور جاکر جھونپڑی میں سے اپنا سامان نکال لو۔
سُورداس۔ سرکار جمین لے کر کیا کرے گی؟ یہاں کوئی مندر بنے گا؟ کوئی تالاب کُھدے گا؟ کوئی دھرمسالا بنے گی؟ بتلائیے!
راجہ۔ یہ میں کچھ نہیں جانتا۔
سُورداس۔ جانتے کیوں نہیں؟ دُنیا جانتی ہے۔ بچّہ بچّہ جانتا ہے۔ پتلی گھر کے مجوروں کے لئے گھر بنیں گے۔ بنیں گے تو اُس پر میرا کیا پھائدہ ہوگا کہ گھر چھوڑ کر نکل جاؤں؟ جو کچھ پھائدہ ہوگا وہ صاحب کو ہوگا۔ پرجا کی تو بربادی ہی ہے۔ ایسے کام کے لئے میں اپنا جھونپڑا نہ چھوڑوں گا۔ ہاں کوئی دھرم کا کام ہوتا تو سب سے پہلے میں اپنا جھونپڑا دے دیتا۔ اس طرح جبرجستی کرنے کا آپ کو اکھتیار ہے۔ سپاہیوں کو حکم دے دیں پھوس میں آگ لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ پر یہ نیائے نہیں ہے۔ پُرانے جمانے میں ایک راجہ اپنا بگیچہ بنوانے لگا تو ایک بُڑھیا کی جھونپڑی بیچ میں پڑ گئی۔ راجہ نے اُسے بُلا کر کہا کہ تو یہ جھونپڑی مجھے دے دے۔ جتنے

روپے کے تجھے دے دوں۔ جہاں کہہ تیرے لئے گھر بنوا دوں۔ بڑھیا نے کہا۔ میرا جھونپڑا رہنے دیجئے۔ جب دنیا دیکھے گی کہ آپ کے بگیچے کے ایک کونے میں بُڑھیا کی جھونپڑی ہے تو آپ کے دھرم اور نیائی کی بڑائی کرے گی۔ بگیچے کی دیوار دس پانچ ہاتھ ٹیڑھی ہو جائے گی پر اس سے آپ کا نام سَدا کے لئے اَمر ہو جائے گا۔ راجہ نے بڑھیا کی جھونپڑی چھوڑ دی۔ سرکار کا دھرم پرجا کو پالنا ہے کہ اُس کا گھر اُجاڑنا۔ اُس کو تباہ کرنا؟

راجہ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ مَیں تم سے دلیل کرنے نہیں آیا ہوں۔ سرکاری حکم کی تعمیل کرنے آیا ہوں ؛

سورداس۔ ہجور میری مجال ہے کہ آپ سے دلیل کر سکوں مگر مجھے اُجاڑئے مت۔ باپ دادوں کی نِسانی یہی جھونپڑی رہ گئی ہے۔ اسے بنی رہنے دیجئے ؛

راجہ صاحب کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ ایک ایک اسامی سے گھنٹوں بحث مباحثہ کرتے۔ اُنہوں نے دوسرے آدمی کو بُلانے کا حکم دیا؛

اندردت نے دیکھا کہ سُورداس ابھی اب وہیں کھڑا ہے ہٹنے کا نام نہیں لیتا تو ڈرے کہ راجہ صاحب کہیں اُسے سپاہیوں سے دھکّے دے کر ہٹوا نہ دیں۔ آہستہ سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ لے گئے اور بولے ــــ سُورداس ہے تو بے انصافی مگر کیا کرو گے؟ جھونپڑی تو چھوڑنی ہی پڑے گی۔ جو کچھ ملتا ہے لے لو۔ راجہ صاحب کی بدنامی کا خوف ہے ورنہ میں تم سے لینے کو نہ کہتا ؛

کئی آدمیوں نے اِن لوگوں کو گھیر لیا۔ ایسے مواقع پر لوگوں کا شوق

بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ کیا ہوا۔ کیا کہا۔ کیا جواب دیا؟ سبھی اِن باتوں کے جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ سُورداس نے اشک آلود آنکھوں سے دیکھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بھیّا تم بھی کہتے ہو کہ روپیہ لے لو۔ مجھے تو اس پتلی گھر نے پیس ڈالا۔ باپ دادوں کی نسانی دس بیگھے جمین تھی وہ پہلے ہی نکل گئی۔ اب یہ جھونپڑی بھی چھینی جا رہی ہے۔ سنسار اسی مایا موہ کا نام ہے۔ جب اِس سے چھوٹ جاؤں گا تو جھونپڑی میں رہنے نہ آؤں گا۔ لیکن جب تک جیتا ہوں اپنا گھر مجھ سے نہ چھوڑا جائے گا۔ اپنا گھر ہے نہیں دیتے۔ ہاں جبرجستی جو چاہے لے لے ؛

اندردت۔ زبردستی کوئی نہیں کر رہا ہے۔ قانون کے مطابق ہی یہ مکانات خالی کرائے جا رہے ہیں۔ سرکار کو اختیار ہے کہ وہ کسی سرکاری کام کے لئے جو مکان یا زمین چاہے لے لے ؛

سُورداس۔ ہوگا کانون۔ میں تو ایک دھرم کا کانون جانتا ہوں۔ اِس طرح جبرجستی کرنے کے لئے جو کانون چاہو بنا لو۔ یہاں کوئی سرکار کا ہاتھ پکڑنے والا تو ہے نہیں۔ اُس کے صلاح کار بھی تو سیٹھ مہاجن ہی ہیں ؛

اندردت نے راجہ صاحب کے پاس جا کر کہا۔ آپ اندھے کا معاملہ آج ملتوی کر دیں تو اچھا ہو۔ گنوار آدمی بات نہیں سمجھتا بس اپنی ہی گائے جاتا ہے ؛

راجہ نے سورداس کو غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ گنوار نہیں ہے۔ چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ وہ ہمیں اور تمہیں دونوں ہی کو قانون پڑھا سکتا ہے۔ ہے بھکاری ترّا ہے۔ میں اِس کا جھونپڑا اگر وائے دیتا ہوں۔"

اِس جُملہ کے آخری الفاظ سُورداس کے کانوں میں پڑ گئے۔ بولا۔

جھونپڑا کیوں گروا دیجئے گا۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ مجھی کو گولی مروا دیجئے ۔

یہ کہہ کر سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ راجہ صاحب کو اُس کی گستاخی پر غصہ آ گیا۔ ثروت خود کو بڑی مشکل سے بھولتی ہے خصوصاً جب دوسروں کے سامنے اُس کی تحقیر کی جائے۔ ماہر علی کو بلا کر کہا۔ اس کی جھونپڑی ابھی گرا دو ۔

دارنغہ ماہر علی چلے۔ مسلح اور غیر مسلح پولیس اور مزدوروں کی ایک جماعت اُن کے ساتھ چلی گویا کسی قلعہ پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ اُن کے پیچھے پیچھے عوام کا ایک مجمع بھی روانہ ہوا۔ راجہ نے ان آدمیوں کے تیور دیکھے تو ہوش اُڑ گئے۔ فساد کا احتمال تھا۔ جھونپڑے کا مسمار کرنا اتنا آسان نہ معلوم ہُوا جتنا کہ اُنھوں نے سمجھ رکھا تھا۔ پچھتائے کہ میں نے ناحق ماہر علی کو حکم دیا۔ جب محلہ میدان ہو جاتا تو جھونپڑا خود بخود اُجڑ جاتا۔ سورداس کوئی بھوت تو ہے نہیں کہ تنہا اُس میں پڑا رہتا۔ میں نے چیونٹی کو تلوار سے مارنے کی کوشش کی۔ ماہر علی غصہ ور آدمی ہے اور ان آدمیوں کے رُخ بھی بدلے ہوئے ہیں۔ عوام غصہ میں اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ موت پر ہنستے ہیں۔ کہیں ماہر علی جلد بازی کر بیٹھا تو ضرور فساد ہو جائے گا۔ اس کا سارا الزام میرے سر ہوگا۔ یہ اندھا خود تو ڈوبا ہی ہُوا ہے۔ مجھے بھی ڈبوئے دیتا ہے۔ بُری طرح میرے پیچھے پڑا ہُوا ہے مگر اس وقت وہ حاکم کی حیثیت میں تھے۔ حکم کو واپس نہ لے سکتے تھے سرکار کی آبرو میں بٹہ لگنے کی بہ نسبت کہیں زیادہ خوف اپنی آبرو میں بٹہ لگنے کا تھا۔ اب یہی تدبیر تھی کہ عوام کو جھونپڑے کی طرف نہ جانے

دیا جائے۔ سپرنٹنڈنٹ ابھی ابھی پل سے لوٹا تھا۔ اور گھوڑے پر چڑھا ہوا سگار پی رہا تھا کہ راجہ صاحب نے جا کر اُس سے کہا۔ ان لوگوں کو روکنا چاہیئے۔

اُس نے کہا "جانے دیجئے۔ کوئی ہرج نہیں۔ شکار ہو گا"۔

"بڑی خونریزی ہوگی"۔

"ہم اس کے لئے تیار ہیں"۔

ونے کے چہرہ کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ نہ آگے جاتے بنتا تھا نہ پیچھے۔ نہایت مغموم ہو کر بولے۔ اندو۔ مَیں بڑی مصیبت میں ہوں۔

اندردت نے کہا۔ اِس میں کیا شک ہے۔

"عوام کو قابو میں رکھنا مشکل ہے"۔

"آپ جایئے۔ میں دیکھ لوں گا۔ آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے"

"تم اکیلے ہی رہ جاؤ گے"۔

"کوئی اندیشہ ہی نہیں"۔

"تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ اب ہم یہاں رہ کر کیا کر لیں گے؟ ہم اپنا فرض ادا کر چکے"۔

"آپ جایئے۔ آپ کو جو مجبوری ہے وہ مجھے نہیں ہے۔ مجھے اپنے کسی عزیز کی عزت یا ذلت کا خوف نہیں"۔

ونے وہیں مضطرب اور ساکت کھڑے ہوئے تھے گویا کوئی عورت گھر سے نکال دی گئی ہو۔ اندردت اُنہیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھے تو مجمع اُسی گلی کے موڑ پر رُکا ہوا تھا۔ جو سورداس کے جھونپڑے کی طرف جاتی تھی۔ گلی کے دروازہ پر پانچ کانسٹبل سنگینیں چڑھائے کھڑے تھے۔ ایک قدم

آگے بڑھنا سنگین کی نوک کو چھاتی پر لینا تھا۔ سنگینوں کی دیوار سامنے کھڑی تھی ٭

اندردت نے ایک کنوئیں کی جگت پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ بھائیو۔ سوچ لو۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ کیا اِس جھونپڑی کے لئے پولیس سے لڑوگے؟ اپنا اور اپنے بھائیوں کا خون بہاؤگے؟ اس قیمت پر یہ جھونپڑی بہت مہنگی ہے۔ اگر اُسے بچانا چاہتے ہو تو اِن آدمیوں ہی سے منت کرو۔ جو اس وقت وردیاں پہنے بندوقیں چڑھائے۔ موت کے فرشتے بنے ہوئے تمہارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور اگرچہ ظاہرا وہ تمہارے دشمن ہیں مگر اُن میں ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس کا دل تمہارے ساتھ نہ ہو۔ جو ایک بیکس اور کمزور اندھے کی جھونپڑی گرانے میں اپنی دلاوری سمجھتا ہو۔ اِن میں سبھی بھلے آدمی ہیں۔ جن کے بال بچے ہیں۔ جو قلیل تنخواہ پر تمہارے جان و مال کی حفاظت کرنے کے لئے گھر سے آئے ہیں ٭

ایک آدمی۔ ہمارے جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں یا سرکار کے رعب و داب کی؟

اندردت۔ ایک ہی بات ہے۔ تمہارے جان و مال کی حفاظت کے لئے سرکار کے رعب داب کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے۔ اِنہیں جو تنخواہ ملتی ہے وہ ایک مزدور کی اُجرت سے بھی کم ہے......

ایک سوال۔ یکّہ بگھی والوں سے پیسے نہیں لیتے؟

دوسرا سوال۔ چوریاں نہیں کراتے؟ جُوا نہیں کھلاتے؟ گھوس نہیں کھاتے؟

اندردت۔ یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ تنخواہ جتنی ملنی چاہئے اُتنی نہیں

ملتی۔ یہ بھی ہماری اور تمہاری طرح انسان ہیں۔ اُن میں بھی رحم اور عقل ہے یہ بھی کمزوروں پر ہاتھ اُٹھانا کمینہ پن سمجھتے ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں۔ مجبور ہو کر۔ انہیں سے کہو کہ اندھے پر ترس کھائیں اور اُس کی جھونپڑی کو بچائیں (کانسٹبلوں سے) کیوں دوستو تم سے اس رحم کی اُمید رکھیں؟ اِن آدمیوں پر رحم کروگے؟

اندردت نے ایک طرف عوام کے دلوں میں سپاہیوں کے لئے ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف سپاہیوں کے دلی رحم کو متحرک کرنے کی۔ جولدار سنگینوں کے عقب میں کھڑا تھا۔ بولا۔ ہماری روزی بچا کر اور جو چاہے وہ کیجئے۔ اِدھر سے نہ جائیے۔

اندردت۔ تو روزی کے لئے اتنے لوگوں کی جانیں لے لوگے؟ یہ بیچارے بھی تو ایک بیکس کی مدد کرنے آئے ہیں۔ جو ایشور تمہیں یہاں رزق دیتا ہے وہ کیا کسی دوسری جگہ تمہیں بھوکوں مارے گا؟ ارے یہ کون پتھر پھینکتا ہے؟ یاد رکھو کہ تم لوگ انصاف کی حفاظت کرنے آئے ہو۔ بلوہ کرنے نہیں۔ ایسے بُزدلانہ حملوں سے اپنے کو قابلِ ملامت نہ بناؤ۔ مت ہاتھ اُٹھاؤ۔ اگر تمہارے اوپر گولیوں کی باڑھ بھی چلے.......

اندردت کو زیادہ کہنے کا موقع نہ ملا۔ سپرنٹنڈنٹ نے گلی کے موڑ پر آدمیوں کا ہجوم دیکھا تو گھوڑا دوڑاتا اِدھر چلا۔ اندردت کی آواز کانوں میں پڑی تو ڈانٹ کر بولا۔ ہٹا دو اس کو۔ ان سب آدمیوں کو ابھی سامنے سے ہٹا دو۔ تم سب آدمی ابھی ہٹ جاؤ۔ ورنہ ہم گولی مار دے گا۔

مجمع ذرا بھی نہ ہٹا۔

"ابھی ہٹ جاؤ نہیں تو ہم فائر کر دے گا۔"

کوئی آدمی اپنی جگہ سے نہ ہلا ؂

سپرنٹنڈنٹ نے تیسری دفعہ آدمیوں کو ہٹ جانے کا حکم دیا ؂

مجمع ساکت اور بےحس کھڑا تھا ؂

فائر کرنے کا حکم ہُوا۔ سپاہیوں نے بندوقیں ہاتھ میں لیں۔ اتنے میں راجہ صاحب بدحواس ہو کر دوڑتے ہوئے آئے اور بولے "مسٹر براؤن۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو"۔ لیکن حکم ہو چکا تھا۔ باڑھ سر کی گئی۔ بندوقوں کی نالوں سے دھواں نکلا۔ دھائیں دھائیں کی دل ہلا دینے والی آوازیں سُنائی دیں اور کئی آدمی چکر کھا کر گر پڑے۔ مجمع کی طرف سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ دو چار شاخیں گر پڑیں مگر درخت ہنوز کھڑا ہوا تھا ؂

پھر فائر کا حکم ہُوا۔ راجہ صاحب نے ابکے بہت منت کر کے کہا۔ "مسٹر براؤن۔ یہ گولیاں میرے دل کو چھیدے ڈالتی ہیں"۔ لیکن حکم ہو چکا تھا۔ دوسری باڑھ چلی۔ پھر کئی آدمی گر پڑے۔ شاخیں گریں لیکن درخت بدستور کھڑا تھا ؂

تیسری بار فائر کرنے کا حکم ہوا۔ راجہ صاحب نے آبدیدہ ہو کر بھری ہوئی آواز میں کہا "مسٹر براؤن۔ اب میں بالکل تباہ ہو گیا"۔ بندوقیں سر کی گئیں۔ کئی آدمی گرے اور اُن کے ساتھ اندردت بھی۔ گولی سینہ کے پار ہو گئی۔ درخت کا تنہ گر گیا ؂

مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی۔ لوگ گرتے پڑتے ایک دوسرے کو کچلتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوئی کسی درخت کی آڑ میں چھپا۔ کوئی کسی گھر میں گھس گیا۔ کوئی سڑک کے کنارے کی کھائیوں میں جا بیٹھا۔ مگر زیادہ تر لوگ وہاں سے ہٹ کر سڑک پر جا کر کھڑے ہو گئے ؂

نایک رام نے ونے سنگھ سے کہا ـــ بھیا کیا کھڑے ہو؟ اندرت کو گولی لگ گئی ۔

ونے ابھی تک بے پروائی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ خبر پاتے ہی گولی سی لگ گئی۔ بے تحاشا دوڑے اور سنگینوں کے سامنے گلی کے دروازہ پر آکر کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی بھاگنے والے سنبھل گئے۔ جو چھپے بیٹھے تھے نکل پڑے۔ جب ایسے ایسے لوگ مرنے کو تیار ہیں جن کے لئے دنیا میں آرام ہی آرام ہے تو ہم پھر کس گنتی میں ہیں۔ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ گرتی ہوئی دیوار پھر کھڑی ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ نے دانت پیس کر چوتھی بار فائر کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ کیا؟ کوئی سپاہی بندوق نہیں چلاتا۔ حولدار نے بندوق زمین پر پٹک دی۔ سپاہیوں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی اپنی بندوقیں رکھ دیں۔ حولدار بولا ـــ حضور کو اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ مگر اب ہم لوگ گولی نہیں چلا سکتے۔ ہم بھی انسان ہیں۔ قصائی نہیں ہیں ۔

براؤن۔ کورٹ مارشل ہو گا ۔

حولدار۔ ہو جائے ۔

براؤن۔ نمک حرام لوگ!

حولدار۔ اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے کے لئے نہیں ان کی حفاظت کے لئے نوکری کی تھی ۔

یہ کہہ کر سب کے سب پیچھے کی طرف پھر گئے اور سورداس کے جھونپڑے کی طرف چلے۔ ان کے ساتھ ہی کئی ہزار آدمی جے جے کے نعرے بلند کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ ونے ان کے آگے آگے تھے۔ راجہ صاحب

اور مسٹر براؤن حواس باختہ سے کھڑے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک
ایسی بات وقوع پذیر ہو رہی تھی جو پولیس کی تاریخ میں ایک نئے زمانہ کی
آمد کا پیش خیمہ تھی۔ جو روایات کے خلاف انسانی فطرت کے خلاف اور
طرز حکومت کے خلاف تھی۔ سرکار کے وہ پرانے خادم جن میں سے کتنوں
ہی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ رعایا کو دبلانے ہی میں بسر کیا تھا۔ یلوں
اکڑے ہوئے چلے جائیں۔ اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان دینے کو بھی تیار
تیار رہو جائیں! راجہ صاحب اب تک جو اباہی کے بوجھ سے کانپ رہے
تھے۔ اب یہ خوف ہوا کہ کہیں یہ لوگ مجھی پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ براؤن تو گھوڑے
پر سوار۔ آدمیوں کو ہنٹر مار مار کر بھگانے کی کوشش کر رہا تھا اور راجہ
صاحب اپنے لئے چھپنے کی کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے۔ لیکن کسی نے اُن
کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ سب کے سب فتح کے نعرے بلند کرتے ہوئے
سیلابی روش سے سورداس کی جھونپڑی کی طرف دوڑے چلے جاتے
تھے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو جھونپڑے کے چاروں طرف سینکڑوں آدمی کھڑے
تھے۔ ماہر علی اپنے آدمیوں کے ساتھ نیم کے درخت کے نیچے کھڑے
ہوئے نئی مسلح پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ
اس بھیڑ کو پار کر کے جھونپڑے کے پاس جائیں۔ سب کے آگے نایک رام
کندھے پر لٹھ رکھے کھڑے ہوئے تھے۔ اس مجمع کے وسط میں جھونپڑے
کے دروازہ پر سورداس سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا گویا صبر، روحانی طاقت
اور پرسکون جلال کی زندہ تصویر تھی +

دسنے کو دیکھتے ہی نایک رام آ کر بولا۔ بھیا تم اب کچھ پھکر مت
کرو۔ میں یہاں سنبھال لوں گا۔ اِدھر مہینوں سے سورداس سے میری

اَن بَن تھی۔ بول چال تک بند تھا پر آج اُس کا جیوٹ جگرا دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ ایک اندھے اپاہج میں اتنی ہمّت! ہم لوگ دیکھتے ہی کو مٹی کا یہ بوجھ لادے ہوئے ہیں ٭

ونے۔ اندروت کا مرنا غضب ہو گیا ٭

نایک رام۔ بھیّا دل نہ چھوٹا کرو۔ بھگوان کی یہی اِچھا تھی ٭

ونے۔ کتنی بہادرانہ موت پائی ہے!

نایک رام۔ مَیں تو کھڑا دیکھتا ہی تھا۔ ماتھے پر شکن تک نہیں آئی ٭

ونے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج یہ نوبت آئے گی۔ ورنہ پہلے خود ہی جاتا۔ وہ اکیلے سمتی کا کام سنبھال سکتے تھے۔ میں نہیں سنبھال سکتا۔ کتنے ہنس مکھ تھے۔ وِپتّوں کو تو دھیان ہی میں نہ لاتے تھے۔ آگ میں کودنے کو تیار رہتے تھے۔ خیریت یہی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا ٭

نایک رام۔ گھر والے کتنا زور دیتے رہے پر اُنھوں نے ایک بار نہیں کر کے پھر ہاں نہ کی ٭

ونے۔ ایک نوجوان عورت کی جان بچ گئی ٭

نایک رام۔ کہاں کی بات بھیّا۔ بیاہ ہو گیا ہوتا تو وہ اس طرح بیدھڑک ہو کر گولیوں کے سامنے جاتے ہی نا۔ بیچارے ماں باپ کا کیا حال ہو گا۔

ونے۔ رو رو کر مر جائیں گے اور کیا ٭

نایک رام۔ اتنا اچھا ہے کہ اور کئی بھائی ہیں اور گھر کے بوڑھے ہیں ٭

ونے۔ دیکھو ان سپاہیوں کی کیا گت ہوتی ہے۔ کل تک فوج آ جائے گی ان غریبوں کی بھی کچھ فکر کرنی چاہئے ٭

نایک رام۔ کیا فکر کرو گے بھیّا۔ ان کا کورٹ ماشل ہو گا۔ بھاگ کر کہاں

جائیں گے؟

ونے - یہی تو اُن سے کہنا ہے کہ بھاگیں نہیں - جو کچھ کیا ہے اس کا پھل بھوگنے سے نہ ڈریں - حولدار کو پھانسی ہو جائے گی ۔

یہ کہتے ہوئے دونوں آدمی جھونپڑی کے پاس گئے تو حولدار بولا۔ کنور صاحب میرا تو کورٹ ماسل ہوگا ہی - میرے بال بچّوں کی کھبر لیجئے گا۔ یہ کہتے کہتے وہ ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگے ۔

بہت لوگ جمع ہو گئے اور کہنے لگے ـــــ کنور صاحب چندہ کھول دیجئے - حولدار تم سچّے سُورما ہو جو کمزوروں پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے ۔

ونے - حولدار - ہم سے جو کچھ ہو سکے گا وہ اُٹھا نہ رکھیں گے - آج تم نے ہماری لاج رکھ لی ۔

حولدار - کنور صاحب - مرنے جینے کی چنتا نہیں ہے - مرنا تو ایک دن ہوگا ہی - اپنے بھائیوں کی سیوا کرتے ہوئے مارے جانے سے بڑھ کر اور کون موت ہوگی؟ دھنیہ ہے آپ کو جو اپنا سُکھ آنند چھوڑ کر ابھاگوں کی رچھا کر رہے ہو ۔

ونے - تمہارے ساتھ کے جو لوگ نوکری کرنا چاہیں اُنہیں ہمارے یہاں جگہ مل سکتی ہے ۔

حولدار - دیکھئے کون بچتا ہے اور کون مرتا ہے؟

راجہ صاحب نے موقع پایا تو موٹر پر بیٹھ کر ہوا ہو گئے - مسٹر براؤن فوجی کمک کے بارہ میں حاکم ضلع سے مشورہ کرنے چلے گئے - ماہر علی اور اُن کے سپاہی وہیں جمے رہے - اندھیرا ہو گیا تھا - لوگ بھی ایک ایک کر کے جانے لگے - دفعتاً سُورداس آ کر بولا ـــــ کنور جی کہاں ہیں؟ دھرماوتار ہاتھ بھر دھرتی کے لئے کیوں اتنا جھنجھٹ کرتے ہو؟ میرے کارن (سبب)

آج اتنے آدمیوں کی جان گئی۔ میں کیا جانتا تھا کہ رانی کا پربت ہو جائے گا نہیں تو اپنے ہاتھ سے اس جھونپڑی میں آگ لگا دیتا اور منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاتا۔ مجھے کیا کرنا تھا۔ جہاں مانگتا وہیں پڑا رہتا۔ بھیا۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ میری جھونپڑی کے پیچھے کتنے ہی گھر اُجڑ جائیں۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کرنا۔

ونے۔ تمہاری جھونپڑی نہیں۔ ہمارا قومی مندر ہے۔ ہم اس پر پھاوڑے چلتے دیکھ کر خاموش نہیں بیٹھے رہ سکتے۔

سُورداس۔ پہلے میری دیہہ پر پھاوڑا چل چکے گا تب گھر پر پھاوڑا چلے گا۔

ونے۔ اور اگر آگ لگا دیں؟

سُورداس۔ تب تو میری چتا بنی بنائی ہے۔ بھیا میں تم سے اور سب بھائیوں سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ اگر میرے کارن کسی ماں کی گود سونی ہوئی یا میری کوئی بہن بدھوا ہوئی تو میں اس جھونپڑی میں آگ لگا کر جل مروں گا۔

ونے نے نایک رام سے کہا۔ اب؟

نایک رام۔ بات کا دھنی ہے۔ جو کہے گا جرور کرے گا۔

ونے۔ تو پھر ابھی اسی طرح چلنے دو۔ دیکھو اُدھر سے کل کیا گُل کھلتا ہے۔ اُن کا ارادہ دیکھ کر ہم لوگ بھی سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ اب چلو۔ اپنے بہادروں کی مٹی ٹھکانے لگا دیں۔ یہ ہمارے قومی شہید ہیں۔ ان کا جنازہ دھوم سے نکلنا چاہئے۔

نو بجتے بجتے نو ارتھیاں نکلیں اور تین جنازے۔ آگے آگے اندردت کی ارتھی تھی۔ پیچھے پیچھے دوسروں کی۔ جنازے قبرستان کی طرف گئے۔

ارتھیوں کے پیچھے کوئی دس ہزار آدمی ننگے سر ننگے پیر سر جھکائے چلے جاتے تھے۔ ہر قدم پر مجمع بڑھتا جاتا تھا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑے چلے آتے تھے۔ لیکن کسی کے چہرہ پر سوگ یا غم کا نشان نہ تھا۔ نہ کسی کی آنکھ میں آنسو تھے۔ نہ کسی کے منہ سے فریاد و فغاں کی آواز نکلتی تھی۔ اس کے خلاف دلوں میں غرور تھا اور آنکھوں میں قومیت کی پُرجوش جھلک۔ اگر اس وقت راستہ میں توپیں لگا دی جاتی تو بھی لوگوں کے قدم پیچھے نہ پڑتے۔ نہ کہیں ماتم کی آواز تھی۔ نہ فتح کا نعرہ۔ عجیب خاموشی تھی۔ جذبہ جوش اور روانی سے معمور۔

راستہ میں راجہ مہیندر کمار کا محل ملا۔ راجہ صاحب چھت پر کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دروازہ پر مسلح سپاہیوں کا ایک گروہ سنگینیں چڑھائے کھڑا تھا۔ جیوں ہی ارتھیاں ان کے دروازہ کے سامنے سے نکلیں کہ ایک عورت اندر سے نکل کر ہجوم میں شامل ہو گئی۔ یہ رانی آنند تھی۔ اُس پر کسی کی نگاہ نہ پڑی۔ اُس کے ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کی ایک مالا تھی جسے اُس نے خود ہی گوندھا تھا۔ وہ اس ہار کو لئے ہوئے آگے بڑھی اور اندر دت کی ارتھی کے پاس جا کر آنسوؤں کے ساتھ اُسے ارتھی پر چڑھا دیا۔ دنے نے دیکھ لیا۔ بولے "آنند"۔ اندر دت نے اُن کی طرف اشک آلود آنکھوں سے دیکھا اور کچھ نہ بولی۔ کچھ بول نہ سکی۔

اے گنگا! ایسا شاندار منظر شاید ہی تمہاری آنکھوں نے کبھی دیکھا ہو گا۔ تم نے بڑے بڑے سورماؤں کو خاکستر کا ڈھیر ہوتے ہوتے دیکھا ہے جو شیروں کا منہ پھیر سکتے تھے۔ بڑے بڑے زبردست راجے مہاراجے تمہاری آنکھوں کے سامنے خاک میں مل گئے جن کے نعروں سے دُنیا تھراتی

تھی۔ بڑے بڑے جری لوگ یہاں چتا کی آگ میں جل گئے۔ کوئی نام و نمود کا بھوکا تھا کوئی راج پاٹ کا اور کوئی سیم و زر کا۔ کتنے گیانی دھیانی۔ جوگی۔ پنڈت تمہارے دیکھتے دیکھتے آگ کے شعلوں میں سما گئے۔ سچ کہنا۔ کبھی تمہارا دل اتنا مسرور ہوا تھا؟ کبھی تمہاری موجوں نے اس طرح سر اٹھایا تھا! اپنے لئے سبھی مرتے ہیں۔ کوئی اس لوک کے لئے اور کوئی پرلوک کے لئے۔ آج تمہاری گود میں وہ لوگ آ رہے ہیں جو بیغرض تھے۔ جنہوں نے پاک اور خالص عدل کی حفاظت کے لئے اپنے کو قربان کر دیا ہے!

اور ایسا مسرت خیز ماتمی مجمع بھی کبھی تم نے دیکھا جس کا ایک ایک جزو اخوت۔ قومی محبت اور بہادرانہ عقیدت سے مملو ہو؟

تمام رات شعلے بلند ہوتے رہے گویا شہیدوں کی روحیں آتشیں تخت پر بیٹھی ہوئیں بہشت کو جا رہی تھیں!

نکلتے ہوئے سورج کی سرخ کرنیں چتاؤں سے گلے لپٹ لپٹ کر ملنے لگیں۔ یہ سورج دیوتا کا آشیرواد (دعا) تھا۔

لوٹتے وقت صرف گنے گنائے لوگ رہ گئے تھے۔ عورتیں پرجوش گانے گاتی ہوئیں چلی آتی تھیں۔ رانی جانھوی آگے آگے تھیں۔ آنند اور کئی دیگر عورات پیچھے پیچھے۔ ان کی بہادرانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی میٹھی تان صبح کی روشن شعاعوں پر ناچ رہی تھی جس طرح دل کے تاروں پر محبت رقص کرتی ہے۔

(۴۳)

صوفیا کے مذہبی خیالات اس کی معاشرت اس کی خورش اس کی مذہبی تعلیم۔ یہ سبھی باتیں ایسی تھیں جن سے ایک ہندو عورت کو نفرت

ہو سکتی تھی۔ مگر اتنے دنوں کے تجربہ نے رانی صاحبہ کے سارے شکوک دور کر دئے تھے۔ صوفیا ابھی تک ہندو مذہب کے دائرہ میں باقاعدہ طریقہ پر داخل نہ ہوئی تھی مگر اُس کا اخلاق ہندو مذہب اور ہندو سوسائٹی کے موافق تھا۔ اس بارہ میں اب رانی جانھوی کو ذرا بھی شک نہ تھا۔ اُنہیں اب اگر شک تھا تو صرف یہ کہ ازدواجی رشتہ کے قائم ہو جانے پر ونے کہیں اپنے مقصد کو نہ بھول جائے۔ اِس تحریک میں رہنمائی کا بار اپنے اوپر لے کر ونے نے اِس شک کو بھی بے بنیاد ثابت کر دیا۔ رانی صاحبہ اب شادی کی تیاریوں میں مشغول ہوئیں۔ کنور صاحب تو پہلے ہی سے راضی تھے۔ البتہ صوفیا کے والدین کی رضامندی ضروری تھی۔ اندو کو کوئی اعتراض ہو ہی نہ سکتا تھا۔ باقی اور رشتہ داروں کی رضامندی یا نارضامندی کی اُنہیں کوئی فکر ہی نہ تھی۔ پس رانی صاحبہ ایک روز مسٹر سیوک کے مکان پر گئیں کہ اس عقد کی بابت طے کر لیں۔ مسٹر سیوک تو خوش ہوئے مگر مسز سیوک کا مُنہ نہ سیدھا ہُوا۔ اُن کی نگاہوں میں ایک یوروپین کی جتنی عزت تھی اُتنی کسی ہندوستانی کی نہ ہو سکتی تھی خواہ وہ کتنا ہی صاحب ثروت کیوں نہ ہو۔ وہ جانتی تھیں کہ یہاں معمولی سے معمولی یوروپین کی عزت یہاں کے بڑے سے بڑے راجہ سے زیادہ ہے۔ پربھو سیوک نے یورپ کی راہ لی۔ اب گھر کو خط تک نہ لکھتے تھے صوفیا نے اِدھر یہ راستہ اختیار کیا۔ زندگی کی ساری آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ جانھوی کے اصرار پر ناخوش ہو کر بولیں۔ خوشی صوفیا کی چاہئے۔ جب وہ خوش ہے تو میری رائے ہو یا نہ ہو۔ ایک ہی بات ہے۔ ماں ہوں۔ اولاد کے لئے جب مُنہ سے نکلے گی تو دعا ہی نکلے گی۔ اُس کی بدخواہی نہیں کر سکتی۔ لیکن معاف کیجئے گا۔ میں شادی کی رسوم میں شامل نہ ہو سکوں گی۔ میں اپنے

اوپر بڑا جبر کر رہی ہوں کہ صوفیا کو بد دعا نہیں دیتی ورنہ ایسی ننگِ خاندان لڑکی کا تو مر جانا ہی اچھا ہے جو اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہو جائے ؎

رانی صاحبہ کو اور کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ گھبرا کر اُنہوں نے عالم پنڈت کو بُلا کر صوفیا کی تبدیلیِ مذہب اور شادی کی ساعت مقرر کر لی ؎

رانی جاہنوی تو اِن رسوم کو دھوم دھام سے ادا کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اُدھر پانڈے پور والی تحریک روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ معاوضہ کے روپے تو اب کسی کے باقی نہ تھے۔ اگرچہ ابھی تک منظوری نہ آئی تھی اور راجہ مہندر کمار کو سبھی اسامیوں کو اپنے پاس سے روپے دینے پڑے تھے مگر اِن خالی مکانات کو گرانے کے لئے مزدور نہ ملتے تھے۔ دوگنی سہ گنی اُجرت دینے پر بھی کوئی مزدور کام کرنے نہ آتا تھا حکام نے ضلع کے دیگر مقامات سے مزدور بُلوائے۔ مگر جب اُنہوں نے آکر یہاں کی حالت دیکھی تو راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعدہٗ حکام نے سرکاری برقندازوں کو تحصیل کے چپڑاسیوں کو بڑی بڑی لالچ دیکر کام کرنے کے لئے تیار کیا مگر جب اُن کے سامنے سینکڑوں نوجوان جن میں کتنے ہی اونچے گھرانوں کے تھے آکر دست بستہ کھڑے ہو گئے اور ملتجی ہوئے کہ بھائیو ایشور کے لئے پھاوڑے نہ چلاؤ اور اگر چلانا ہی چاہتے ہو تو پہلے ہماری گردنوں پر چلاؤ تو اُن سب کی بھی کایا پلٹ ہو گئی۔ دوسرے روز سے وہ لوگ پھر کام پر نہ آئے۔ ونے اور اُن کے رفیق والنٹیر لوگ آج کل اِس ستیاگرہ کو بڑھانے میں مصروف رہتے تھے ؎

سُورداس صبح سے شام تک جھونپڑے کے دروازہ پر بت بنا بیٹھا

رہتا۔ حولدار اور اُس کے سپاہیوں پر عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ موقع واردات کی حفاظت کے لئے دوسرے ضلع سے مسلح پولیس بُلائی گئی تھی۔ وہ سپاہی سنگینیں چڑھائے چوبیسوں گھنٹے جھونپڑی کے سامنے والے میدان میں ٹہلتے رہتے۔ شہر کے ہزار دو ہزار آدمی آٹھوں پہر موجود رہتے۔ ایک جاتا تو دوسرا آتا۔ آنے جانے والوں کا سلسلہ دن بھر جاری رہتا تھا۔ والنٹیروں کی جماعت بھی نایک رام کے خالی برآمدے میں موجود رہتی تھی کہ نہ جانے کب کیا فساد ہو جائے۔ راجہ صاحب اور سپرنٹنڈنٹ پولیس دن میں دو دو مرتبہ ضرور آتے تھے مگر کسی سبب سے جھونپڑے کو منہدم کرنے کا حکم نہ دیتے تھے۔ عوام کی طرف سے فساد کا اتنا اندیشہ نہ تھا جتنا کہ پولیس کی جانب سے عدول حکمی کا۔ حولدار کے رویّہ سے جملہ حُکّام کے دلوں میں خوف سما گیا تھا۔ صوبہ کی گورنمنٹ کو مقامی حالات کی رپورٹ ہر روز بھیجی جاتی تھی۔ گورنمنٹ نے بھی ڈھارس دی تھی کہ جلد ہی گورکھوں کی ایک رجمنٹ بھیجنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اب حُکّام کی اُمیدوں کا گورکھوں ہی پر انحصار تھا جن کی وفاداری کا اُنہیں پورا یقین تھا۔ ونے عموماً تمام دن یہیں رہا کرتے تھے اور راجہ صاحب کے درمیان میں اب شمشیر برہنہ کا وقفہ تھا۔ وہ ونے کو دیکھتے تو نفرت سے مُنہ پھیر لیتے۔ اُن کی نگاہ میں ونے باقی تھا اور سورداس اُس کے ہاتھوں کا کھلونا۔

رانی جاہنوی جیوں جیوں شادی کی تیاریاں کرتی تھیں اور تاریخ قریب آتی جاتی تھی۔ صوفیا کا دل ایک نامعلوم خوف ایک موہوم اندیشہ ایک نحوست آمیز فکر سے ہراساں ہو رہا تھا۔ خوف یہ تھا کہ شاید شادی

کے بعد ہماری ازدواجی زندگی راحت خیز نہ ہو۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی خامیاں معلوم ہو جائیں اور پس ہماری زندگی تلخ ہو جائے۔ ونے کی نگاہ میں صوفیا بے عیب۔ بے خطا۔ پاک صاف۔ بہمہ صفت موصوف دیوی تھی صوفیا کو ونے پر اتنا اعتماد نہ تھا۔ اُس کے وسیع مذہبی مطالعہ نے اُسے انسانوں کی جبلی خامیوں سے واقف کر دیا تھا۔ اُس نے بڑے بڑے مہاتماؤں۔ رشیوں۔ منیوں۔ پنڈتوں اور جوگیوں کو جو اپنی سخت ریاضت سے اپنی نفسانی خواہشات کو مغلوب کر چکے تھے۔ دنیا کے چکنے مگر کائی سے ڈھکے ہوئے سطح پر پھسلتے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگرچہ نفس پر قابو رکھنے والے لوگ بڑی مشکل سے پھسلتے ہیں مگر جب ایک بار پھسل گئے تو پھر کسی طرح نہیں سنبھل سکتے۔ اُس کی دبی ہوئی خواہشات اُس کی مقیت۔ آرزوئیں اُس کی مغلوب تمنائیں بڑی تیزی سے مخالف سمت کو چلتی ہیں زمین پر چلنے والا انسان گر کر پھر اُٹھ سکتا ہے۔ مگر آسمان پر گھومنے والا آدمی گرے تو اُسے کون روکے گا۔ اُس کے لئے کوئی اُمید نہیں۔ اُس کے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ صوفیا کو خوف تھا کہ کہیں مجھے بھی یہی تلخ تجربہ نہ ہو۔ کہیں میری بھی یہی حالت نہ ہو۔ ممکن ہے مجھ میں کوئی ایسا عیب نکل آئے جو مجھے ونے کی نگاہوں میں گرا دے۔ وہ میری بے قدری کرنے لگیں۔ یہ اندیشہ سب سے زبردست سب سے زیادہ مایوس کن تھا۔ آہ اُس وقت میری کیا حالت ہو گی۔ دُنیا میں ایسے کتنے مرد عورت کے جوڑے ہیں کہ اگر انہیں دوبارہ انتخاب کی آزادی دے دی جائے تو اپنے پہلے انتخاب پر قائم رہیں؟

صوفیا برابر اسی قسم کے خیالات میں محو رہتی تھی۔ ونے بار بار اُس کے

پاس آتے۔ اُس سے باتیں کرنا چاہتے۔ پانڈے پور والے معاملہ کے متعلق اُس سے رائے لینا چاہتے مگر اُس کی بیرخی دیکھ کر اُنہیں کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔

فکر مرض کی جڑ ہے۔ صوفیا اس قدر متفکر رہتی کہ دن دن بھر کمرہ سے باہر نہ نکلتی۔ کھانا بھی بہت کم کھاتی اور کبھی کبھی کچھ نہ کھاتی۔ دل میں ایک آگ سی جل رہی تھی۔ مگر اپنے دل کی بات کس سے کہے؟ ونے سے اس بارہ میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کا انجام بُرا ہوگا۔ مایوسی کی حالت میں ونے نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ آخر اُس کا نازک جسم اس دل کی جلن کو برداشت نہ کر سکا۔ پہلے سر میں درد رہنے لگا اور پھر رفتہ رفتہ بخار کی نوبت آگئی۔

لیکن بسترِ علالت پر پڑتے ہی صوفیا کو ونے سے ایک لمحہ بھی جُدا ہونا ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ کمزور آدمی کو اپنی لاٹھی سے بھی بے انتہا محبت ہو جاتی ہے۔ بیماری کی حالت میں ہمارا دل محبت کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ صوفیا جو کئی روز پہلے کمرہ میں ونے کے آتے گوشۂ تنہائی کی تلاش کرتی تھی کہ کہیں یہ عشقیہ گفتگو نہ کرنے لگیں۔ اُن کی مشتاق نگاہوں سے اُن کے شیریں تبسم سے اُن کی دل لبھانے والی ہنسی سے تھر تھر کانپتی رہتی تھی۔ جس طرح کوئی بیمار لذیذ کھانوں کو سامنے دیکھ کر ڈرتا ہے کہ میں بدپرہیزی نہ کر بیٹھوں۔ اب منتظر نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھتی ہوئی ونے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ونے اب کہیں نہ جائیں۔ میرے ہی پاس بیٹھے رہیں۔ ونے بھی زیادہ تر اُس کے پاس ہی رہتے۔ پانڈے پور کا کام اپنے رفیقوں پر چھوڑ کر صوفیا کی تیمارداری میں مشغول ہو گئے۔ اُن

کے بیٹھے رہنے سے صوفیا کے دل کو گونہ اطمینان رہتا۔ وہ اپنے کمزور ہاتھوں کو ونے کے زانو پر رکھ دیتی اور معصوم تمناؤں کے ساتھ اُن کے چہرہ کی طرف دیکھتی۔ ونے کو کہیں جاتے دیکھتی تو پریشان ہو جاتی اور التجا آمیز نگاہوں سے بیٹھنے کی استدعا کرتی ⁂

رانی جاہنوی کے برتاؤ میں بھی اب ایک خاص فرق دکھائی دیتا تھا۔ صاف تو نہ کہہ سکتیں مگر اشاروں سے ونے کو پانڈے پور کے ستیاگرہ میں شامل ہونے سے روکتیں۔ اندر دت کی موت نے اُنہیں بہت خائف کر دیا تھا۔ اُنہیں اندیشہ تھا کہ اس خونریزی کا آخری نظارہ اُس سے بھی زیادہ خوفناک ہوگا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ شادی کے طے ہوتے ہی ونے سنگھ کا جوش بھی کم ہو چلا تھا۔ صوفیا کے پاس بیٹھ کر اُس تشفی آمیز گفتگو کرنا اور اُس کی محبت بھری باتیں سُننا اُنہیں اب بہت مرغوب تھا۔ صوفیا کی التجاؤں نے اُن کی محبت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ہم پہلے انسان ہیں اور پیچھے قومی خادم۔ حب الوطنی کے لئے ہم اپنے انسانی جذبات کو پامال نہیں کر سکتے۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اپنے بیٹے کی موت کا غم قومی مصیبت کے غم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اپنا غم جان گسل ہوتا ہے اور قومی غم یاس انگیز۔ اپنے غم پر ہم روتے ہیں۔ قومی غم پر متردّد ہو جاتے ہیں ⁂

ایک روز علی الصباح ونے ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لے کر لوٹے تھے۔ (اچھے دیدوں کے ہوتے ہوئے بھی اُن کا اعتقاد مغربی دواؤں پر زیادہ تھا) کہ کنور صاحب نے اُنہیں بُلا بھیجا۔ ونے ادھر مہینوں سے اُن سے ملنے نہ گئے تھے۔ باہمی ناچاقی سی ہو گئی تھی۔ ونے نے صوفیا کو دوا پلائی اور پھر

کنور صاحب سے ملنے گئے۔ وہ اپنے کمرہ میں ٹہل رہے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر بولے
تم تو اب کبھی آتے ہی نہیں ؛
ونے نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ فرصت نہیں ملتی۔ آپ نے کبھی یاد
بھی تو نہیں کیا۔ میرے آنے سے شاید آپ کا وقت خراب ہوتا ہے ؛
کنور صاحب نے اس طنز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ آج مجھے تم
سے ایک تشویش انگیز امر میں مشورہ لینا ہے۔ اچھی طرح بیٹھ جاؤ۔ اتنی جلد فراغت
نہ ہوگی ؛
ونے۔ فرمائیے۔ میں سُن رہا ہوں ؛
کنور صاحب بہت پس و پیش کے لہجہ میں کہا۔ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ تمہارا
نام ریاست سے ـــــ
یہ کہتے کہتے کنور صاحب رو پڑے۔ ذرا دیر میں طبیعت سنبھلی تو بولے
میری تم سے عاجزانہ التجاء ہے کہ تم بالاعلان اس تحریک سے اپنا قطع تعلق
کر لو اور اخباروں میں اس اعلان کو شائع کرا دو۔ تم سے ایسی التجاء کرتے
ہوئے مجھے کتنی ندامت اور پریشانی ہو رہی ہے اس کا اندازہ تمہارے سوا
اور کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر حالاتِ وقت نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں تم سے
یہ ہرگز نہیں کہتا کہ کسی کی خوشامد کرو۔ کسی کے سامنے سر جھکاؤ۔ نہیں مجھے
خود اس سے نفرت تھی اور ہے۔ مگر اپنی جائداد بچانے کی غرض سے میری
اس التجاء کو منظور کرو۔ میں نے سمجھا تھا کہ ریاست کو سرکار کے ہاتھ میں دے
دینا کافی ہوگا مگر حکام اسے کافی نہیں کرتے۔ ایسی حالت میں میرے لئے
دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو تم خود اس تحریک سے علیحدہ ہو جاؤ۔ کم از کم اس
میں نمایاں حصہ نہ لو یا میں ایک معاہدہ تحریر کر کے تمہیں ریاست سے

محروم کر دوں۔ آگے آنے والی اولاد کے لئے اس جائداد کا محفوظ رہنا نہایت ضروری ہے۔ تمہارے لئے پہلی صورت جتنی مشکل ہے اتنی ہی مشکل میرے لئے دوسری صورت ہے۔ تم اس بارہ میں کیا فیصلہ کرتے ہو؟

ونے نے تمکنت سے جواب دیا۔ میں جائداد کو اپنے پیروں کی زنجیر نہیں بنانا چاہتا۔ اگر جائداد ہماری ہے تو اُس کے لئے کسی شرط کی ضرورت نہیں۔ اگر غیر کی ہے اور آپ کا قبضہ محض مشروط ہے تو اُسے میں اپنی جائداد نہیں سمجھتا۔ حقیقی عزت و وقار کے لئے جائداد کی ضرورت نہیں۔ اُس کے لئے ایثار نفسی اور خدمت کافی ہیں۔

بھرت سنگھ۔ بیٹا۔ میں اس وقت تمہارے سامنے جائداد پر اصولی بحث نہیں کر رہا ہوں۔ اُسے صرف عملی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ کسی حد تک جائداد ہماری حقیقی آزادی میں رکاوٹ ڈالتی ہے مگر اس کا روشن پہلو بھی تو ہے۔ فکر معاش سے نجات ملتی ہے اور وہ عزت و وقار جس کے حصول کے لئے غیر معمولی ایثار و خدمت کی ضرورت ہے یہاں بلا کسی مشقت کے خود بخود ہاتھ آ جاتا ہے۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اس تحریک سے کوئی ظاہرا تعلق نہ رکھو۔ یوں پوشیدہ طور سے اُس کی جتنی مدد کرنی چاہو کر سکتے ہو۔ بس اپنے کو قانونی گرفت سے بچائے رہو۔

ونے۔ یعنی کوئی اخبار بھی پڑھوں تو چھپ کر۔ کواڑ بند کر کے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ جس کام کے لئے پردہ کی ضرورت ہے خواہ اُس کا مقصد کتنا ہی پاک کیوں نہ ہو پھر بھی وہ واقعی اہانت آمیز ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں میں اُسے چوری کہنے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ یہ شبہ اور خوف کی زندگی انسان کے بہترین اوصاف کو زائل کر دیتی ہے۔ میں قول و فعل کی اتنی آزادی

ضروری سمجھتا ہوں۔ جس سے ہماری خودداری قائم رہے۔ اس بارہ میں میں اپنے خیالات کو اس سے زیادہ واضح الفاظ نہیں ظاہر کر سکتا۔

کنور صاحب نے ونے کو اشک آلود نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کتنی التجا، کتنی عاجزی، کتنا انتشار تھا۔ پھر بولے۔ میری خاطر سے اتنا مان جاؤ۔

ونے آپ کے قدموں پر اپنے کو نثار کر سکتا ہوں مگر اپنے ضمیر کی آزادی کا خون نہیں کر سکتا۔

ونے یہ کہہ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ کنور صاحب نے پوچھا ـــــ تمہارے پاس روپے تو بالکل نہ ہوں گے؟

ونے۔ مجھے روپیوں کی فکر نہیں۔

کنور۔ میری خاطر سے یہ لیتے جاؤ۔

انہوں نے نوٹوں کا ایک پلندہ ونے کی طرف بڑھا دیا۔ ونے انکار نہ کر سکے۔ کنور صاحب پر انہیں ترس آ رہا تھا۔ جب وہ نوٹ لے کر کمرہ سے چلے گئے تو کنور صاحب رنج و مایوسی سے مضطرب ہو کر کرسی پر گر پڑے۔ دنیا ان کی نگاہوں میں تاریک تھی۔

ونے کی حمیت نے انہیں ریاست چھوڑنے پر آمادہ تو کر دیا۔ مگر ان کے سامنے اب ایک نیا سوال پیدا ہو گیا۔ وہ کسب معاش کا سوال تھا۔ سمتی کے بارہ میں تو کوئی خاص فکر نہ تھی۔ اُس کا بار ملک پر تھا۔ اس کے علاوہ کسی قومی کام کے لئے بھیک مانگنے میں بھی کوئی شرم کی بات نہیں۔ انہیں اس کا یقین ہو گیا تھا کہ کوشش کی جائے تو اس کام کے لئے مستقل سرمایہ جمع ہو سکتا ہے۔ مگر معاش کے لئے کیا ہو؟ مشکل یہ تھی کہ کسب معاش سے مراد صرف ان کی روزمرہ کی ضروریات کا پورا ہونا نہ تھا بلکہ خاندانی روایات

کا قائم رکھنا بھی۔ اب تک اِس مسئلہ کی اہمیت کا اُنھیں احساس نہ ہوا تھا۔ دل میں کسی بھی خواہش کے صرف پیدا ہونے کی دیر تھی کہ وہ پوری ہو جاتی تھی۔ اب جو نگاہوں کے سامنے یہ زبردست مسئلہ یک دم کھڑا ہو گیا تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ ممکن تھا کہ اب بھی کچھ دنوں تک والدین کی شفقت اُنہیں اس فکر سے آزاد رکھتی۔ مگر اِس کمزور بنیاد پر زندگی کا محل نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ پھر اُن کی حمیّت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ اپنی اصول پروری اور معیار پسندی کا کفارہ اپنے والدین سے کرائیں۔ کچھ نہیں۔ یہ بےحیائی ہے اور بزدلی۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ اپنی زندگی کا بار والدین پر ڈالوں۔ اُنہوں نے اِس ملاقات کا تذکرہ اپنی ماں سے بھی نہ کیا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے۔ علاوہ بریں اُن کو اب اپنی ہی فکر نہ تھی۔ صوفیا بھی اُن کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ پس اُس کی فکر اور بھی زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ مانا کہ صوفیا میرے ساتھ زندگی کی بڑی بڑی مصیبت کو برداشت کر لے گی مگر کیا یہ مناسب ہے کہ اُسے محبت کے لئے یہ سخت سزا دی جائے؟ اُس کی محبت کو اِس سخت آزمائش میں ڈالا جائے۔ وہ تمام دن اُنہیں تفکرات میں مبتلا رہے۔ یہ عقدہ اُنہیں ناقابلِ حل معلوم ہوتا تھا۔ اُن کی تعلیم میں کسبِ معاش کے مسئلہ پر ذرا بھی دھیان نہ دیا گیا تھا۔ ابھی چند روز پیشتر اُن کے لئے اس مسئلہ کا وجود ہی نہ تھا۔ وہ خود سختیاں اُٹھانے کے عادی تھے۔ ارادہ تھا کہ تمام عمر قومی خدمت کا کام انجام دوں گا مگر صوفیا کے سبب اُن کے اِس ارادہ میں فرق آ گیا تھا۔ جن چیزوں کی پہلے اُن کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی وہ اب نہایت ضروری معلوم ہوتی تھیں۔ محبت کو خصوصاً عیش و عشرت کا خیال پسند رہے۔ وہ تکلیف اور مفلسی کا خواب

نہیں دیکھتی۔ ونے صوفیا کو ایک رانی کی طرح رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے زندگی کی اُن تمام نعمتوں سے معمور کر دینا چاہتا تھا جو شوق و تکلف نے ایجاد کی ہیں۔ مگر حالات ایسی صورت اختیار کرتے جاتے تھے جس سے وہ ساری تمنائیں برباد ہوئی جاتی تھیں۔ چاروں طرف سے مفلسی اور مصیبت ہی کا دور دورہ نظر آتا تھا۔ اِس پریشانی کی حالت میں وہ کبھی صوفیا کے پاس جاتے اور کبھی اپنے کمرہ میں جاتے۔ کچھ گم سُم گم۔ اُداس۔ پست ہمت۔ اُترا ہوا اور بے رونق چہرہ۔ گویا کوئی بڑی مسافت طے کر کے آتے ہوں۔ پانڈے پور سے بڑی خوفناک اطلاعیں موصول ہو رہی تھیں۔ آج کمشنر آیا۔ آج گورکھا پلٹن کی رجمنٹ آ پہنچی۔ آج گورکھوں نے مکانوں کو مسمار کرنا شروع کیا اور لوگوں کے روکنے پر انہیں مارا پیٹا۔ آج پولیس نے رضاکاروں کو گرفتار کرنا شروع کیا۔ دس رضاکار پکڑ لئے گئے۔ آج بیس پکڑے گئے۔ آج حکم دیا گیا ہے کہ سڑک سے سورداس کی جھونپڑی تک کانٹے دار تار لگا دیا جائے۔ کوئی وہاں جا ہی نہیں سکتا۔ ونے یہ خبریں سُنتے تھے اور کسی پرشکستہ پرند کی طرح ایک بار تڑپ کر رہ جاتے +

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا اور صوفیا کی صحت ٹھیک ہونے لگی۔ اُس کے پیروں میں اتنی طاقت آ گئی کہ پیدل باغیچہ میں ٹہلنے چلی جاتی کھانا اچھا معلوم ہونے لگا۔ چہرہ پر صحت کی سُرخی نمودار ہو گئی۔ ونے کی عقیدتمندانہ تیمارداریوں نے اُس پر پوری فتح حاصل کر لی تھی۔ وہ اندیشے جو اُس کے دل میں پہلے پیدا ہوتے تھے۔ دور ہو گئے تھے۔ محبت کے رشتہ کو خدمت نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ وہ اپنے شکریہ کا اظہار لفظوں میں نہیں بلکہ اپنے آپ کو وقف کر کے کرنا چاہتی تھی۔ ونے سنگھ کو مغموم دیکھ

کر کہتی۔ تم میرے لئے اتنے متفکر کیوں ہوتے ہو؟ میں تمہارے ساتھ سب
کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ میں تمہاری دولت و ثروت کی بھوکی نہیں ہوں
جو مجھے تمہاری خدمت کرنے کا موقع نہ دے گی۔ جو تمہیں جذبات سے محروم
بنا دے گی۔ اس سے مجھے تمہارا مفلس ہونا کہیں زیادہ پسند ہے۔ البتہ ہیولا
جیوں اُس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اُسے خیال ہونے لگا کہ کہیں لوگ مجھے
بدنام نہ کرتے ہوں کہ اسی کی وجہ سے ونے پانڈے پور نہیں جاتے۔ ان
متیاگرہ کی لڑائی میں وہ حصہ نہیں لیتے جو اُن کا فرض ہے۔ خود آگ
لگا کر دور سے کھڑے ہوئے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس خیال کے
پیدا ہونے پر بھی اُس کی یہ خواہش نہ ہوتی تھی کہ ونے وہاں جائیں۔

ایک روز آندو اُسے دیکھنے آئی۔ بہت مغموم اور پریشان تھی۔ اب
اپنے شوہر سے اس قدر بد اعتقاد ہو گئی تھی کہ ادھر ہفتوں سے اُس نے
اُن سے بات تک نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ اب وہ کھلے الفاظ میں اُن کی ہجو
کرنے سے بھی نہ ہچکتی تھی۔ راجہ صاحب بھی اُس سے نہ بولتے تھے۔ باتوں
باتوں میں ونے سے بولی ——— اُنہیں تو حاکموں کی خوشامد نے چوپٹ کیا
پتاجی کو جائداد کی محبت نے چوپٹ کیا۔ کیا محبت تمہیں بھی چوپٹ کر دے
گی؟ کیوں صوفیا تم انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی قید سے نہیں آزاد کرتیں؟
اگر ابھی سے اِن کا یہ حال ہے تو شادی ہو جانے پر کیا ہوگا؟ جب تو یہ شاید
دین و دنیا کہیں کے بھی نہ رہ جائیں گے۔ بھونرے کی طرح محبت کا رس پی
کر بدمست رہیں گے۔

صوفیا بہت خجل ہوئی۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔ اُس کا یہ گمان درست
نکلا کہ ونے کی بے پروائی کا سبب میں ہی سمجھی جا رہی ہوں۔ لیکن کہیں ایسا

تو نہیں ہے کہ ونے اپنی جائداد بچانے کے خیال سے میری بیماری کا حیلہ کر کے اِس لڑائی سے الگ رہنا چاہتے ہوں؟ یہ بُرا خیال خواہ مخواہ اُس کے دل میں پیدا ہُوا۔ وہ اُسے دل سے نکال دینا چاہتی تھی جیسے ہم کسی قابلِ نفرت شے سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ مگر اِس الزام کو اپنے سَر سے دور کرنا ضروری تھا۔ لجاتی ہوئی بولی ـــ میں نے تو کبھی منع نہیں کیا ॰

اندو۔ منع کرنے کے بھی کئی ڈھنگ ہیں۔

صوفیا۔ اچھّا تو میں آپ کے سامنے کہہ رہی ہوں کہ مجھے اُن کے وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں اسے اپنے اور اُن کے دونوں ہی کے لئے فخر کی بات سمجھتی ہوں۔ اب میں ایشور کے رحم اور اُن کی مہربانی سے آرام ہو گئی ہوں اور اُنہیں یقین دلاتی ہوں کہ اُن کے وہاں جانے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں خود بھی دو چار روز میں جاؤں گی ॰

اندو نے ونے کی طرف منتہی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ لو اب تو تمہارے لئے کوئی رُکاوٹ نہیں رہی۔ تمہارے وہاں رہنے سے سب کام عمدہ طریقہ پر ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ حاکموں کو جلد ہی سمجھوتہ کر لینا پڑے۔ میں نہیں چاہتی کہ اُس کی عزّت کسی دوسرے آدمی کو ملے ॰

جب اِس تاکید کا بھی ونے پر کوئی اثر نہ ہوا تو صوفیا کو یقین ہوگیا کہ اس علیحدگی کا سبب چاہے جائداد کی لالچ نہ ہو مگر محبّت بھی نہیں ہے جب اِنہیں معلوم ہے کہ ان کی علیحدگی سے میری بدنامی ہو رہی ہے تو یہ دیدہ و دانستہ کیوں مجھے نشانۂ ملامت بنا رہے ہیں؟ یہ تو اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہوگیا۔ رونے کو تھے ہی۔ آنکھوں میں کوئی چیز پڑ گئی۔ میں اُن کے پیر تھوڑا ہی پکڑے ہوئے ہوں۔ وہ تو اب پانڈے پور کا نام تک نہیں لیتے گویا وہاں کچھ ہوہی

نہیں رہا ہے۔ اُس نے صاف الفاظ میں تو نہیں لیکن کنایتاً ونے کو وہاں جانے کی ترغیب بھی دی مگر وہ پھر ٹال گئے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اتنے دنوں تک علیحدہ رہنے کے بعد ونے اب وہاں جاتے ہوئے شرماتے تھے۔ اُنہیں اندیشہ تھا کہ وہاں جانے پر کہیں مجھ پر لوگ تالیاں نہ بجائیں کہ خوف سے پیچھے بیٹھے رہے۔ وہ اب خود پشیمان ہو رہے تھے کہ میں کیوں اتنے دنوں تک مُنہ چھپائے رہا؟ میں نے کیوں اپنی ذاتی پریشانیوں کو اپنے فرض کے راستہ کا کانٹا بننے دیا؟ صوفیا کی رضامندی سے میں جا سکتا تھا۔ وہ کبھی مجھے منع نہ کرتی صوفیا میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ میں اُس کے نفع کے لئے بھی جو کام کرتا ہوں اُسے بھی وہ ایک بیرحم نقاد کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ خواہ چاہے محبت سے مغلوب ہو کر اپنے فرض کی ذرا بھی پرواہ نہ کرے مگر میں معیار سے ذرا بھی نہیں ہٹ سکتا۔ اب اُنہیں معلوم ہوا کہ یہ میری کمزوری۔ میری بُزدلی میری کاہلی تھی جس نے صوفیا کی علالت کو میرے مُنہ چھپانے کا حیلہ بنا دیا ورنہ میری جگہ تو سپاہیوں کے اوّلیں صف میں تھی۔ ونے چاہتے تھے کہ کوئی ایسی بات پیدا ہو جائے کہ میں اپنی خفت کو مٹا سکوں۔ اِس کالکھ کو دھو سکوں۔ کہیں دوسرے صوبہ سے کسی خوفناک حادثہ کی خبر آ جائے اور میں وہاں جا کر اپنی لاج رکھوں۔

صوفیا کو اب اُن کا ہر وقت ساتھ رہنا گوارا نہ تھا۔ ہم بیماری میں جس لاٹھی کے سہارے چلتے پھرتے ہیں۔ آرام ہو جانے پر اُسے چھوتے تک نہیں۔ ماں بھی تو چاہتی ہے کہ بچہ کچھ دیر جا کر کھیل آئے۔ صوفیا کا دل اب بھی ونے کو آنکھوں سے اُجھل ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ اُنہیں دیکھتے ہی اُس کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں محبت کا سرور

چھا جاتا تھا۔ مگر قوت امتیازی اُسے فوراً اپنے فرض کی یاد دلا دیتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ جب وہ میرے پاس آئے تو میں بے مروّت بن جاؤں۔ بے اعتنائی سے پیش آؤں۔ بولوں نہیں۔ آپ چلے جائیں گے۔ مگر یہ صرف اُس کی پاک خواہش تھی۔ وہ اتنی بیدرد۔ اتنی بیمروّت نہ ہو سکتی تھی۔ خوف ہوتا تھا کہ کہیں بُرا نہ مان جائیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ اس کا دل ڈانواڈول ہے یا یہ اتنی خود غرض ہے کہ بیماری میں تو سراپا محبت بنی ہوئی تھی۔ اور اب مجھ سے بولتے ہوئے بھی زبان دُکھتی ہے۔ صوفیا تیرا دل محبت چاہتا ہے تیری عقل نیک نامی اور شہرت اور ان دونوں میں برابر کشمکش جاری ہے۔

معرکہ کو شروع ہوئے دو ماہ گزر گئے۔ معاملہ روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔ والنٹیروں کی گرفتاری پر قانع نہ ہو کر گورکھوں نے اب اُنہیں جسمانی اذیت پہنچانی شروع کر دی تھی۔ بیعزتی بھی کرتے تھے اور اپنے وحشیانہ سلوک سے اُنہیں خائف بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر سُورداس پر فائر کرنے کی یا اُس کے جھونپڑے میں آگ لگانے کی ہمت نہ پڑتی تھی انقلاب کا خوف تھا۔ بغاوت کا خوف نہ تھا بڑی سے بڑی بغاوت بھی اُنہیں خائف نہ کر سکتی تھی۔ خوف تھا خونریزی کا۔ نہ جانے کتنے غریب مر جائیں۔ نہ جانے کتنا کہرام مچے۔ ایکبار پتھر کا دل بھی خونریزی سے کانپ اُٹھتا ہے۔

سارے شہر میں۔ کوچہ کوچہ۔ گھر گھر یہی چرچا تھی۔ شہر کے ہزاروں آدمی روز وہاں پہنچ جاتے۔ صرف تماشا دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ ایک بار اُس پھوس کی جھونپڑی کا اور اُس کے اندر رہنے والے کا درشن کرنے کے لئے نیز موقع پڑنے پر اپنے سے جو کچھ ہو سکے وہ کر دکھلانے کے لئے۔ والنٹیروں کی گرفتاری سے اُن کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ قربانی کی ہوا سی

بہہ گئی تھی ۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ ایک شخص ڈونڈی پیٹتا ہوا نکلا۔ ونے نے نوکر کو بھیجا کہ کیا بات ہے۔ اُس نے لوٹ کر کہا۔ سرکار کا حکم ہوا ہے کہ آج سے شہر کا کوئی آدمی باندھے پور نہ جائے۔ سرکار اُس کی جان کی حفاظت کی ذمہ دار نہ ہوگی ۔

ونے نے متفکرانہ انداز سے کہا ـــــ آج کوئی نیا حملہ ہونے والا ہے ۔

صوفیا۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے ۔

ونے۔ شاید سرکار نے اس جنگ کو ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے ۔

صوفیا۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ۔

ونے۔ سخت خونریزی ہوگی ۔

صوفیا۔ ضرور ہوگی ۔

دفعتاً ایک والنٹیر نے آ کر ونے کو نمسکار کیا اور بولا۔ آج تو اُدھر کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ مسٹر کلارک راجپوتانہ سے حاکم ضلع کی جگہ پر آ گئے ہیں۔ مسٹر سیناپتی معطل کر دئے گئے ہیں ۔

ونے۔ اچھا۔ مسٹر کلارک آ گئے۔ کب آئے ؟

والنٹیر۔ آج ہی چارج لیا ہے۔ سُنا جاتا ہے۔ سرکار نے اُنہیں اسی کام کے لئے خاص طور سے یہاں تعینات کیا ہے ۔

ونے۔ تمہارے کتنے آدمی وہاں ہوں گے ؟

والنٹیر۔ کوئی پچاس آدمی ۔

ونے کچھ سوچنے لگے۔ والنٹیر نے کئی منٹ کے بعد پوچھا۔ آپ کوئی خاص حکم دینا چاہتے ہیں ۔

ونے نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا ـــــ خوامخواہ آگ میں مت کودنا۔ اور حتی الامکان عوام کو وہاں جانے سے روکنا۔

والنٹیر۔ آپ بھی آئیں گے ؟

ونے نے کچھ اُداس ہو کر کہا ـــــ دیکھا جائے گا۔

والنٹیر کے چلے جانے پر ونے کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ سوال تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں ؟ دونوں کے متعلق سوچ بچار ہونے لگا۔ میں جا کر کیا کروں گا ؟ حکام کی جو مرضی ہوگی ویسا تو وہ ضرور ہی کریں گے۔ اب سمجھوتہ کی کوئی اُمید نہیں۔ لیکن یہ کتنی ذلت کی بات ہے کہ شہر کے باشندے تو وہاں جانے کے لئے تیار ہوں اور میں جس نے یہ معرکہ چھیڑا ہے منہ چھپا کر بیٹھ رہوں۔ اِس موقع پر میرا الگ رہنا مجھے زندگی بھر کے لئے بدنام کر دے گا۔ میری حالت مہیندر کمار سے بھی زیادہ گئی گزری ہو جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے بزدل ہے۔ ایک طرح سے میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ آج بھی گولیاں چلیں۔ ضرور چلیں گی۔ کون کہہ سکتا ہے کیا ہوگا ؟ صوفیا کس کی ہو کر رہے گی۔ آہ۔ میں نے ناحق عوام میں یہ جوش پھیلایا۔ اندھے کا جھونپڑا گر گیا ہوتا اور ساری باتیں ختم ہو جاتیں۔ میں نے ہی ستیاگرہ کا جھنڈا اکھڑا کیا۔ سوتے ہوئے شیر کو جگایا۔ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالی۔

اُنہوں نے اپنے دل کو ملامت کرتے ہوئے سوچا۔ آج میں اتنا پست ہمت کیوں ہو رہا ہوں ؟ کیا میں موت سے ڈرتا ہوں ؟ موت سے کیا ڈر ؟ مرنا تو ایک دن ضرور ہی ہے ! کیا میرے مرنے سے ملک سونا ہو جائے گا ؟ کیا میں ہی نکمیا ہوں ؟ کیا دوسرے بہادروں کی پیدا کرنے

والی ماں مُلک میں موجود ہی نہیں ہے۔
صوفیا کچھ دیر تک ٹکٹکی لگائے اُن کے مُنہ کی طرف تاکتی رہی۔ دفعتاً وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ میں وہاں جاتی ہوں۔
وسنے نے خوف زدہ ہو کر کہا — آج جانا خطرناک ہے۔ سُنا نہیں۔ سارے ناکے بند کر دئے گئے ہیں؟
صوفیا۔ عورتوں کو کوئی نہ روکے گا۔
وسنے نے صوفیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت منّت آمیز انداز سے کہا۔ جانِ من۔ میرا کہنا مانو۔ آج نہ جاؤ۔ آثار اچھے نہیں نظر آتے۔ کوئی بُرا واقعہ ہونے والا ہے۔
صوفیا۔ جبھی تو میں جاتی ہوں۔ اوروں کے لئے خوف مانع ہو تو میرے لئے بھی کیوں ہو؟
وسنے۔ کلارک کا آنا بُرا ہُوا۔
صوفیا۔ اسی لئے میں اور جانا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے سامنے کوئی وحشیانہ حرکت نہ کر سکے گا۔ اتنی شرافت ابھی اُس میں ہے۔
یہ کہہ کر صوفیا اپنے کمرہ میں گئی۔ اُس نے اپنا ننھا سا پستول شلوکے کی جیب میں رکھا۔ گاڑی تیار کرنے کو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ باہر نکلی تو گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اُس نے جا کر ونے سنگھ کے کمرہ میں دیکھا وہ وہاں نہ تھے۔ پھر وہ دروازہ پر کچھ دیر تک کھڑی رہی۔ ایک نامعلوم خوف نے کسی آنے والی مصیبت کے اندیشہ نے اُس کے دل کو ڈانواڈول کر دیا۔ وہ اپنے کمرہ میں واپس جانا چاہتی تھی کہ کنور صاحب آتے ہوئے دکھائی دئے۔ صوفیا ڈری کہ یہ کچھ پوچھ نہ بیٹھیں۔ وہ فوراً گاڑی میں جا بیٹھی اور کوچوان

کو تیزی سے لے جانے کا حکم دیا۔ لیکن جب گاڑی کچھ دور نکل گئی تو وہ سوچنے لگی کہ ونے کہاں چلے گئے ؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ مجھے جانے پر آمادہ دیکھ کر وہ مجھ سے پہلے ہی چلے گئے ہوں ؟ اُسے پچھتاوا ہونے لگا کہ میں ناحق یہاں آنے کو تیار ہوئی۔ ونے کی خواہش نہ تھی۔ وہ میرے ہی اصرار سے آئے ہیں۔ ایشور۔ تم اُن کی حفاظت کرنا۔ کلارک اُن سے جلا ہی ہوا ہے کہیں ہنگامہ نہ ہو جائے۔ میں نے ونے کو نکما سمجھا۔ میری کتنی زیادتی ہے! یہ دوسرا موقع ہے کہ میں نے اُن پر جھوٹا الزام لگایا۔ میں شاید اب تک اُنہیں نہیں سمجھی۔ وہ دل کے جری ہیں۔ یہ میری کم ظرفی ہے کہ اُن کے بارہ میں اکثر مجھے بدگمانی ہو جاتی ہے۔ اگر میں اُن کی راہ کا کانٹا نہ بنی ہوتی تو ان کی زندگی کتنی پاک و صاف کتنی روشن ہوتی۔ میں ہی اُن کی کمزوری کا سبب ہوں اور میں ہی اُن پر الزام عاید کرنے والی ہے۔ ایشور کرے وہ یہاں نہ آئے ہوں۔ اُن کا نہ آنا ہی اچھا ہے۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں آئے یا نہیں چل کر دیکھ لوں ؛

اُس نے کوچوان کو اور تیز ہانکنے کا حکم دیا ؛

اُدھر ونے سنگھ دفتر میں جا کر سمتی کے جمع خرچ کا حساب لکھ رہے تھے۔ اُن کا دل بہت اُداس تھا۔ چہرہ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد اپنے چاروں طرف مغموم نگاہوں سے دیکھتے اور پھر حساب لکھنے لگتے نہ جانے وہاں سے لوٹ کر آنا ہو یا نہ ہو۔ اس لئے حساب کتاب ٹھیک کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔ کام ختم کر کے اُنہوں نے دعائیہ انداز سے اوپر کی طرف دیکھا۔ پھر باہر نکلے۔ بائیسکل اُٹھائی اور تیزی سے چلے پیچھے مُڑ مُڑ کر مکان۔ باغ اور درختوں کو اتنی مشتاق نگاہوں سے دیکھتے جاتے گویا وہ انہیں

پھر نہ دیکھیں گے۔ گویا یہ اُن کا آخری نظارہ ہے۔ کچھ دور جا کر اُنہوں نے دیکھا کہ صوفیا چلی جا رہی ہے۔ اگر وہ اُس سے مل جاتے تو شاید صوفیا بھی اُن کے ساتھ لوٹ پڑتی مگر اُنہیں تو یہ دُھن سوار تھی کہ مَیں صوفیا کے پہلے وہاں جا پہنچوں۔ موڑ پر آتے ہی اُنہوں نے اپنی سائیکل کو پھیر دیا اور دوسرا راستہ پکڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ میدانِ جنگ میں پہنچے تو صوفیا ابھی وہاں نہ آئی تھی۔ ونے نے دیکھا کہ گرے ہوئے مکانوں کی جگہ سینکڑوں چھولداریاں کھڑی ہوئی ہیں اور اُن کے چاروں طرف گورکھے کھڑے ہوئے گشت لگا رہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اندر جا سکے۔ ہزاروں آدمی ارد گرد جمع ہیں گویا کسی بڑے تماشہ کو دیکھنے کے لئے تماشائی لوگ ایک حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے ہوں۔ درمیان میں سورداس کا جھونپڑا اسٹیج کی طرح موجود تھا۔ سورداس جھونپڑے کے سامنے لاٹھی لئے کھڑا تھا گویا ناٹک کو شروع کرنے کے لئے کھڑا ہو۔ سب لوگ سامنے کا نظارہ دیکھنے میں اس قدر محو تھے کہ ونے کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ سمتی کے جانباز والنٹیر راتوں رات جھونپڑے کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ ونے نے فیصلہ کیا کہ میں بھی وہیں جا کر کھڑا ہو جاؤں۔

یکایک کسی نے پیچھے سے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اُنہوں نے چونک کر دیکھا تو صوفیا تھی۔ اُس کے چہرہ کا رنگ فق تھا۔ گھبرائی ہوئی آواز سے بولی —— تم کیوں آئے؟

ونے۔ تمہیں تنہا کیسے چھوڑ دیتا؟

صوفیا۔ مجھے بڑا خوف معلوم ہو رہا ہے۔ یہ توپیں کیوں لگا دی گئی ہیں؟

ونے نے توپیں نہ دیکھی تھیں۔ واقعی تین توپیں جھونپڑے کی طرف

مُنہ کر کے کھڑی کر دی گئی تھیں۔ گویا تماشا گاہ میں دیوآ گئے ہوں ۔

ونے۔ شاید آج اس ستیا گرہ کو ختم کر دینے کا فیصلہ ہوا ہے ۔

صوفیا۔ میں یہاں ناحق آئی۔ مجھے گھر پہنچا دو ۔

آج صوفیا کو پہلی بار محبّت کی کمزوری کا احساس ہُوا۔ ونے کی سلامتی کے خیال سے وہ کبھی اتنی بدحواس نہ ہوئی تھی۔ جانتی تھی کہ ونے کا فرض اُن کی عزت اُن کی نیک نامی یہاں رہنے ہی میں ہے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی اُن کو یہاں سے ہٹا لے جانا چاہتی تھی۔ اُسے اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ اپنے کو وہ بالکل بھول گئی تھی ۔

ونے۔ ہاں تمہارا یہاں رہنا خطرناک ہے۔ مَیں نے پہلے ہی منع کیا تھا پر تم نے نہ مانا ۔

صوفیا ونے کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں گاڑی میں بٹھا دینا چاہتی تھی کہ دفعتاً اندو رانی کا موٹر آ پہنچا۔ موٹر سے اُتر کر وہ صوفیا کے پاس گئیں۔ اور بولیں —— کیوں صوفیا جاتی ہو کیا ؟

صوفیا نے بات بنا کر کہا۔ نہیں جاتی نہیں ہوں۔ ذرا پیچھے ہٹ جانا چاہتی ہوں ۔

صوفیا کو اندو کا آنا کبھی اتنا ناگوار نہ ہوا تھا۔ ونے کو بھی بُرا معلوم ہُوا۔ بولے۔ تم کیوں آئیں ؟

اندو۔ اس لئے کہ تمہارے بھائی صاحب نے آج خط کے ذریعہ مجھے منع کر دیا تھا ۔

ونے۔ آج کی حالت بہت نازک ہے۔ ان لوگوں کے صبر و تحمل۔ ہمت و جوانمردی کا آج سخت ترین امتحان ہوگا ۔

اندو۔ تمہارے بھائی صاحب نے بھی تو اُس خط میں یہی بات لکھی تھی۔
ونے۔ کلارک کو دیکھو۔ کتنی بیدردی سے لوگوں کو ہنٹر مار رہا ہے مگر کوئی اُس کا نام نہیں لیتا۔ عوام کا ضبط و تحمل اب آخری حد کو پہنچ گیا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کیا ہو جائے۔

عوام اس قدر مستقل مزاج اور وفا شعار ہو سکتے ہیں۔ اِس کا احساس ونے کو آج ہی ہوا۔ ہر شخص سر فروشی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ اتنے میں نایک رام کسی طرف سے آ گئے۔ اُنہوں نے ونے کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا آج تم اِدھر کیسے بھول پڑے بھیا؟

اِس سوال میں کتنا طنز کتنی حقارت کتنی ملامت تھی۔ ونے تلملا گئے بات ٹال کر بولے۔ کلارک بڑا بے رحم ہے۔

نایک رام نے انگوچھا ہٹا کر ونے کو اپنی پیٹھ دکھائی۔ گردن سے کمر تک ایک نیلا سُرخ خط کھنچا ہوا تھا گویا کسی نوک دار کیل سے کھرچ دیا گیا ہو۔ ونے نے پوچھا —— یہ زخم کیسے لگا؟

نایک رام۔ ابھی یہی ہنٹر کھائے ہوئے چلا آتا ہوں۔ آج جیتا بچا تو سمجھوں گا۔ غُصّہ تو ایسا آیا تھا کہ ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لوں مگر ڈرا کہ کہیں گولی نہ چل جائے تو نایک سب آدمی بھون جائیں۔ تم نے تو اِدھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ عورت کا مایا جال بڑا کٹھن ہے۔

صوفیا نے اِس جملہ کا آخری لفظ سُن لیا بولی —— تم پرمیشر کا شکر ادا کرو کہ تم اس مایا جال میں نہیں پھنسے۔

صوفیا کی چُٹکی نے نایک رام کو گُدگُدا دیا۔ سارا غصّہ فرو ہو گیا۔ بولے بھیا۔ مِس صاحب کا جواب دو۔ مجھے معلوم تو ہے پر کہتے نہیں بنتا۔ ہاں

کیسے ؟

وسنے۔ کیوں تمہیں نے تو فیصلہ کیا تھا کہ اب عورتوں کے نزدیک نہ جاؤں گا یہ بڑی بے وفا ہوتی ہیں۔ یہ اُسی روز کی بات ہے جب میں صوفیا کی ملاقات سُن کر اُدھر سے پور جا رہا تھا ؞

نایک رام (شرما کر) واہ بھیا۔ تم نے تو میرے ہی اوپر جھونک دیا ؞

وسنے۔ اور کیا کہوں ؟ سچ کہنے میں کیا تامل ؟ خوش ہوں تو مصیبت۔ ناراض ہوں تو مصیبت ؞

نایک رام۔ بس بھیا میرے مَن کی بات کہی۔ ٹھیک یہی بات ہے۔ ہر طرح مردوں ہی پر مار۔ راجی ہوں تو مصیبت۔ ناراج ہوں تو اُس سے بُری مصیبت ؞

صوفیا۔ جب عورت اتنی بڑی مصیبت ہے تو مرد کیوں اُسے اپنے سر مڑھتے ہیں ؟ جسے دیکھو وہی اُس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ کیا دُنیا کے سبھی مَرد جاہل ہیں۔ کسی کے تمیز نہیں چھُو گئی ؟

نایک رام۔ بھیا۔ مِس صاحب نے تو میرے سامنے پتھر لڑھکا دیا۔ بات تو سچّی ہے کہ جب عورت اتنی بڑی مصیبت ہے تو مَرد کیوں اُس کے پیچھے حیران رہتے ہیں ؟ ایک کی دُردَسا دیکھ کر دوسرا کیوں نہیں سیکھتا ؟ بولو بھیا ہے کچھ جواب ؟

وسنے۔ جواب کیوں نہیں ہے۔ ایک تو تمہیں نے میری دُردَسا سے سیکھ لیا۔ تمہاری طرح اور بھی کتنے ہی پڑے ہوں گے ؞

نایک رام (ہنس کر) بھیا تم نے پھر میرے ہی سر ڈال دیا۔ یہ تو کچھ ٹھیک جواب نہ بَن پڑا ؞

وتے۔ ٹھیک وہی ہے جو تم نے آتے ہی آتے کہا تھا کہ عورت کا مایا جال بڑا کٹھن ہے ؀

انسان فطرتاً تفریح پسند ہے۔ ایسے رنج کے وقت بھی اُسے ہنسی سوجھتی ہے۔ پھانسی پر چڑھنے والے لوگ بھی ہنستے دیکھے گئے ہیں۔ یہاں یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ مسٹر کلارک گھوڑا اُچھالتے اور آدمیوں کو کچلتے ہوئے وہاں آ پہنچے۔ صوفیا پر نگاہ پڑی۔ تیر سا لگا۔ ٹوپی اوپر اُٹھا کر بولے۔ یہ وہی ناٹک ہے یا کوئی دوسرا شروع کر دیا؟

نشتر سے بھی تیز۔ پتھر سے بھی سخت۔ بیدردانہ جملہ تھا۔ مسٹر کلارک نے اپنی دلی مایوسی۔ اپنے رنج اپنی بداعتقادی۔ اپنے غصّہ کو ان الفاظ میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا؀

صوفیا نے برجستہ جواب دیا۔ نہیں بالکل نیا۔ اُس وقت جو دوست تھے۔ وہی اب دشمن ہیں؀

کلارک طنز کو سمجھ کر تلملا اُٹھے۔ بولے۔ یہ تمہاری بے انصافی ہے میں اپنے اصول سے ذرا بھی منحرف نہیں ہوا؀

صوفیا۔ کسی کو ایک بار پناہ دینا اور دوسری بار اُسی پر تلوار اُٹھانا کیا ایک ہی بات ہے؟ جس اندھے کے لئے کل تم نے یہاں کے رؤسا کا مقابلہ کیا تھا۔ جس کے لئے بدنام ہوئے تھے۔ جس کا خمیازہ اُٹھایا تھا۔ اُسی اندھے پر تلوار چلانے کو آج راجپوتانہ سے دوڑے آئے ہو۔ کیا دونوں ایک ہی بات ہے؟

کلارک۔ ہاں مس سیوک۔ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں۔ اپنے ذاتی جذبات و خیالات پر عمل پیرا ہونے کے نہیں۔

جہاز سے اُترتے ہی ہم اپنی شخصیت کو مٹا دیتے ہیں۔ ہمارے انصاف ہماری ہمدردی۔ ہمارا اخلاق۔ سب کا ایک ہی مقصد ہے۔ ہمارا اوّل اور آخر مقصد ہے حکومت کرنا۔

مسٹر کلارک کا اشارہ صوفیا کی طرف اتنا نہیں جتنے دنئے کی طرف تھا۔ وہ دنئے کو کنایتًا دھمکا رہے تھے۔ صاف الفاظ میں اُن کا مطلب یہی تھا کہ ہم کسی کے دوست نہیں ہیں۔ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں اور جو ہمارے کام میں مداخلت کرے گا اُسے بیخ و بُن سے اُڑا دیں گے۔

صوفیا نے کہا۔ نامنصفانہ حکومت حکومت نہیں بلکہ جنگ ہے۔

کلارک۔ تم نے پھاوڑے کو پھاوڑا کہہ دیا۔ ہم میں اتنی شرافت ہے۔ اچھا میں تم سے پھر ملوں گا۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے گھوڑے کو مہمیز لگائی۔ صوفیا نے بلند لہجہ میں کہا۔ نہیں ہرگز نہ آنا۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔

آسمان ابر آلود ہو رہا تھا۔ شام سے پہلے شام ہو گئی تھی۔ مسٹر کلارک ابھی گئے تھے کہ مسٹر جان سیوک کا موٹر آپہنچا۔ وہ جیوں ہی موٹر سے اُترے کہ سینکڑوں آدمی اُن کی طرف لپکے۔ لوگ حکام سے دبتے ہیں۔ اُن کی طاقت کا اُنھیں علم ہوتا ہے اور احساس بھی۔ جہاں اُس طاقت کا خوف نہیں ہوتا وہاں وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مسٹر سیوک پر حکام کی مہربانی تھی مگر وہ خود حاکم نہ تھے۔ وہ اپنی جان بچا کر گورکھوں کے کیمپ کی طرف بھاگے۔ سر پر پیر رکھ کر دوڑے مگر ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ مسٹر کلارک نے گھوڑے پر سے اُنھیں دوڑتے دیکھا تھا۔ اُنھیں گرتے دیکھا تو سمجھے کہ لوگوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اُنھوں نے فوراً

گورکھوں کی ایک جماعت کو اُن کی حفاظت کے لئے بھیجا۔ مجمع نے بھی خطرناک صورت اختیار کی۔ چوہے بلّی سے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ سورداس ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ یہ ہل چل سُنی تو خوفزدہ ہو کر بھیرو سے بولا۔ تم مجھے ذرا اپنے کندھے پر بیٹھا لو۔ ایک بار اور لوگوں کو سمجھا دوں۔ کیوں لوگ یہاں سے ہٹ نہیں جاتے؟ سینکڑوں بار کہہ چکا۔ کوئی سُنتا ہی نہیں۔ کہیں گولی چل گئی تو آج اُس دن سے بھی زیادہ کھون کھرابہ ہوگا۔

بھیرو نے سورداس کو کندھے پر بٹھالیا۔ اِس مجمع سے اُس کا سر بالشت بھر اونچا ہو گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے اُس کی باتیں سُننے دوڑے۔ بہادروں کی پرستش کرنا عوام کا ذاتی خاصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اندھا یونانی دیوتا اپنے عقیدتمندوں کے درمیان میں کھڑا ہے۔

سورداس نے اپنی بے نور آنکھوں سے مجمع کی طرف دیکھ کر کہا۔ بھائیو۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھر جائیں۔ آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں۔ گھر چلے جائیں۔ یہاں جمع ہو کر حاکم لوگوں کو چڑھانے سے کیا پھائدہ؟ میری موت آوے گی تو آپ لوگ کھڑے رہیں گے اور میں مر جاؤں گا موت نہ آوے گی تو میں توپوں کے مُنہ سے بچ کر نکل جاؤں گا۔ آپ لوگ اصل میں میری مدد کرنے نہیں آئے۔ مجھ سے دشمنی کرنے آئے ہیں۔ حاکموں کے مَن میں پھوج کے مَن میں پولیس کے مَن میں جو دیا اور دھرم کا کھیال آتا۔ آپ لوگوں نے جمع ہو کر اُس کھیال کو گُسا بنا دیا ہے۔ میں حاکموں کو دکھا دیتا کہ ایک گریب اندھا آدمی ایک پھوج کو کیسے پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ توپ کا مُنہ کیسے بند کر دیتا ہے۔ تلوار کی دھار کیسے موڑ دیتا ہے۔ میں دھرم کے بل پر لڑنا چاہتا تھا.......

اس کے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ مسٹر کلارک نے اُسے کھڑے ہو کر کچھ بولتے ہوئے سُنا تو سمجھے کہ اندھا لوگوں کو فساد کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اُنہوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک روح یہاں موجود رہے گی اعضاء کی حرکت کبھی بند نہ ہوگی۔ اس لئے روح کو جُدا کر دینا ضروری ہے۔ منبع کو بند کر دینے سے چشمہ کی روانی خود بخود بند ہو جائے گی۔ وہ اسی تاک میں لگے ہوئے کہ اس خیال کو کس طرح عمل میں تبدیل کریں۔ مگر سُورداس کے گرد روز ہی آدمیوں کا مجمع رہتا تھا۔ کلارک کو مناسب موقع نہ ملتا تھا۔ اب جو اُس کے سر کو اوپر اُٹھا ہوا دیکھا تو اُنہیں وہ موقع مل گیا۔ وہ سنہرا موقع تھا جس کے ملنے پر ہی اس جنگ کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اُسے وہ جانتے تھے۔ مجمع میں جوش پیدا ہوگا۔ وہ پتھر برسائے گا۔ گھروں میں آگ لگائے گا۔ سرکاری دفتروں کو لوٹے گا۔ ان شرارتوں کو مٹا دینے کے لئے اُن کے پاس کافی طاقت تھی۔ اصل چیز تھی اندھے کو رزم گاہ سے ہٹا دینا۔ یہی زندگی کا مرکز ہے۔ یہی حرکت دینے والی طاقت ہے۔ اُنہوں نے جیب سے پستول نکالا اور سورداس پر فائر کر دیا۔ نشانہ بیٹھا تھا۔ گولی سُورداس کے کندھے میں لگی۔ سر لٹک گیا اور خون بہنے لگا۔ بھیرو اُسے سنبھال نہ سکا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ روحانی طاقت مادی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکی ۔

صوفیا نے مسٹر کلارک کو جیب سے پستول نکالتے اور سورداس کو نشانہ بناتے دیکھا تھا۔ اُس کو زمین پر گرتے دیکھ کر سمجھ گئی کہ قاتل نے اپنا کام پورا کر دیا۔ فٹن پر کھڑی تھی۔ نیچے کُود پڑی اور مقتل کی طرف دوڑی جیسے کوئی ماں اپنے بچّہ کو کسی آنے والی گاڑی کی زد میں دیکھ کر

بے تحاشا دوڑ پڑے۔ و نے اُس کے پیچھے پیچھے اُسے روکنے کے لئے دوڑے وہ کہتے جاتے تھے "صوفیا۔ ایشور کے لئے وہاں نہ جاؤ۔ مجھ پر اتنا رحم کرو۔ دیکھو گورکھے بندوقیں سنبھال رہے ہیں۔ ہائے تم نہیں مانتیں۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے صوفیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف کھینچا۔ لیکن صوفیا نے ایک جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر دوڑی۔ اُسے اس وقت کچھ نہ سُوجھتا تھا۔ نہ گولیوں کا خوف تھا نہ سنگینوں کا۔ لوگ اُسے دوڑتے دیکھ کر خودبخود راستہ سے ہٹتے جاتے۔ گورکھے سپاہی سامنے کھڑے تھے مگر صوفیا کو دیکھ کر وہ بھی ہٹ گئے۔ مسٹر کلارک نے پہلے ہی سخت تاکید کر دی تھی کہ کوئی سپاہی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ ونے اِس فوجی دیوار کو پار نہ کر سکے۔ رقیق شے سُوراخ کے راستہ نکل گئی مگر ٹھوس چیز نہ نکل سکی ÷

صوفیا نے جا کر دیکھا تو سورداس کے شانہ سے خون بہہ رہا تھا اعضا سُست پڑ گئے تھے۔ چہرہ بگڑ گیا تھا مگر آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں اور ان میں سکون، قناعت اور صبر کی چمک تھی۔ اُن میں عفو تھا۔ غصہ اور خوف کا نام نہ تھا۔ صوفیا نے فوراً رومال نکال کر زخم پر باندھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اِنہیں شفاخانہ بھیجنا چاہئے۔ ابھی جان ہے۔ ممکن ہے بچ جائیں۔ پھر ونے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ صوفیا اُسے اپنی گاڑی تک لائی۔ اُس پر سورداس کو لٹا دیا۔ خود گاڑی پر بیٹھ گئی اور کوچوان کو شفاخانہ چلنے کا حکم دیا ÷

مجمع مایوسی اور غصہ سے دیوانہ ہو گیا۔ ہم بھی یہیں مر مٹیں گے! کسی کو یہ ہوش نہ رہا کہ یوں مر مٹنے سے اپنے سوا کسی دوسرے کا کیا نقصان ہو گا۔ بچہ مچلتا ہے تو جانتا ہے کہ ماں مجھے بچا لے گی۔ یہاں کون ماں تھی جو ان مچلنے والوں کی حفاظت کرے۔ لیکن غصہ میں دور اندیشی کے کواڑ بند ہو

جاتے ہیں۔ لوگوں کا دہ سمندر اُمنڈتا ہوا گورکھوں کی طرف چلا۔ بستی کے والنٹیر گھبرائے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے لیکن اُن کی فہمایش کا کسی پر اثر نہ ہوتا تھا۔ لوگ دوڑ دوڑ کر اینٹ کنکر پتھر جمع کر رہے تھے۔ کھنڈروں میں ملبہ کی کیا کمی۔ دیکھتے دیکھتے جگہ جگہ پتھروں کے انبار لگ گئے ؛

ونے نے دیکھا کہ اب غضب ہوا چاہتا ہے۔ آن واحد میں سینکڑوں جانوں پر بن جائے گی۔ فوراً ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھ کر بولے —
دوستو! یہ غصہ کا موقع نہیں ہے انتقام کا موقع نہیں ہے بلکہ حق کی فتح پر خوشی اور جشن منانے کا موقع ہے ؛

ایک آدمی بولا۔ ارے یہ تو کنور ونے سنگھ ہیں ؛

دوسرا۔ واقعی خوشی اور جشن منانے کا موقع ہے۔ منائیے۔ شادی مبارک ہو ؛

تیسرا۔ جب میدان صاف ہوگیا تو آپ مردوں کی لاش پر آنسو بہانے آئے ہیں۔ جائیے خواب گاہ میں مزے اُڑائیے۔ یہ تکلیف کیوں اُٹھاتے ہیں ؟

ونے۔ ہاں یہ خوشی منانے کا موقع ہے کہ اب بھی ہماری گری ہوئی پامال اور خستہ حال قوم اتنی عجیب روحانی طاقت ہے کہ ایک بیکس مجہول۔ اندھا بھکاری طاقت ور حکام کا اتنی مردانگی سے مقابلہ کر سکتا ہے ؛

ایک آدمی نے طنز سے کہا۔ ایک بیکس اندھا جو کچھ کر سکتا ہے وہ راجے رئیس نہیں کر سکتے ؛

دوسرا۔ محل کے بالاخانہ میں جا کر سوئیے۔ دیر ہو رہی ہے۔ ہم بدنصیبوں کو مرنے دیجئے ؛

تیسرا۔ سرکار سے کتنا انعام ملنے والا ہے ؟

چوتھا۔ آپ ہی نے تو راجپوتانہ میں دربار کی طرف ہو کر رعایا کو آگ میں جھونک دیا تھا۔

ونے۔ میری ملامت کا موقع پھر آئے گا۔ اگرچہ میں چند خاص وجوہ سے اِدھر آپ کا ساتھ نہ دے سکا مگر ایشور جانتا ہے کہ میری ہمدردی آپ ہی کے ساتھ تھی۔ مَیں ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کی طرف سے غافل نہ تھا۔

ایک آدمی۔ یار دیہاں کھڑے کھڑے کیا بکواس کر رہے ہو؟ کچھ دم ہو تو چلو کٹ مریں۔

دوسرا۔ یہ لکچر بازی کا موقع نہیں ہے۔ آج ہمیں یہ دکھانا ہے کہ ہم حق کے لئے کتنی دلیری سے جان دے سکتے ہیں۔

تیسرا۔ چل کر گورکھوں کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی شخص قدم پیچھے نہ ہٹا دے۔ زمیں اپنی لاشوں کا ڈھیر لگا دو۔ بال بچّوں کو خدا پر چھوڑ دو۔

چوتھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آگے بڑھ کر للکاریں کہ بندوں کا خون بھی جوش کھانے لگے۔ ہمیں سمجھانے چلے ہیں۔ گویا ہم دیکھتے نہیں کہ سامنے فوج بندوقیں بھرے کھڑی ہے اور ایک ہی باڑھ میں ہمارا صفایا کر دے گی۔

پانچواں۔ بھائی۔ ہم غریبوں کی جان سستی ہوتی ہے۔ رئیس زادہ ہوتے تو ہم بھی دور ہی سے کھڑے تماشہ دیکھتے۔

چھٹواں۔ اِس سے کہو کہ جا کر چلّو بھر پانی میں ڈوب مرے۔ ہمیں اُس کے نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ اُنگلی میں خون لگا شہید بننے چلے ہیں۔

یہ حقارت آمیز طنزیہ اور سخت الفاظ ونے کے دل میں تیر کی طرح اُتر گئے۔ ہائے رے قسمت۔ میری زندگی بھر کی خدمت۔ قربانی

اور نفس کشی کا یہی نتیجہ ہے! اپنا سب کچھ قومی خدمت کی قربان گاہ پر چڑھا کر روٹیوں کو محتاج ہو جانے کا یہی صلہ ہے! کیا ریاست کی بدنامی میرے سَر سے کبھی نہ دور ہوگی؟ یہ کہتے ہوئے وہ بھول گئے کہ "میں یہاں عوام کی حفاظت کرنے آیا ہوں۔ گورکھا فوج سامنے کھڑی ہے۔ میں یہاں سے ہٹا کہ ایک لمحہ میں انسانوں کا وحشیانہ قتل ہونے لگے گا۔ میرا خاص فرض عوام کو آخیر تک روکے رہنا ہے۔ کوئی مضایقہ نہیں اگر اُنہوں نے طعنے دئے۔ میری تحقیر کی۔ مجھے بدنام کیا۔ نا ملائم الفاظ کہے۔ میں قصوروار ہوں۔ اگر نہیں ہوں تو بھی مجھے صبر و تحمّل سے کام لینا چاہئے۔" یہ سبھی باتیں وہ بھول گئے۔ موقع شناس آدمی وقت کے موافق کام کرتا ہے۔ جہاں دبنا چاہئے وہاں دب جاتا ہے۔ جہاں تیز پڑنا چاہئے وہاں تیز پڑتا ہے۔ اُسے عزت یا ذلت سے خوشی یا رنج نہیں ہوتا۔ اُس کی نگاہ برابر اپنے مقصد پر رہتی ہے۔ وہ پُرجوش ثابت قدمی کے ساتھ اُسی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن سادہ مزاج غیر تمند اور صاف دل لوگ بادلوں کی مانند ہوتے ہیں جو بادِ موافق کو پاکر زمین کو سیراب کر دیتے ہیں اور بادِ مخالف کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ سیاست داں شخص کے لئے اپنا معیار ہی سب کچھ ہے۔ ضمیر کی اُس کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں۔ باعزت آدمیوں کے لئے اپنی اخلاقی قوت ہی سب سے بڑھ کر ہے۔ وہ اپنے اخلاق پر کئے گئے حملوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی بیگناہی ثابت کرنا اپنی معیار پسندی سے کہیں زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ونے کا خوب صورت چہرہ تمتما اُٹھا اور اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ دیوانہ وار متحرک مجمع کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔ "کیا آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ رئیسوں کے بیٹے کیونکر جان دیتے ہیں؟ دیکھئے۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے جیب سے بھرا ہوا پستول نکالا۔ اُس کی نال سینہ میں لگائی اور جب تک لوگ دوڑیں زمین پر گر پڑے۔ لاش تڑپنے لگی۔ دل کی ساری تمنائیں خون کا فوارہ بن کر نکل گئیں۔ اُسی وقت بارش ہونے لگی گویا جنّت کی روحیں پھول برسا رہی تھیں ۔

زندگی کا رشتہ کتنا نازک ہے! کیا پھول سے بھی زیادہ نازک نہیں جو ہوا کے جھونکے سہتا ہے اور مُرجھاتا نہیں؟ کیا وہ بیلوں سے زیادہ نازک نہیں جو درختوں کے جھونکے سہتی اور اُن سے لپٹی رہتی ہے؟ کیا وہ حباب آپ سے زیادہ نازک نہیں جو موجوں پر تیرتے ہیں اور ٹوٹتے نہیں؟ دنیا میں اور کون سی چیز اتنی بے ثبات ہے جس کے لئے ایک طنز ایک سخت لفظ بھی قابلِ برداشت اور مہلک ہے! اسی نازک بنیاد پر کتنے زبردست اور عالی شان محلوں کی تعمیر کی جاتی ہے!

مجمع ششدر اور دم بخود رہ گیا جیسے آنکھوں میں اندھیرا چھا جائے۔ اُن کا غصّہ رحم کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ چاروں طرف سے دوڑ دوڑ کر لوگ آنے لگے۔ دنے کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو پاک بنانے اور اُنکی لاش پر چار بوند آنسو بہانے کے لئے جو دشمن تھا خود غرض تھا عیش پسند تھا وہی ایک لمحہ میں دیوتا کی طرح ایثار کا مجسمہ ملک کا پیارا اور قوم کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا۔ جو لوگ گورکھوں کے سامنے پہنچ گئے تھے وہ بھی واپس آ گئے۔ ہزاروں غمگین آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ جو قدرتی بارش سے مل کر زمین کو سیراب کر رہی تھی۔ ہر دل فرطِ غم سے بیقرار تھا۔ ہر دل اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا۔ ہر دل پشیمان ہو رہا تھا آہ یہ ہمارے ہی طعنوں ہماری سخت کلامی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اسی کے

قاتل ہیں۔ اس کا خون ہماری ہی گردن پر ہے۔ ہائے کتنا بہادر کتنا بُردبار کتنا متین۔ کتنا فراخ دل۔ کتنا غیرت مند۔ کتنا خوددار۔ غریبوں کا کتنا سچا خدمت گزار اور انصاف کا کتنا سچا پجاری تھا۔ جس نے اتنی بڑی ریاست خس و خاشاک سمجھا اور ہم کمظرفوں نے اُس کا خون کر ڈالا اُسے نہ پہچانا۔

ایک نے رو کر کہا۔ خدا کرے میری زبان جل جائے۔ میں نے ہی شادی پر مبارکبادی کا طعنہ دیا تھا۔

دوسرا بولا۔ دوستو۔ اِس لاش پر فدا ہو جاؤ اس پر نثار ہو جاؤ۔ اس کے قدموں پر گر کر قربان ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر اُس نے کمر سے تلوار نکالی۔ اپنی گردن پر پھیر لی اور سد میں تڑپنے لگا۔

تیسرا سر پیٹتا ہوا بولا۔ کتنا پُرجلال چہرہ ہے۔ ہائے میں کیا جانتا تھا کہ میرا طعنہ بجلی کا کام کرے گا۔

چوتھا۔ ہمارے دلوں کا یہ زخم ہمیشہ ہرا رہے گا۔ ہم اِس فرشتہ خصلت انسان کو کبھی بھول نہ سکیں گے۔ کتنی بہادری سے جان دے دی۔ جیسے کوئی ایک پیسہ نکال کر بھکاری کے سامنے پھینک دے۔ رئیس زادوں میں یہی اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ اگر جینا جانتے ہیں تو مرنا بھی جانتے ہیں رئیس کی یہی پہچان ہے کہ بات پر مر مٹے۔

اندھیرا ہوتا جاتا تھا۔ پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ کبھی ذرا دیر کے لئے بوندیں ہلکی پڑ جاتیں اور پھر زور زور سے گرنے لگتیں۔ جیسے کوئی رونے والا تھک کر ذرا دم لے لے اور پھر رونے لگے۔ زمین نے پانی کی چادر میں مُنہ چھپا لیا تھا۔ ماتا مُنہ پر انچل ڈالے رو رہی تھی۔ رہ

رہ کر ٹوٹی ہوئی دیواروں کے گرنے کا دھماکا ہوتا تھا۔ جیسے کوئی سینہ پیٹ پیٹ کر ماتم کر رہا ہو۔ لحہ لحہ پر بجلی کوندتی تھی جیسے آسمان پر روحیں ماتم کر رہی ہوں۔ دَم دَم کے میں یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اندو مسٹر جان سیوک کے ساتھ تھی۔ یہ خبر سنتے ہی غش کھا کر گر پڑی ؛

دنے کی لاش پر ایک چادر تان دی گئی تھی۔ چراغوں کی روشنی میں اس کا چہرہ اب بھی پھولوں کی طرح شگفتہ تھا۔ دیکھنے والے آتے تھے۔ روتے تھے اور عزاداروں کی صف میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ کوئی کوئی پھول کی مالا رکھ دیتا تھا۔ جانباز لوگ یونہی مرتے ہیں۔ تمنائیں اُن کے گلے کی زنجیر نہیں ہوتیں۔ نفسانی خواہشات اُن کے پیروں کی بیڑیاں نہیں بنتیں۔ اُنہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ میرے بعد کون ہنسے گا اور کون روئے گا۔ اُنہیں اس کا خوف نہیں ہوتا کہ میرے بعد کام کون سنبھالے گا؟ یہ سب دُنیا سے چمٹنے والوں کے بہانے ہیں۔ بہادر لوگ آزاد ہوتے ہیں جب تک جیتے ہیں بیفکری سے جیتے ہیں۔ جب مرتے ہیں بیفکری سے مرتے ہیں؟

ہم داستانِ غم کو کیوں طول دیں؟ جب بیگانوں کی آنکھوں سے آنسو اور دلوں سے آہ نکل پڑتی تھی تو یگانوں کا کہنا ہی کیا۔ نایک رام سورداس کے ساتھ شفا خانہ گئے تھے۔ لوٹے ہی تھے کہ یہ منظر دکھائی دیا۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر ونے کے قدموں پر سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگے۔ ذرا طبیعت ٹھکانے ہوئی تو صوفیا کو خبر دینے چلے جو ابھی شفا خانہ ہی میں تھی ؛

نایک رام راستہ بھر دوڑتے ہوئے گئے مگر صوفیا کے پاس پہنچے تو گلا اتنا بھر گیا کہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اُس کی طرف دیکھ کر سسک

سسک سسک کر رونے لگے۔ صوفیا کے دل میں درد سا اُٹھا۔ ابھی نایک رام گئے اور اُلٹے پاؤں واپس آئے۔ ضرور کوئی بُری خبر ہے۔ پوچھا "کیا ہے پنڈا جی"؟ یہ پوچھتے ہی اُس کا گلا بھی بھر آیا۔

نایک رام کی سسکیاں فریاد و فغاں میں تبدیل ہوگئیں۔ صوفیا نے دوڑ کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا "کیا ونئے"؟ یہ کہتے کہتے فرطِ غم کی حالت میں شفاخانہ سے نکل پڑی اور پانڈے پور کی طرف چلی۔ نایک رام آگے آگے لالٹین دکھاتے ہوئے چلے۔ پانی نے جل تھل ایک کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کے درخت جو اب پانی میں کھڑے تھے سڑک کا پتہ دے رہے تھے۔ صوفیا کا رنج ایک ہی لمحہ میں پشیمانی کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ ہائے میں ہی ہتیارن ہوں۔ کیوں آسمان سے بجلی گر کر مجھے جلا نہیں دیتی؟ کیوں کوئی سانپ زمین سے نکل کر مجھے ڈس نہیں لیتا؟ کیوں زمین پھٹ کر مجھے نگل نہیں جاتی؟ ہائے آج میں وہاں نہ گئی ہوتی تو وہ ہرگز نہ جاتے۔ میں کیا جانتی تھی کہ مقدر مجھے تباہی و بربادی کی طرف لئے جاتا ہے؟ میں دل میں اُن پر جھنجھلا رہی تھی۔ مجھے یہ شک بھی ہوا تھا کہ یہ ڈرتے ہیں۔ آہ۔ یہ سب میرے کارن ہوا۔ میں ہی اپنی بربادی کا سبب ہوں۔ میں اپنے ہی ہاتھوں لُٹ گئی۔ ہائے میں اُن کی محبت کے معیار کو نہ پہنچ سکی"۔

پھر اس کے دل میں خیال آیا۔ کہیں یہ خبر غلط نہ ہو۔ اُنہیں صرف چوٹ لگی ہو اور وہ بیہوش ہوگئے ہوں۔ آہ۔ کاش میں ایک بار اُن کی باتوں سے اپنے دل کو پاک بنا لیتی۔ نہیں نہیں وہ زندہ ہیں۔ ایشور مجھ پر اتنا ظلم نہیں کر سکتے۔ میں نے کبھی کسی مخلوق کو ایذا نہیں پہنچائی۔ میں

کبھی بداعتقاد نہیں ہوئی۔ پھر وہ مجھے اتنی سخت سزا کیوں دے گا؟

جب صوفیا موقع واردات کے قریب پہنچی تو اُس پر ایک زبردست خوف کا غلبہ ہوا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک میل کے پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہاں کیسے جاؤں؟ کیسے اُنہیں دیکھوں گی؟ ان کی موت کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اُن کی لاش خاک و خون میں لپٹی ہوئی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اسے اُس نے گویا جیتے جاگتے دیکھا تھا۔ اُسے اس بُری حالت میں وہ کیسے دیکھے گی؟ اُسے اس وقت زبردست خواہش ہوئی کہ وہاں جاتے ہی میں بھی اُن کے قدموں پر گر کر جان دے دوں اب دُنیا میں میرے لئے کون سا آرام ہے۔ ہائے یہ صبر آزما جدائی! کیسے برداشت ہوگی؟ میں نے اپنی زندگی کو تباہ کر دیا۔ ایسے اعلیٰ آدمی کو مذہب کی وحشیانہ نمونہ پر قربان کر دیا۔

اگرچہ وہ جانتی تھی کہ ونے کا انتقال ہوگیا۔ پھر اُسے ایک چھوٹی اُمید ہو رہی تھی کہ کون جانے اُنہیں صرف غش آگیا ہو۔ دفعتاً اُسے اپنے عقب سے ایک موٹر کار پانی کو چیرتے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ اُس کی تیز روشنی میں پھٹا ہوا پانی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دونوں طرف سے آبی جانور اُس پر حملہ کر رہے ہوں۔ وہ نزدیک آکر رُکا۔ رانی جانھوی تھیں۔ صوفیا کو دیکھ کر بولیں۔ بیٹی۔ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ آؤ میرے ساتھ چلو۔ کیا گاڑی نہ ملی؟

صوفیا چیخ مار کر رانی سے لپٹ گئی مگر اُن کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اور نہ چہرہ پر آثارِ غم۔ اُن کی آنکھوں میں غرور کا نشہ چھا رہا تھا اور چہرہ پر فاتحانہ مسرت کی نمود تھی۔ صوفیا کو گلے سے لگاتی ہوئی بولیں۔ کیوں

روتی ہو بیٹی ؟ دنے کے لئے ؟ بہادروں کی موت پر آنسو نہیں بہائے جاتے۔ خوشی کا راگ گایا جاتا ہے۔ میرے پاس ہیرے جواہرات ہوتے تو اُس کی لاش پر لٹا دیتی۔ مجھے اُس کے مرنے کا غم نہیں ہے۔ غم ہوتا اگر وہ آج جان بچا کر بھاگتا۔ وہ تو میری دیرینہ خواہش تھی۔ نہایت دیرینہ۔ جب میں نوجوان تھی اور بہادر راجپوتوں اور راجپوتنیوں کی قربانی کی داستانیں پڑھا کرتی تھی۔ اُسی وقت میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایشور مجھے بھی کوئی ایسا ہی سپوت دیتا جو انہیں جانبازوں کی طرح موت سے کھیلتا۔ جو اپنی زندگی کو ملک و قوم کی خدمت میں قربان کر دیتا۔ جو اپنے خاندان کا نام روشن کرتا۔ میری وہ خواہش پوری ہو گئی۔ آج میں ایک جانباز بیٹے کی ماں ہوں۔ کیوں روتی ہو؟ اس سے اُس کی روح کو تکلیف ہو گی۔ تم نے تو مذہبی کتابیں پڑھی ہیں۔ انسان کبھی مرتا ہے ؟ روح تو غیر فانی ہے۔ اُسے تو ایشور بھی فنا نہیں کر سکتا۔ موت تو صرف نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ ایک بہتر زندگی کا راستہ۔ دنے پھر دُنیا میں آئے گا۔ وہ اور زیادہ نیک نام ہوگا۔ جس موت پر گھر والے روئیں وہ بھی کوئی موت ہے۔ وہ تو ایڑیاں رگڑنا ہے۔ شاندار موت وہی ہے۔ جس پر بیگانے روئیں اور یگانے خوشی منائیں۔ شاندار موت شاندار زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ شاندار زندگی میں بدنام ہو کر مرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ شاندار موت میں یہ اندیشہ کہاں ؟ کوئی زندگی شاندار نہیں ہے جب تک کہ اُس کا انجام بھی ویسا ہی نہ ہو۔ یہ لو۔ پہنچ گئے۔ کتنے زور کی بارش ہے۔ کیسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ پھر بھی ہزاروں آدمی اُس کی لاش پر آنسو بہا رہے ہیں۔ کیا یہ رونے کا مقام ہے ؟

موٹر رُکا۔ صوفیا اور جاہنوی کو دیکھ کر لوگ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔
اندو دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔ ہزاروں آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔
رانی نے ونے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اُسے سینہ سے لگایا۔ اُس کا بوسہ
لیا اور ماتمی مجمع کی طرف فخر آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ یہ نوجوان جس
نے ونے پر اپنی جان نچھاور کر دی۔ ونے سے بڑھ کر ہے۔ کیا کہا؟ مسلمان
ہے! فرض کے دائرہ میں ہندو مسلمان کا فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی کشتی
پر سوار ہیں۔ ڈوبیں گے تو دونوں۔ بچیں گے تو دونوں۔ میں اس بہادر
شخص کا یہیں مزار بنواؤں گی۔ شہید کے مزار کو کون کھود کر پھینک دے
گا؟ کون اتنا سفلہ اور کمینہ ہوگا؟ یہ سچا شہید تھا۔ تم لوگ کیوں روتے
ہو؟ ونے کے لئے؟ تم لوگوں میں کتنے ہی نوجوان ہیں کتنے ہی بال بچوں
والے ہیں۔ نوجوانوں سے میں کہوں گی "جاؤ اور ونے کی طرح قربان
ہونا سیکھو۔ دُنیا صرف پیٹ پالنے کی جگہ نہیں ہے۔ ملک کی آنکھیں تمہاری
طرف لگی ہوئی ہیں۔ تمہیں اُس کا بیڑا پار لگاؤ گے۔ گرہستی کے جال میں نہ
پھنسو۔ جب تک ملک کا کچھ کام نہ کر لو۔ دیکھو ونے کیسا ہنس رہا ہے۔
جب بچہ تھا اُس وقت کی یاد آتی ہے۔ اسی طرح ہنستا تھا۔ کبھی اُسے روتے
نہیں دیکھا۔ کتنی عجیب ہنسی ہے۔ کیا اس نے دولت کے لئے جان دی؟
دولت اُس کے گھر میں بھری ہوئی تھی۔ اُس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی
نہیں دیکھا۔ برسوں ہو گئے پلنگ پر نہیں سویا۔ جوتے نہیں پہنے پیٹ
بھر کھانا نہیں کھایا۔ ذرا دیکھو اُس کے پیروں میں کیسے گھٹے پڑ گئے ہیں
وہ سادھو تھا۔ تم لوگ بھی ایسے ہی سادھو بن جاؤ" بال بچے والوں
سے میری التجا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کو چکی کا بیل نہ بناؤ۔ خانہ داری

کا غلام نہ بناؤ۔ ایسی تعلیم دو کہ زندہ رہیں۔ زندگی کے غلام بن کر نہیں بلکہ زندگی کے مالک بن کر۔ یہی تعلیم ہے جو اس سرفروش نے تمہیں دی ہے۔ جانتے ہو۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ یہی پیاری لڑکی میری بہو بننے والی تھی۔ کسی نے ایسا دلکش حسن۔ ایسا روحانی جلوہ دیکھا ہے؟ اپسرائیں اس کے آگے پانی بھریں۔ علم میں اس کے سامنے کوئی پنڈت نہیں کھول سکتا۔ زبان پر سرسوتی ہے گھر کا اجالا ہے۔ دلے کو اس سے کتنی محبت تھی۔ یہ اسی سے پوچھو۔ لیکن کیا ہوا؟ جب موقع آیا تو اُس نے محبت کے رشتہ کو کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا۔ اُسے اپنی توہین کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اُس پر اپنے مقصد کو قربان نہیں کیا۔ پیار و پیٹ پر اپنی جوانی کو اپنی روح کو اپنی اُمنگوں کو نہ قربان کرو۔ اندو بیٹی کیوں روتی ہو؟ کس کو ایسا بھائی ملا ہے؟

اندو کے دل میں بڑی دیر سے آگ سی جل رہی تھی۔ وہ اِن سارے دُکھوں کا اصلی سبب اپنے شوہر کو سمجھتی تھی۔ اب تک آگ دل میں تھی۔ اب باہر نکل پڑی۔ یہ خیال نہ رہا کہ میں اتنے آدمیوں کے سامنے کیا کہتی ہوں۔ جواز کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بولی۔ ماتا جی۔ اس خون کا الزام میرے سر ہے۔ مَیں اب اُس شخص کا منہ نہ دیکھوں گی جس نے میرے دلاور بھائی کی جان لے کر چھوڑی اور یہ صرف اپنی خود غرضی کو پورا کرنے کے لئے۔

رانی جاہنوی نے تیز لہجہ میں کہا۔ کیا مہیندر کو کہتی ہے؟ اگر پھر میرے سامنے مُنہ سے ایسی بات نکالی تو تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔ کیا تو اُنہیں اپنا غلام بنا کر رکھے گی؟ تو عورت ہو کر چاہتی ہے کہ کوئی میرا

ہاتھ نہ پکڑے تو وہ مرد ہو کر کیوں نہ ایسا چاہیں؟ وہ دُنیا کو کیوں تیری ہی آنکھوں سے دیکھیں؟ کیا بھگوان نے اُنہیں آنکھیں نہیں دیں؟ اپنے نفع و نقصان کا حساب دار تجھے کیوں بنائیں؟ کیا بھگوان نے انہیں عقل نہیں دی۔ تیری سمجھ میں اور میری سمجھ میں اور یہاں جو لوگ ہیں اُن کی سمجھ میں وہی راستہ اچھا ہے جس پر ہم چل رہے ہیں۔ مگر اُن کی سمجھ میں وہ راستہ خطرناک ہے۔ درندوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا بُرا ماننا کیا؟ اگر تجھے اُن کی باتیں پسند نہیں آتیں تو کوشش کر کہ پلٹ آئیں۔ وہ تیرے سوامی ہیں تیرے لئے اُن کی خدمت سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔

دس بج گئے تھے۔ لوگ کنور بھرت سنگھ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب دس کے گھنٹہ کی آواز کانوں میں آئی تو رانی جانھوی نے کہا۔ اُن کی راہ اب نہ دیکھو۔ وہ نہ آئیں گے اور نہ آسکتے ہیں۔ وہ اُن باپوں میں ہیں جو بیٹے کے لئے جیتے ہیں اور بیٹے کے لئے مرتے ہیں اور بیٹے کے بیٹوں کے لئے منصوبے باندھتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہوگا۔ تمام دُنیا سُونی معلوم ہوتی ہوگی۔ بیہوش پڑے ہوں گے ممکن ہے۔ مر بھی گئے ہوں۔ اُن کا مذہب اُن کا فرض اُن کی زندگی۔ اُن کی موت اُن کا دین۔ اُن کی دُنیا سبھی کا انحصار اِسی اکلوتے بیٹے پر تھا۔ اب وہ بے سہارا ہیں۔ اُن کی زندگی کا کوئی مقصد کوئی معیار نہیں وہ اب ہرگز نہ آئیں گے۔ آ ہی نہیں سکتے۔ چلو۔ ونے کے ساتھ اپنا آخری فرض پورا کر لوں۔ اِنہیں ہاتھوں سے اُسے ہنڈولے میں جھلایا تھا۔ اُنہیں ہاتھوں سے اُسے چتا پر رکھ دوں۔ اِنہیں ہاتھوں سے اُسے کھانا

کھلاتی تھی۔ اُنہیں ہاتھوں سے اُسے گنگا جل پلا دوں +

(۴۴)

گنگا سے لوٹتے لوٹتے دن کے نو بج گئے۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم گلیاں تنگ اور کیچڑ سے بھری ہوئیں۔ قدم قدم پر پھولوں کی بارش۔ والنٹیروں کے قومی گانے۔ گنگا تک پہنچتے ہی پہنچتے سویرا ہو گیا تھا۔ لوٹتے ہوئے جانھوی نے کہا۔ چلو ذرا سورداس کو دیکھتے چلیں۔ نہ جانے مرا کہ بچا سُنتی ہوں۔ زخم کاری تھا +

صوفیا اور جانھوی دونوں شفاخانہ گئیں تو دیکھا کہ سورداس آنکھ میں چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔ بھیرو اُس کے پائنتے کھڑا ہے اور سبھاگی سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔ جانھوی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ اس کی حالت کیسی ہے ؟ بچنے کی کوئی اُمید ہے ؟

ڈاکٹر نے کہا۔ کسی دوسرے آدمی کو ایسا زخم لگا ہوتا تو اب تک مر چکا ہوتا۔ اُس کی قوتِ برداشت حیرت انگیز ہے۔ دوسروں کو نشتر لگاتے وقت کلوروفارم دینا پڑتا ہے۔ اس کے کنارے میں دو انچ گہرا اور دو انچ چوڑا نشتر دیا گیا پر اس نے کلوروفارم نہ لیا۔ گولی نکل آئی ہے مگر بچ جائے تو کہیں +

صوفیا کو رات بھر کی سخت روحانی تکلیف نے اتنا گھلا دیا تھا کہ اُسے پہچاننا مشکل تھا۔ گویا کوئی پھول مرجھا گیا ہو۔ چال سست۔ چہرہ اُترا ہوا۔ آنکھیں بجھی ہوئیں گویا مادی دنیا میں نہیں بلکہ خیالی دنیا میں حرکت کر رہی ہے۔ آنکھوں کو جتنا رونا تھا رو چکی تھیں۔ اب اُس کا بال بال رو رہا تھا۔ اُس نے سورداس کے پاس جا کر کہا۔ سورداس۔ کیسا جی

ہے ؟ رانی جاہنوی آئی ہیں +
سُورداس۔ دھنیہ بھاگ۔ اچھّا ہوں +
جاہنوی۔ درد بہت ہو رہا ہے؟ بہت تکلیف ہے؟
سُوردس۔ کچھ تکلیف نہیں ہے۔ کھیلتے کھیلتے گر پڑا ہوں۔ چوٹ آگئی ہے۔ اچھا ہو جاؤں گا۔ اُدھر کیا ہُوا؟ جھونپڑی بچی کہ گئی؟
صوفیا۔ ابھی تو نہیں گئی ہے۔ پر شاید اب نہ رہے۔ ہم لوگ تو ونے کو گنگا کی گود میں سونپنے چلے آتے ہیں +
سُورداس نے کمزور آواز میں کہا۔ بھگوان کی مرضی۔ بیروں کا یہی دھرم ہے۔ جو گریبوں کے لئے جان دیتا ہے وہی سچّا بیر ہے +
جاہنوی۔ تم سادھو ہو۔ ایشور سے دعا کرو کہ ونے کا پھر اسی دیش میں جنم ہو +
سُورداس۔ ایسا ہی ہو گا ماتا جی ایسا ہی ہو گا۔ اب جہاں (بڑے) پُرس لوگ ہمارے ہی دیس میں جنم لیں گے۔ جہاں انیائے اور ادھرم ہوتا ہے۔ وہیں دیوتا لوگ جاتے ہیں۔ اُن کے سنسکار اُنہیں کھینچ لے جاتے ہیں۔ میرا مَن کہہ رہا ہے کہ کوئی مہاتما تھوڑے ہی دنوں میں اس دیس میں جنم لینے والے ہیں +
ڈاکٹر نے آکر کہا۔ رانی جی میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ سورداس سے باتیں نہ کریں ورنہ زور پڑنے سے اُن کی حالت بگڑ جائے گی۔ ایسی حالت میں سب سے زیادہ خیال اس امر کا ہونا چاہئے کہ مریض کی طاقت زائل نہ ہو۔ اُسے ضعف نہ آنے پائے +
شفاخانہ کے مریضوں اور ملازموں کو جیوں ہی معلوم ہوا کہ ونے سنگھ

کی ماں آئی ہوئی ہیں تو سب اُن کی زیارت کو جمع ہو گئے۔ کتنوں ہی نے اُن کے قدموں کی خاک ماتھے پر چڑھائی۔ یہ دیکھ کر رانی کا دل غرور سے پھول گیا۔ ہنستے ہوئے سبوں کو دعائیں دے کر یہاں سے جانے لگیں۔ تو صوفیا نے کہا۔ ماتا جی۔ آپ کی اجازت ہو تو میں یہیں رہ جاؤں سورداس کی حالت خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی باتوں میں وہ مجذوبیت ہے جو موت کی خبر دے رہی ہے۔ میں نے اسے ہوش میں ایسی باتیں کرتے کبھی نہیں سُنا ❊

رانی نے صوفیا کو گلے لگا کر بخوشی اجازت دی۔ دراصل صوفیہ سیوا بھون (ونے کا مکان) نہ جانا چاہتی تھی۔ وہاں کی ایک ایک چیز وہاں کے پھول پتے حتیٰ کہ وہاں کی ہوا بھی ونے کی یاد دلائے گی۔ جس گھر میں ونے کے ساتھ رہی اُس میں ونے کے بغیر رہنے کا خیال ہی اُسے تڑپائے دیتا تھا ❊

رانی کے چلے جانے پر صوفیا ایک مونڈھا لے کر سورداس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔ سورداس کی آنکھیں بند تھیں مگر چہرہ پر ایک دلآویز سکون چھایا ہوا تھا۔ صوفیا کو آج معلوم ہوا کہ دل کا سکون ہی اصلی حُسن ہے ❊

صوفیا کو وہاں بیٹھے بیٹھے سارا دن گزر گیا۔ وہ بے آب و دانہ اُداس بیٹھی ہوئی گزری ہوئی خوشی کی باتوں کا خواب دیکھ رہی تھی اور جب آنکھیں بھر جاتی تھیں تو آڑ میں جا کر رومال سے آنسو پونچھ آتی تھی۔ اُسے اب سب سے زیادہ رنج اس بات کا تھا کہ میں نے ونے کی کوئی آرزو نہ پوری کی۔ اُنہیں ہمیشہ محروم ہی رکھا۔ اُن کی محبت کی یاد اُس کے دل کو

ایسا محسوس رہی تھی۔ کہ وہ بہت ہی مضطرب و بیقرار تھی ؛

شام ہو گئی تھی۔ صوفیا لیمپ کے سامنے بیٹھی ہوئی سورداس کو خداوند یسوع کے سوانحی حالات سُنا رہی تھی۔ سورداس ایسا محو ہو رہا تھا گویا اُسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ دفعتاً راجہ مہیندر کمار آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُنھوں نے صوفیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صوفیا جیوں کی تیوں بیٹھی رہی۔ اُس نے راجہ صاحب سے ہاتھ نہ ملایا ؛

سُورداس نے پوچھا۔ کون ہے۔ مس صاحب ؟

صوفیا نے کہا۔ راجہ مہیندر کمار ہیں ؛

سُورداس نے تعظیماً اُٹھنا چاہا مگر صوفیا نے لِٹا دیا اور کہا۔ ہلو مت ورنہ زخم کھُل جائے گا۔ آرام سے پڑے رہو ؛

سُورداس۔ راجہ صاحب آئے ہیں۔ اُن کا اتنا آدر بھی نہ کروں ؟ میرے ایسے بھاگ تو ہوئے۔ کچھ بیٹھنے کو ہے ؟

صوفیا۔ ہاں کُرسی پر بیٹھ گئے ہیں ؛

راجہ صاحب نے پوچھا۔ سُورداس۔ کیسا جی ہے ؟

سُورداس بھگوان کی دیا ہے ؛

راجہ صاحب جن باتوں کو ظاہر کرنے یہاں آئے تھے اُنھیں صوفیا کے سامنے زبان پر لاتے ہوئے شرماتے تھے۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر بولے۔ سورداس۔ مَیں تم سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے آیا ہوں۔ اگر میرے بس کی بات ہوتی تو آج اپنی زندگی کو تمہاری زندگی سے بدل لیتا ؛

سُورداس۔ سرکار ایسی بات نہ کہئے۔ آپ راجا ہیں۔ میں بھکاری ہوں۔

آپ نے جو کچھ کیا۔ دوسروں کی بھلائی کے بچار سے کیا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنا دھرم سمجھ کر کیا۔ میرے کارن آپ کو اپجس ملا۔ کتنے گھر ناس ہوئے۔ یہاں یہاں تک کہ اندر دت اور کنور و نے سنگھ جیسے دو انمول رتن ہاتھ سے کھو گئے۔ پر اپنا کیا بس ہے۔ ہم تو کھیل کھیلتے ہیں۔ جیت ہار بھگوان کے ہاتھ ہے وہ جیسا ٹھیک سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔ بس اپنی نیت ٹھیک ہونی چاہئے ؛

راجہ۔ سورداس۔ نیت کو کون دیکھتا ہے۔ میں نے ہمیشہ لوگوں کی بھلائی پر ہی نگاہ رکھی پر آج تمام شہر میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو مجھے کمینہ خود غرض۔ بے ایمان اور گناہگار نہ سمجھتا ہو۔ اور تو کیا۔ میری بیوی بھی مجھ سے نفرت کر رہی ہے۔ ایسی باتوں سے دل کیوں نہ اُداس ہو جائے؟ کیوں نہ دُنیا سے نفرت پیدا ہو جائے ؟ میں تو اب کہیں مُنہ دکھانے لائق نہیں رہا؛

سُورداس۔ اُس کی چنتا (فکر) نہ کیجئے۔ بھا نہ ہ۔ نکسان۔ جینا مرنا نیکنامی بدنامی۔ سب تقدیر کے ہاتھ ہے۔ ہم تو کھالی میدان میں کھیلنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ سبھی کھلاڑی من لگا کر کھیلتے ہیں۔ سبھی چاہتے ہیں کہ ہماری جیت ہو۔ پر جیت تو ایک ہی کی ہوتی ہے۔ تو کیا اِس سے ہارنے والے ہمت ہار جاتے ہیں ؟ وہ پھر کھیلتے ہیں۔ پھر ہار جاتے ہیں تو پھر کھیلتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی تو اُن کی جیت ہوتی ہی ہے۔ جو آج آپ کو بُرا سمجھ رہے ہیں وہی کل آپ کے سامنے سر جھکائیں گے۔ ہاں نیت ٹھیک رہنی چاہئے۔ مجھے کیا اُن کے گھر والے بُرا نہ کہتے ہوں گے جو میرے کارن جان سے گئے ؟ اندر دت اور کنور و نے سنگھ جیسے دو لعل جن کے ہاتھوں سنسار کا کتنا اُپکار (بھلائی) ہوتا سنسار سے اُٹھ گئے۔ جس اپجس (نیکنامی بدنامی) بھگوان کے

ہاتھ ہے۔ ہمارا یہاں کیا بس ہے؟

راجہ۔ آہ۔ سورداس۔ تمہیں نہیں معلوم کہ مَیں کتنی مصیبت میں گرفتار ہوں تمہیں ستانے والے اگر دس پانچ ہوں گے تو تمہارا جس گانے والے بہت ہیں۔ یہاں تک کہ حکام بھی تمہارے صبر۔ تمہاری مضبوطی کی تعریف کر رہے ہیں۔ مَیں تو دونوں طرف سے گیا۔ رعایا اور سرکار دونوں سے باغی ہوا حکام اس ساری گڑبڑ کا الزام میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ اُن کی سمجھ میں بھی مَیں نالائق کوتاہ اندیش اور خودغرض ہوں۔ اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ مُنہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں ؞

سُورداس۔ نہیں نہیں۔ راجہ صاحب۔ نراس ہونا کھلاڑیوں کا دھرم نہیں ہے۔ اب کے ہار ہوئی تو پھر کبھی جیت ہوگی ؞

راجہ۔ مجھے تو یقین نہیں ہوتا کہ پھر کبھی میری عزّت ہوگی۔ مس سیلوک۔ آپ میری کمزوری پر ہنس رہی ہوں گی۔ پر مَیں بہت ہی دُکھی ہوں ؞

صوفیا نے بے اختیاری کے لہجہ میں کہا۔ عوام کے مزاج میں عفو کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اگر اب بھی آپ عوام کو یہ دکھا سکیں کہ اس حادثہ پر آپ کو دلی افسوس ہے تو شاید وہ آپ کی پھر عزّت کرنے لگیں ؞

راجہ نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ سُورداس بول اُٹھا۔ سرکار نیکنامی اور بدنامی بہت سے لوگوں کے سوا گُل مچانے سے نہیں ہوتی۔ سچی نیکنامی اپنے مَن میں ہوتی ہے۔ اگر اپنا مَن بولے کہ مَیں نے جو کچھ کیا وہی مجھے کرنا چاہئے تھا۔ اس کے سوا کچھ اور کرنا مجھے اُچِت (مناسب) نہ تھا تو وہی نیکنامی ہے۔ اگر آپ کو اس مارکاٹ پر دُکھ ہے تو آپ کا دھرم ہے کہ لاٹ صاحب سے اُس کی لکھا پڑھی کریں۔ وہ نہ سُنیں تو جو اُن سے بڑا حاکم ہو اُس سے

کہیں اور جب تک سرکار پر جا کے ساتھ نیائے نہ کرے دم نہ لیں۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے کیا وہی آپ کا دھرم تھا۔ اپنے سوارتھ کے لئے آپ نے کوئی بات نہیں کی۔ تو آپ کو تنک بھی دُکھ نہ کرنا چاہئے۔

صوفیا نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ سرکار کے طرفداروں کے لئے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اُن میں خود غرضی کا شائبہ نہیں ہے۔

راجہ۔ مس سیلوک۔ میں آپ کو صدق دل سے یقین دلاتا ہوں کہ میں نے حکام کے ہاتھوں عزت و وقار پانے کے لئے اُن کی طرفداری نہیں کی اور عہدہ کی لالچ تو مجھے کبھی نہیں رہی۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سی بات تھی۔ جس نے مجھے سرکار کی طرف کھینچا۔ ممکن ہے نقصان کا خوف ہو یا صرف خوشامد۔ پر میری کوئی غرض نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ میں نے اُس جماعت کی نکتہ چینیوں اُس کے پوشیدہ حملوں یا اُس کی طعنہ زنیوں سے ڈر کر ایسا کیا ہو۔ میں خود ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال تھا کہ سرکار سے موافقت رکھ کر رعایا کی جتنی بھلائی کر سکتا ہوں [illegible] سرکار سے مخالفت رکھ کر نہیں کر سکتا۔ مگر آج معلوم ہوا کہ وہاں [illegible] ہونے کی جتنی اُمید ہے اُس سے کہیں زیادہ خوف بُرائی ہونے کا [illegible] عزت و نیکنامی کا راستہ وہی ہے جسے سُورداس نے اختیار کیا۔ سُورداس [illegible] کہ ایشور مجھے ٹھیک راستہ پر چلنے کی سنگت دیں۔

آسمان پر بادل لنڈلا [illegible] تھے۔ سورداس نیند میں غافل تھا۔ اتنی باتیں کرنے سے وہ تھک [illegible] سبھاگی ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لئے ہوئے آئی اور سورداس کے پائنتے بچھا [illegible] پڑ رہی۔ شفا خانہ کے ملازمین چلے گئے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

صوفیا گاڑی کا انتظار کر رہی تھی ——— دس بجے ہوں گے۔ رانی جی
شاید گاڑی بھیجنا بھول گئیں۔ اُنہوں نے شام ہی کو گاڑی بھیجنے کا وعدہ کیا
تھا۔ کیسے جاؤں؟ کیا ہرج ہے۔ یہیں بیٹھی رہوں؟ وہاں رونے کے سوا
اور کیا کروں گی! آہ میں نے ونے کو تباہ کر دیا۔ میرے ہی سبب سے وہ
دوبار فرض کے راستہ سے منحرف ہوئے۔ میرے ہی سبب سے بالآخر آج
اُن کی جان پر بنی! اب اُس موہنی مورت کے دیکھنے کو ترس جاؤں گی۔ میں
جانتی ہوں کہ ہم پھر ملیں گے۔ پر نہیں جانتی کہ کب؟
اُسے وہ دن یاد آ گئے۔ جب بھیلوں کے گاؤں میں اسی وقت وہ
دروازہ پر بیٹھی ہوئی اُن کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اور وہ کمبل اوڑھے ننگے
سر ننگے پیر۔ ہاتھ میں ایک لکڑی لئے آتے تھے۔ اور مسکرا کر پوچھتے تھے
کہ مجھے دیر تو نہیں ہو گئی؟ وہ دن یاد آیا جب راجپوتانہ جاتے وقت ونے
نے اُس کی طرف بیقرار اور مایوس نگاہوں سے دیکھا تھا۔ آہ وہ دن یاد آیا
جب اُس کی طرف دیکھنے پر رانی جی نے اُنہیں تیز نگاہوں سے دیکھا تھا۔
اور وہ سر جھکائے باہر چلے گئے تھے۔ صوفیا رنج سے بے چین ہو گئی جیسے
ہوا کے جھونکے زمین پر پڑی ہوئی گرد کو اوپر اُٹھا دیتے ہیں۔ اسی طرح اس
خاموش رات نے اُس کی یاد کو تازہ کر دیا۔ اُس کا دل ہی سراپا یاد بن گیا
وہ بیقرار ہو کر کرسی سے اُٹھی اور ٹہلنے لگی۔ جی نہ جانے کیا چاہتا تھا ———
کہیں اُڑ جاؤں، مر جاؤں۔ کمبخت دل کو کہاں تک سمجھاؤں؟ کہاں تک صبر
کروں؟ اب نہ سمجھاؤں گی۔ روؤں گی۔ تڑپوں گی۔ خوب جی بھر کر۔ وہ مجھ
پر جان نچھاور کرتا تھا۔ دنیا سے اُٹھ جاتے اور میں اپنے کو سمجھاؤں کہ اب
رونے سے کیا ہو گا! میں روؤں گی۔ اتنا روؤں گی کہ آنکھیں پھوٹ جائیں گی

دل خون ہو کر آنکھوں کے راستہ نکلے گا اور گلا بیٹھ جائے گا۔ آنکھوں کو اب کرنا ہی کیا ہے؟ وہ اب کسے دیکھ کر خوش ہوں گی۔ دل بھی اب متحرک ہو کر کیا کرے گا۔

اتنے میں کسی کی آہٹ سُنائی دی۔ مٹھوا اور بھیرو برآمدہ میں آئے مٹھوا نے صوفیا کو سلام کیا اور سُورداس کی چارپائی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سُورداس نے چونک کر پوچھا۔ کون ہے بھیرو؟

مٹھوا۔ دادا میں ہوں۔

سُورداس۔ بہت اچھے آئے بیٹا۔ تم سے بھینٹ ہو گئی۔ اتنی دیر کیوں ہوئی؟

مٹھوا۔ کیا کروں دادا؟ بڑے بابو سے سانجھ سے چھٹی مانگ رہا تھا مگر ایک نہ ایک کام لگا دیتے تھے۔ ڈاؤن نمبر تھرڈ کو نکالا۔ اب نمبر ون کو نکالا پھر پارسل گاڑی آئی تو اُس پر مال لدوایا۔ ڈاؤن نمبر تھرٹی کو نکال کر تب آنے پایا ہوں۔ اِسی سے تو کلی تھا۔ تبھی اچھا تھا کہ جب جی چاہتا تھا جاتا تھا۔ کوئی روکنے والا نہ تھا۔ نہیں تو اب نہانے کھانے کی چھٹی نہیں ملتی بابو لوگ اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے ہیں۔ کسی کو نوکر رکھنے کی سمائی تو ہے نہیں۔ سینت میت میں کام نکالتے ہیں۔

سُورداس۔ مَیں نہ بلاتا تو تم اب بھی نہ آتے۔ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اندھا آدمی ہے نہ جانے کیسے ہوگا۔ چل کر ذرا حال احوال پوچھتا آؤں۔ تم کو اِس لئے بلایا ہے کہ مر جاؤں تو میرا کریا کرم کرنا۔ اپنے ہاتھوں سے پنڈا دینا۔ برادری کو بھوج دینا اور ہو سکے تو گیا کر آنا۔ بولو اتنا کرو گے؟

بھیرو۔ بھیا تم اُس کی چنتا نہ کرو۔ تمہارا کریا کرم اتنی دھوم سے ہوگا

کہ برادری میں کبھی کسی کا نہ ہوگا ۔

شوُرداس ۔ دھوم دھام سے نام تو ہوگا پر مجھے پہنچے گا تو وہی جوٹھوا دے گا ۔

مٹھوا ۔ دادا ۔ میری ننگا جھوری لے لو ۔ جو میرے پاس دھیلا بھی ہو ۔ کھانے بھر کو تو ہوتا ہی نہیں ۔ بچے گا کیا ؟

شوُرداس ۔ ارے تو کیا تم میرا کریا کرم بھی نہ کروگے ؟

مٹھوا ۔ کیسے کر دوں گا ۔ دادا ؟ کچھ پلّے پاس ہو تب نا ۔

شوُرداس ۔ تو تم نے یہ آسرا بھی توڑ دی ۔ میرے بھاگ میں تمہاری کمائی نہ جیتے جی بدی تھی نہ مرنے کے پیچھے ۔

مٹھوا ۔ دادا ۔ اب منہ نہ کھلواؤ ۔ پر دہ ڈھکا رہنے دو ۔ مجھے جو چٹ کرکے مرے جاتے ہو اس پر کہتے ہو ۔ میرا کریا کرم کر دینا ۔ گیا پراگ کر دینا ۔ ہماری دس بیگھے بھور دتی جمین تھی کہ نہیں ؟ اُس کا ماوجہ ۔ پیسے چار پیسے کچھ تم کو ملا کہ نہیں ؟ اُس میں سے میرے ہاتھ کیا لگا ؟ گھر میں بھی میرا کچھ حصہ ہوتا ہے یا نہیں ؟ حاکموں سے بیر نہ ٹھانتے تو اُس گھر کے تین سو سے کم نہ ملتے ۔ پنڈا جی نے کیسے پانچ ہجار مار لئے ؟ ہے اُن کا گھر پانچ ہجار کا ؟ وردوا پر میرے ہاتھوں کے لگائے دو نیم کے پیڑ تھے ۔ کیا وہ پانچ پانچ روپے میں بھی مہنگے تھے ؟ مجھے تو تم نے ملیا میٹ کر دیا ۔ کہیں کا نہ رکھا ۔ دُنیا بھر کے لئے اچھّے ہوگئے ۔ میری گردن پر تو تم نے چھُری پھیر دی ۔ مجھے تو حلال کر ڈالا ۔ مجھے بھی تو ابھی بیاہ لگائی کرنی ہے ۔ گھر دوار بنوانا ہے ۔ کریا کرم کرنے بیٹھوں تو اُس کے لئے کہاں سے روپے لاؤں ؟ کمائی میں تمہارے سک نہیں ۔ مگر کچھ اُڑایا ۔ کچھ جلایا ۔ اب مجھے بنا چھاہنہ کے چھوڑے چلے

جاتے ہو۔ بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہیں۔ اب تک میں چپ تھا۔ نابالک تھا۔ اب تو میرے بھی ہاتھ پاؤں ہوئے۔ دیکھتا ہوں کہ میری چین کا مادجہ کیسے نہیں ملتا! صاحب لکھ پتی ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ میرا حصہ کیسے دبالیں گے؟ گھر میں بھی میرا حصہ ہوتا ہے (جھانک کر) ممں صاحب پھاٹک پر کھڑی ہیں۔ گھر کیوں نہیں جاتیں؟ اور سن ہی لیں گی تو مجھے کیا ڈر؟ صاحب نے سیدھے سے دیا تو دیا نہیں تو پھر میرے من میں بھی جو آئے گا وہ کروں گا۔ ایک سے دو جان تو ہوں گی نہیں مگر ہاں انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ کسی غریب کی چین لینا دل لگی نہیں ہے"۔

سورداس بھوچکا سا رہ گیا۔ اُسے خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ مٹھوا کے منہ سے مجھے کوئی ایسی سخت باتیں سننی پڑیں گی۔ اُسے بڑا تھا رنج ہوا۔ خصوصاً اس لئے کہ یہ باتیں اُس وقت کہی گئیں جب وہ سکون اور ہمدردی کا خواستگار اور مستحق تھا۔ جب اُسے خواہش تھی کہ میرے عزیز واقارب میرے پاس بیٹھے ہوئے میری تکالیف کے دفعیہ کی تدبیریں کرتے ہوتے۔ یہی وقت ہے جب انسان کو اپنی بڑائی سننے کی خواہش ہوتی ہے جب اُس کا کمزور دل بچوں کی طرح گود میں بیٹھنے کے لئے پیار کے لئے خاطرداری کے لئے خدمت کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ جسے اُس نے بچپن سے بیٹے کی طرح پالا۔ جس کے لئے اُس نے نہ جانے کیا کیا تکلیفیں سہیں۔ وہ آخر وقت آ کر اُس سے اپنا حصہ کا دعوےٰ کر رہا تھا۔ اسے اپنا حق جتا رہا تھا۔ سورداس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بولا۔ بیٹا میری بھول تھی کہ تم سے کریا کرم کرنے کو کہا۔ تم کچھ مت کرنا۔ چاہے میں پنڈا اور جل کے بنا رہ جاؤں پر یہ اُس سے کہیں اچھا ہے کہ تم صاحب سے اپنا مادجہ

مانگو۔ مَیں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنا کانون کا مُڈاجان گئے ہو۔ نہیں تو پیسہ پیسہ کا حساب لکھتا جاتا۔

مٹھوا۔ میں اپنے مادجے کا دعوے جرور کروں گا۔ چاہے صاحب دیں۔ چاہے سرکار دے۔ چاہے کالا چور دے۔ مجھے تو اپنے روپے سے کام ہے

سورداس۔ ہاں سرکار ہی دے دے پر صاحب سے کوئی مطلب نہیں۔

مٹھوا۔ میں تو صاحب سے لوں گا۔ وہ چاہے جس سے دلائیں۔ نہ دلائیں گے تو جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا وہ کروں گا۔ صاحب کچھ لاٹ تو ہیں نہیں۔ میری جائداد اُنہیں ہجم نہ ہونے پائے گی۔ تم کو اُس کا کیا کلک تھا۔ سوچا ہوگا کہ کون میرے بیٹی بیٹا بیٹھا ہوا ہے۔ چپکے سے بیٹھ رہے۔ میں چپکا بیٹھنے والا نہیں ہوں۔

سورداس۔ مٹھوا کیوں میرا دل دکھاتے ہو؟ اس جمین کے لئے میں نے کون سی بات اُٹھا رکھی؟ گھر کے لئے تو جان دے دی! اب اور میرے کئے کیا ہوسکتا تھا؟ لیکن بھلا بتاؤ تو کہ تم صاحب سے کیسے روپے لے لوگے؟ عدالت میں تو تم اُن سے لے نہیں سکتے۔ وہ روپے والے ہیں اور عدالت روپے والوں کی ہے! ہاریں گے بھی تو تمہیں بگاڑ دیں گے۔ پھر تمہاری جمین سرکار نے جاپطے سے لی ہے۔ تمہارا دعوے صاحب پر چلے گا کیسے؟

مٹھوا۔ یہ سب پڑھے بیٹھا ہوں۔ لگادوں گا آگ۔ سارا گودام جل کر راکھ ہو جائے گا (آہستہ سے) بم گولہ بنانا جانتا ہوں۔ ایک گولہ رکھ دوں گا تو پتلی گھر سواہا ہو جائے گا۔ میرا کوئی کیا کرے گا؟

سورداس۔ بھیرو۔ سنتے ہو اُس کی باتیں۔ جرا انہیں سمجھاؤ۔

بھیرو۔ میں تو راستہ بھر سمجھاتا آ رہا ہوں۔ سنتا ہی نہیں ۔

سُورداس۔ تو پھر میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ اس سے ہوشیار رہیں ۔

مٹھوا۔ تم کو گنئو مارنے کی ہتیا لگے جو تم صاحب یا کسی اور سے اس بات کی چرچا تک کرو۔ اگر میں پکڑا گیا۔ تو تمہیں کو اُس کا پاپ لگے گا۔ جیتے جی میرا بُرا چیتا اب مرنے پر بھی میرے لئے کانٹے بونا چاہتے ہو۔ تمہارا تو مُنہ دیکھنا پاپ ہے ۔

یہ کہہ کر مٹھوا غصّہ سے بھرا ہوا چلا گیا۔ بھیرو روکتا ہی رہا پر اُس نے نہ مانا۔ سُورداس آدھ گھنٹہ تک غشی کی سی حالت میں پڑا رہا۔ یہ صدمہ گولی کے زخم سے بھی زیادہ مہلک تھا۔ مٹھوا کی بدمعاشی اُس کے انجام کا خوف۔ اپنی ذمہ داری۔ صاحب کو آگاہ کر دینے کا فرض۔ یہ پہاڑ سی قسم۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ چاروں طرف سے بندھا ہوا تھا۔ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں پڑا ہوا تھا کہ مسٹر جان سیوک آئے۔ صوفیا بھی پھاٹک سے اُن کے ساتھ چلی۔ صوفیا نے دور ہی سے کہا۔ سُورداس۔ پاپا تم سے ملنے آئے ہیں۔ اصل میں تو مسٹر سیوک سُورداس سے ملنے نہیں آئے تھے بلکہ صوفیا سے ماتم پُرسی کا فرض ادا کرنے آئے تھے۔ دن بھر فرصت نہ ملی۔ مِل سے نو بجے چلے تو یاد آئی۔ سیوا بھون گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ صوفیا ہسپتال میں ہے۔ گاڑی اس طرف پھیر دی۔ صوفیا رانی صاحبہ کی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ پاپا آتے ہوں گے۔ اُنہیں دیکھ کر رونے لگی۔ پاپا مجھے چاہتے ہیں۔ اِس کا اُسے ہمیشہ یقین رہا۔ واقعی تھی بھی یہی بات۔ مسٹر سیوک کو ہمیشہ صوفیا کی یاد آتی رہتی تھی۔ کاروبار میں بیحد مصروف رہنے پر بھی وہ صوفیا کی طرف سے بالکل بیفکر نہ تھے۔ البتہ اپنی بیوی سے مجبور تھے جس کا اُن

پر پورا قابو تھا۔ صوفیا کو روتے دیکھ کر اُنہیں ترس آ گیا۔ اُسے گلے سے لگا لیا اور اُس کی دلجوئی کرنے لگے۔ اُنہیں بار بار اِس کارخانہ کو کھولنے جا افسوس ہوتا تھا جو کسی مزمن مرض کی طرح اُن کے گلے پڑ گیا۔ اس کے سبب خاندانی امن میں خلل واقع نہ ہوا۔ سارا کنبہ بارہ باٹ ہو گیا۔ تمام شہر میں بدنامی ہوئی۔ ساری عزت مٹی میں مل گئی۔ گھر سے ہزاروں روپے خرچ ہو گئے اور ابھی تک منافع کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اب مستری اور مزدور بھی کام چھوڑ چھوڑ کر گھر بھاگے جا رہے تھے۔ اُدھر شہر اور صوبہ میں اِس کارخانہ کے خلاف تحریک جاری ہو رہی تھی۔ پربھو سیوک کا ترکِ سکونت چراغ بن کر اُن کے دل کو جلا رہا تھا۔ نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا۔

مسٹر سیوک کوئی نصف گھنٹہ تک صوفیا کو اپنی مصیبت کی داستان سناتے رہے۔ آخر میں بولے۔ صوفیا تمہاری ماما کو یہ رشتہ پسند نہ تھا مگر مجھے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ کنور ونے سنگھ جیسا بیٹا یا داماد پا کر ایسا کون ہے جو اپنے کو خوش نصیب نہ سمجھتا؟ مذہبی اختلاف کی مجھے ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ مذہب ہماری حفاظت اور بہتری کے لئے ہے۔ اگر وہ ہماری روح کو سکون اور جسم کو آرام نہیں دے سکتا تو میں اُسے پُرانے کوٹ کی طرح اُتار کر پھینک دینا ہی پسند کروں گا۔ جو مذہب ہماری روح کی زنجیر ہو جائے اُس سے جتنی جلد ہم اپنی گلو خلاصی کر لیں اُتنا ہی اچھا۔ مجھے ہمیشہ اُس کا افسوس رہے گا کہ بالواسطہ یا بلے واسطہ طریقہ پر میں تمہارا دشمن ہوا۔ اگر مجھے ذرا بھی معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ اتنا طول کھینچے گا اور اس کا انجام اتنا افسوسناک ہے گا تو میں اُس آبادی پر قبضہ کرنے کا نام بھی نہ لیتا۔ میں نے سمجھا تھا کہ باشندے کچھ مخالفت ضرور کریں گے۔ لیکن دھمکانے سے ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ

جانتا تھا کہ لڑائی چھڑ جائے گی اور اُس میں میری ہی ہار ہوگی۔ یہ کیا بات ہے صوفیا ماکہ آج رانی جاہنوی نے میرے ساتھ مہذبانہ اور منکسرانہ سلوک کیا؟ میں تو چاہتا تھا کہ باہر ہی سے نہیں بلالوں لیکن دربان نے رانی صاحبہ سے کہہ دیا اور وہ فوراً باہر نکل آئیں۔ میں پشیمانی و ندامت سے گڑا جاتا تھا اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ بڑا وسیع دل ہے۔ پہلی کی سی رعونت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صوفیا ونے سنگھ کی ناوقت وفات کا کسے رنج نہ ہوگا؟ مگر اُن کی قربانی نے سینکڑوں جانیں بچالیں ورنہ مجمع آگ میں کود پڑنے کو تیار تھا۔ بڑا غضب ہو جاتا۔ مسٹر کلارک نے شورداس پر گولی تو چلا دی تھی۔ مگر عوام کا رُخ دیکھ کر سہمے جاتے تھے کہ نہ جانے کیا ہو۔ بہادر شخص تھا بڑا ہی دلیر اور جانباز!

اس طرح صوفیا کو تسکین دینے کے بعد مسٹر سیوک نے اُس سے گھر چلنے کا اصرار کیا۔ صوفیا نے بات ٹال کر کہا — پاپا اِس وقت مجھے معاف کیجئے۔ شورداس کی حالت بہت نازک ہے۔ میرے یہاں رہنے سے ڈاکٹر اور دیگر ملازمین خاص توجہ کرتے ہیں۔ مَیں نہ ہوں گی تو کوئی اُسے پوچھے گا بھی نہیں۔ آیئے۔ ذرا دیکھئے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اس حالت میں بھی وہ کتنا باہوش ہے۔ اور کتنی دانشمندانہ گفتگو کرتا ہے! مجھے تو وہ انسانی قالب میں کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔

سیوک۔ میرے جانے سے اُسے رنج نہ ہوگا۔

صوفیا۔ کبھی نہیں پاپا۔ اس کا تو خیال ہی تو دل میں نہ لائیے۔ اُسے کینہ یا کدورت چھو تک نہیں گئی۔

دونوں شورداس کے پاس گئے تو وہ پریشانیوں کی تکلیف سے بیقرار

ہو رہا تھا۔ مسٹر سیوک بولے۔ شور داس کیسی طبیعت ہے ؟

شور داس۔ صاحب سلام۔ بہت اچھا ہوں۔ میرے دھنیہ بھاگ۔ مَیں مَرتے مَرتے بڑا آدمی ہو جاؤں گا۔

سیوک۔ نہیں نہیں۔ شور داس۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

شور داس۔ (ہنس کر) اب جی کر کیا کروں گا؟ اس سمے (وقت) مروں گا تو بیکنٹھ پاؤں گا پھر نہ جانے کیا ہو؟ جیسے کھیت کٹنے کا ایک بکھت ہے ویسے ہی مرنے کا بھی ایک بکھت ہوتا ہے۔ پک جانے پر کھیت نہ کٹے تو اناج سڑ جائے گا۔ میری بھی وہی دسا ہو گی۔ مَیں کئی آدمیوں کو جانتا ہوں جو آج سے دس برس پہلے مرتے تو لوگ اُن کا جس گاتے۔ آج اُن کی بُرائی ہو رہی ہے۔

سیوک۔ میرے ہاتھوں تمہیں بہت نقصان پہنچا۔ اس کے لئے مجھے معاف کرنا۔

شور داس۔ میرا تو آپ نے کوئی نکسان نہیں کیا۔ مجھ سے اور آپ سے دُسمنی ہی کون سی تھی؟ ہم اور آپ آمنے سامنے کی بالیوں میں کھیلے۔ آپ نے بھر سک جور لگایا۔ مَیں نے بھی بھر سک جور لگایا۔ جس کو جیتنا تھا جیتا۔ جس کو ہارنا تھا ہارا۔ کھلاڑیوں میں بیر نہیں ہوتا۔ کھیل میں روتے تو لڑکوں کو بھی لاج آتی ہے۔ کھیل میں چوٹ لگ جائے چاہے جان نکل جائے پر بیر نہ ہونا چاہئے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

سیوک۔ شور داس۔ اگر اس فلسفہ کو زندگی کے اِس بھید کو میں بھی تمہاری طرح سمجھ سکتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مجھے یاد ہے تم نے ایک بار

میرے کارخانہ کو آگ سے بچایا تھا۔ مَیں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید آگ میں اور تیل ڈال دیتا۔ تم اس لڑائی میں ہوشیار رہو سورداس۔ میں تمہارے سامنے نادان بچہ ہوں۔ دُنیا کی نظروں میں مَیں جیتا اور تم ہارے۔ مگر میں جیت کر بھی دُکھی ہوں اور تم ہار کر بھی سُکھی ہو۔ تمہارے نام کی پوجا ہو رہی ہے۔ میرا پُتلا بنا کر لوگ جلا رہے ہیں۔ مَیں دولت اور عزت رکھ کر بھی تمہارا سامنا کر کے نہ لڑ سکا۔ سرکار کی آڑ سے لڑا۔ مجھے جب موقع مِلا میں نے تمہارے اوپر ناجائز حملے کئے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔

مرتے ہوئے آدمی کی وہ لوگ بھی کھُلے دل سے تعریف کرتے ہیں جن کی زندگی اُس سے دشمنی کرنے ہی میں گذری ہو۔ کیونکہ اب اُس سے کسی نقصان کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

سُورداس نے فراخ دلی سے کہا۔ نہیں صاحب۔ آپ نے میرے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی۔ دَگا کرنا تو مجبوروں کا ہتھیار ہے۔ بلوان کبھی نیچے نہیں ہوتا۔

سیوک۔ ہاں سورداس۔ ہونا یہی چاہئے جو تم کہتے ہو پر ایسا ہوتا نہیں مَیں ٹھیک قاعدہ پر کبھی نہیں چلا۔ مَیں دُنیا کو کھیل کا میدان نہیں بلکہ لڑائی کا میدان سمجھتا رہا۔ اور لڑائی میں دغا فریب۔ چھپا دلار سبھی کچھ کیا جاتا ہے۔ مذہبی جنگ کا زمانہ اب نہیں رہا۔

سُورداس نے اُس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مٹھوا کی بات صاحب سے کہہ دوں یا نہیں؟ اُس نے کڑی قسم کھائی ہے مگر کہہ دینا ہی مناسب ہے۔ لونڈا ضدی اور بدچلن ہے پھر اُس پر گھیسو کا ساتھ کوئی نہ کوئی شرارت ضرور کرے گا۔ قسم کھا دینے سے تو مجھے ہتیا لگتی نہیں۔

کہیں کچھ کر بیٹھا تو صاحب سمجھیں گے کہ اندھے نے مرنے کے بعد بھی کسر نکالی

بولا ــــ صاحب۔ آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں ۔

سیوک۔ کہو۔ شوق سے کہو ۔

سورداس نے چند لفظوں میں مٹھوا کی بیہودہ باتیں مسٹر سیوک سے کہہ دیں اور آخر میں کہا۔ میری آپ سے اتنی ہی بنتی (عرض) ہے کہ اس پر کڑی نگاہ رکھئے گا۔ اگر موکا پا گیا تو چوکنے والا نہیں ہے۔ تب آپ کو بھی اس پر غصہ آہی جائے گا اور آپ اسے ڈنڈ دینے کا اپاے سوچیں گے۔ میں ان دونو باتوں میں سے ایک بھی نہیں چاہتا ۔

مسٹر سیوک دیگر دولتمند لوگوں کی طرح بدمعاشوں سے بہت ڈرتے تھے۔ متفکرانہ لہجہ میں بولے۔ سورداس تم نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ اس کے لئے تمہارا احسان مند ہوں۔ مجھ میں اور تم میں یہی فرق ہے۔ میں تمہیں کبھی یوں نہ چیتاتا۔ کسی دوسرے کے ہاتھوں تمہاری گردن کٹتے دیکھ کر بھی شاید مجھے رحم نہ آتا۔ قصائی بھی رحم دل اور بیرحم ہو سکتے ہیں۔ ہم لوگ دشمنی میں بیرحم قصائیوں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ (صوفیا سے انگریزی میں) بڑا راستی پسند شخص ہے۔ شاید دُنیا ایسے آدمیوں کے رہنے کا مقام نہیں ہے۔ مجھے ایک چھپے ہوئے دشمن سے بچانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ یہ تو بھتیجا ہے مگر بیٹے کی بات ہوتی تو بھی مجھے ضرور خبر کر دیتا۔ صوفیا۔ مجھے تو اب یقین ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم دغا بازوں کو پیدا کرتی ہے اور قدرت بھلے آدمیوں کو ۔

جان سیوک کو یہ بات پسند نہ آئی۔ تعلیم کی اتنی ہجو وہ نہ برداشت کر سکتے تھے۔ بولے۔ سورداس میرے قابل اور کوئی خدمت ہو تو بتلاؤ ۔

شوورداس۔ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی ٭

سیلوک۔ نہیں نہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا پس و پیش کہو ٭

شوورداس۔ طاہر علی کو پھر نوکر رکھ لیجئے گا۔ ان کے بال بچے بڑی تکلیف میں ہیں ٭

سیلوک۔ شووداس مجھے سخت افسوس ہے کہ میں تمہارے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ کسی بدنیت آدمی کو نوکر رکھنا میرے اصول کے خلاف ہے مجھے تمہاری بات نہ ماننے کا بہت رنج ہے مگر یہ میری زندگی کا ایک خاص اصول ہے اور میں اُسے توڑ نہیں سکتا ٭

شوورداس۔ رحم کرنا کبھی اصول کے خلاف نہیں ہوتا ٭

سیلوک۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ طاہر علی کے بال بچوں کی پرورش کرتا رہوں۔ لیکن اُسے نوکر نہ رکھوں گا ٭

شوورداس۔ جیسی آپ کی مرضی۔ کسی طرح اُن غریبوں کی پرورش ہونی چاہیئے ٭

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ رانی جاہنوی کا موٹر آ پہنچا۔ رانی اُتر کر صوفیا کے پاس گئیں اور بولیں۔ بیٹی معاف کرنا۔ مجھے بڑی دیر ہو گئی۔ تم گھبرائیں تو نہیں؟ فقیروں کو کھلانے کے بعد یہاں آنے کو گھر سے نکلی تو کنور صاحب آ گئے۔ باتوں باتوں میں اُن سے بکواس ہو گئی۔ بڑھاپے میں کیوں آدمی اتنا دولت پرست ہو جاتا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں مسٹر سیلوک۔ آپ کا کیا تجربہ ہے؟

سیلوک۔ میں نے دونوں طرح کے آدمی دیکھے ہیں۔ اگر ۔۔۔ دولت کو ہیچ سمجھتا ہے تو میرے والد صاحب کو بھیک کی چاٹ۔ سادی چپاتیاں اور

دھندلی روشنی ہی پسند ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر گنگولی ہیں کہ جن کی آمدنی خرچ کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اور پھر راجہ مہیندر کمار سنگھ جن کے یہاں پائی پائی کا حساب لکھا جاتا ہے۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے لوگ موٹروں کی طرف چلے۔ مسٹر سیوک اپنے بنگلہ کو گئے اور صوفیا رانی کے ساتھ سیوا آشرم کو۔

(۴۵)

پانڈے پور میں گورکھے ابھی تک پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اُن کے اُپلوں کے جلنے سے چاروں طرف دھواں چھایا ہوا تھا۔ اس پھیلی ہوئی تاریکی میں آبادی کے کھنڈر خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ یہاں اب بھی دن میں تماشائیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ شہر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا۔ جو ان دو تین دنوں میں یہاں ایک بار نہ آیا ہو۔ یہ مقام اب مسلمانوں کا شہید گاہ اور ہندوؤں کا تیرتھ سا ہو گیا تھا۔ جہاں ونے سنگھ شہید ہوئے تھے وہاں لوگ جاتے تو پیر سے جوتے اُتار دیتے۔ کچھ لوگوں نے وہاں پھول پتے بھی چڑھائے تھے۔ یہاں کی خاص چیز سورداس کے جھونپڑے کا نشان تھا۔ پھوس کے ڈھیر ابھی تک پڑے ہوئے تھے۔ لوگ یہاں آکر گھنٹوں کھڑے رہتے اور فوج کو غصہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ اِن آدمیوں نے ہمیں ذلیل کیا اور اب بھی یہیں جمے ہوئے ہیں۔ اب نہ جانے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ بجرنگی۔ ٹھاکر دین۔ نایک رام۔ جگدھر وغیرہ بھی اپنا زیادہ وقت یہیں گھومنے میں لگاتے۔ گھر کی یاد بھولتے بھولتے ہی بھولتی ہے۔ کوئی اپنی بھول سے چھوڑی ہوئی چیز تلاش کرنے آتا۔ کوئی پتھر یا لکڑی خریدنے اور بچوں کو تو اپنے گھروں کے نشانات دیکھنے ہی میں لطف آتا تھا۔ ایک پوچھتا۔ اچھا

بتاؤ ہمارا گھر کہاں تھا؟ دوسرا کہتا۔ وہ جہاں کتا لیٹا ہوا ہے۔ تیسرا کہتا۔ جی کہیں ہو نہ ہو وہاں تو لالہ بیچو کا گھر تھا۔ دیکھتے نہیں۔ یہ امرود کا پیڑ اُسی کے آنگن میں تھا۔ دوکان دار وغیرہ بھی یہیں شام صبح آتے اور گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے رہتے جیسے گھر کے لوگ مرے ہوئے آدمی کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا آنگن تھا۔ یہ میری دالان تھی۔ یہیں بیٹھ کر تو میں بہی کھاتہ لکھا کرتا تھا۔ ارے میرے گھی کی ہانڈی پڑی ہوئی ہے۔ کتوں نے منہ ڈال دیا ہوگا نہیں تو لیتے چلتے۔ کئی سال کی ہانڈی تھی۔ ارے میرا پرانا جوتہ پڑا ہوا ہے۔ پانی میں پھول کر کتنا بڑا ہو گیا ہے! دو چار آدمی ویسے بھی تھے جو اپنے بزرگوں کا دفینہ کھودنے آیا کرتے تھے۔ عجلت میں اُنہیں گھر کھودنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دادا بنگال کی ساری کمائی اپنے سرہانے گاڑ کر مر گئے۔ کبھی اُس کا پتہ نہ بتایا۔ کیسی ہی گرمی پڑے۔ کتنا ہی مچھر کاٹیں وہ اپنی کوٹھڑی ہی میں سوتے تھے۔ پتاجی کھودتے کھودتے رہ گئے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں شور نہ مچ جائے جلدی کیا ہے؟ گھر ہی میں تو ہے۔ جب جی چاہے گا نکال لیں گے۔ میں بھی یہی سوچتا رہا۔ کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے۔ نہیں تو پہلے ہی سے کھود نہ لیا ہوتا۔ اب کہاں پتہ ملتا ہے؟ جس کے بھاگ کا ہوگا وہ پائے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ نایک رام بجرنگی اور اُن کے دیگر احباب آکر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

نایک رام۔ کہو بجرنگی۔ کہیں کوئی گھر ملا؟

بجرنگی۔ گھر نہیں پتھر ملا۔ شہر میں رہوں تو اتنا کرایہ کہاں سے لاؤں۔ گھاس چارا کہاں ملے؟ اتنی جگہ کہاں ملی جاتی ہے؟ ہاں اوروں کی طرح دودھ میں پانی ملانے لگوں تو گجر ہو سکتا ہے۔ پر یہ کرم عمر بھر نہیں کیا تو اب

کیا کروں گا؟ دیہات میں رہتا ہوں تو گھر بنوانا پڑتا ہے۔ جمین دار کو نجر نہ دو تو جمین نہ ملے۔ ایک ایک بسوے کے دو دو سو مانگتے ہیں۔ گھر بنوانے کو الگ ہجار روپیہ چاہئے۔ اتنے روپے کہاں سے لائیں؟ جتنا مادجا ملا ہے اُتنے میں تو ایک کوٹھڑی بھی نہیں بن سکتی۔ مَیں تو سوچتا ہوں کہ جانوروں کو بیچ ڈالوں اور یہیں پتلی گھر میں مجوری کروں۔ سب جھگڑا ہی مٹ جائے طلب تو اچھی ملتی ہے۔ اور کہاں کہاں ٹھکانا ڈھونڈھتے پھریں؟

جگدھر۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ بنا بنایا مکان رہنے کو مل جائے گا پڑے رہیں گے۔ کہیں گھر بیٹھے کھانے کو تو ملے گا نہیں۔ دن بھر کھونچہ لئے نہ پھرے یہیں مجوری کی ؞

ٹھاکردین۔ تم لوگوں سے مجوری ہو سکتی ہے کرو۔ میں تو چاہے بھوکوں مر جاؤں پر مجوری نہیں کر سکتا۔ مجوری شودروں کا کام ہے۔ روجگار کرنا دیسوں کا کام ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنا رُتبہ کیوں کھوئیں۔ بھگوان کہیں نہ کہیں ٹھکانا لگائیں گے ہی۔ یہاں تو اب کوئی مجھے سیٹ میت رہنے کے لئے تو نہ رہوں۔ بستی اُجڑ جاتی ہے تو بھوتوں کا ڈیرا ہو جاتا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کیسا سیاپا چھایا ہوا ہے نہیں تو اس بیلا یہاں کتنا گُل جار رہتا تھا ؞

نایک رام۔ مجھے کیا صلاح دیتے ہو بجرنگی؟ دیہات میں رہوں کہ سہر میں؟

بجرنگی۔ بھیا۔ تمہارا دِہات میں نباہ نہ ہوگا۔ کہیں آگے پیچھے ہٹنا ہی پڑیگا روج سہر کا آنا جانا ٹھہرا۔ کتنی مشکل ہوگی۔ پھر تمہارے جاتری تمہارے ساتھ دہات میں تھوڑے جائیں گے۔ یہاں سے تو سہر اتنا دور نہیں تھا اس لئے سب چلے آتے تھے ؞

نایک رام۔ تمہاری کیا صلاح ہے. جگدھر؟

جگدھر۔ بھیّا۔ میں تو سہر میں رہنے کو نہ کہوں گا. کھرچ کتنا بڑھ جائے گا۔ مٹی بھی مول ملے۔ پانی کے بھی دام دو۔ چالیس پچاس کو تو ایک چھوٹا سا مکان ملے گا۔ تمہارے ساتھ ہر بکھت دس بیس آدمی رہا چاہیں۔ اس لئے بڑا گھر لینا پڑے گا۔ اس کا کرایہ سَو سے نیچے نہ ہوگا۔ گائیں بھینسیں کہاں رکھو گے؟ جاتریوں کو کہاں ٹکاؤ گے۔ تمہیں جتنا ماوجہ ملا ہے اُتنے میں تو اتنی جمین بھی نہ ملے گی۔ گھر بنوانے کی کون کہے؟

نایک رام۔ بولو بھائی بجرنگی۔ سال کے بارہ سَو کرایہ کے کہاں سے آئیں گے؟ کیا ساری کمائی کرایہ ہی میں کھرچ کر دوں گا؟

بجرنگی۔ جمین تو دیہات میں بھی مول لینی پڑے گی۔ سینت تو ملے گی نہیں۔ پھر کون جانے کس گاؤں میں جگہ ملے۔ بہت سے آس پاس کے گاؤں تو ایسے بھرے ہوئے ہیں کہ وہاں اب ایک جھونپڑی بھی نہیں بن سکتی۔ کسی کے دوار پر آنگن تک نہیں ہے۔ پھر جگہ مل گئی تو گھر بنوانے کے لئے سارا سامان سہر سے لے آنا پڑے گا۔ اس میں کتنا کھرچ پڑے گا۔ نو کی لکڑی سے بتنے کھرچ۔ کچّا مکان بنواؤ گے تو کتنی کلیپھ۔ ٹپکے۔ کیچڑ ہو۔ روج منوں کوڑا نکلے۔ ساتویں دن لیپنے کو چاہئے۔ تمہارے گھر میں کون لیپنے والا بیٹھا ہوا ہے. تمہارا رہا کچّے مکان میں نہ رہا جائے گا۔ سہر میں آنے جانے کے لئے سواری رکھنی پڑے گی۔ اس کا کھرچ بھی پچاس سے نیچے نہ ہوگا۔ تم کچّے مکان میں تو کبھی رہے نہیں۔ کیا جانو دیمک۔ کیڑے۔ مکوڑے۔ سیل۔ پوری جھیجھا لیدر ہوتی ہے۔ تم تماس بین آدمی ٹھہرے۔ پان پتّا۔ ساگ بھاجی۔ دیہات میں کہاں؟ میں تو یہی کہوں گا کہ دیہات کے ایک کی جگہ سہر میں دو کھرچ ہوں

تب بھی تم سہر ہی میں رہو۔ وہاں ہم لوگوں سے بھی بھینٹ بھلائی ہو جایا کرے گی۔ آکھر دودھ دہی لے کر سہر تو روج جانا ہی پڑے گا ؛

نایک رام۔ واہ بہادُر واہ۔ مان گیا۔ تمہارا جوڑ تو بھیرو تھا۔ دوسرا کون تمہارے اسامنے ٹِک سکتا ہے۔ تمہاری بات میرے مَن میں بیٹھ گئی۔ بولو جگدھر۔ اِس کا کچھ جواب دیتے ہو تو دو نہیں تو بجرنگی کی ڈگری ہوتی ہے سو روپے کرایہ دینا منجور۔ یہ جھنجھٹ کو سر پر لے گا ؛

جگدھر۔ بھیّا تمہاری مرجی ہے تو سہر میں چلے جاؤ۔ میں بجرنگی سے لڑائی تھوڑے ہی کرتا ہوں۔ پر دِہات دِہات ہی ہے۔ سہر سہر ہی ہے۔ سہر میں پانی تک تو اچھّا نہیں مِلتا۔ دہی بیسے کا پانی پیو۔ دھرم جائے اور کچھ سواد بھی نہ ملے ؛

ٹھاکر دین۔ اندھا آگم جانی تھا۔ جانتا تھا کہ ایک دن یہ پُتلی گھر ہم لوگوں کو بن باس دے گا۔ جان تک گنوائی پر اپنی جمین نہ دی۔ ہم لوگ اِس کرنٹے کے چکمے میں آکر اُس کا ساتھ نہ چھوڑتے تو صاحب لاکھ سر پٹک کر مر جاتے ایک نہ چلتی ؛

نایک رام۔ اب اُس کے بچنے کی کوئی آسا نہیں معلوم ہوتی۔ آج میں گیا تھا۔ بُرا حال تھا۔ کہتے ہیں کہ رات کو ہوس میں تھا۔ جان سیوک صاحب اور راجہ صاحب سے دیر تک باتیں کیں۔ مٹھوا سے بھی باتیں کیں۔ سب لوگ سوچ رہے تھے کہ اب بچ جائے گا۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے کھُد کہا کہ اندھے کی جان کا کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ مگر سُور داس یہی کہتا رہا کہ آپ کو میری جو سائنست کرنا ہے کر لیجئے۔ پر میں بچوں گا نہیں۔ آج بول بند ہے مٹھوا بڑا کپوت نکل گیا۔ اُسی کی کپوتی نے اندھے کی جان لی نہیں تو ابھی کچھ دن

اور جتیا ایسے بیر بر لے ہی کہیں ہوتے ہیں۔ آدمی نہیں دیوتا تھا۔
بجرنگی۔ سچ کہتے ہو بھیا۔ آدمی نہیں تھا دیوتا تھا۔ ایسا مرد آدمی کہیں نہیں دیکھا۔ سچائی کے سامنے کسی کی پرواہ نہیں چاہیے کوئی اپنے گھر کا لاٹ ہی کیوں نہ ہو۔ گھیسو کے پیچھے میں اُس سے بگڑ گیا تھا پر اب جو سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ سُورداس نے کوئی انیائے نہیں کیا۔ کوئی بدماس ہماری ہی بہو بیٹی کو بُری نگاہ سے دیکھے تو بُرا لگے گا کہ نہیں۔ اُس کے لہو کے پیاسے ہو جاؤ گے۔ گھات پائیں گے تو سر اُتار لیں گے۔ اگر سُور نے ہمارے ساتھ وہی برتاؤ کیا تو کیا بُرائی کی؟ گھیسو کا چلن بگڑ گیا تھا۔ سجا نہ پاتا تو نہ جانے کیا اندھیر کرتا۔
ٹھاکردین۔ اب تک یا تو اُسی کی جان گئی ہوتی یا دوسروں کی۔
جگدھر۔ چودھری۔ گھر گاؤں میں اتنی سچائی نہیں برتی جاتی۔ اگر سچائی سے کسی کا نکسان ہوتا ہو تو اُس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ سُور میں اور سب باتیں اچھی تھیں بس اتنی ہی بات بُری تھی۔
ٹھاکردین۔ دیکھو جگدھر۔ سورداس یہاں نہیں ہے۔ کسی کی پیٹھ پیچھے نِندا (ہجو) نہیں کرنی چاہیے۔ نِندا کرنے والے کی تو بات ہی کیا۔ نِندا سُننے والوں کو بھی پاپ لگتا ہے۔ نہ جانے پورب جنم میں کون سا پاپ کیا تھا کہ ساری جما جتھا چور موس لے گئے۔ یہ پاپ اب نہ کروں گا۔
بجرنگی۔ ہاں جگدھر۔ یہ بات اچھی نہیں۔ میرے اوپر بھی تو وہی پڑی ہے جو تمہارے اوپر پڑی۔ لیکن سُورداس کی نِندا نہیں سُن سکتا۔
ٹھاکردین۔ ان کی بہو بیٹی کو کوئی گھورتا تو ایسی باتیں نہ کرتے۔
جگدھر۔ بہو بیٹی کی بات اور ہے۔ ہرجائیوں کی بات اور۔

ٹھاکردین۔ بس اب چُپ ہی رہنا جگدھر۔ تمہیں ایک بار سُبھاگی کی بھلائی دیتے پھرتے تھے۔ آج ہرجائی کہتے ہو۔ لاج بھی نہیں آتی؟

نایک رام۔ یہ عادت بہت کھراب ہے۔

بجرنگی۔ آسمان پر تھوکنے سے تھوک اپنے ہی مُنہ پر پڑتا ہے۔

جگدھر۔ ارے تو مَیں سُور کی نِندا تھوڑے ہی کر رہا ہوں۔ دِل دُکھتا ہے تو بات مُنہ سے نکل ہی آتی ہے۔ تمہیں سوچو کہ بِدیا دھر اب کس کام کا رہا؟ پڑھانا لکھانا سب مٹی ہو گیا کہ نہیں؟ اب نہ سرکار میں نوکری ملے گی۔ نہ کوئی دوسرا آدمی رکھے گا۔ اُس کی تو جِندگانی کھراب ہو گئی۔ بس یہی دکھ ہے نہیں تو سُورداس کا سا آدمی کوئی کیا ہوگا۔

نایک رام۔ ہاں اِتنا میں بھی مانتا ہوں۔ کہ اُس کی جِندگانی کھراب ہو گئی۔ جس سچائی سے کسی کا اَن بھَل ہوتا ہو اُس کا منہ سے نہ نکالنا ہی اچھا۔ پر سُورداس کو سب کچھ معاف ہے۔

ٹھاکردین۔ سُورداس نے بِدّیا تو نہیں چھین لی؟

جگدھر۔ وہ بِدّیا کس کام کی جب نوکری چاکری نہ کر سکے۔ دھرم کی بات ہوتی تو یوں بھی کام دیتی۔ یہ بِدّیا ہمارے کس کام آوے گی؟

نایک رام۔ اچھا یہ بتاؤ کہ سُورداس مر گئے تو گنگا نہانے چلو گے یا نہیں؟

جگدھر۔ گنگا نہانے کیوں نہ چلوں گا؟ سب کے پہلے چلوں گا۔ کندھا تو آدمی بَیری کو بھی دے دیتا ہے۔ سُورداس ہمارے بَیری نہیں تھے جب اُنہوں نے مِٹھوا کو نہیں چھوڑا جیسے بیٹے کی طرح پالا تو دوسروں کی بات ہی کیا۔ مِٹھوا کیا وہ اپنے کھاس بیٹے کو نہ چھوڑتے۔

نایک رام۔ چلو دیکھ آئیں ۔

چاروں آدمی شوروداس کو دیکھنے چلے ۔

(۴۶)

چاروں آدمی شفاخانہ پہنچے تو نو بج چکے تھے۔ آسمان خواب میں مست آنکھیں بند کئے پڑا ہوا تھا مگر زمین بیدار تھی۔ بھیرو کھڑا ہوا شوروداس کو پنکھا جھل رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ سرہانے کی طرف بیٹھی ہوئی صوفیا بیقرار آنکھوں سے شوروداس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سُبھاگی انگیٹھی میں آگ بنا رہی تھی کہ تھوڑا سا دودھ گرم کر کے شوروداس کو پلائے۔ تینوں کی شکل سے مایوسی برس رہی تھی۔ چاروں طرف وہ سکوت تھا جو موت کا پیش خیمہ ہے ۔

صوفیا نے غمگین لہجہ میں کہا۔ پنڈا جی۔ آج سوگ کی رات ہے۔ اُن کی نبض کا کئی کئی منٹوں تک پتہ نہیں چلتا۔ شاید آج کی رات مشکل ہی سے کٹے۔ ہیئت تبدیل ہو گئی ہے ۔

بھیرو۔ دوپہر سے یہی حال ہے۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کو پہچانتے ہیں ۔

صوفیا۔ ڈاکٹر گنگولی آتے ہوں گے۔ اُن کا تار آیا تھا کہ مَیں آ رہا ہوں۔ یوں تو موت کی دوا کسی کے پاس نہیں مگر ممکن ہے کہ ڈاکٹر گنگولی کے ہی ہاتھوں جس بدا ہو ۔

سُبھاگی۔ مَیں نے شام کو پکارا تھا تو آنکھیں کھولی تھیں پر بولے کچھ نہیں ۔

ٹھاکر دین۔ بڑا اکبالی پُرس تھا ۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک موٹر آیا اور کنور بھرت سنگھ۔ ڈاکٹر

گنگولی اور رانی جاتھوی اُتر پڑے۔ گنگولی نے سُورداس کے چہرہ کی طرف دیکھا اور مایوسانہ تبسّم سے بولے۔ ہم کو دس منٹ کا بھی دیر ہوتا تو اِن کا درشن بھی نہ پاتا۔ بُلاوا آچکا ہے۔ کیوں دودھ گرم کرتا ہے بھائی۔ دودھ کون پئے گا؟ جمراج (فرشتہ موت) تو دودھ پینے کا مہلت نہیں دیتا۔

صوفیا نے معصومانہ انداز سے پوچھا۔ کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر صاحب؟

گنگولی۔ بہت کچھ ہوسکتا ہے مس صوفیا؟ ہم جمراج کو ہرا دے گا۔ ایسے لوگوں کا اصلی جندگی تو موت کے پیچھے ہی ہوتا ہے جب وہ مٹی پانی ہوا آگ آکاش۔ اِن پانچوں کے بندھن کو توڑ دیتا ہے۔ سورداس ابھی نہیں مرے گا۔ بہت دنوں تک نہیں مرے گا۔ ہم سب مرجائیں گا۔ کوئی آج کوئی کل۔ کوئی پرسوں۔ پر سُورداس تو امر ہوگیا۔ اُس نے تو کال کو جیت لیا۔ ابھی تک اُس کا جندگی مٹی پانی وغیرہ پانچوں سے بندھا تھا۔ اب وہ پھیلے گا اور سارے صوبہ اور سارے ملک کو جگا دے گا۔ ہم کو کام کرنے کا بیر بننے کا بات بتائے گا۔ یہ سورداس کا موت نہیں ہے صوفیا! یہ اُس کی جندگی کا بڑھنا ہے۔ ہم تو ایسی ہی ایک سمجھتا ہے۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر گنگولی نے جیب سے ایک شیشی نکالی اور اُس کے کئی قطرے سُورداس کا مُنہ کھول کر حلق میں ٹپکا دئے۔ فوری اثر نمودار ہوا۔ سُورداس کے بے رونق چہرہ پر ہلکی سُرخی دوڑ گئی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر تاکتے ہوئے ہنسا۔ پھر گراموفون کی سی بناوٹی اور بیٹھی ہوئی آواز سے بولا۔ بس بس۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو؟ تم جیتے اور میں ہارا۔ یہ بازی تمہارے ہاتھ رہی۔ مجھ سے کھیلتے نہیں بنا۔ تم منجھے ہوئے

کھلاڑی ہو۔ دم نہیں اُکھڑتا۔ کھلاڑیوں کو ملا کر کھیلتے ہو اور تمہیں حوصلہ بھی اچھا ہے۔ ہمارا دم اُکھڑ جاتا ہے۔ ہم ہانپنے لگتے ہیں۔ ہم کھلاڑیوں کو ملا کر نہیں کھیلتے۔ آپس میں جھگڑتے ہیں۔ گالی گلوچ مار پیٹ کرتے ہیں۔ کوئی کسی کی نہیں مانتا۔ تم کھیلنے میں ہوشیار ہو اور ہم اناڑی ہیں۔ بس اتنا پھرک ہے۔ تالیاں کیوں بجاتے ہو؟ یہ تو جیتنے والوں کا دھرم نہیں؟ تمہارا دھرم تو ہے ہماری پیٹھ ٹھونکیں۔ ہم ہارے تو کیا۔ میدان سے بھاگے تو نہیں۔ اسے روئے تو نہیں۔ دھاندلی تو نہیں کی۔ پھر کھیلیں گے۔ جرا دم لے لینے دو۔ ہار ہار کر تمہیں سے کھیلنا سیکھیں گے اور ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی۔ ضرور ہوگی ۔

ڈاکٹر گنگولی اس ہاداس کو آنکھیں بند کئے کچھ اس طریقہ پر محو ہو کر سنتے رہے گویا کلام خدا ہو۔ پھر عقیدت کے لہجہ میں بولے ——— بڑے کھیال کا آدمی ہے۔ ہمارے تمام آپس کے سوشل اور پولٹیکل جندگی کا بڑا اچھا تصیر کھینچ دیا اور تھوڑے میں

صوفیا نے سورداس سے کہا ——— سورداس کنور صاحب اور رانی جی آئے ہوئے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟

سورداس نے مجذوبانہ سرگرمی سے کہا۔ ہاں ہاں ہاں۔ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اُن کے چرنوں کی دھول میرے ماتھے پر لگا دو۔ ترجاؤں۔ نہیں نہیں مجھے اُٹھا کر بیٹھا دو۔ کھول دو یہ پٹی۔ میں کھیل چکا۔ اب مجھے مرہم پٹی نہیں چاہئے۔ رانی۔ کون؟ ونے سنگھ کی ماتا نا؟ کنور صاحب اُن کے پتا نا؟ مجھے بیٹھا دو۔ اُن کے پیروں پر آنکھیں ملوں گا۔ میری آنکھیں کھل جائیں گی۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر اسیس دو۔ ماتا۔ ہاں اب میری جیت ہوگی۔

اد ہو۔ وہ سامنے وسنے سنگھ اور اور اندر دت سنگاسن پر بیٹھے ہوئے مجھے بلا رہے ہیں۔ اُن کے چہرہ پر کتنا تیج ہے! میں بھی آتا ہوں۔ یہاں تمہاری کچھ سیوا نہ کر سکا اب وہیں کروں گا۔ ماتا پتا۔ بھائی بند۔ سب کو سورداس کا رام رام! اب جاتا ہوں۔ جو کچھ بنا بگڑا ہو معاف کرنا۔

رانی جانہوی نے آگے بڑھ کر فرطِ عقیدت سے سورداس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ سورداس کے پیر آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کنور صاحب نے آنکھوں پر رومال ڈال لیا اور کھڑے کھڑے رونے لگے۔

سورداس کا چہرہ پھر اُداس ہو گیا۔ دوا کا اثر زائل ہو گیا۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔

نایک رام گنگا جل لانے دوڑے۔ جگدھر نے سورداس کے قریب جا کر زور سے کہا۔ سورداس میں ہوں جگدھر۔ میرا اپرادھ چھما کر دو۔

سورداس مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ دونوں ہاتھ جوڑے۔ آنسو کی دو بوندیں گالوں پر بہہ آئیں اور کھلاڑی میدان سے رخصت ہو گیا۔

ایک لمحہ میں چاروں طرف خبر پھیل گئی۔ چھوٹے بڑے امیر غریب عورت مرد۔ بوڑھے جوان ہزاروں کی تعداد میں نکل پڑے۔ سب ننگے سر ننگے پیر۔ گلے میں انگوچھے ڈالے شفاخانہ کے میدان میں جمع ہو گئے۔ عورتیں مُنہ ڈھانکے کھڑی رو رہی تھیں۔ گویا اپنے گھر کا کوئی آدمی مر گیا ہو۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اُسی کے سب ہوتے ہیں۔ سارا شہر اُمڈا چلا آتا تھا۔ سب کے سب اِس کھلاڑی کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے جس کی ہار میں بھی جیت کی شان تھی۔ کوئی کہتا تھا سادھو تھا۔ کوئی کہتا تھا ولی تھا۔ کوئی

دیوتا کہتا تھا۔ پراصل میں وہ کھلاڑی تھا۔ وہ کھلاڑی جس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں پڑی۔ جس نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ جس نے کبھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ جیتا تو خوش رہا۔ ہارا تو خوش رہا۔ ہارا تو جیتنے والے سے کینہ نہیں رکھا۔ جیتا تو ہارنے والے پر تالیاں نہیں بجائیں۔ جس نے کھیل میں ہمیشہ صفائی برتی۔ کبھی دھاندلی نہیں کی۔ کبھی مخالف پر چھپ کر وار نہیں کیا۔ بھکاری تھا۔ مجہول تھا۔ اندھا تھا بیکس تھا کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوا۔ کبھی بدن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملا۔ مگر دل برداشت عفو۔ سچائی اور ہمت کے جذبات سے معمور تھا۔ بدن پر گوشت نہ تھا مگر دل میں انکسار۔ اخلاق اور ہمدردی تھی ۔

ہاں وہ سادھو نہ تھا۔ مہاتما نہ تھا۔ دیوتا نہ تھا۔ فرشتہ نہ تھا بلکہ ایک حقیر اور کمزور انسان تھا۔ مگر دہاتِ دینوی سے گھرا ہوا۔ جس میں برائیاں بھی تھیں اور بھلائیاں بھی۔ بھلائیاں کم تھیں برائیاں بہت۔ غصہ۔ حرص تلوّن۔ غرور۔ یہ سبھی برائیاں اس میں موجود تھیں۔ وصف صرف ایک تھا مگر یہ سبھی کمزوریاں اس ایک وصف سے مل کر نمک کی کان میں جا کر نمک ہو جانے والی چیزوں کی طرح خوبیوں کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ غصہ جائز غصہ ہو جاتا تھا۔ حرص محبت بن جاتی تھی۔ تلوّن جوش کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ اور غرور خودداری کی صورت میں۔ وہ وصف کیا تھا؟ حق پرستی انصاف پسندی ایثار نفسی یا ہمدردی یا اس کا اور جو نام چاہے رکھ لیجئے۔ ناانصافی دیکھ کر اس سے نہ رہا جاتا تھا۔ زیادتی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی ۔

جنازہ کس دھوم دھام سے نکالا گیا۔ اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔

باجے گاجے نہ تھے۔ ہاتھی گھوڑے نہ تھے مگر آنسو بہانے والی آنکھوں اور
تعریف کرنے والی زبانوں کی کمی نہ تھی۔ بڑا ہجوم تھا۔ شورداس کی سب سے
بڑی جیت یہ تھی کہ دشمنوں کو بھی اُس سے دشمنی نہ تھی۔ اگر عزاداروں میں
صوفیا۔ گنگولی۔ جانھوی۔ بھرت سنگھ۔ نایک رام۔ بھیرو وغیرہ تھے تو
مہیندر کمار سنگھ۔ جان سیوک جگدھر جیسے کہ مسٹر کلارک بھی تھے۔ صندل کی
چتا تیار کی گئی تھی۔ اُس پر فتح کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ چتا میں آگ دینے
کی رسم کون ادا کرتا؟ مٹھوا ٹھیک اُسی وقت روتا ہُوا آ پہنچا۔ شورداس
نے جیتے جی جو نہ کر پایا تھا اُسے مر کر کیا۔

اسی مقام پر کئی روز پہلے یہی رنج وسوگ کا منظر دکھائی دیا تھا۔
فرق صرف اتنا تھا کہ اُس روز لوگوں کے دل میں غم تھا اور آج فتح کا
غرور۔ وہ ایک بہادرانہ موت تھی۔ یہ ایک کھلاڑی کا آخری
کھیل۔ ایک بار پھر آفتاب کی شعاعیں چتا پر پڑیں۔ اُن میں غرور کی چمک
تھی گویا آسمان سے فاتحانہ گیت کے نغمے آ رہے تھے۔

لوٹتے وقت مسٹر کلارک نے راجہ مہیندر کمار سے کہا۔ یہ میری بدنصیبی
ہے کہ میرے ہاتھوں ایسے نیک انسان کا خون ہُوا۔

راجہ صاحب نے طنز سے کہا۔ خوش نصیبی کہئے۔ بدنصیبی کیوں؟
کلارک۔ نہیں راجہ صاحب بدنصیبی ہی ہے۔ ہمیں آپ جیسے انسانوں
سے خوف نہیں۔ خوف ایسے ہی آدمیوں سے ہے جو عوام کے دلوں پر حکومت
کرتے ہیں۔ یہ حکومت کرنے کی سزا ہے کہ اِس مُلک میں ہم ایسے آدمیوں
کو قتل کرتے ہیں جن کی انگلینڈ میں ہم پرستش کرتے ہیں۔

صوفیا اُسی وقت اُن کے پاس سے ہو کر گزری۔ یہ الفاظ اُس کے

کان میں پڑے۔ بول اُٹھی ـــــ کاش یہ الفاظ آپ کے دل سے نکلے ہوتے!
یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ مسٹر کلارک اس طنز سے تلملا گئے۔ ضبط
نہ کر سکے۔ گھوڑا بڑھا کر بولے۔ یہ تمہارے اُس ظلم کا نتیجہ ہے جو تم نے
مجھ پر کیا ہے ÷

صوفیا آگے بڑھ گئی۔ یہ بات اُس نے نہ سُنی ÷

آسمانی راہ گیر جو پردۂ ابر سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک ایک کرکے
رخصت ہو رہے تھے۔ لاش کے ساتھ جانے والے بھی ایک ایک کرکے
رخصت ہو گئے۔ پر صوفیا کہاں جاتی؟ اسی دو بدھا میں کھڑی تھی کہ اندو
مل گئی۔ صوفیا نے کہا ـــــ اندو، ذرا ٹھہرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ
چلوں گی ÷

(۷۴)

شام ہو گئی تھی۔ مل کے مزدور چھٹی پا گئے تھے۔ آج کل دونی مزدوری
دینے پر بھی بہت تھوڑے مزدور کام کرنے آتے تھے۔ پانڈے پور میں سناٹا
چھایا ہوا تھا۔ وہاں اب مکانات کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہاں
درخت ابھی تک بدستور کھڑے تھے۔ وہ چھوٹا سا نیم کا درخت اب سُورداس
کی جھونپڑی کا نشان بتلاتا تھا۔ پھوس لوگ اُٹھا لے گئے تھے۔ زمین
ہموار کی جا رہی تھی اور کہیں کہیں نئے مکانوں کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔
صرف بستی کے آخری حصہ میں ایک چھوٹا سا کھپریل کا گھر اب تک آباد
تھا جیسے کسی خاندان کے سب آدمی مر گئے ہوں اور صرف ایک بوڑھا کمزور
اور مریض آدمی نام لیوا باقی رہ گیا ہو۔ یہی کلثوم کا گھر ہے جسے اپنے وعدہ
کے ایفاء میں سُورداس کی خاطر سے مسٹر جان سیوک نے گرانے نہیں دیا

دروازہ پر نسیمہ اور جابر کھیل رہے ہیں اور طاہر علی ایک ٹوٹی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہینوں سے اُن کی حجامت نہیں بنی۔ بدن کمزور ہے چہرہ اُترا ہوا۔ آنکھیں آگے کو نکل آئی ہیں۔ سر کے بال بھی کچھڑی ہو گئے ہیں۔ قید کی تکلیفوں اور گھر کے فکروں نے کمر توڑ دی ہے۔ وقت کی رفتار نے اُن پر برسوں کا کام مہینوں میں کر ڈالا ہے۔ اُن کے اپنے کپڑے جو جیل سے چھوٹتے وقت واپس ملے ہیں اُتارے سے معلوم ہوتے ہیں۔ آج صبح وہ نینی جیل سے آئے ہیں اور گھر کی دردناک حالت نے اُنہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ بال بنوانے تک کا جی نہیں چاہتا۔ اُن کے آنسو نہیں تھمتے۔ دل کو بہت سمجھانے پر بھی نہیں تھمتے۔ اس وقت بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ اُنہیں رہ رہ کر طاہر علی پر غصہ آتا ہے اور وہ ایک آہِ سرد کھینچ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ تکلیفیں یاد آ رہی ہیں جو اُنہوں نے خاندان کے لئے خوشی سے جھیلی تھیں۔ وہ ساری تکلیفیں ساری قربانیاں بیکار گئیں۔ کیا اِسی دن کے لئے میں نے اتنی مصیبتیں جھیلی تھیں؟ اسی دن کے لئے اپنے خون سے خاندان کے درخت کو سینچا تھا؟ یہی کڑوے پھل کھانے کے لئے؟ آخر میں جیل ہی کیوں گیا تھا؟ میری آمدنی میرے بال بچوں کی پرورش کے لئے کافی تھی۔ میں نے جان دی خاندان کے لئے۔ آبا نے جو بوجھ میرے سر رکھ دیا تھا وہی میری تباہی کا سبب ہُوا۔ غضب خدا کا مجھ پر یہ ستم! مجھ پر یہ قہر! میں نے کبھی نئے جوتے نہیں پہنے۔ برسوں کپڑوں میں پیوند لگا لگا کر دن گزارے۔ بچے مٹھائیوں کو ترس ترس کر رہ جاتے تھے۔ بیوی کے سر کے لئے تیل بھی میسر نہ ہوتا تھا۔ چوڑیاں پہننا نصیب نہ تھا۔ ہم نے فاقے

گئے۔ زیور اور کپڑوں کی کون کہے۔ عید کے دن بھی بچوں کو نئے کپڑے نہ ملتے تھے۔ کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بیوی کے لئے ایک لوہے کا چھلّا بنوا آتا۔ اُلٹے اُس کے سارے گہنے فروخت کر کر کے کھلا دیئے۔ اس تمام نفس کشی کا یہ نتیجہ اور وہ بھی میری غیر حاضری میں۔ میرے بچے اس طرح گھر سے نکال دئے گئے گویا کسی غیر کے بچے ہیں۔ میری بیوی کو رو رو کر دن کاٹنے پڑے کوئی آنسو پونچھنے والا بھی نہ ہوا اور میں نے اسی کمبخت لونڈے کے لئے غبن کیا تھا! اسی کے لئے امانت میں خیانت کی تھی! کیا میں مر گیا تھا؟ اگر وہ لوگ میرے بال بچوں کو اچھّی طرح عزت آبرو سے رکھتے تو کیا میں ایسا گیا گزرا تھا کہ اُن کے احسان کے بار سے سبکدوش ہونے کی کوشش نہ کرتا؟ نہ دودھ گھی کھلاتے نہ تنزیب اوڑھنی پہناتے۔ روکھی روٹیاں ہی دیتے گزی گاڑھا پہناتے مگر گھر میں تو رکھتے۔ وہ روپیوں کے پان کھاجاتے ہوں گے اور یہاں میری بیوی کو سلائی کر کے اپنا گزر بسر کرنا پڑا۔ اُن ہی سبھوں سے تو جان پہچان ہی اچھے جنہوں نے رہنے کا مکان تو نہ گرایا مدد کرنے کے لئے آئے تو۔

کلثوم نے یہ مصیبت کے دن سلائی کر کے گزارے تھے۔ دیہات کی عورتیں اُس کے یہاں اپنے لئے کرتیاں۔ بچوں کے لئے ٹوپ اور کرتے سلاتیں۔ کوئی پیسے دے جاتی۔ کوئی اناج۔ اُسے کھانے پینے کی تکلیف نہ تھی۔ طاہر علی اپنے عروج کے زمانہ میں بھی اُس سے زیادہ آرام نہ دے سکے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُس وقت سر پر اپنا شوہر تھا اور اب کوئی نہ تھا۔ اِس بے کسی نے مصیبت کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ تاریکی میں تنہائی زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔

طاہر علی سر جھکائے غمگین بیٹھے تھے کہ کلثوم نے دروازہ پر آکر کہا۔ شام ہو گئی اور ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ چلو۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ طاہر علی نے سامنے کے کھنڈروں کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ماہر تھا نہ ہی یہیں رہتے ہیں یا کہیں اور مکان لیا ہے؟

کلثوم۔ مجھے کیا خبر۔ یہاں تب سے جھوٹوں بھی تو نہیں آئے۔ جب یہ مکانات خالی کرائے جا رہے تھے جبھی ایک روز سپاہیوں کو لے کر آئے تھے۔ نسیمہ اور رضا سب چچا چچا کہہ کر دوڑے پر انہوں نے دونوں کو پھٹکار دیا۔

طاہر علی۔ ہاں کیوں نہ پھٹکارتے۔ اُن کے کون ہوتے تھے۔

کلثوم۔ چلو۔ دو لقمے کھا لو۔

طاہر علی۔ ماہر میاں سے ملے بغیر مجھ پر آب و دانہ حرام ہے۔

کلثوم۔ مل لینا۔ کہیں بھاگے جاتے ہیں۔

طاہر علی۔ جب تک جی بھر اُس سے باتیں نہ کر لوں گا۔ دل کو تسکین نہ ہوگی۔

کلثوم۔ خدا اُنہیں خوش رکھے۔ ہماری بھی تو کسی طرح کٹ ہی گئی۔ خدا نے کسی نہ کسی حیلہ سے رزق پہنچا ہی دیا۔ تم سلامت رہو گے تو ہماری پھر آرام سے گزرے گی اور پہلے سے زیادہ آرام سے۔ دو کو کھلا کر کھائیں گے۔ اُن لوگوں نے جو کچھ کیا اُس کا ثواب اور عذاب اُن کو خدا سے ملے گا۔

طاہر علی۔ خدا ہی انصاف کرتا تو ہماری یہ حالت کیوں ہوتی؟ اُس نے انصاف کرنا چھوڑ دیا۔

اتنے میں ایک بڑھیا سر پر ٹوکری رکھے آکر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ بھولے لڑکوں کے لئے بھٹے لائی ہوں۔ کیا تمہارے میاں آ گئے کیا؟

کلثوم بڑھیا کے ساتھ کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اُس کے کچھ کپڑے بٹے تھے۔ دونوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

اندھیری رات دریا کی لہروں کی طرح مشرق سے دوڑی چلی آتی تھی۔ وہ کھنڈر ایسے بھیانک معلوم ہوتے تھے گویا کوئی قبرستان ہے نسیمہ اور صابر دونوں آکر طاہر علی کی گود میں بیٹھ گئے۔

نسیمہ نے پوچھا۔ آبا۔ اب تو ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ گے؟

صابر۔ اب جائیں گے تو مَیں انہیں پکڑ لوں گا۔ دیکھیں کیسے چلے جاتے ہیں۔

طاہر علی۔ میں تو تمہارے لئے مٹھائیاں بھی نہیں لایا۔

نسیمہ۔ تم تو ہمارے آباجان ہو۔ تم نہیں تھے تو چچا نے ہمیں اپنے پاس سے بھگا دیا تھا۔

صابر۔ پنڈا جی نے ہمیں پیسے دئے تھے۔ یاد ہے نا نسیمہ؟

نسیمہ۔ اور سورداس کی جھونپڑی میں ہم تم جاکر بیٹھے تو اُس نے ہمیں گڑ کھانے کو دیا تھا۔ مجھے گود میں اُٹھا کر پیار کرتا تھا۔

صابر۔ اُس بیچارے کو ایک صاحب نے گولی مار دی آبا مر گیا۔

نسیمہ۔ یہاں پلٹن آئی تھی آبا۔ ہم لوگ ڈر کے مارے گھر سے نہ نکلتے تھے۔ کیوں صابر؟

صابر۔ نکلتے تو پلٹن والے پکڑ نہ لے جاتے!

بچے تو باپ کی گود میں بیٹھ کر چہک رہے تھے مگر باپ کا دھیان اُن کی طرف نہ تھا۔ وہ ماہر علی سے ملنے کو بیقرار تھے۔ اب موقع پایا تو بچوں سے مٹھائیاں لانے کا حیلہ کرکے چل کھڑے ہوئے۔ تھانہ میں پہنچ کر پوچھا تو

معلوم ہوا کہ دارو غہ جی اپنے دوستوں کے ساتھ بنگلہ میں رونق افروز ہیں۔
طاہر علی بنگلہ کی طرف چلے جو پھوس کا ایک ہشت پہل جھونپڑا تھا بیلوں
سے سجا ہوا۔ ماہر علی نے برسات میں سونے اور اپنے احباب کی صحبت کا
لطف اُٹھانے کے لئے اِسے بنوایا تھا۔ چاروں طرف سے ہوا جاتی تھی۔
طاہر علی نے سامنے جا کر دیکھا تو کئی اصحاب مسند لگائے بیٹھے ہوئے تھے
بیچ میں اُگالدان رکھا ہوا تھا۔ خمیرہ تمباکو دھواں دھار اُڑ رہی تھی۔
ایک طشتری میں پان الائچی رکھے ہوئے تھے۔ دو چوکیدار کھڑے پنکھا
جھل رہے تھے۔ اُس وقت تاش کی بازی ہو رہی تھی۔ درمیان میں مذاق
بھی ہونے لگتا تھا۔ طاہر علی کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ یہاں یہ جلسے ہو
رہے ہیں۔ یہ عیش کی گرم بازاری ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ کہیں بیٹھنے کا
ٹھکانا بھی نہیں۔ روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں جتنا پان تمباکو
میں اُڑ جاتا ہوگا اُتنے میں میرے بال بچوں کی پرورش ہو جاتی۔ غصہ سے
ہونٹ چبانے لگے۔ خون کھولنے لگا۔ بیدھڑک مجلس میں گھس گئے۔ اور غم
و غصہ سے دیوانہ ہو کر بولے۔ ماہر! مجھے پہچانتے ہو کون ہوں؟ غور سے دیکھ
لو۔ بڑھے ہوئے بالوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں نے میری صورت اتنی نہیں
بدل ڈالی ہے کہ پہچانا نہ جا سکوں۔ بدحالی صورت کو نہیں تبدیل کر سکتی۔
دوستو۔ آپ لوگ شاید نہ جانتے ہوں گے۔ میں اس بیوفا و دغاباز کمینہ آدمی
کا بھائی ہوں۔ اس کے لئے میں نے کیا کیا تکلیفیں اُٹھائیں یہ میرا خدا
جانتا ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو اپنی بیوی کو اپنی ذات کو اس کے لئے
مٹا دیا۔ اس کی ماں اور اُس کے بھائیوں کے لئے میں نے وہ سب کچھ برداشت
کیا جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ اسی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اُس کے

شوق اور تعلیم کا خرچ ادا کرنے کے لئے میں نے قرض لیا۔ اپنے آقا کے مال میں تصرف کیا اور جیل بھی گیا۔ ان تمام نیکیوں کا یہ صلہ ہے کہ اس کم ظرف نے میرے بال بچوں کی بات بھی نہ پوچھی۔ یہ اُسی روز مراد آباد سے آیا جس روز مجھے سزا ہوئی تھی۔ میں نے اسے تانگہ پر آتے دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل بلّیوں اُچھلنے لگا کہ میرا بھائی ابھی آکر میری تشفی کرے گا اور گھر کو سنبھالے گا۔ مگر یہ احسان فراموش سیدھا چلا گیا میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ مُنہ پھیر لیا۔ اُس کے دو چار دن بعد یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ یہاں چلا آیا۔ میرے بچّوں کو وہیں ویرانہ میں چھوڑ دیا۔ یہاں مجلس سجی ہوئی ہے۔ عیش ہو رہا ہے اور وہاں میرے تاریک مکان میں چراغ بتی کی بھی صورت نہیں۔ خدا اگر منصف ہوتا تو اس کے سر پر اُس کا قہر بجلی بن کر گرتا۔ لیکن اُس نے انصاف کرنا چھوڑ دیا۔ آپ لوگ اس ظالم سے پُوچھئے کہ کیا میں اسی بیدردانہ سلوک کا سزاوار تھا؟ کیا اسی دن کے لئے میں نے فقیروں کی سی زندگی لبسر کی تھی؟ اس کو شرمندہ کیجئے۔ اُس کے چہرہ پر کالکھ لگائیے اس کے منہ پر تھوکئے۔ نہیں۔ آپ لوگ اس کے دوست ہیں۔ مُروّت کے سبب انصاف نہ کر سکیں گے۔ اب مجھی کو انصاف کرنا پڑے گا۔ خدا گواہ ہے اور خود اس کا دل گواہ ہے کہ آج تک میں نے اسے کبھی تیز نگاہ سے بھی نہیں دیکھا۔ اسے کھلا کر خود فاقہ کیا۔ اسے پہنا کر خود برہنہ رہا۔ مجھے یاد بھی نہیں آتا کہ میں نے کبھی نئے جوتے پہنے تھے۔ کبھی نئے کپڑے بنوائے تھے۔ اس کے اُتارے ہوئے جوتوں اور کپڑوں ہی پر میری لبسر ہوتی تھی۔ ایسے ظالم پر اگر خدا کا عذاب نہیں نازل ہوتا تو اس کا سبب یہی ہے کہ خدا نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے ؂

طاہر علی نے تیزی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور قبل اس کے
ماہر علی کچھ جواب دیں یا جواب سوچ سکیں طاہر علی نے چھپٹ کر قلمدان
اُٹھا لیا۔ اس کی سیاہی نکال لی اور ماہر علی کی گردن زور سے پکڑ کر اُس
سیاہی کو اُن کے چہرہ پر مل دیا۔ پھر تین بار اُنہیں جھک جھک کر سلام
کیا اور آخر میں یہ کہہ کر وہیں بیٹھ گئے۔ میرے ارمان نکل گئے۔ میں نے
آج سے سمجھ لیا کہ تم مر گئے۔ اور مجھے تو تم نے پہلے ہی سے مرا ہوا سمجھ لیا ہے
بس ہمارے اور تمہارے درمیان اتنا ہی رشتہ تھا۔ آج وہ بھی ٹوٹ گیا۔
میں اپنی تمام تکالیف کا صلہ اور انعام پا گیا۔ اب تمہیں اختیار ہے مجھے
گرفتار کرو۔ مار دو یا ذلیل کرو۔ میں یہاں مرنے ہی کے لئے آیا ہوں۔
زندگی سے سیر ہو گیا ہوں۔ دنیا رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں اتنا دغا ہے۔
اتنی بیوفائی ہے۔ اتنا حسد ہے۔ اتنا کینہ ہے کہ یہاں زندہ رہ کر کبھی خوشی
نہیں حاصل ہو سکتی +

ماہر علی دم بخود سے بیٹھے رہے۔ مگر اُن کے ایک دوست نے کہا۔
مان لیجئے اِنھوں نے بیوفائی کی ......

طاہر علی نے کہا۔ مان کیا لوں صاحب۔ بھگت رہا ہوں۔ رو رہا ہوں۔
ماننے کی بات نہیں ہے +

دوست نے کہا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ انہوں نے ضرور بیوفائی کی لیکن
آپ بزرگ ہیں۔ یہ حرکت شرافت سے بعید ہے کہ کسی کو سرِ مجلس بُرا بھلا
کہا جائے اور اُس کے چہرہ پر سیاہی لگا دی جائے +

دوسرے دوست نے کہا۔ شرافت سے بعید ہی نہیں ہے۔ دیوانگی ہے
ایسے شخص کو پاگل خانہ میں بند کر دینا چاہئے +

طاہر علی۔ جانتا ہوں۔ اتنا جانتا ہوں کہ شرافت سے بعید ہے لیکن میں شریف نہیں ہوں۔ پاگل ہوں دیوانہ ہوں۔ شرافت تو آنسو بن کر آنکھوں کی راہ بہہ گئی۔ جس کے بچے گلیوں میں دوکانوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہوں۔ جس کی بیوی پڑوسیوں کا آٹا پیس کر اپنا گذر کرے۔ جس کی کوئی خبر لینے والا نہ ہو جس کے رہنے کو گھر نہ ہو۔ جس کے پہننے کو کپڑے نہ ہوں وہ شریف نہیں ہو سکتا اور نہ وہ آدمی شریف ہو سکتا ہے جس کے بیرحم ہاتھوں نے میری یہ بُری گت بنائی۔ اپنے جیل سے لوٹنے والے بھائی کو دیکھ کر منہ پھیر لینا اگر شرافت ہے تو یہ بھی شرافت ہے۔ کیوں میاں ماہر۔ بولتے کیوں نہیں ؟ یاد ہے تم نئی اچکن پہنتے تھے اور جب تم اُسے اُتار کر پھینک دیا کرتے تھے تو میں پہن لیتا تھا ؟ یاد ہے تمہارے پھٹے جوتے گنٹھوا کر میں پہنا کرتا تھا ؟ یاد ہے میرا مشاہیرہ کُل پچیس روپے ماہوار تھا اور وہ سب کا سب میں تمہیں مرادآباد بھیج دیا کرتا تھا یاد ہے ؟ دیکھو ذرا میری طرف دیکھو ! تمہارے تمباکو کا خرچ میرے بال بچوں کے لئے کافی ہو سکتا تھا ! نہیں تم سب کچھ بھول گئے۔ اچھی بات ہے بھول جاؤ۔ نہ میں تمہارا بھائی ہوں نہ تم میرے بھائی ہو۔ میری ساری تکلیفوں کا معاوضہ وہی سیاہی ہے جو تمہارے مُنہ پر لگی ہوئی ہے۔ لو رخصت۔ اب تم پھر یہ صورت نہ دیکھوگے۔ اب حساب کے دن تمہارا دامن نہ پکڑوں گا۔ تمہارے اوپر میرا کوئی حق نہیں ہے ؟

یہ کہہ کر طاہر علی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس اندھیرے میں جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی چلے گئے۔ جیسے ہوا کا کوئی جھونکا آئے اور نکل جائے ماہر علی نے بڑی دیر کے بعد سر اُٹھایا اور فوراً صابون سے مُنہ دھو کر تولیہ

سے صاف کیا۔ بعدہٗ آئینہ میں منہ دیکھ کر بولے۔ آپ لوگ گواہ رہیں۔ میں ان کو اس حرکت کا مزہ چکھاؤں گا ◆

ایک دوست۔ اجی جانے بھی دیجئے مجھے تو دیوانہ سے معلوم ہوتے ہیں ◆

دوسرا دوست۔ دیوانہ نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی سمجھ داروں کا کام ہے ◆

ماہر علی۔ ہمیشہ سے بیوی کے غلام رہے جس طرف چاہتی ہے ناک پکڑ کر گھما دیتی ہے۔ آپ لوگوں سے خانگی دکھڑا کیا روؤں ؟ میری ماں کی بھائیوں کی اور خود میری بھاوج کے ہاتھوں جو درگت ہوئی ہے وہ کسی دشمن کی بھی نہ ہو۔ کبھی بلا رونے دانہ نہ نصیب ہوتا تھا۔ میری البتہ یہ ذرا خاطر کرتے تھے۔ سمجھتے رہے ہوں گے کہ اس کے ساتھ ذرا ظاہر کردو بس زندگی بھر کے لئے میرا غلام ہو جائے گا۔ ایسی عورت کے ساتھ نباہ کیونکر ہوتا؟ یہ حضرت تو جیل میں تھے۔ وہاں اُس نے ہم لوگوں کو فاقے کرانے شروع کئے۔ میں خالی ہاتھ تھا بڑی مصیبت میں پڑا۔ وہ تو کہئے دور اندیشی کرنے سے یہ آسامی مل گئی۔ ورنہ خدا ہی جانے کہ ہم لوگوں کی کیا حالت ہوتی۔ ہم نہار منہ تمام دن بیٹھے رہتے تھے اور مٹھائیاں منگا منگا کر کھائی جاتی تھیں میں ہمیشہ سے ان کا ادب کرتا رہا۔ یہ اُسی کا صلہ ہے جو آپ نے عطا فرمایا ہے۔ آپ لوگوں نے دیکھا کہ میں نے اتنی ذلت گوارا کی مگر سر تک نہیں اُٹھایا۔ زبان تک نہیں کھولی۔ نہیں ایک دھکا دیتا تو بیسوں قلابازیاں کھا جاتے۔ اب بھی دعوےٰ کر دوں تو حضرت بندھے بندھے پھریں مگر اُس وقت دنیا یہی کہے گی کہ بڑے بھائی کو ذلیل کیا ◆

ایک دوست ۔ جانے بھی دو میاں گھروں میں ایسے جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بیچاؤں کی بلا دُور۔ مردوں کے لئے شرم نہیں ہے۔ لاؤ تاش اُٹھاؤ۔ اب تک تو ایک بازی ہو گئی ہوتی ؎

ماہر علی۔ قسم کلام شریف کی۔ آماں جان نے اپنے پاس کے دو ہزار روپے اِن لوگوں کو کھلا دئے ورنہ پچیس روپیوں میں یہ بیچارے کیا کھا کر سارے خاندان کا خرچ سنبھالتے ؎

ایک کانسٹبل۔ ہجور۔ گھر گرستی میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ جانے دیجئے جو ہُوا سو ہُوا۔ وہ بڑے ہیں آپ چھوٹے ہیں دُنیا اُنہیں کو تھوکے گی۔ آپ کی بڑائی ہوگی ؎

ایک دوست۔ میرا شیر کیسا لپکا ہُوا آیا اور قلمدان سے سیاہی اُنڈیل کر مل ہی تو دی۔ مانتا ہوں ؎

ماہر علی۔ حضرت۔ اس وقت دل نہ جلائیے۔ قسم خدا کی بڑا ملال ہے ؎

طاہر علی یہاں سے چلے تو اُن کی حالت میں وہ اضطراب نہ تھا۔ دل میں پچھتا رہے تھے کہ ناحق اپنی شرافت میں بٹہ لگایا۔ گھر آئے تو کلثوم نے پوچھا۔ تم کہاں غائب ہو گئے؟ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں۔ بچے رو کر سو گئے کہ ابا پھر چلے گئے ؎

طاہر علی۔ ذرا ماہر علی سے ملنے گیا تھا ؎

کلثوم۔ اس کی ایسی کیا جلدی تھی؟ کل مل لیتے۔ تمہیں یوں پھٹے حالوں دیکھ کر شرمائے تو نہ ہوں گے؟

طاہر علی۔ میں اُنہیں ایسی سُنائی کہ عمر بھر نہ بھولیں گے۔ زبان تک نہ کھلی۔ اُسی غصّہ میں مَیں نے اُس کے چہرہ پہ کالکھ بھی لگا دی ؎

کلثوم اُداس ہوگئی۔ بولی ــــ تم نے بڑی نادانی کا کام کیا۔ یہ کالکھ تم نے اُس کے مُنہ میں نہیں بلکہ اپنے مُنہ میں لگائی ہے۔ تمہاری زندگی بھر کے کئے دھرے پر سیاہی پھر گئی۔ تم نے اپنی ساری نیکیوں کو ملیامیٹ کر دیا آخر یہ تمہیں سوجھی کیا؟ تم تو اتنے غصّہ در کبھی نہ تھے۔ اتنا صبر نہ ہوسکا کہ اپنے بھائی ہی تھے۔ ان کی پرورش کی تو کون سی حاتم کی قبر پر لات ماری۔ چھی چھی۔ انسان کسی غیر کے ساتھ بھی نیکی کرتا ہے تو دریا میں ڈال دیتا ہے یہ نہیں کہ قرض وصول کرتا پھرے۔ تم نے جو کچھ کیا خدا کی راہ میں کیا۔ اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ قرض نہیں دیا تھا۔ کہ مع سود واپس لے لو۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے نہ رکھا۔ ابھی دنیا اُن کو ہنستی تھی۔ اب تمہیں ہنسے گی دُنیا ہنسے یا نہ ہنسے۔ اس کی پرواہ نہیں۔ اب تک خدا اور رسول کی نظروں میں وہ خطادار تھے۔ اب تم خطادار ہو۔

طاہر علی نے نادم ہوکر کہا۔ حماقت تو ہوگئی مگر میں تو بالکل دیوانہ ہوگیا تھا۔

کلثوم۔ بھری مجلس میں اُنھوں نے سر تک نہ اُٹھایا۔ پھر بھی تمہیں غیرت نہ آئی۔ میں تو کہوں گی تم سے کہیں زیادہ شریف وہی ہیں ورنہ تمہاری آبرو ریزی کرادینا اُن کے لئے کیا مشکل تھا۔

طاہر علی۔ اب یہی خوف ہے کہ کہیں مجھ پر دعوےٰ نہ کردے۔

کلثوم۔ اُن میں تم سے زیادہ انسانیت ہے!

کلثوم نے اتنا شرمندہ کیا کہ طاہر علی رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔ پھر بہت منانے پر کھانے کو اُٹھے اور کھا پی کر سو رہے۔ تین روز تک وہ اُسی کوٹھری میں پڑے رہے۔ کچھ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کہاں جائیں کیا کریں

کیسے گو بسر کریں؟ چوتھے دن گھر سے نوکری کی تلاش میں نکلے مگر کہیں کوئی صورت نہ نکلی۔ یکایک اُنھیں سوجھی کہ کیوں نہ جلد بندی کا کام کروں۔ جیل خانہ میں وہ اس کام کو سیکھ گئے تھے۔ ارادہ پختہ ہو گیا کلثوم نے بھی پسند کیا۔ بلا سے تھوڑا ملے گا کسی کے غلام تو نہ رہو گے۔ سند کی ضرورت نوکری ہی کے لئے ہے۔ وہاں جیل سے آئے ہوؤں کا گو نہیں پیشہ ور کے لئے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ اُن کا کام ہی اُن کی سند ہے۔ چوتھے روز طاہر علی نے وہ مکان چھوڑ دیا اور شہر کے دوسرے محلہ میں ایک چھوٹا سا مکان لے کر جلد بندی کا کام کرنے لگے ٭

اُن کی بنائی ہوئی جلدیں بہت خوب صورت اور مضبوط ہوتی ہیں۔ کام کی کمی نہیں ہے سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اُنھوں نے اب دو تین جلد سازوں کو نوکر رکھ لیا ہے اور شام تک دو تین روپے کی مزدوری کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی اتنے مرفہ حال نہ تھے ٭

(۸۴)

بنارس کے میونسپل بورڈ میں مختلف سیاسی عقاید کے لوگ موجود تھے۔ بادشاہت سے لے کر جمہوریت تک سبھی خیالات کے لوگ تھے۔ ابھی تک دولت و ثروت کا بول بالا تھا۔ مہاجنوں اور رئیسوں کی کثرت تھی۔ جمہوریت پسند فرقہ کمزور تھا۔ اُسے سر اُٹھانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ راجہ مہیندر کمار کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی اُن کی مخالفت نہ کر سکتا تھا۔ مگر پانڈے پور کے ستیاگرہ نے جمہوریت پسندوں میں ایک نئی اجتماعی قوت پیدا کر دی۔ اُس سانحہ کا سارا الزام راجہ صاحب پر عاید کیا جانے لگا۔ تحریک شروع ہوئی کہ اُن پر بداعتقادی کی تجویز پیش کی جائے۔

تحریک روز بروز زور پکڑنے لگی۔ جمہوریت کے حامیوں نے طے کر لیا کہ موجودہ انتظام کا خاتمہ کر دینا چاہئے جس کی وجہ سے عوام کو اتنی مصیبت برداشت کرنی پڑی۔ راجہ صاحب کے لئے یہ ایک سخت امتحان کا موقع تھا۔ ایک طرف تو حکام اُن سے بدظن تھے۔ دوسری طرف یہ مخالف جماعت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی مشکل میں پڑے۔ اُنہوں نے جمہوریت پسندوں کی مدد سے حکّام کی مخالفت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اُن کے سیاسی عقاید میں بھی کچھ تغیر واقع ہو گیا تھا۔ وہ عوام کو ساتھ لے کر میونسپلٹی کا کام کرنا چاہتے تھے۔ پر اب کیا ہو؟ اس تجویز کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ جمہوریت پسند طبقہ کے رہنماؤں سے ملے۔ اُن کی بہت کچھ تشفّی کی کہ آئندہ اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہوگا۔ اِدھر اپنی جماعت کو بھی مضبوط کرنے لگے۔ جمہوری خیالات والوں کو وہ ہمیشہ سے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے لیکن اب مجبوراً اُنہیں کی خوشامد کرنی پڑی۔ وہ جانتے تھے کہ بورڈ میں یہ تجویز رکھ دی گئی تو اُس کا منظور ہو جانا یقینی ہے۔ خود دوڑتے تھے اپنے دوستوں کو بھی دوڑاتے تھے کہ کسی طرح یہ بلا سر سے دُور ہو مگر پانڈے پور کے جلاوطنوں کا تمام شہر میں روتے پھرنا اُن کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیتا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے۔ ہمیں کیونکر یقین ہو کہ ایسی حالت میں آپ پھر ایسی ہی خودسری سے کام نہ کریں گے۔ سورداس ہمارے شہر کا ایک رتن (جواہر) تھا۔ ونے سنگھ اور راندر دت انسانی جماعت کے دو رتن تھے۔ اُن کا خون کس کی گردن پر ہے۔

بالآخر وہ تجویز حسب ضابطہ بورڈ میں پیش ہی کر دی گئی۔ اُس روز تڑکے ہی سے بورڈ کے احاطہ میں لوگوں کا مجمع ہونے لگا۔ یہاں تک کہ دوپہر

ہوتے ہوتے دس بارہ ہزار آدمی جمع ہوگئے۔ ایک بجے تجویز پیش ہوئی۔
راجہ صاحب نے کھڑے ہوکر نہایت دردناک الفاظ میں اپنی صفائی دی۔
ثابت کیا کہ میں مجبور تھا اگر اُسی حالت میں میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا
تو وہ بھی وہی کرتا جو میں نے کیا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ
ہی نہ تھا۔ اُن کے آخری الفاظ یہ تھے ـــــ مجھے عہدہ کی پرواہ نہیں۔
عزّت کی پرواہ نہیں۔ صرف آپ کی خدمت کی پرواہ ہے۔ اب اور بھی
زیادہ اِس لئے کہ مجھے پراسچت (کفارہ) کرنا ہے جسے اِس عہدہ سے سبکدوش
ہوکر میں نہ کر سکوں گا کیونکہ اُس کا ذریعہ ہی میرے ہاتھوں سے نکل جائیگا
سُورداس سے مجھے اُتنی ہی عقیدت ہے جتنی کسی اور شخص کو ہوسکتی ہے۔
آپ لوگوں کو شاید معلوم نہیں ہے کہ مَیں نے شفاخانہ میں جاکر اُن سے معافی
مانگی تھی اور سچے دل سے افسوس ظاہر کیا تھا۔ سورداس ہی کا حکم تھا کہ
میں اپنے عہدہ پر قائم رہوں ورنہ مَیں نے تو پہلے ہی سے استعفاء دینے کا
ارادہ کر لیا تھا۔ کنورونے سنگھ کی ناوقت وفات کا رنج جتنا مجھے ہے
اُتنا اُن کے والدین کے علاوہ کسی کو نہیں ہوسکتا۔ وہ میرے بھائی تھے۔
اُن کی وفات سے میرے دل پر وہ زخم لگا ہے جس کا اندمال تاحیات نہ
ہوگا۔ اندرونت سے بھی میری گہری دوستی تھی۔ کیا میں اتنا کمینہ اتنا مکار
ہوں کہ اپنے ہاتھوں اپنے بھائی اور اپنے دوست کی گردن پر چھری
پھیرتا؟ یہ الزام بالکل نامنصفانہ ہے۔ یہ میرے جلے ہوئے پر نمک چھڑکنا
ہے! مَیں اپنے ضمیر اور خدا کے سامنے بیگناہ ہوں۔ مَیں آپ کو اپنی خدمتوں
کی یاد نہیں دلانا چاہتا۔ وہ تو مسلّمہ ہے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ میں نے
آپ کی خدمت میں اپنا کتنا وقت صرف کیا ہے۔ کتنی محنت کتنی جانفشانی

کی ہے۔ میں رعایت نہیں چاہتا صرف انصاف چاہتا ہوں ۔

تقریر نہایت مؤثر تھی مگر جمہوریت پسندوں کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکی۔ پندرہ منٹ میں کثرت رائے سے رزدلیوشن منظور ہوگیا اور راجہ صاحب نے بھی اُسی وقت استعفٰی دے دیا۔ جب وہ بورڈ کے کمرہ سے باہر نکلے تو عوام نے جنہیں اُن کی تقریر سُننے کا موقع نہ ملا تھا اُن پر اتنی پھبتیاں اُڑائیں اتنی تالیاں بجائیں کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے موٹر تک پہنچ سکے۔ پولیس نے کافی احتیاط نہ برتی ہوتی تو ضرور فساد ہو جاتا۔ راجہ صاحب نے ایک بار مُڑ کر بورڈ کے کمرہ کو آبدیدہ ہو کر دیکھا اور چلے گئے۔ نیک نام ہونا اُن کی زندگی کا خاص مقصد تھا اور اس کا یاس انگیز نتیجہ ہوا۔ زندگی بھر کے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ ساری نیک نامی۔ ساری عزّت۔ ساری شہرت عوام کے غصّہ کے سیلاب میں بہہ گئی!

راجہ صاحب وہاں سے چلے گئے گھر آئے تو دیکھا کہ اندو اور صوفیا دونوں بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں۔ اُنہیں دیکھتے ہی اندو بولی — مس صوفیا سُورداس کا مجسمہ نصب کرنے کے لئے چندہ جمع کر رہی ہیں۔ آپ بھی تو اُس کی جانبازی کے مدّاح تھے۔ کتنا دیجئے گا؟

صوفیا۔ اندو رانی نے ایک ہزار روپے دئے ہیں اور اس کے دوگنے سے کم دینا آپ کے لئے نازیبا ہوگا۔

مہیندر کمار۔ میں اس کا جواب سوچ کر دوں گا۔

صوفیا۔ میں پھر کب آؤں؟

مہیندر کمار نے ظاہرداری سے کہا۔ آپ کے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھیج دوں گا۔

صوفیا نے اُن کے چہرہ کی طرف دیکھا تو تیور بدلے ہوئے تھے۔ وہ اُٹھ کر چلی گئی تو راجہ صاحب نے اندو سے کہا۔ تم مجھ سے بلا پوچھے ایسا کام کیوں کر گزرتی ہو جس سے میری سراسر بیعزتی ہوتی ہے؟ میں تمہیں کتنی بار سمجھا کر ہار گیا۔ آج اُسی اندھے کی بدولت مجھے مُنہ کی کھانی پڑی۔ بورڈ نے مجھ پر بے اعتمادی کا رزولیوشن پاس کر دیا اور اُسی کے مجسمہ کے لئے تم نے چندہ دیا اور مجھے بھی دینے کو کہہ رہی ہو۔

اندو۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بورڈ میں کیا ہو رہا ہے۔ آپ نے بھی تو کہا تھا کہ اس رزولیوشن کے پاس ہونے کا اِمکان نہیں ہے۔

راجہ۔ کچھ نہیں۔ تم مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو۔

اندو۔ آپ اُس روز شوروا اس کی تعریف کر رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ چندہ دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ میں کسی کے دل کی بات تھوڑا ہی جانتی ہوں۔ آخر وہ رزولیوشن پاس کیسے ہو گیا۔

راجہ۔ اب میں کیا جانوں کہ کیسے پاس ہو گیا۔ اتنا جانتا ہوں کہ پاس ہو گیا۔ ہمیشہ سبھی کام اپنی مرضی یا اُمید کے موافق تو ہُوا نہیں کرتے۔ جن لوگوں پر میرا کامل اعتماد تھا اُنہیں نے دغا کیا۔ وہ بورڈ میں آئے ہی نہیں۔ مَیں اتنا متحمل مزاج نہیں ہوں کہ جس کے سبب میری ذلّت ہو اُسی کی پرستش کروں۔ میں حتے الامکان اِس مجسّمہ والی تحریک کو سرسبز نہ ہونے دوں گا بدنامی تو ہو ہی رہی ہے اور ہو اُس کی پرواہ نہیں۔ مَیں سرکار کو ایسا بھر دوں گا کہ مجسّمہ نصب نہ ہونے پائے گا۔ مُلک کو نفع پہنچانے کی طاقت اب چاہے نہ ہو پر نقصان پہنچانے کی طاقت ہے اور یہ طاقت روز بروز بڑھتی جائے گی۔ تم بھی اپنا چندہ واپس لے لو۔

اندو۔ (متحیر ہوکر) دئے ہوئے روپے واپس کرلوں؟
راجہ۔ ہاں۔ اس میں کوئی ہرج نہیں +
اندو۔ آپ کو کوئی ہرج نہ معلوم ہوتا ہو۔ میری تو اس میں سراسر ذلت ہے +
راجہ۔ جس طرح تمہیں میری ذلت کی پرواہ نہیں اُسی طرح اگر میں بھی تمہاری ذلت کی پرواہ نہ کروں تو کوئی بے انصافی نہ ہوگی +
اندو۔ میں آپ سے روپے تو نہیں مانگتی +

بات پر بات نکلنے لگی۔ حتیٰ کہ ردّوکد پر نوبت پہنچی۔ پھر طنز کی باری آئی حتےٰ کہ ایک لمحہ میں بدزبانی ہونے لگی۔ اپنے اپنے خیال کے مطابق دونوں حق پر تھے اس لئے کوئی نہ دبتا تھا +

راجہ صاحب نے کہا۔ نہ جانے وہ کون سا دن ہوگا کہ مجھے تم سے نجات ملے گی۔ موت کے سوا شاید اب کہیں ٹھکانا نہیں ہے +
اندو۔ آپ کو اپنی عزت و نیکنامی مبارک رہے۔ میرا بھی ایشور مالک ہے میں بھی زندگی سے تنگ آگئی۔ کہاں تک لونڈی بنوں؟ اب حد ہوگئی +
راجہ۔ تم میری لونڈی بنوگی! وہ دوسری ستی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں پر جان نچھاور کردیتی ہیں۔ تمہارا بس چلے تو مجھے زہر دے دو اور دے ہی رہی ہو۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا +
اندو۔ یہ زہر کیوں اُگلتے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میرے گھر سے نکل جا۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو میرا رہنا شاق گزرتا ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے جانتی ہوں۔ اُسی دن جان گئی تھی جب میں نے ایک مہری کو اپنی نئی ساڑی دے دی تھی اور آپ نے مہابھارت مچایا تھا۔

اُسی دن سمجھ گئی تھی کہ یہ بیل مُنڈھے چڑھنے کی نہیں۔ جتنے دن یہاں رہی۔ کبھی آپ نے یہ نہ سمجھنے نہ دیا کہ یہ میرا گھر ہے۔ پیسے پیسے کا حساب دے کر بھی گلا نہیں چھوٹتا۔ شاید آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ میرے ہی روپے کو اپنا کہہ کر من مانا خرچ کرتی ہے اور یہاں آپ کا ایک دھیلا چھونے کی قسم کھاتی ہوں۔ آپ کے ساتھ بیاہ ہوا ہے آپ کے ہاتھوں کچھ اپنا ضمیر نہیں فروخت کر دیا ❖

مہیندر نے ہونٹ چبا کر کہا۔ بھگوان سب دُکھ دے پر بُرے کا ساتھ نہ دے۔ موت پہلے ہی دے دے۔ تم جیسی عورت کا گلا گھونٹ دینا بھی ثواب میں داخل ہے۔ اس حکومت کی خیریت مناؤ کہ چین کر رہی ہو۔ اپنی حکومت ہوتی تو یہ قینچی سی چلنے والی زبان تالو سے کھینچ لیتا ❖

اندو۔ اچھا اب چُپ رہیئے بہت ہو گیا۔ میں آپ کی گالیاں سُننے نہیں آئی ہوں۔ یہ لیجئے اپنا گھر۔ خوب پیر پھیلا کر سوئیے ❖

ساجیہ۔ جاؤ۔ کسی طرح دفان بھی ہو۔ بِلّی بخشے چوہا اکیلا ہی بھلا ❖

اندو نے دبی زبان سے کہا۔ یہاں کون تمہارے لئے دیوانہ ہو رہا ہے؟

ساجیہ نے غضب ناک ہو کر کہا۔ گالیاں دے رہی ہے زبان کھینچ لوں گا ❖

اندو جانے کے لئے دروازہ تک گئی تھی۔ یہ دھمکی سُن کر لوٹ پڑی۔ اور شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔ اِس بھروسہ پر نہ رہئے گا۔ بھائی مر گیا ہے تو کیا۔ گڑ کا باپ کولھو تیار ہے۔ سر کے بال نہ بچیں گے۔ ایسے ہی بھلے مانس ہوتے تو دنیا میں اتنا اپجس (رسوائی) کیسے کماتے؟

یہ کہہ کر اندو اپنے کمرہ میں گئی۔ اُن چیزوں کو سمیٹا جو اُسے مائکہ میں ملی تھیں۔ وہ سب چیزیں الگ کر دیں جو یہاں کی تھیں۔ فکر نہ تھی غم نہ تھا

ایک آگ تھی جو اُس کے نازک جسم میں زہر کی طرح پھیل رہی تھی۔ مُنہ سُرخ تھا آنکھیں سُرخ تھیں۔ ناک سُرخ تھی۔ روئیں روئیں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ ذلت ایک آتشیں شے ہے *

اپنی سب چیزیں سنبھال کر اندو نے اپنی خاص گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ گاڑی تیار ہونے تک وہ برآمدہ میں ٹہلتی رہی۔ جیوں ہی پھاٹک پر گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دی وہ آکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ جس گھر کی وہ رانی تھی جسے وہ اپنا سمجھتی تھی جس میں کہیں ذرا سا کوڑا پڑا ہوا دیکھ کر وہ نوکروں کے سر ہو جاتی تھی اُسی گھر سے وہ اس طرح نکل گئی جیسے روح قالب سے۔ اُسی قالب سے جس کی وہ ہمیشہ حفاظت کرتی تھی اور جس کی ذرا ذرا سی تکلیف سے خود بے چین ہو جاتی تھی۔ کسی سے کچھ نہ کہا اور نہ کسی کی ہمت پڑی کہ اُس سے کچھ پُوچھے۔ اُس کے چلے جانے کے بعد مہراجن نے جا کر مہیندر سے کہا۔ سرکار رانی بہو نہ جانے کہاں چلی جا رہی ہیں!

مہیندر نے اُس کی طرف گھور کر کہا۔ جانے دو *

مہراجن۔ سرکار صندوک اور صندوقچے لئے جاتی ہیں *

مہیندر۔ کہہ دیا۔ جانے دو *

مہراجن۔ سرکار روٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی دور نہ گئی ہوں گی۔ آپ منالیں *

مہیندر۔ میرا سر نہ کھا *

آنندا اپنا سب سامان لئے ہوئے سیوا بھون پہنچی تو جانھوی نے کہا۔ تم لڑ کر آرہی ہو۔ کیوں؟

اندو- کوئی اپنے گھر میں نہیں رہنے دیتا تو کیا زبردستی ہے ؟
جانھوی- صوفیا نے آتے ہی آتے مجھ سے کہا تھا۔ آج خیریت نہیں ہے ◆
اندو- میں لونڈی بن کر نہیں رہ سکتی ◆
جانھوی- تم نے اُن سے بِلا پوچھے چندہ کیوں لکھا ؟
اندو- مَیں نے کسی کے ہاتھوں اپنا ضمیر نہیں بیچا ◆
جانھوی- جو استری اپنے پُرش کی ہتک کرتی ہے اُسے لوک پرلوک کہیں شانتی نہیں مل سکتی ◆
اندو- کیا آپ چاہتی ہیں کہ یہاں سے بھی چلی جاؤں ؟ میرے زخم پر نمک نہ چھڑکئے ◆
جانھوی- پچھتاؤ گی اور کیا۔ سمجھاتے سمجھاتے ہار گئی پر تم نے اپنی ہٹ نہ چھوڑی ◆

اندو یہاں سے اُٹھ کر صوفیا کے کمرہ میں چلی گئی۔ ماں کی باتیں اُسے زہر سی لگیں ◆

یہ جھگڑا اب ازدواجی دائرہ سے نکل کر سیاسی دائرہ میں پہنچا۔ مہیندر کمار اُدھر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اِس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے اور صوبہ کی گورنمنٹ کو بھی اُٹھا رہے تھے۔ اِدھر اندو صوفیا کے ساتھ چندہ وصول کرنے میں مصروف تھی۔ مسٹر کلارک ابھی تک راجہ صاحب سے کینہ رکھتے تھے۔ اپنی ذلت بھولے نہ تھے۔ اُنہوں نے عوام کی اِس تحریک میں دست اندازی کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ صاحب کی ایک نہ چلی۔ چندہ کثرت سے

وصول ہونے لگا۔ ایک ماہ میں ایک لاکھ سے زیادہ آ گیا۔ کسی پر کسی طرح کا دباؤ نہ تھا۔ کسی سے کوئی سفارش نہ کرتا تھا۔ دونوں دیویوں کی کوششوں کا معجزہ تھا۔ نہیں اُن شہیدوں کی جانبازی کی کرامات تھی۔ جنہیں یاد کرکے لوگ ابھی رویا کرتے تھے۔ لوگ خود آ کر چندہ دیتے تھے۔ اور اپنی حیثیت سے زیادہ مسٹر جان سیوک نے بھی اپنی خوشی سے ایک ہزار روپے دئے۔ اندو نے اپنا چندہ ایک ہزار تو دیا تھا۔ اب اپنے کئی قیمتی زیورات بھی دے ڈالے جو بیس ہزار کو فروخت ہوئے۔ راجہ صاحب کے دل پر سانپ سا لوٹتا رہتا تھا۔ پہلے پوشیدہ پھر علانیہ طور سے مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ گورنر کے پاس خود گئے۔ رؤسا کو بھڑکایا۔ سب کچھ کیا مگر جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ✦

چھ مہینے گزر گئے۔ سورداس کا مجسمہ بن کر آ گیا۔ پونا ایک مشہور کاریگر نے اُسے ایک قومی خدمت سمجھ کر بنا دیا تھا۔ اُسے پانڈے پور میں نصب کرنے کی تجویز تھی۔ جان سیوک نے بخوشی اجازت دے دی۔ جہاں سورداس کا جھونپڑا تھا وہیں اُسے نصب کیا گیا۔ نیک ناموں کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے انسانوں کے پاس اور کون سا ذریعہ ہے؟ اشوک کی یاد بھی تو اُس سنگین ستونوں کی تحریروں سے تازہ ہے۔ والمیک اور ویاس۔ ہومر اور فردوسی سب کو تو نہیں ملتے ✦

پانڈے پور بڑی دھوم دھام سے جلسہ ہو رہا تھا۔ شہر کے لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر اُس میں شامل ہوئے تھے۔ رانی جاہنوی نے اس مجسمہ کو قائم کیا۔ اس کے بعد دیر تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ پھر قومی رہنماؤں کی پر اثر تقریریں ہوئیں اور پہلوانوں نے اپنے اپنے کرتب دکھائے۔ شام کو ایک دعوت دی

گئی۔ چھوت اور اچھوت ایک قطار میں بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے۔ یہ سُورداس کی سب سے بڑی فتح تھی۔ رات کو ایک ناٹک منڈلی (جماعت) نے سُورداس نامی ناٹک کھیلا جس میں سُورداس ہی کے حالات بیان کئے گئے تھے۔ پربھوسیو نے انگلستان سے یہ ناٹک بنا کر اسی موقع کے لئے بھیجا تھا۔ بارہ بجتے بجتے جلسہ ختم ہُوا۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ وہاں سناٹا چھا گیا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور اُس کی اُجلی روشنی میں سُورداس کی مُورت ایک ہاتھ میں لاٹھی ٹیکتی ہوئی اور دوسرا ہاتھ کسی غیبی داتا کے سامنے پھیلائے کھڑی تھی۔ وہی کمزور جسم تھا۔ ہنسلیاں نکلی ہوئیں کمر جھکی ہُوئی۔ چہرہ پر مسکینی اور سادگی چھائی ہوئی مجسم سُورداس معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ متحرک تھا اور یہ ساکن۔ وہ گویا تھا اور یہ خاموش۔ اور بنانے والے نے اُس میں ایک ایسی محبت کی نمود بھر دی تھی جس کا اصل میں پتہ نہ تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بیکنٹھ کا بھکاری دیوتاؤں سے سنسار کے کلیان کی بھیک مانگ رہا تھا!

آدھی رات گزر چکی تھی۔ ایک شخص سائیکل پر سوار ہو کر مجسمہ کے قریب آیا۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی اوزار تھا۔ اُس نے لمحہ بھر تو مورت کو سر سے پیر تک دیکھا اور پھر اُسی اوزار سے اُس پر وار کیا۔ تڑاق کی آواز ہوئی اور وہ سنگین بُت دھماکے کے ساتھ زمین پر آ گرا اور اُسی شخص پر جس نے اُسے توڑا تھا۔ وہ شاید دوسرا وار کرنے والا تھا کہ اتنے میں بُت گر پڑا۔ وہ بھاگ نہ سکا۔ اُسی کے نیچے دب گیا۔ صبح لوگوں نے دیکھا تو راجہ مہیندر سنگھ تھے۔ سارے شہر میں خبر پھیل گئی کہ راجہ صاحب نے سُورداس کی مورت توڑ ڈالی اور خود اُسی کے نیچے دب گئے۔ جب تک جیا سُورداس کے ساتھ

دشمنی رکھی اور اُس کے مرنے پر بھی دشمنی نہ چھوڑی۔ ایسے حاسد انسان بھی ہوتے ہیں۔ ایشور نے اُس کا پھل بھی فوراً دے دیا۔ جب تک جئے سُورداس سے نیچا دیکھا اور مرے بھی تو اُسی کے مجسمہ کے نیچے دب کر۔ دشمن قوم قاتل مکّار۔ دغا باز اور اس سے بھی زیادہ ثقیل الفاظ میں اُن کا ذکر کیا گیا ۔

کاری گروں نے پھر مسالہ سے مورت کے پیر جوڑے اور اُسے کھڑا کیا۔ لیکن اُس ضرب کے نشانات ابھی تک پیروں پر بنے ہوئے ہیں اور چہرہ بھی بگڑ گیا ہے ۔

(۴۹)

اِدھر سُورداس کی یادگار قائم کرنے کے لئے چندہ فراہم کیا جا رہا تھا۔ اُدھر قلیوں کے مکانات کی سنگ بنیاد رکھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں شہر کے معززین مدعو کئے گئے تھے۔ صوبہ کے گورنر سے سنگِ بنیاد رکھنے کی استدعا کی گئی تھی۔ ایک گارڈن پارٹی ہونے والی تھی۔ گورنر صاحب کو ایڈریس دیا جانے والا تھا۔ مسز سیوک دل و جان سے تیاریاں کر رہی تھیں۔ بنگلہ کی صفائی اور آرایش ہو رہی تھی۔ جھالریں وغیرہ بنائی جا رہی تھیں۔ انگریزی بینڈ بلایا گیا تھا۔ مسٹر کلارک نے سرکاری اہلکاروں کو مسز سیوک کی مدد کے لئے تعینات کر دیا تھا اور خود بھی چاروں طرف دوڑتے پھرتے تھے ۔

مسز سیوک کے دل میں اب ایک نئی اُمید پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ونے سنگھ کی موت سے صوفیا اب مسٹر کلارک کی طرف متوجہ ہو۔ اِس لئے وہ مسٹر کلارک کی اور بھی خاطر و مدارات کر رہی تھیں۔ صوفیا کو خود جا کر ساتھ لانے کا قصد کر چکی تھیں۔ جیسے بنے گا ویسے لاؤں گی۔ خوشی سے نہ آئے گی تو جبراً لاؤں گی۔ روؤں گی پیروں پڑوں گی اور بغیر ساتھ لائے اُس کا گلا نہ

چھوڑ دوں گی +

مسٹر جان سیوک کمپنی کی سالانہ رپورٹ تیار کرنے میں مصروف تھے ۔ سال گذشتہ کا منافع ظاہر کرنے کے لئے اُنہوں نے اسی موقع کو پسند کیا تھا۔ اگرچہ واقعی منافع بہت کم ہُوا تھا مگر جمع خرچ میں حسب دلخواہ تصرف کرکے وہ اُمید سے بڑھ کر منافع دکھلانا چاہتے تھے کہ کمپنی کے حصص کا نرخ چڑھ جائے اور لوگ اُن پر ٹوٹ پڑیں۔ اِدھر کے نقصان کو وہ اِس حکمت سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ کلرکوں کو رات رات بھر کام کرنا پڑتا تھا اور خود مسٹر سیوک حساب کے بنانے میں اُس سے کہیں زیادہ محنت کر رہے تھے جتنا کہ جلسہ کی تیاری میں +

لیکن مسٹر ایشور سیوک کو یہ تیاریاں جنہیں وہ فضول خرچی کہتے تھے۔ ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ بار بار جھنجھلاتے تھے۔ بیچارے بُوڑھے آدمی کو صبح سے شام تک سر کھپاتے گزرتا تھا۔ کبھی بیٹے پر جھلاتے۔ کبھی بہو پر۔ کبھی منتظموں پر۔ کبھی ملازموں پر۔ یہ پانچ من برف کی کیا ضرورت ہے؟ کیا لوگ اِس میں نہائیں گے؟ من بھر کافی تھی۔ کام تو نصف من میں ہی چل سکتا تھا اتنی شراب کی کیا ضرورت؟ کوئی پرنالہ بہانا ہے یا مہمانوں کو پلا کر اُن کی جان لینا ہے؟ اس سے کیا فائدہ کہ لوگ پی پی کر بدمست ہو جائیں اور آپس میں جوتی پیزار ہونے لگے؟ لگا دو گھر میں آگ یا مجھی کو زہر دے دو۔ نہ زندہ رہوں گا نہ جلن ہو گی۔ خداوند یسوع مجھے اپنے دامن میں لے۔ اس اندھیر کا کچھ ٹھکانا ہے۔ فوجی بینڈ کی کیا ضرورت؟ کیا گورنر کوئی بچہ ہے جو باجہ سُن کر خوش ہو گا یا شہر کے رؤسا باجہ کے بھوکے ہیں؟ یہ آتشبازیاں کیا ہوں گی؟ غضب خدا کا! کیا ایک سرے سے سب بھنگ پی گئے ہیں؟ گورنر کا خیر مقدم ہے پانچوں

کا کھیل ؟ پٹاخے اور چھچھوندریں کس کو خوش کریں گی ؟ مانا کہ پٹاخے اور چھچھوندریں نہ ہوں گی۔ انگریزی آتشبازی ہوگی مگر کیا گورنر نے آتشبازی نہیں دیکھی؟ فضول کام کرنے سے کیا مطلب ؟ کسی غریب کا گھر جل جائے کوئی اور حادثہ ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ ہندوستانی رئیسوں کے لئے یہ پھل میوے اور مربّے مٹھائیاں منگانے کی کیا ضرورت ؟ وہ ایسے مربھوکے نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ایک ایک سگریٹ کافی تھا۔ ہاں پان الائچی کا بندوبست اور کر دیا جاتا بس۔ وہ یہاں کوئی دعوت کھانے تو آئیں گے نہیں۔ کمپنی کی سالانہ رپورٹ سننے آئیں گے۔ ارے او خانساماں سُور! ایسا نہ ہو کہ میں تیرا سر توڑ کر رکھ دوں۔ جو جو وہ پگلی (مسز سیوک) کہتی ہے تو وہی کرتا ہے تجھے بھی کچھ تمیز ہے کہ نہیں ؟ جانتا ہے آج کل چار روپیہ سیر انگور ملتے ہیں۔ اُن کی مطلق ضرورت نہیں۔ خبردار جو یہاں انگور آئے۔ خلاصہ یہ کہ کئی دنوں کی لگاتار بکواس سے اُن کی طبیعت کچھ خراب سی ہو رہی تھی۔ کوئی اُن کی سنتا نہ تھا۔ سب مَن مانی کرتے تھے۔ جب وہ بکتے بکتے تھک جاتے تو اُٹھ کر باغ میں چلے جاتے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر آ پہنچتے۔ اور پہلے کی طرح لوگوں پر بگڑنے لگتے۔ یہاں تک کہ جلسہ کے ایک ہفتہ قبل جب مسٹر جان سیوک نے یہ تجویز کیا کہ گھر کے سب نوکروں اور کارخانہ کے چپڑاسیوں کو انگوٹھی کی نئی وردیاں دی جائیں تو مسٹر ایشور سیوک نے غصہ کے مارے وہ انجیل جسے وہ ہاتھ میں لئے ہوئے ظاہرا عینک کی مدد سے مگر دراصل اپنے حافظہ سے پڑھ رہے تھے اپنے سر پر پٹک لی اور بولے —— یا خدا! مجھے اِس جنجال سے نکال! سر دیوار کے قریب تھا۔ یہ دھکا لگا تو دیوار سے ٹکرا گیا۔ نوّے برس کی عمر۔ کمزور جسم (وہ تو کہو پُرانی ہڈیاں تھیں جو کام دیتی تھیں) بیہوش

بہوش ہوگئے۔ دماغ اِس صدمہ کو برداشت نہ کرسکا۔ آنکھیں نکل آئیں۔ ہونٹ کھُل گئے اور جب تک لوگ ڈاکٹروں کو بُلائیں اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ خدا نے اُن کی آخری دُعا قبول کرلی۔ اُنہیں اِس جنجال سے نکال لیا۔ یقینی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی موت کا خاص سبب کیا تھا۔ چوٹ کا صدمہ یا خانگی تفکرات کا صدمہ۔

صوفیا نے یہ خبر سُنی تو اُس کی کشیدگی جاتی رہی۔ اپنے گھر میں اب اگر کسی کو اُس سے محبت تھی تو وہ ایشور سیوک ہی تھے۔ صوفیا کو بھی اُن سے عقیدت تھی۔ اُس نے فوراً ماتمی لباس پہنا اور اپنے گھر گئی۔ مسز سیوک دوڑ کر اُس سے گلے ملیں اور ماں بیٹی نے مل کر ایشور سیوک کی لاش پر خوب آنسو بہائے۔

رات کو جب ماتمی دعوت ختم ہوئی اور لوگ اپنے اپنے گھر گئے تو مسز سیوک نے صوفیا سے کہا۔ بیٹی تم اپنا گھر ہوتے ہُوئے دوسری جگہ رہتی ہو۔ کیا یہ ہمارے لئے شرم و افسوس کی بات نہیں ہے؟ یہاں اب تمہارے سوا اور کون وارث ہے؟ پربھو کا اب کیا ٹھکانا۔ گھر آئے یا نہ آئے۔ اب تو جو کچھ ہو تمہیں ہو۔ ہم نے اگر کبھی سخت بات کہی ہوگی تو تمہارے بھلے کے لئے۔ میں کچھ تمہاری دشمن تو ہوں نہیں۔ اب اپنے گھر میں رہو۔ یوں آنے جانے کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ رانی صاحب سے بھی مل آیا کرو پر رہنا یہیں چاہئے۔ خدا نے اور تو سب ارمان پورے کر دئے۔ تمہاری شادی بھی ہوجاتی تو بیفکر ہوجاتی۔ پربھو جب آتا دیکھی جاتی۔ اتنے دنوں کا ماتم کم نہیں ہوتا۔ اب وقت گوارنا مناسب نہیں۔ میری خواہش ہے کہ اب کی تمہاری شادی ہوجائے اور گرمیوں میں ہم سب دو تین ماہ کے لئے منصوری چلیں۔

صوفیا نے کہا۔ جیسی آپ کی مرضی کروں گی ⁂

ماں۔ اَور کیا صوفی۔ زمانہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ ہماری زندگی کا کیا بھروسہ۔ تمہارے بڑے پاپا یہ ارمان لئے ہی چلے گئے۔ تو میں تیاری کروں؟

صوفیا۔ کہہ تو رہی ہوں ⁂

ماں۔ تمہارے پاپا سُن کر پھُولے نہ سمائیں گے۔ کنور ونئے سنگھ کی میں بُرائی نہیں کرتی۔ بڑا جوانمرد تھا مگر بیٹی اپنے ہم مذہب شخص کی بات ہی کچھ اَور ہے ⁂

صوفیا۔ ہاں اور کیا ⁂

ماں۔ تو اب رانی جاہنوی کے یہاں نہ جاؤں گی نہ؟

صوفیا۔ جی نہیں۔ نہ جاؤں گی ⁂

ماں۔ آدمیوں سے کہہ دوں تمہاری چیزیں اُٹھا لائیں؟

صوفیا۔ کل رانی صاحبہ خود ہی بھیج دیں گی ⁂

مسز سیوک خوش خوش دعوت کا کمرہ صاف کرانے گئیں۔ مسٹر کلارک ابھی وہیں تھے۔ اُنہیں بھی یہ مژدہ سُنایا۔ سُن کر پھڑک اُٹھے۔ باچھیں کھِل گئیں۔ دوڑے ہوئے صوفیا کے پاس گئے اور بُولے۔ صوفیا تم نے مجھے زندہ کر دیا۔ آہا۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ مگر تم ایک بار اپنے مُنہ سے میرے سامنے کہہ دو۔ تم اپنا وعدہ پورا کروگی؟

صوفیا۔ کروں گی ⁂

اور ابھی بہت سے لوگ موجود تھے پس مسٹر کلارک صوفیا کو پیار نہ کر سکے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے اور ہوائی قلعے بناتے اپنے گھر گئے ⁂

علے الصباح صوفیا کا اپنے کمرہ میں پتہ نہ تھا۔ تلاش شروع ہوئی۔ ماں

نے کہا کہ میں نے اُنہیں جاتے تو نہیں دیکھا پر جب یہاں سب لوگ سو گئے تھے تو ایک بار پھاٹک کھلنے کی آواز آئی تھی۔ لوگوں نے سمجھا کہ کنور بھرت سنگھ کے یہاں گئی ہوگی۔ فوراً ایک آدمی بھیجا گیا۔ لیکن وہاں بھی پتہ نہ تھا۔ بڑی للّ چل مچی۔ کہاں گئی؟

جان سیوک۔ تم نے رات کو کچھ کہا سُنا تو نہیں تھا؟

مسز سیوک۔ رات کو تو شادی کی بات چیت ہوتی رہی۔ مجھ سے تیاریاں کرنے کو بھی کہا۔ خوش خوش سوئی۔

جان سیوک۔ تمہاری سمجھ کا قصور تھا۔ اُس نے تو اپنے دل کی بات ظاہر کر دی۔ تم کو جتا دیا کہ کل میں نہ ہوں گی۔ جانتی ہو۔ شادی سے اس کا مطلب کیا تھا؟ فنا ہو جانا! اب ونے سے اُس کی شادی ہوگی۔ جو یہاں نہ ہو سکی وہ بہشت میں ہوگی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ تم نے رات کو شادی کا تذکرہ چھیڑ کر اُسے خوف زدہ کر دیا۔ جو بات کچھ دنوں میں ہوتی وہ آج ہی ہو گئی۔ اب جتنا رونا ہو رو لو۔ میں تو پہلے ہی رو چکا ہوں۔

اتنے میں رانی جاہنوی آئیں۔ آنکھیں روتے روتے سُرخ ہو گئی تھیں اُنہوں نے ایک خط مسز سیوک کے ہاتھ میں رکھ دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر مُنہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

یہ صوفیا کا خط تھا۔ ابھی ڈاکیہ نے دیا تھا۔ لکھا تھا۔

"مادرِ محترمہ۔ آپ کی صوفیا آج دُنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ جب وُنے نہ رہے تو یہاں میں کس کے لئے رہوں؟ اتنے روز تک دل کو تسکین دینے کی کوشش کرتی رہی۔ سمجھتی تھی کہ کتب کے مطالعہ میں اس دُکھ بھری یاد کو

غرق کر دوں گی اور اپنی زندگی کو خدمتی فرائض کی انجام دہی میں گزار دوں گی۔ مگر میرا پیارا دسنے مجھے بلا رہا ہے۔ میرے بغیر اُسے وہاں ایک لمحہ بھی چین نہیں ہے۔ اُس سے ملنے جاتی ہوں۔ یہ جسم ہی میرے اور اُن کے درمیان میں حائل ہے۔ اِسے میں یہیں چھوڑ دوں گی۔ اسے میں گنگا کو سونپے دیتی ہوں۔ میرا دل بشاش ہے۔ پیر اُڑے جا رہے ہیں۔ خوشی رؤئیں رؤئیں میں سما رہی ہے۔ اب جلد ہی مجھے دسنے کے درشن ہوں گے۔ آپ میرے لئے غم نہ کیجئے گا۔ مجھے کھوجنے کی بیفائدہ کوشش بھی نہ کیجئے گا کیونکہ جب تک یہ خط آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ صوفیا کا سر دسنے کے قدموں پر ہوگا۔ مجھے ایک زبردست طاقت کھینچے لئے جا رہی ہے اور بیڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ ماما اور پاپا سے کہہ دیجئے گا۔ کہ صوفیا کا بیاہ ہو گیا۔ اب اُس کی فکر نہ کریں ؟

خط کے ختم ہوتے ہی مسز سیوک دیوانہ وار کرخت لہجہ میں بولیں۔ تمہیں سب کی گانٹھ ہو۔ میری زندگی کو برباد کرنے والی میری اُمیدوں کو پامال کرنے والی میری عزت بگاڑنے والی کالی ناگن تمہیں ہو۔ تمہیں نے اپنی شیریں کلامی سے اپنی چال بازی سے اپنی جادوگری سے میری سیدھی سادی صوفیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور آخر کو اسے تباہ کر دیا۔ یہ تمہیں لوگوں کی ترغیب و تحریک کا نتیجہ ہے کہ میرا لڑکا آج نہ جانے کہاں اور کس حالت میں ہے اور میری لڑکی کا یہ حشر ہوا۔ تم نے میرے سارے منصوبے خاک میں ملا دئے ؟

وہ اُسی حالت غیظ میں نہ جانے اور کیا کیا کہتیں کہ مسٹر جان سیوک اُن کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے کھینچ لے گئے۔ مدانی جاہنوی نے ان ناملائم اور

اہانت آمیز الفاظ کا کچھ جواب نہ دیا۔ مسز سیوک کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتی رہیں اور پھر بلا کچھ کہے سُنے وہاں سے اُٹھ کر چلی گئیں ؂

مسز سیوک کی تمام خواہشوں پر پالا پڑ گیا۔ اُس روز سے پھر اُنہیں کسی نے گرجا جاتے نہیں دیکھا۔ وہ پھر کبھی گاؤن اور ہیٹ پہنے ہوئے نہیں دکھائی دیں۔ پھر یوروپین کلب میں نہیں گئیں پھر انگریزی عورتوں میں شریک نہیں ہوئیں۔ دوسرے دن علی الصباح پادری پم اور مسٹر کلارک ماتم پُرسی کے لئے آئے۔ مگر مسز سیوک نے دونوں کو وہ پھٹکار سُنائی کہ اپنا سا مُنہ لے کر واپس گئے۔ خلاصہ یہ کہ اُسی روز سے اُن کی عقل میں فتور آگیا۔ دماغ اتنی سخت چوٹیں نہ سہ سکا۔ وہ ابھی تک زندہ ہیں مگر زندہ درگور۔ انسانوں کی صورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ کبھی ہنستی ہیں کبھی روتی ہیں کبھی ناچتی ہیں۔ کبھی گاتی ہیں۔ کوئی سامنے جاتا ہے تو دانت نکالے کاٹنے کو دوڑتی ہیں ؂

رہے مسٹر جان سیوک۔ وہ مایوسانہ استقلال کے ساتھ صبح سے شام تک اپنے تاجرانہ مشاغل میں منہمک رہتے ہیں۔ اُنہیں اب دُنیا میں کوئی خواہش کوئی آرزو نہیں۔ دولت سے اُنہیں بےغرضانہ محبت ہے۔ کچھ وہی محبت جو اولیائے کرام کو خدا سے ہوتی ہے۔ دولت اُن کے لئے کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ خود مقصد ہے۔ نہ دن کو دن سمجھتے ہیں نہ رات کو رات۔ کاروبار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ نفع بھی روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے یا نہیں۔ اس میں شک ہے۔ ملک میں کوچہ کوچہ۔ دوکان دوکان۔ اِس کارخانہ کے سگار اور سگرٹیں کی کثرت ہے۔ وہ اب پٹنہ میں ایک تمباکو کا کارخانہ کھولنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کیونکہ صوبہ بہار میں تمباکو بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دولت کی ہوس

علم کی ہوس کی طرح آسودہ نہیں ہوتی ⁂

(۵۰)

کنورو نے سنگھ کی بہادرانہ موت کے بعد رانی جاہنوی کا جوش دونا ہوگیا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی سے کام کرنے لگیں۔ اُن کے روئیں روئیں سے غیر معمولی سرگرمی ظاہر ہونے لگی۔ عالم ضعیفی کی کاہلی شباب کی تیزی میں تبدیل ہوگئی۔ اُنہوں نے کمربستہ ہوکر سیوا سمتی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ رنواس چھوڑ کر میدانِ عمل میں قدم رکھا اور اتنے جوش سے کام کرنے لگیں کہ سمتی کو جو فروغ کبھی نہ حاصل ہوا تھا وہ اب ہوا۔ روپیہ کبھی اتنا زیادہ نہ تھا اور نہ والنٹیروں کی تعداد ہی کبھی اس قدر کثیر تھی۔ اُن کا خدمتی دائرہ بھی کبھی اتنا وسیع نہ تھا۔ اُن کے پاس جتنی ذاتی دولت تھی وہ سب سمتی کو وقف کردی حتیٰ کہ اپنے لئے ایک زیور بھی نہ رکھا۔ سنیاسی کا بھیس لے کر دکھا دیا کہ موقع پڑنے پر عورتیں کتنا کام کر سکتی ہیں ⁂

ڈاکٹر گنگولی کی اُمیدواریاں بھی بالآخر اپنی برسنگی میں ظاہر ہوگئیں۔ اُنہیں معلوم ہوگیا کہ موجودہ حالت میں کوئی اُمید رکھنا اپنے ضمیر کو دھوکا دینے کے سوا اَور کچھ نہیں۔ اُنہوں نے کونسل میں مسٹر کلارک کے خلاف بڑا واویلا مچایا مگر وہ سب نالۂ صحرا ثابت ہُوا۔ مہینوں کی بحث اور سوالوں کی بھرمار سب بے سود ہوئی۔ وہ گورنمنٹ کو مسٹر کلارک کی تنبیہ کے لئے مجبور نہ کر سکے۔ اس کے برعکس مسٹر کلارک کے عہدہ میں ترقی ہوگئی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اتنے برانگیختہ ہوئے کہ آپے میں نہ رہ سکے۔ وہیں بھری سبھا میں گورنر کو خوب سخت سُست کہا یہاں تک کہ صدرِ جلسہ نے اُنہیں بیٹھ

جانے کو کہا۔ اُس پر وہ اَور بھی گرم ہوئے اور صدر صاحب کی بھی خبر لی۔ اِس پر صدر نے اُنہیں کونسل ہاوس سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اور پولیس سے مدد لینے کی دھمکی دی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا غصّہ اب بھی فرو نہ ہوا۔ وہ بگڑ کر بولے "آپ حیوانی طاقت سے مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں! اس لئے کہ آپ میں جواز و انصاف کی قوت نہیں ہے۔ آج میرے دل سے وہ اعتقاد اُٹھ گیا جو گزشتہ چالیس برسوں سے مجھے تھا کہ گورنمنٹ انصاف کی طاقت سے حکومت کرنا چاہتی ہے۔ آج اس طاقت کی قلعی کھُل گئی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹ گیا اور ہم گورنمنٹ کو اُس کی بے حجابانہ اور برہنہ شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ اب ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ صرف ہم کو پیل کر تیل نکالنے کے لئے ہماری ہستی مٹانے کے لئے ہماری تہذیب و انسانیت کا خون کرنے کے لئے ہم کو غیر محدود زمانہ تک چکّی کا بَیل بنائے رکھنے کے لئے ہم پر حکومت کی جا رہی ہے! اب تک جو کوئی مجھ سے ایسی باتیں کرتا تھا تو میں اُس سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ میں برِن۔ ہیوم اور بسنٹ وغیرہ کی تعریف کر کے اُسے لاجواب کر دینے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر اب معلوم ہو گیا کہ مقصد سب کا ایک ہے۔ صرف حصول کے ذرائع میں فرق ہے"۔

وہ زیادہ نہ بولنے پائے۔ پولیس کا ایک سارجنٹ اُنہیں وہاں سے باہر نکال لے گیا۔ اَور ممبر بھی وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پہلے تو لوگوں کو اندیشہ تھا کہ سرکار ڈاکٹر گنگولی پر مقدمہ چلائے گی مگر شاید کارکنانِ متعلقہ کو اُن کی پیرانہ سالی پر رحم آ گیا خصوصاً اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اُسی روز گھر آتے ہی اپنا استعفےٰ بھیج دیا۔

وہ اُسی دن وہاں سے روانہ ہو گئے اور تیسرے روز کنور بھرت سنگھ

سے آملے۔ کنور صاحب نے کہا ـــ تم تو اتنے غصّہ ور نہ تھے۔ یہ تمھیں ہو کیا گیا؟

گنگولی۔ ہو کیا گیا۔ وہی ہو گیا جو آج سے چالیس برس قبل ہونا چاہئے تھا۔ اب ہم بھی آپ کا ساتھی ہو گیا۔ اب ہم دونوں سمتی کا کام کھوب حوصلہ سے کرے گا۔

کنور۔ نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ مجھ میں وہ جوش نہیں رہا۔ وسنے کے ساتھ سب چلا گیا۔ جالھوری البتہ آپ کی مدد کریں گی۔ اگر اب تک کچھ شک تھا تو آپ کے اس طرح چلے آنے سے وہ دور ہو گیا کہ سیوا سمتی سے حکام اعلیٰ بدظن ہیں اور اگر میں اس سے علیحدہ نہ رہا تو مجھے اپنی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جب یہ یقین ہے کہ ہماری قسمت میں غلامی ہی لکھی ہوئی ہے ......

گنگولی۔ یہ آپ کو کیسے یقین ہوا؟

کنور۔ حالات کو دیکھ کر اور کیا۔ جب یہ یقین ہے کہ ہم ہمیشہ غلام ہی رہیں گے تو میں اپنی جائداد کیوں تلف کروں؟ جائداد بچی رہے گی تو ہم اس معذوری کی حالت میں بھی اپنے غریب بھائیوں کے کچھ کام آسکیں گے۔ اگر وہ بھی نکل گئی تو ہمارے دونوں ہاتھ کٹ جائیں گے۔ ہم رونے والوں کے آنسو بھی نہ پونچھ سکیں گے۔

گنگولی۔ ہا۔ تو کنور دسلے سنگھ کی موت بھی آپ کے اس بیڑی کو نہیں توڑ سکا۔ ہم سمجھا تھا۔ اب آپ چھوٹ گیا پر دیکھتا ہے تو وہ بیڑی ویسا ہی آپ کے پیروں میں پڑا ہوا ہے۔ اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہم کیوں جائداد والوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ تو اپنی جائداد کا غلام ہے۔ وہ کبھی سچائی

کا لڑائی نہیں لڑ سکتا۔ جو سپاہی سونے کا اینٹ گردن میں باندھ کر لڑنے چلے وہ کبھی نہیں لڑ سکتا۔ اُس کو تو اپنے اینٹ کا پھکر لگا رہے گا۔ جب تک ہم لوگ موہ (جرمن) کا تیاگ نہیں کریں گا ہمارا مطلب کبھی نہ پورا ہوگا۔ ابھی تک ہم کو کچھ سک تھا پر وہ بھی مٹ گیا کہ جائداد والا آدمی ہمارا مدد کرنے کے بدلے اُلٹا ہمیں نکسان پہنچائے گا۔ پہلے آپ نراس حالا تھا اب آپ جائداد والا ہو گیا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر گنگولی بددلی کے ساتھ وہاں سے اُٹھے اور جاہنوی کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہیں۔ اُنھوں نے دیکھتے ہی ہنس کر ان کی تعظیم کی پھر کہا ۔۔۔ "اب تو آپ بھی میرے رفیق ہو گئے میں جانتی تھی کہ ہم لوگ ایک نہ ایک روز آپ کو ضرور کھینچ لیں گے۔ جن میں خودداری کا جذبہ ہے اُن کے لئے وہاں جگہ نہیں ہے۔ وہاں اُنہیں کے لئے جگہ ہے جو یا تو خود غرض ہیں یا اپنے کو دھوکا دینے میں مشاق۔ ابھی یہاں دو ایک روز آرام کیجئے گا نا؟ میں تو آج کی گاڑی سے پنجاب جا رہی ہوں"۔

گنگولی۔ آرام کرنے کا وکھت تو اب کریب آگیا ہے۔ اُس کا کیا جلدی ہے؟ تب بہت آرام کرے گا۔ ابھی تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلے گا۔

جاہنوی۔ کیا کروں بیچاری صوفیا نہ ہوئی ورنہ اُس سے بڑی مدد ملتی۔

گنگولی۔ ہم کو تو اُس کا حال وہیں ملا تھا۔ اُس کی جندگی اب دُکھ میں کٹتا۔ وہ کھتم ہو گیا۔ یہ بہت اچھا ہُوا۔ پریم سے نراس ہو کر وہ کبھی سُکھی نہیں رہ سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ ستی تھا اور ستی کا یہی دھرم ہے۔ رانی اندو تو آرام سے ہے نا؟

جا ٹھوری۔ وہ تو مہیندر کمار سے پہلے ہی روٹھ کر چلی آئی تھی۔ اب یہیں رہتی ہے۔ وہ بھی تو میرے ساتھ جا رہی ہے۔ اُس نے اپنی ریاست کے انتظام کے لئے ایک ٹرسٹ قایم کرنا طے کیا ہے جس کے پریسیڈنٹ آپ ہوں گے۔ اُسے ریاست سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔

اتنے میں اندرا آگئی اور ڈاکٹر گنگولی کو دیکھ کر اُنہیں نمسکار کر کے بولی آپ خود آ گئے۔ میرا تو ارادہ تھا کہ پنجاب ہوتے ہوئے آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں۔

ڈاکٹر گنگولی نے کچھ کھانا کھایا اور شام کے وقت تینوں آدمی یہاں سے روانہ ہو گئے۔ اُن کے دلوں میں ایک ہی لگن تھی۔ ایک ہی آگ تھی۔ اُنہیں ایشور پر پورا بھروسہ تھا۔

کنور بھرت سنگھ اب پھر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر وہی سیر و شکار ہے۔ وہی رئیسانہ تکلفات۔ وہی امیرانہ نخرے۔ وہی نمود و نمائش اُن کے مذہبی اعتقاد کی جڑ اُکھڑ گئی ہے۔ اِس زندگی کے بعد اب اُن کے لئے ناقابلِ فنا ہی خلا اور غیر محدود نیستی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ دنیا ناپائدار ہے۔ عقبیٰ بھی ناپائدار ہے۔ جب تک زندگی ہے ہنس کھیل کر گزار دو۔ مرنے کے پیچھے کیا ہوگا سو کون جانتا ہے۔ دُنیا سدا اسی طرح رہی اور اسی طرح رہے گی۔ اُس کا انتظام نہ کسی سے ہو سکا ہے نہ ہو سکے گا۔ بڑے بڑے داتا بڑے بڑے فلاسفر۔ بڑے بڑے رشی مُنی مر گئے اور کوئی یہ بھید نہ جان سکا۔ ہم محض جیو ہیں اور ہمارا کام فقط جینا ہے۔ حُب الوطنی انسانیت۔ خدمت ایثار۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ اب اُن کے مایوس دل کو انہیں خیالات سے تسکین ملتی ہے۔

ادبی تصانیف

پریم بتیسی حصہ اوّل و دوم

ہندوستان کے بے نظیر افسانہ نویس منشی پریم چند کے افسانے ہمیشہ اصلاح اخلاق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور ان کا مقصد شریفانہ جذبات مثلاً غیرت۔ حیا۔ خوف خدا۔ شجاعت اور آزادیٔ ضمیر وغیرہ کا برانگیختہ کرنا ہوتا ہے۔ پریم بتیسی آپ کے بتیس تازہ ترین قصوں کا مجموعہ ہے۔ ان قصوں میں فطرت کا دلچسپ مطالعہ۔ نازک ترین جذبات واحساسات کا بیان۔ ہندوستانی مناظر قدرت کے پرلطف اسکیچ ہیں۔ زندگی کے معموں کو نہایت خوبی سے سلجھایا۔ اور ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ وہ قصے ہیں۔ جو ہندوستانی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیں گے غیر ممکن ہے۔ کہ کوئی منشی صاحب موصوف کی تصنیف پڑھے۔ اور آپ کی جادو بیانی اور سحر نگاری کا قائل نہ ہو جائے۔ قیمت حصہ اوّل ۱۲؍ حصہ دوم ۱۲؍

پریم پچیسی حصہ اول و دوم

ادیب فطرت نگار منشی پریم چند کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مقبول تصنیف جو پہلا اڈیشن تمام ہونے کے بعد کہیں سے دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔

اس مجموعے میں ماستا۔ بڑے گھر کی بیٹی۔ نمک کا داروغہ۔ رانی سارندھا۔ بے غرض محسن۔ آہ بے کس۔ خون سفید صرف ایک آواز۔ کرموں کا پھل۔ غیرت کی کٹاری۔ منزل مقصود وغیرہ خاص طور پر شہرت حاصل کر چکے ہیں +

کتابت طباعت اور کاغذ کے متعلق دارالاشاعت پنجاب کی تمام مطبوعات ہی خاص شہرت رکھتی ہیں۔ یہ کتاب سلسلہ کہکشاں میں شامل کر لی گئی ہے۔ اور اسی سلسلے کے چھوٹے سائز پر چھاپی گئی ہے۔

قیمت حصہ اوّل عہ/ حصہ دوم عہ/

بازارِ حُسن حصہ اول و دوم

ادیب فطرت نگار منشی پریم چند کا پہلا ضخیم ناول اُردو میں، ایک حسین اور ناز و نعم میں پلی ہوئی لڑکی کی سرگزشت۔ جسے اُس کے باپ کی گرفتاری کے بعد اس کے عزیزوں نے ایک ایسے غریب شخص سے بیاہ دیا۔ جو کسی لحاظ سے اس کے لئے موزوں نہ تھا۔ ایک طوائف کا مکان قریب ہونے کے باعث وہ لڑکی اپنی حالت کا موازنہ اس سے کر کے ہمیشہ رشک کرتی رہی۔ یہاں تک کہ آخر ایک روز خاوند سے لڑائی ہونے کے بعد بازارِ حُسن کی زینت بن گئی۔ ایک مخلص قوم نے اسے بہت مشکل سے اس ذلت کے غار سے نکال کر اس راستے پر لگا دیا۔ جو انسانی زندگی کی منزل مقصود ہے۔ ضمناً ان امور پر بھی نہایت خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہ بازارِ حُسن کے فروغ کا سوسائٹی پر کس قدر الزام ہے۔ ہندو مسلم اختلافات کے کیسے مضر نتائج نکلتے ہیں۔ اور

بازار حسن کی اصلاح کے کیا طریق ہیں۔ قیمت حصہ اوّل عمر حصہ دوم عہ

خوابِ خیال

منشی پریم چند کے تازہ ترین چودہ مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ پختگی خیالات اور شستگی تحریر کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور وہ حقائق حیات کی مصوری کے ساتھ معاشری مسائل کے نہایت اہم پہلوؤں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحے۔ ٹائیٹل رنگین۔ قیمت عہ

نقشِ فرنگ

قاضی عبدالغفار صاحب اڈیٹر صباح و جمہور نے یورپ سے واپس آکر ان تاثرات کو قلمبند فرمایا ہے۔ جو دیار فرنگ کی تاریخی یادگار بدولت دور حاضر کے محیر العقول تمدن اور مدبرین مغرب کی جنگ زرگری کے مناظر سے آپ کے قلب پر وارد ہوتے تھے۔ یہ کتاب "سفرنامہ" نہیں بلکہ ایک ادیب کے دلاویز و دلفریب خیالات ہیں۔ جن سے دل و دماغ دونوں لذت اندوز ہوتے ہیں۔ قیمت عہ

لیلیٰ یا محاصرۂ غرناطہ

ترجمہ سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے۔ اڈیٹر کہکشاں جس میں اسلامی تہذیب و تمدن کی آخری جھلک۔ مور خاندان کے فلسفی شہزادہ ابو عبداللہ کا حسرتناک انجام تحفظ وطن و مذہب کے لئے غرناطہ کے مردمیدان موسیٰ ابن ابی غازان کی سرگرم مساعی۔ عیسائیوں کے

محکمہ احتساب کے ہولناک مظالم۔ حصول آزادی کے لئے یہودیوں کی دیوانہ وار کشمکش۔ اور مذہبوں اور سلطنتوں کی اس جدوجہد کے درمیان لیلئے! ایک مجنون یہودی کی معصوم دختر! جو قوم یہود کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے پروان چڑھائی گئی تھی۔ غرناطہ کے مسلم مرد میدان کو چاہنے لگی۔ واقعات کی رَو اُسے کہیں سے کہیں بہالے گئی۔ اور وہ عیسائیت کی آغوش میں جاتی ہوئی اپنے نامراد باپ کے خنجر سے تمام ہو گئی۔ انداز تحریر کے شکوہ۔ افراد قصہ کی سیرت کے مکمل بیان اور صحیح تاریخی واقعات اور اثر و تاثیر کے لحاظ سے ادب اردو میں حیرت انگیز اضافہ ہے۔ قیمت عہ/ ۲ر

عذرا

امین کے باپ نے حنیف کو ایک صندوقچی دی۔ اور وصیت کی کہ میرا خورد سال بچہ جب بالغ ہو جائے۔ تو یہ صندوقچی کھولی جائے۔ اس صندوقچی میں سے ایک تحریر نکلی جس کے بموجب حنیف و امین افریقہ کے لق و دق جنگلوں میں ایک ایسی عورت کے ملک میں پہنچے۔ جو ہزار سال سے زندہ چلی آتی تھی۔ اور آگ کے شعلوں میں نہایا کرتی تھی۔ اس کے حالات ایسے عجیب ہیں۔ کہ نہ آنکھوں نے دیکھے۔ اور نہ کانوں نے سنے۔ قیمت عہ/

شیخ حسن

روحانیات کے متعلق ایک نہایت دلچسپ کتاب جو چشم دید